مارچ 2013
بہنوں کا اپنا ماہنامہ
شعاع
پاک سوسائٹی
ڈاٹ کام
www.paksociety.com

مستقل سلسلے

مارچ 2013
جلد 27 شمارہ 7
قیمت 50 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا - مقام: 2-اے، پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی، کراچی
Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494. Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

شعاع کا مارچ کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

انتہائی منظم طریقے سے وطن عزیز کو لہولہان کیا جا رہا ہے۔ کراچی تو ایک مدت سے ہی قتل گاہ بنا ہوا ہے۔ وطن عزیز کے دوسرے شہر بھی محفوظ نہیں۔ حال ہی میں کوئٹہ میں پیش آنے والے المناک سانحہ پر ہر حساس دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ کیا ستم ہے کہ ایک اللہ، ایک قرآن، ایک رسولؐ پر یقین رکھنے والے، ماننے والے ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہیں۔ اس سے زیادہ افسوس ناک بات تو یہ ہے کہ آج تک کسی بھی مجرم کا سراغ نہیں مل سکا ہے۔ قانون نافذ کرنے والے ادارے جرائم کا سراغ لگانے والی ایجنسیاں عوام کو تحفظ دینے کے ذمہ داران ان کو پکڑ نہیں سکے ہیں۔ نہ جانے انہوں نے کون سی جادوئی ٹوپیاں پہن رکھی ہیں جو کسی کو دکھائی نہیں دیتے۔ انتہائی دیدہ دلیری سے واردات کر کے غائب ہو جاتے ہیں۔ یہ کون سی کرامات کر رہے ہیں کہ ان کے داغ دار دامن نظر آتے ہیں نہ لہو میں رنگے ہاتھ۔

یہ حالات کسی بین الاقوامی سازش کا نتیجہ ہیں یا ان کے پس پشت کوئی مفاد پرست گروہ یا مافیا ہے۔ اس کا پتا چلانا، عوام کو تحفظ دینا حکومت اور ریاست کی ذمہ داری ہے۔
لیکن موجودہ حالات تو یہ کہہ رہے ہیں کہ یہاں کسی حکومت کا وجود ہی نہیں ہے۔

اس شمارے میں،

- نمرہ احمد کا مکمل ناول۔ جنت کے پتے تکمیل کے مراحل میں،
- مصباح نوشین کا ناول۔ محبت گمشدہ میری،
- صائمہ اکرم، سحرش بانو اور شیریں ملک کے ناولٹ،
- فرحانہ ناز ملک، مصباح علی، عنبرین اعجاز، رابعہ افتخار اور صدف آصف کے افسانے،
- عالیہ بخاری اور رخسانہ نگار عدنان کے ناول،
- بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا۔ آمنہ نذیر کا تبصرہ،
- عائشہ بخش اور عدنان امین کا بندھن،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں،
- خط آپ کے، شعاع کے ساتھ ساتھ اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

شعاع کا شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ آپ کی رائے جاننے کے منتظر ہیں۔

مجھ پہ کر دیجیے کرم سائیں
لے کر آیا ہوں چشمِ نم سائیں

تیری حمد و ثنا ہی لکھتا رہوں
دم میں جب تک ہے میرے دم سائیں

تا دمِ مرگ تیری مدحت میں
سر بہ سجدہ رہے قلم سائیں

روح پرواز جب کرے میری
سامنے ہو تیرا حرم سائیں

ہے یقیں مجھ کو روزِ محشر بھی
تو رکھے گا میرا بھرم سائیں

میں تو تیری رضا پہ راضی ہوں
رنج کیا شے ہے، کیا الم سائیں

خورشید بیگ میلسوری

دل جس سے زندہ ہے، وہ تمنا تم ہی تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں، وہ دنیا تم ہی تو ہو

پھوٹا جو سینۂ شبِ تارِ الست سے
اس نورِ اولیں کا اجالا تم ہی تو ہو

سب کچھ تمہارے واسطے پیدا کیا گیا
سب غایتوں کی غایتِ اولیٰ تم ہی تو ہو

دنیا میں رحمتِ دو جہاں اور کون ہے
جس کی نہیں نظیر، وہ تنہا تم ہی تو ہو

گرتے ہوؤں کو تھام لیا جس کے ہاتھ نے
اے تاجدارِ یثرب و بطحا تم ہی تو ہو

جلتے ہیں جبرئیل کے پَر جس مقام پر
اس کی حقیقتوں کے شناسا تم ہی تو ہو

مولانا ظفر علی خان

نیک لوگوں، کمزوروں اور مسکینوں کو ایذا پہنچانا نہایت خطرناک ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "اور جو لوگ مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ایذا پہنچائیں جب کہ انہوں نے کوئی جرم اور قصور نہ کیا ہو تو یقیناً ان لوگوں نے بہتان اور کھلے گناہ کا بوجھ اٹھایا۔" (سورۂ احزاب 58)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "لہٰذا آپ یتیم پر سختی نہ کریں۔ اور سوالی کو نہ جھڑکیں۔" (سورۂ ضحیٰ 9-10)

اس باب سے متعلق احادیث کثرت سے ہیں۔ ان ہی میں سے ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ایک روایت ہے۔

"جو میرے دوست سے دشمنی رکھتا ہے، میرا اس سے اعلان جنگ ہے۔"

اسی طرح حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے۔

"اے ابوبکر! اگر تُو نے انہیں ناراض کر دیا تو یقیناً تو نے اپنے رب کو ناراض کر دیا۔"

اللہ کی حفاظت

حضرت جندب بن عبداللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جس نے صبح کی نماز پڑھی، وہ اللہ کی حفاظت و ضمانت میں ہے۔ چنانچہ (یاد رکھو!) اللہ تعالیٰ تم سے اپنی ضمانت کے بارے میں کچھ بازپرس نہ کرے، اس لیے کہ جس سے وہ اپنے ذمہ کے بارے میں کچھ بھی بازپرس کرے گا تو (وہ کوتاہی پر) اس کا مواخذہ کرے گا اور پھر اسے منہ کے بل (اوندھا کر کے) جہنم کی آگ میں ڈال دے گا۔" (مسلم)

فوائد و مسائل

(1) ذمہ اللہ کے معنی فی امان اللہ ہیں جس کا ایک مطلب تو یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص ایسے پابند صلوٰۃ مومن کو ایذا نہ پہنچائے (کیونکہ وہ اللہ کی حفاظت اور امان میں ہے)۔ جو شخص اسے ایذا پہنچاتا ہے، وہ گویا اللہ کے عہد کو توڑتا ہے جس پر اللہ اس کا مواخذہ فرمائے گا۔

(2) دوسرا مطلب یہ ہے کہ فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنے سے مومن اللہ کے ساتھ ایک عہد کر لیتا ہے، جس کا تقاضا یہ ہے کہ اب وہ سارا دن اللہ کے عہد، یعنی اس کے احکام کی پاس داری کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا، بلکہ نماز پڑھنے کے بعد اللہ کے احکام سے بے نیاز ہو جاتا اور من مانی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے اپنے عہد کے بارے میں بازپرس کرے گا اور اس کا مواخذہ فرمائے گا۔ پہلے مفہوم کی رو سے اس میں فجر کی نماز با جماعت پڑھنے والے کی فضیلت ہے اور دوسرے مفہوم کی رو سے اس میں ایک مومن کے لیے تنبیہہ ہے کہ اس نے صبح کا آغاز اللہ کی عبادت یعنی اس کے ساتھ عہد وفا سے کیا ہے۔ اب سارا دن اس عہد کو نبھانا اور نقض عہد سے اجتناب کرنا ہے۔

ظاہر کے اعتبار سے فیصلہ کرنا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "پس اگر وہ توبہ کر لیں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں ان کا راستہ چھوڑ دو۔" (سورۂ توبہ۔5)

مطلب یہ ہے کہ کفر و شرک سے توبہ کر کے اگر کوئی شخص مسلمان ہو جائے اور ظاہری طور پر وہ احکام اسلام کی پابندی کرے تو پھر اس سے کسی قسم کا تعرض نہیں کیا جائے گا۔ اگر وہ نفاق کے طور پر ایسا کر رہا ہے یا نمود و نمائش یا کوئی اور مقصد اس کے پیش نظر ہے تو یہ چونکہ اندرونی معاملہ ہے، اسے اللہ کے سپرد کر دیا جائے گا کیونکہ وہی اس کے احوال سے واقف ہے۔ کوئی دوسرا شخص کسی کے دل میں جھانک کر نہیں دیکھ سکتا۔

باطن کا معاملہ

حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے قتال (جہاد) کرتا رہوں، یہاں تک کہ وہ اس بات کی گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں۔ (اس توحید و رسالت کے اقرار کے بعد) وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ جب وہ ایسا کریں گے تو وہ مجھ سے اپنے خون اور اپنے مال محفوظ کر لیں گے، سوائے حق اسلام کے۔ (یعنی مالوں میں سے صرف زکوٰۃ وصول کی جائے گی اور اگر کسی کو ناجائز قتل کر دے گا تو قصاص میں اسے قتل کیا جائے گا وغیرہ) اور ان (کے باطن) کا حساب اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل۔

(1) اس حدیث میں ایک تو جہاد کے مقصد اور اس کی غرض و غایت کا بیان ہے اور وہ ہے دنیا سے کفر اور طاغوت کی عبادت و حکومت کا خاتمہ۔ جب تک یہ مقصد مکمل طور پر حاصل نہیں ہو گا، جہاد جاری رہے گا، اسی لیے ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے "جہاد قیامت تک جاری رہے گا" علاوہ ازیں حدیث میں (لوگوں) سے مراد مشرکین اور بتوں کے پجاری ہیں کیونکہ دوسری نصوص سے اہل کتاب کے لیے استثنا ثابت ہے کہ اگر وہ جزیہ دے کر اہل اسلام کی ماتحتی میں رہنا پسند کریں تو ان سے جہاد کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ مشرکین کے لیے ایک ہی صورت ہے کہ وہ یا تو اسلام قبول کر کے اللہ واحد کے پرستار بن جائیں ورنہ لڑائی کے لیے تیار رہیں اور مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ ان سے جہاد کر کے کفر و شرک کا خاتمہ کریں اور اللہ کی توحید کا جھنڈا ہر جگہ لہرائیں۔

(2) اسلام کا مقصد دنیا سے تاریکی، گمراہی اور ظلم کا خاتمہ اور لوگوں کو لوگوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی کی راہ پر لگانا اور انہیں عدل و انصاف مہیا کرنا ہے۔ دنیا کے جس خطے میں بھی غیر اللہ کی بندگی اور ظلم و جہالت کا اندھیرا ہو گا، اس کے خاتمے کے لیے مسلمانوں پر جہاد کرنا ضروری ہے۔

جہاد کی ایک تیسری قسم یہ ہے کہ جہاں مسلمان کفار کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے ہوئے ہوں، انہیں نرغۂ کفار سے نکالنے کے لیے کافروں سے جہاد کیا جائے۔

(3) قبول اسلام کے بعد ہر مسلمان کی جان و مال محفوظ ہے، البتہ اسلام کے احکام ان پر لاگو ہوں گے، جس میں ایک حکم ان کے مالوں میں سے زکوٰۃ وغیرہ کی ادائی ہے۔ اسی طرح اگر وہ کسی مسلمان کو ناجائز قتل کریں گے تو قصاص میں انہیں بھی قتل کیا جائے گا، اِلّا یہ کہ مقتول کے ورثاء معاف کر دیں یا دیت قبول کر لیں۔

(4) اگر کسی شخص نے اسلام قبول کر لیا ہے تو اس پر اس کے ظاہری حالات کے مطابق احکام اسلام کا اجرا ہو گا، اس کے باطن کو نہیں کریدا جائے گا۔ اگر اس کے دل میں کھوٹ ہے یا کوئی اور مقصد اس کے پیش نظر ہے تو جب تک اس کا صحیح ثبوت مہیا نہیں ہو گا، اس کے خلاف کارروائی نہیں ہو گی اور اس کے باطن کا معاملہ اللہ کے سپرد ہو گا، یعنی اللہ تعالیٰ ہی قیامت والے دن اس کا فیصلہ فرمائے گا۔

کلمہ پڑھنا

حضرت ابو عبداللہ طارق بن اشیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سُنا ہے کہ۔

”جس شخص نے لاالٰہ الا اللہ کہا اور اللہ کے سوا دوسرے معبودوں کا انکار کیا تو اس کا مال اور خون محفوظ (حرام) ہو گیا اور اس (کے باطن) کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔“ (مسلم)

فوائدومسائل۔ اس میں دو چیزیں بیان ہوئی ہیں جن کے بغیر توحید مکمل نہیں ہوتی۔ صرف اللہ کی معبودیت کا اقرار اور غیروں کی معبودیت کا انکار۔

کلمہ پڑھنے والا

حضرت ابو معبد مقداد بن اسود سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا۔

”یہ بیان فرمائیے کہ اگر میری کافروں میں سے کسی آدمی سے مڈبھیڑ ہو جائے، ہم آپس میں لڑیں، وہ میرے ایک ہاتھ کو تلوار سے کاٹ دے، پھر وہ میرے وار سے بچنے کے لیے ایک درخت کی پناہ لے لے اور کہے۔ میں اللہ پر ایمان لے آیا تو اس کے یہ کہنے کے بعد کیا میں اسے قتل کر دوں؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ ”تم اسے قتل مت کرو۔“

میں نے عرض کیا۔ ”اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اس نے میرا ایک ہاتھ کاٹ دیا اور ہاتھ کاٹنے کے بعد اس نے کہا؟“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”تم اسے قتل مت کرو، اگر تم نے اسے قتل کر دیا تو (یاد رکھنا) وہ تمہارے اس مرتبے پر ہو جائے گا جس پر تم اس کے قتل سے پہلے تھے اور تم اس کے مرتبے پر ہو جاؤ گے جس پر وہ اس کلمے کے کہنے سے قبل تھا جو اس نے کہا۔“ (بخاری و مسلم)

”وہ تمہارے مرتبے پر ہو جائے گا“ کا مطلب ہے، اس کا خون محفوظ ہو گا اور وہ مسلمان سمجھا جائے گا۔ ”اور تم اس کے مرتبے پر ہو جاؤ گے“ کے معنی ہیں، اس کے وارثوں کے لیے بطور قصاص تمہارا خون بہانا جائز ہو گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم اس کے کفر کے مرتبے پر ہو جاؤ گے یعنی کافر ہو جاؤ گے۔

فوائدومسائل

(1) احکام اسلام کا نفاذ ظاہری حالات ہی پر ہو گا، باطن پر نہیں کیونکہ باطن کا علم کسی کو نہیں ہو سکتا اس لیے کوئی قبول اسلام کا اظہار کرے گا تو اسے تسلیم کرنا ہو گا اور اس کے جان و مال کا تحفظ ضروری ہو گا اور جو شخص اس حرمت کے علم کے باوجود اسے قتل کر دے گا تو مقتول کے ورثاء کے لیے قصاص لینا جائز ہو گا۔

(2) اگر کوئی شخص جہالت یا تاویل سے کام لیتے ہوئے قتل کرے گا تو صرف دیت کی ادائی ضروری ہو گی۔ چنانچہ بعض صحابہ نے یہی تاویل کرتے ہوئے کہا کہ اس نے صرف جان بچانے کے لیے اسلام کا اظہار کیا ہے۔ اسلام کا اظہار کرنے والے کو قتل کر دیا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتول کے ورثاء کو دیت ادا فرمائی۔

کلمہ پڑھنے والا مسلمان ہے

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں جہینہ قبیلے کی ایک شاخ حرقہ کی طرف (لڑائی کے لیے) بھیجا۔ چنانچہ صبح صبح ہم ان کے پانی کے چشموں پر حملہ آور ہو گئے۔ (لڑائی کے دوران) میری اور ایک اور انصاری کی مڈبھیڑ ان کے ایک آدمی کے ساتھ ہوئی۔ جب ہم نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تو اس نے پڑھا لاالٰہ الا اللہ جس پر (میرے ساتھی) انصاری نے تو اپنا ہاتھ روک لیا لیکن میں نے اسے اپنا نیزہ مارا حتیٰ کہ اسے قتل کر دیا۔ جب ہم مدینہ واپس آئے تو یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا۔

”اے اسامہ! کیا تم نے اسے لاالٰہ الا اللہ کہنے کے بعد بھی قتل کر دیا؟“

میں نے عرض کیا۔ ”اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اس نے تو صرف جان بچانے کے لیے ایسا کیا تھا۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے (پھر) فرمایا۔ ”کیا تم نے اسے لاالٰہ الا اللہ کہنے کے بعد بھی قتل کر دیا؟“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہی فقرہ بار بار میرے سامنے دہراتے رہے، یہاں تک کہ میں نے آرزو کی کہ میں آج سے پہلے مسلمان نہ ہوا ہوتا۔ (یعنی اب مسلمان ہوتا تاکہ میرے ہاتھوں ایک نو مسلم کا قتل تو نہ ہوتا)“۔ (بخاری و مسلم)

ایک اور روایت میں ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

”کیا اس نے لاالٰہ الا اللہ کہا اور تم نے اسے قتل کر دیا۔“

”میں نے کہا۔“ اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! اس نے تو ہتھیار (تلوار یا نیزے) کے خوف سے یہ کلمہ کہا تھا۔“

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ”کیا تم نے اس کا دل چیرا تھا کہ تمہیں علم ہو گیا کہ اس نے یہ کلمہ دل سے کہا ہے یا نہیں؟“

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم۔ یہ فقرہ دہراتے رہے، یہاں تک کہ مجھے آرزو ہوئی کہ (میں اس سے قبل مسلمان نہ ہوا ہوتا بلکہ) آج مسلمان ہوتا۔“

فوائدومسائل

(1) احکام اسلام کا نفاذ و اجرا ظاہری حالات پر ہو گا۔ اس میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اس طرح انتقامی کارروائیوں کا سدباب کر دیا گیا ہے، ورنہ ہر شخص کسی دشمن وغیرہ کو قتل کر کے دعوا کر سکتا تھا کہ اپنے دعوائے اسلام میں جھوٹا تھا، اس لیے میں نے یہ کارروائی کی ہے۔ چنانچہ سد ذریعہ کے طور پر باطنی کیفیت کے کھوج لگانے کو سرے ہی سے غیر ضروری قرار دے دیا گیا اور صرف ظاہر پر معاملہ کرنے کی تاکید کی گئی۔

اللہ پر چھوڑ دیں

حضرت عبداللہ بن عتبہ بن مسعود بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ بن خطاب کو فرماتے ہوئے سنا کہ۔

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تو کچھ لوگوں کا مواخذہ وحی کے ذریعے سے ہو جاتا تھا، لیکن اب وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے (اور باطن کے احوال پر مواخذہ ممکن نہیں رہا) اس لیے اب ہم تمہارا مواخذہ صرف تمہارے ان عملوں پر کریں گے جو ہمارے سامنے آئیں گے۔ چنانچہ جو ہمارے لیے بھلائی ظاہر کرے گا، ہم اسے امن دیں گے (یا اس پر اعتبار و اعتماد کریں گے) اور اسے اپنے قریب کریں گے اور ہمیں اس کے اندرونی حالات سے کوئی سروکار نہیں۔ ان کا حساب اللہ تعالیٰ ہی اس سے کرے گا۔ اور جو ہمارے لیے برائی ظاہر کرے گا، ہم اسے امن دیں گے (یا اس پر اعتبار کریں گے) نہ اس کی تصدیق کریں گے، اگرچہ وہ یہ کہے کہ اس کا اندرونی معاملہ (ارادہ) اچھا تھا۔“ (بخاری)

فوائدومسائل

(1) اس سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ احکام کا اجرا ظاہری اعمال پر ہو گا، نہ کہ لوگوں کے ارادوں اور نیتوں پر کیونکہ ان کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہو سکتا۔

(2) دور حاضر میں اکثر لوگ علانیہ اسلامی احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور ان سے اصلاح کے لیے کہا جائے تو وہ کہتے ہیں کہ ہماری نیت درست ہے۔ ایسے لوگ شیطان کے فریب زدہ ہیں۔ بھلا اعمال کے بغیر نیت محض کا کیا فائدہ؟ جب ظاہری اعمال ہی درست نہ ہوں تو یہ کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ نیت

درست ہے۔ اس کو آپ مثال کے ذریعے سے یوں سمجھ سکتے ہیں۔ اگر کسی شیشے کے گلاس میں پانی ہو اور وہ اندر سے صاف ہو لیکن اس کے باہر گندگی لگی ہو اور کوئی شخص آپ کو اس میں پانی پیش کر کے کہے کہ جناب گلاس اندر سے صاف ہے تو کیا آپ اسے صاف تسلیم کر کے وہ پانی پییں گے؟ ہرگز نہیں! کیونکہ اس کا ظاہر آلودہ ہے' اس لیے جس کا ظاہر ہی آلودہ اور احکام شرعیہ کا مخالف ہو' اس کے باطن کا کوئی اعتبار نہیں ہوگا۔

خشیت الٰہی کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "اور مجھ ہی سے ڈرو۔"

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "بے شک تیرے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔" (سورۂ بروج 12)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "اور اسی طرح ہے تیرے رب کی پکڑ' جب وہ کسی بستی کو پکڑتا ہے جب کہ اس کے باشندے ظلم کرنے والے ہوتے ہیں۔ یقیناً اس کی پکڑ نہایت دردناک ہے۔ بلاشبہ اس میں اس شخص کے لیے نشانی ہے جو عذاب آخرت سے ڈرتا ہے۔ یہ وہ دن ہوگا جس میں لوگ اکٹھے کیے جائیں گے اور یہی دن سب کی حاضری کا ہے' ہم اسے صرف ایک گنی ہوئی مدت کے لیے (مصلحتاً) مؤخر کر رہے ہیں۔ جب یہ دن آئے گا تو کسی کو اللہ کی اجازت کے بغیر یارائے گفتگو نہیں ہوگا' چنانچہ بعض لوگ بدبخت اور بعض نیک بخت ہوں گے۔ جو بدبخت ہوں گے' ان کا ٹھکانا آگ ہے' ان کے لیے اس میں چیخنا اور پکارنا ہوگا۔" (سورۂ ہود۔6)

اور فرمایا۔ "اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے۔" (سورۃ العمران)

اور فرمایا اللہ تعالیٰ نے۔ "جس دن بھاگے گا آدمی اپنے بھائی سے' اپنی ماں اور اپنے باپ سے' اپنی بیوی اور بیٹیوں سے۔ ہر ایک کے لیے ایسی حالت ہوگی جو اسے (دوسروں سے) بے نیاز اور بے پروا کردے گی۔" (سورۂ عبس 37۔38)

اور فرمایا۔ "اے لوگو' اپنے رب سے ڈرو' بے شک قیامت کا بھونچال بڑی (ہولناک) چیز ہے۔ اس دن تم دیکھو گے کہ ہر دودھ پلانے والی اپنے شیر خوار بچے کو بھول جائے گی۔ اور ہر حمل والی کا حمل گر جائے گا۔ اور تم دیکھو گے کہ لوگ مدہوش ہیں اور یہ مدہوشی نہیں ہوگی' بلکہ اللہ کا عذاب بڑا سخت ہے۔" (سورۂ حج 1۔2)

اور فرمایا۔ "اور (اہل جنت) ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر ایک دوسرے سے پوچھیں گے۔ وہ کہیں گے۔ اس سے پہلے ہم اپنے اہل و عیال میں (دنیا میں اللہ سے) ڈرا کرتے تھے۔ پھر اللہ نے ہم پر احسان کیا اور ہمیں لو (جہنم) کے عذاب سے بچالیا۔ بے شک ہم اس سے قبل اسی کو پکارتے تھے' بلاشبہ وہ بہت احسان کرنے والا' نہایت مہربان ہے۔" (سورۂ طور 25۔28)

اس موضوع پر احادیث بھی کثرت سے ہیں' جن میں سے یہاں کچھ بیان کی جاتی ہیں۔

جہنم

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سُنا۔

"قیامت والے دن جہنمیوں میں سب سے زیادہ ہلکے عذاب والا وہ آدمی ہوگا جس کے پاؤں کے تلوؤں میں دو انگارے رکھے جائیں گے جن سے اس کا دماغ کھولے گا۔ وہ خیال کرے گا کہ اس سے زیادہ سخت عذاب والا کوئی نہیں' حالانکہ وہ ان جہنمیوں میں سب سے زیادہ ہلکے عذاب والا ہوگا۔" (بخاری و مسلم)

بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا

الکیمسٹ

مُصنّف: پاؤلو کوئیلو

ترجمہ: عقیل عباس سومرو

تبصرہ: آمنہ زریں

خواب پر' خود پر اور خدا پر بھروسے کا انعام نہ ملے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس بھروسے کو آزمائش جیسی پرکھ سے نہ گزارا جائے' یہ بھی نہیں ہو سکتا۔ ہمت مرداں' مدد خدا کے دوسرے حصے کی پُرزور تائید کرتے ہوئے ہم پہلی شرط کی اہمیت سے صرف نظر کا رویہ رکھتے ہیں۔

خزانے کی تلاش کی روداد پڑھتے ہوئے بھی عام طور پر ہمارا دھیان حصول مراد کی جانب رہتا ہے اور اس کی خاطر اٹھائی گئی مشقت' مول لیے گئے خطرات' داخلی اور بیرونی دشواریاں' کبھی کم رو اور کبھی خوبرو رکاوٹیں' ترک کی گئی سہل پسندی اور اختیار کی گئی دشوار گزاریاں ہم فراموش کرتے جاتے ہیں۔

یہ کہانی بظاہر ایک نو عمر گڈریے کے سفر' انتخاب خواب کے تعاقب اور خزانے کی تلاش کی سرگزشت ہے۔ مگر تین کروڑ سے زائد اس کی کاپیوں کی فروخت یہ ثابت کرتی ہے کہ یہ کسی بھی فرد کی کہانی ہو سکتی ہے۔

دور دراز کے میدانوں' شہروں اور صحرا کے سفر کی کہانی ہونے کے باوجود' یہ فرد کی روح سے ربط رکھتی ہے۔ اور یہی ربط اسے ہر فرد کی کہانی ہونے کا امتیاز عطا کر دیتا ہے۔ اسے پڑھتے ہوئے ہمیں خوش گوار حیرت ہوتی ہے کہ مصنف نہ صرف ہمارے دین کے متعلق اچھی واقفیت رکھتا ہے بلکہ اچھی رائے بھی۔ بیشتر کردار مسلمان ہیں اور جابجا دین فطرت کی خوب صورت تعلیمات کا اثر بھی۔

تو چلتے ہیں ایک گڈریے کے شب و روز کے ساتھ جس کا آبائی پیشہ کھیتی باڑی تھا۔ اس کے خاندان کی خواہش تھی کہ وہ پادری بنے' مگر دنیا دیکھنے کی جستجو نے اسے بھیڑوں کے ساتھ سفر کا خوگر بنا دیا۔

"بھیڑوں کو چارے پانی کی ہی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کی زندگیاں ہمیشہ ایک جیسی ہوتی ہیں۔ صبح سے شام تک نہ ختم ہونے والی ایک جیسی۔ وہ زندگی میں کوئی کتاب نہیں پڑھتیں اور جب لڑکا شہروں کا احوال سناتا تو سمجھ بھی نہیں پاتیں۔ ان کا تعلق کھانے اور پینے سے رہتا ہے اور اس کے عوض وہ اون دیا کرتی ہیں' اپنی ہم رکابی اور کبھی کبھی اپنا گوشت بھی۔ آج اگر میں ایک ظالم بن جاؤں اور انہیں یکے بعد دیگرے قتل کر دینے کا فیصلہ کرلوں تو وہ اس سے اسی وقت آگاہ ہو سکیں گی' جب ان کا ایک بڑا حصہ قتل ہو چکا ہوگا۔ لڑکے نے سوچا۔ "وہ مجھ پر بھروسا کرتی ہیں اور خود پر بھروسا کرنے کی عادت کو بھول چکی ہیں کیونکہ ان کے کھانے پینے کا انتظام میں کرتا ہوں۔"

(ایمان داری کی بات ہے۔ مجھے لگا' شاید پاکستانیوں کا ذکر ہو رہا ہے۔)

"ایک گڈریا ہمیشہ بھیڑیوں اور قحط سالی کا خطرہ مول لیتا ہے اور اسی باعث گڈریے کی زندگی میں توانائی آتی ہے۔"

ایک عام آدمی کی زندگی میں وسوسے، اندیشے، بھیڑیوں اور قحط سالی کی جگہ لے لیتے ہیں اور ان پر قابو پانا اس کا امتحان ثابت ہوتا ہے۔

"شاید چرچ جس میں انجیر کا درخت ہے، وہ آسیب زدہ ہو۔ اسی وجہ سے دوبارہ ایسا خواب دکھائی دیا ہو۔"

"سنتیاگو کو چرچ میں شب بسری کے دوران دو دفعہ ایک ہی خواب سے واسطہ پڑا تو اس نے تعبیر بتانے والی ایک خانہ بدوش عورت سے رابطہ کیا۔ اس نے تعبیر بتانے کا معاوضہ خزانے کا دسواں حصہ طلب کیا۔ جسے گڈریے نے خوش دلی سے تسلیم کرلیا۔"

"میں صرف خواب کی تعبیر بتاتی ہوں۔ یہ نہیں جانتی کہ اسے حقیقت کس طرح بناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں یہاں دور اس جگہ رہتی ہوں اور میری ضروریات زندگی میری بیٹیاں پوری کرتی ہیں۔"

گڈریے کے اس سفر کے دوران قدم قدم پر ہمیں مختلف کردار اور ان کی توجیہات جاننے کا موقع ملتا ہے کہ تقدیر اور عمل کا ربط باہمی انسان کی زندگی پر کیا اثرات مرتب کرتا ہے۔۔۔ پھر لڑکے کی ملاقات ایک بوڑھے شخص سے ہوئی۔ جس نے خود کو سالم کا بادشاہ بتایا۔ اس نے لڑکے کی جستجو اور قوت فیصلہ کی تعریف کی اور اسے تقدیر پر بھروسا کرنے کے لیے متحرک کیا۔

"دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ کیا ہے؟" لڑکے نے حیرت کے ساتھ پوچھا۔

"وہ یہ کہ ہم اپنی زندگی کے خاص لمحے میں، اپنے ساتھ ہونے والے واقعات کو قابو میں نہیں رکھتے اور ہماری زندگی پر قسمت کا زور چل جاتا ہے۔ یہ دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔"

"خواہش کائنات کی روح میں پیدا ہوتی ہے۔ زمین پر یہ تمہاری ذمہ داری ہے۔ یہاں تک کہ تم اگر سفر کرنا چاہتے ہو یا پھر تاجر کی لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ دنیا کی روح کی غذا انسان کی خوشیاں ہوتی ہیں اور مایوسی، حسد اور جلن کا احساس بھی۔ کسی کی تقدیر کو ماننا ہی آدمی کی حقیقی ذمہ داری ہوتی ہے۔"

"یہ بہت اچھا ہوا کہ تم جان گئے کہ زندگی میں ہر چیز کی قیمت ہوا کرتی ہے۔۔۔ اور یہی چیز تو بھلائی کے لیے جنگ کرنے والے سکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

بوڑھے نے اسے ریوڑ بیچ کر سفر کرنے کا مشورہ دیا اور کچھ نصیحتیں بھی۔۔۔

"لڑکے نے ہواؤں کی آزاد روی پر حسد کا جذبہ محسوس کیا اور سوچا کہ ایسی آزاد روی وہ خود بھی حاصل کرسکتا ہے۔ اسے خود کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں روک سکتا تھا۔ بھیڑیں، تاجر کی بیٹی اور اندلس کے میدان تقدیر کے راستے میں محض چند قدم تھے۔"

"اس نے اندلس کے میدانوں میں کچھ وقت گزارا تھا۔ اس دوران اس نے زمین اور آسمان دیکھ کر راستے کا تعین کرنا سیکھ لیا تھا۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ پرندوں کی موجودگی کا مطلب سانپ کا قریب ہی ہونا ہے۔ اگر کہیں گھاس پھوس نظر آئے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ قریب ہی پانی موجود ہے۔ یہ سب میں نے بھیڑوں سے سیکھا ہے۔ اگر خدا بھیڑوں کی اتنی اچھی رہنمائی کرتا ہے تو پھر وہی انسان کی بھی کرے گا۔ اس نے سوچا۔ اس خیال نے اس کی طبیعت بحال کردی۔ چائے کے کسیلے پن میں کمی واقع ہوگئی۔"

فیصلہ کن گھڑی کی مشکلات پر خود سے گفتگو اور خدا سے رجوع کرکے قابو پانا اور ہار مانتے ہوئے دل کو پھر سے میدان عمل کے لیے آمادہ کرنا۔۔۔ ہم گڈریے سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔

"اس کی جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ لیکن بھروسا ضرور تھا۔"

بھیڑوں کا ریوڑ بیچ کر اجنبی شہر میں پہنچتے ہی معصوم لڑکا اپنی سادگی میں لٹ گیا۔ جہاں کی زبان سے بھی وہ ناواقف تھا۔

ایک اجنبی شہر میں لٹ جانے کے بعد۔۔۔ سنبھلنے سے ذرا پہلے۔۔۔ اس نے خود سے پوچھا کہ وہ ایک غریب شخص ہے یا پھر خزانے کی تلاش میں ایک مہم جو۔

"میں ایک مہم جو ہوں، خزانے کی تلاش میں۔" اس نے خود سے کہا۔

ارادے کو استحکام بخش تقویت دینے کے بعد لڑکا شیشے کی دکان کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اشارے سے پوچھا کہ کیا وہ شیشے صاف کردے۔ جواب ملنے کا انتظار کیے بغیر اس نے اپنے کوٹ سے سارے شیشے چمکا دیے۔

"کیا تم میرے پاس کام کرنا پسند کروگے؟" دکان دار نے پوچھا۔

"میں آج پورے دن کام کرسکتا ہوں، پوری رات جتنے شیشے ہیں ان کو صاف کروں گا۔ اس کے عوض مجھے پیسے درکار ہوں گے تاکہ کل میں مصر چلا جاؤں۔"

دکان دار ہنسا۔ "اگر تم پورے سال شیشے صاف کرو، یہاں تک کہ ہر شیشے کی فروخت پر کمیشن بھی وصول کرو۔ اس کے باوجود تمہیں مصر جانے کے لیے قرض لینا ہوگا۔ یہاں اور وہاں کے درمیان ہزاروں کلو میٹر صحرا پھیلا ہوا ہے۔"

وہ خاموشی کا ایک ایسا لمحہ تھا کہ لگتا تھا جیسے پورا شہر گہری نیند میں ہے۔ یہ ایسا تھا جیسے دنیا اس لیے خاموش ہو گئی ہے کیونکہ لڑکے کی روح خاموش ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ مرجائے اور اس لمحے سب کچھ ہمیشہ کے لیے ختم ہوجائے۔

"میں تمہیں واپس اپنے ملک جانے کے لیے رقم دے سکتا ہوں بیٹے!" شیشہ بیچنے والے نے کہا۔

شیشے کا سوداگر، ایک منفی تحریک کے طور پر ہمارے سامنے آتا ہے۔ جو کسی بھی نئے خیال اور تبدیلی سے خوف محسوس کرتا ہے۔

"میں شیشے کو نمایاں کرنے کے لیے ایک کیس بنانا چاہتا ہوں۔" لڑکے نے کہا۔ "اسے میں دکان کے باہر رکھوں گا، جو ان لوگوں کی توجہ مبذول کرائے گا، جو پہاڑی کے نیچے سے گزرتے ہیں۔"

"میرے پاس پہلے ایسا کچھ نہیں ہے۔" سوداگر نے جواب دیا۔ "لوگ اس کے قریب سے گزرتے ہوئے اس سے ٹکرائیں گے اور شیشے ٹوٹ جائیں گے۔"

"اس طرح تو میں اپنی بھیڑوں کو جب چراگاہ میں لے جاؤں گا اور وہاں سانپ ہوا تو وہ خوف سے مرجائیں گی۔ گڈریوں اور بھیڑوں کی یہی زندگی ہوتی ہے۔"

سوداگر کی مسلسل حوصلہ شکنی نے لڑکے کو نئے خیال کی ترویج سے تو نہ روکا۔ مگر اس نے مصر جانے کا ارادہ واقعی ترک کرکے، بھیڑوں کا ریوڑ خریدنے اور واپس اندلس جانے کا سوچ لیا۔

"مجھے خوف ہے کہ میرے خواب نے حقیقت کا روپ دھار لیا تو زندہ رہنے کی کوئی وجہ نہیں ہوگی۔ تم اپنی بھیڑوں اور اہرام مصر کے متعلق خواب دیکھتے ہو اور مجھ سے مختلف ہو کیونکہ تم اپنے خواب کو حقیقت کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہو۔ میں صرف مکہ کے متعلق خواب دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے تصور میں ہزاروں بار صحرا عبور کیا، کعبہ پہنچا۔ میں نے تصور میں ان لوگوں کو بھی دیکھا، جو میرے ساتھ تھے۔ ان سے گفتگو بھی ہوئی۔ لیکن مجھے خوف ہے کہ اس طرح مجھے مایوسی ہوگی۔ اس لیے اس کا خواب دیکھنے کو ترجیح دیتا ہوں۔"

بہت سارے پیسے جمع کرکے لڑکے نے واپسی کا قصد کیا۔

"خواب دیکھنا کبھی نہ چھوڑو۔" بوڑھے نے کہا تھا۔ اسے یاد آگیا۔

لڑکا ایک بار پھر دوراہے پر کھڑا تھا۔

"اندلس کی پہاڑیاں دو گھنٹے کے فاصلے پر تھیں لیکن اس کے اور اہرام کے درمیان ایک بڑا صحرا واقع تھا۔ لڑکا اب بھی سوچ رہا تھا کہ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے کوئی دوسرا راستہ بھی ہوگا۔ حقیقت یہ تھی کہ وہ اپنے خزانے سے دو گھنٹے قریب تھا۔ اس

سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ دو گھنٹے پھیل کر ایک سال پر محیط ہو گئے۔

بھولا ہوا خواب دوبارہ یاد آنے پر وہ پھر سے سرگرم عمل ہو گیا اور اختیار کی ہوئی دست برداری کو خیرباد کہہ کر صحرا کے سفر کی تیاری کرنے لگا۔"

کوئی فیصلہ کرنا صرف کسی چیز کی ابتدا ہوتی ہے۔ کوئی شخص ایک فیصلہ کرتا ہے تو طاقت ور لہریں اسے ان جگہوں پر لے جاتی ہیں، جس کا اس نے خواب تک نہیں دیکھا ہوتا۔

"میں نے بہت سی چیزیں بھیڑ سے سیکھی ہیں۔ اس کے علاوہ بلوریں شیشوں سے۔" اس نے سوچا۔ "میں صحرا سے بھی کچھ چیزیں سیکھ سکتا ہوں۔ یہ عمر رسیدہ اور دانا لگتا ہے۔"

سفر کے آغاز پر ہی ہماری ملاقات نئے کردار سے ہوتی ہے، جو انگریز ہے اور کتابی علم کو ہی حرف آخر تصور کرتا ہے۔ وہ کیمیاگر کی تلاش میں ہے کہ جو اسے سونا بنانے کا طریقہ سکھا دے۔ سفر پر جا رہا ہے اور ہمہ وقت کتاب پڑھنے میں مگن، مشاہدے اور ارد گرد کی دنیا سے بے زار ہے۔

جبکہ لڑکا وقت کو مشاہدے کے عمل سے کر رہا ہے۔

"ساربان نے اسے بتایا۔ "ہمیں یہ خوف ہوتا ہے کہ ہمارے پاس جو ہے، وہ ضائع نہ ہو جائے۔ چاہے وہ ہماری زندگی ہو یا ہمارا مال اسباب اور جائیداد، لیکن یہ خوف اس وقت جاتا رہتا ہے۔ اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ ہماری زندگی کی کہانیاں اور دنیا کی تاریخ ایک ہی ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں۔"

"بربادی نے مجھے یہ سکھایا کہ اللہ کی دنیا کیا ہے۔ لوگوں کو ان دیکھی چیزوں سے خوف کھانے کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ اپنی ضرورت اور خواہش کو حاصل کرنے کی اہمیت رکھتے ہیں۔"

"جب تم صحرا میں ایک بار آجاتے ہو تو واپسی کا راستہ نہیں ہوتا اور جب تم واپس نہیں جا سکتے تو تمہیں صرف آگے بڑھنے کے لیے اچھے سے اچھے راستے کی فکر کرنی چاہیے۔ باقی اللہ پر چھوڑ دو خطروں سمیت۔"

زندگی بھی صحرا کا سفر ہی ہے۔ آگے تو بڑھنا ہی ہے۔ تو مثبت طرز فکر اور بھروسے کے ساتھ کیوں نہیں!

دلچسپ سفر کا اختتام نخلستان پہنچنے پر ہوا اور وہیں لڑکے کو فاطمہ ملی۔

ایک خوبرو رکاوٹ... جس کو کھو دینے کے خوف نے لڑکے کو ایک بار پھر آزمائش سے گزارا...

کائناتی زبان سمجھنے کی جستجو نے لڑکے کو ہوا، صحرا، پرندوں کی اڑان کا مطلب سمجھنے کی اہلیت دی اور جنگ کی پیش گوئی نے جہاں اسے مشیر کا عہدہ عطا کیا، وہیں کیمیاگر سے ملاقات کا سبب بھی۔

"نخلستان کے ایک صاحب بصیرت نے لڑکے سے کہا۔ "پوشیدگی تو حال میں ہے۔ اگر حال پر توجہ دو تو اسے مستقبل کر سکتے ہو اور اگر حال کو مستقبل کر لو تو جو کچھ بعد میں ہونے والا ہے، وہ بھی بہتر ہو جائے گا۔ مستقبل کو بھول جاؤ اور اس طرح زندگی گزارو جیسے کہ ہدایت کی گئی ہے۔ اس پر یقین رکھو کہ خدا اپنے بندوں سے محبت کرتا ہے۔ ہر دن بجائے خود آخرت کی حیات کی جاودانی لے کر آتا ہے۔"

نخلستان میں ملنے والا اعزاز، دولت اور فاطمہ کی محبت نے ایک دفعہ پھر لڑکے کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ کیا یہی کافی نہیں؟

اب کی بار اس کی آزمائش کا دورانیہ کٹھن تھا اور اس کا ابہام دور کرنے کے لیے مرد دانا، کیمیاگر مدد کو آیا

"تمہیں سمجھ لینا چاہیے کہ محبت ایک شخص کو قسمت کے لیے جدوجہد سے کبھی نہیں روکتی۔ اگر وہ اس جدوجہد کو ترک کر دیتا ہے تو اس کا مطلب ہو گا، وہ حقیقی محبت نہیں۔ محبت دنیا کی زبان ہی بولتی ہے۔"

کیمیاگر اسے اپنی ہمراہی میں اہرام کے سفر پر لے

گیا۔ دوران سفر مسلسل اس کی پرکھ اور رہنمائی کی۔

"دانالوگ سمجھتے تھے کہ یہ عام دنیا محض جنت کی ایک تصویر ہے۔ اس دنیا کی موجودگی ایک سادہ سی ضمانت ہے کہ کوئی دوسری دنیا بھی ہے۔ جو انتہائی مکمل ہے۔ خدا نے دنیا اس لیے بنائی ہے کہ اس کی دکھائی دینے والی مادی چیزوں کے ذریعے لوگ اس کی روحانی تعلیمات کو اور اس کی دانش و حکمت کے کرشمے کو سمجھ سکیں۔"

"بس ایک چیز ایسی ہے جس کے باعث خوابوں کو پانا ناممکن ہوتا ہے اور وہ ناکامی کا خوف ہوتا ہے۔"

"اپنے دل سے کہو کہ مبتلائے مصیبت ہونے کا خوف، خود مصیبت آنے سے بھی بدتر ہے۔"

"کیا انسان کا دل ہمیشہ اس کی مدد کرتا ہے؟" لڑکے نے پوچھا۔

"زیادہ تر ایسے لوگوں کا دل جو اپنی تقدیر کو تسلیم کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور وہ بچوں، نشے بازوں اور بڑی عمر کے لوگوں کی بھی مدد کرتا ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں کبھی خطرے میں نہیں پڑوں گا۔"

"اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ دل وہی کرتا ہے جو وہ کر سکتا ہے۔" کیمیاگر نے کہا۔

اس کے ساتھ ہی خطرہ ظاہر ہو گیا اور لڑکے کی آخری لیکن کٹھن ترین آزمائش بھی... کیمیاگر حقیقی رہنما تھا۔ اس نے لڑکے کے آخری سبق کو بے مثال بنادیا۔

"عام طور پر موت کی دھمکی انسان کو اپنی زندگی سے زیادہ باخبر کر دیتی ہے۔"

پس، لڑکا اپنی آزمائش میں تن تنہا تھا۔ موت کا خطرہ اس کے سر پر منڈلا رہا تھا۔ ایسے میں اس نے اپنے سے گفتگو کی... صحرا کو مخاطب کیا... ہوا اور سورج سے مکالمہ کیا... اور ان تمام عناصر فطرت نے اس سے... لڑکے کے سوالوں نے ان کی حدود کا تعین ان پر واضح کیا... اور ہمیں معیار محبت کا ایک منفرد نظریہ بتلایا۔

"محبت ایک ایسی طاقت ہے، جو تبدیل کرتی اور دنیا کی روح کو بڑھاتی ہے۔"

ہوا اور سورج سے جان دار مکالموں نے جہاں ان کے اختیار اور حدود کو واضح کیا۔ وہیں ان کے لاجواب ہونے سے لامتناہی حدود اور طاقت کے سرچشمے سے رجوع کے دل نشین لہجے کو بھی۔

"اس کے دل سے محبت کی لہریں اٹھیں اور لڑکے نے دعا کرنی شروع کی۔ یہ ایک ایسی دعا تھی کہ اس نے اس سے قبل کبھی نہیں کی تھی۔ کیونکہ یہ دعا لفظوں کے ذریعے نہیں تھی۔ اس کی دعا میں وہ شکریہ بھی نہیں تھا کہ اس کی بھیڑوں کو نئی چراگاہ ملی تھی۔ اس نے یہ بھی نہیں کہا کہ لڑکے میں شیشہ فروخت کرنے کی اور زیادہ اہلیت دے۔ یہ التجا بھی نہیں کی کہ اس نے جس عورت سے ملاقات کی تھی، وہ اس کی واپسی کا منتظر رہے۔"

خاموشی میں لڑکے کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ صحرا، ہوائیں اور سورج سب ہی ان اشاروں کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جس ہاتھ نے یہ سب کچھ لکھا اور چاہتے ہیں کہ اسی راستے پر چلیں۔ وہ دیکھ سکتا ہے کہ نہ تو صحرا نہ ہوا، نہ سورج اور نہ بنی نوع انسان اس سے باخبر ہے کہ اس کی تخلیق کیوں کی گئی۔ لیکن اس ہاتھ کے پاس ان تمام باتوں کی ایک وجہ تھی اور وہی ہاتھ ہر قسم کے معجزات دکھا سکتا ہے یا سمندر کو صحرا میں بدل سکتا ہے۔ کیونکہ وہ ہاتھ جانتا ہے کہ یہی وہ بڑا خاکہ ہے جس نے کائنات کو اس جگہ پہنچایا۔ جس میں تخلیق کے چھ دن لگے اور یہ شاہکار تیار ہوا۔

موت کے خطرے سے رہائی پاکر، کیمیاگر نے اس کی منزل سے چند گام دور اسے رخصت کر دیا۔

"وہ جب ٹیلے کے اوپر پہنچا تو اس کا دل دھڑکنے لگا۔ وہاں چاند کی روشنی سے منور اور صحرا کی چمک میں عظیم الشان اہرام مصر کھڑا تھا۔

لڑکا گھٹنوں کے بل بیٹھ کر رونے لگا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے اپنی قسمت پر یقین کیا اور اس نے ایک بادشاہ سے ملنے میں رہنمائی کی اور ایک تاجر اور پھر انگریز اس کے بعد کیمیاگر سے ملاقات کرائی۔ سب سے بڑھ کر صحرا کی ایک عورت سے ملاقات جس نے کہا کہ محبت ایک مرد کو اس کی قسمت سے کبھی نہیں روکے گی۔"

لڑکے نے خود سے کہا کہ قسمت سے آگاہی کے دوران اس نے وہ تمام چیزیں سیکھی تھیں جن کی اسے ضرورت تھی اور ان تمام چیزوں کا تجربہ حاصل کیا تھا، جس کا اس نے خواب دیکھا تھا۔ لیکن یہاں خزانہ ملنے پر اس نے خود کو یاد دلایا کہ کوئی بھی منصوبہ تب تک تکمیل پذیر نہیں ہوتا، جب تک کہ اس کے مقاصد حاصل نہ ہو جائیں۔

کھدائی کرتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں آبلے پڑ گئے۔ ہوائیں ٹیلوں کو پھر سے ریت سے بھر دیتی تھیں۔ وہ دن رات اپنے کام میں لگا رہا۔ حتیٰ کہ اس نے اپنے سر پر کچھ لوگوں کو نمودار ہوتے دیکھا۔ وہ جنگ کی وجہ سے مہاجر تھے اور انہیں رقم درکار تھی۔ لڑکے کی تلاشی پر تھیلے سے کیمیاگر کا دیا ہوا سونا برآمد ہوا اور مزید کی طلب نے انہیں لڑکے پر تشدد پر آمادہ کر دیا۔ خوب مار پیٹ کے بعد، نڈھال ہو کر جان بچانے کی آرزو میں لڑکے نے اپنا خواب، سفر اور خزانے کی کتھا کہہ ڈالی۔

"لڑکا ریت پر گر گیا۔ قریب قریب بے ہوش۔ لیڈر نے اسے جھنجھوڑا اور کہا ہم جا رہے ہیں۔ لیکن اس سے قبل کہ جاتے، وہ لڑکے کے پاس آیا اور کہا۔

"تم مرنے نہیں جا رہے ہو۔ تم زندہ رہو گے اور یہ سیکھو گے کہ کسی کو اتنا بے وقوف نہیں ہونا چاہیے۔ دو سال قبل اسی جگہ میں نے بھی کئی بار خواب دیکھا تھا کہ مجھے اسپین کے میدانوں میں سفر کرنا چاہیے اور اس تباہ چرچ کو دیکھنا چاہیے جہاں گڈریے اور ان کی بھیڑیں سوتی ہیں۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ تباہ شدہ چرچ کے مقدس گوشے میں ایک انجیر کا درخت اگ رہا ہے اور مجھے کہا گیا کہ انجیر کی جڑ میں کھدائی کروں تو وہاں ایک خزانہ چھپا ہوا ہے۔ لیکن میں اتنا پاگل نہیں ہوں کہ اتنا بڑا صحرا عبور کروں، کیونکہ مجھے بار بار خواب دکھائی دیا ہے۔"

لڑکا لڑکھڑاتا ہوا کھڑا ہوا اور ایک بار پھر اہرام کو دیکھنے لگا۔ ایسا لگا تھا۔ جیسے وہ ان پر ہنس رہے ہوں۔ اس کے بعد وہ بھی ہنسنے لگا۔ اس کا دل خوشیوں سے بھر گیا۔ کیونکہ وہ اب جان گیا تھا کہ اس کا خزانہ کہاں ہے۔"

اس کے ساتھ ہی آپ کا خیال بھی کھلکھلا کے ہنس دیتا ہے اور لڑکے کی خوشی میں خود کو شریک سمجھتا ہے۔

اس کتاب کو پڑھتے ہوئے آپ کے ذہن میں قرآن کی آیتیں ابھرتی ہیں۔ جس میں قرآن دعوت دیتا ہے کہ زمین میں چلو، پھرو... اور دعوت فکر دیتا ہے کہ غور کیوں نہیں کرتے۔ بتلایا ہے کہ دن اور رات کے آنے جانے میں نشانیاں ہیں، عقل والوں کے لیے۔ زمین، آسمان، کائنات کو انسان کے لیے مسخر کر رکھنے کی خبر دیتا ہے، کیوں؟

تاکہ غور و فکر کریں۔

تو حیف ہے اس عقل پر جو معیار زندگی بلند کرنے کے دائرے میں قید ہو کر ترقی کے نئے جہاں تسخیر کر رہی ہے۔ مگر تخلیق، قوت اور محبت کے سرچشمے سے رجوع کرنا گوارا نہیں کرتی۔

کہانی کے اختتام پر واضح ہوا کہ قدرت نے یہ موقع ایک وقت میں دو لوگوں کو عطا کیا... مگر خود کو عقل مندی سے سرفراز سمجھ کر ایک نے اس خواب کو درخور اعتنا ہی نہیں جانا اور دوسرے نے جستجو، دریافت اور مہم جوئی میں ہر پل کچھ نیا سیکھا اور سرخرو ہوا۔

اسپین کے اسی چرچ میں موجود خزانے کا پتا اسے صحرا عبور کر کے مصر پہنچ کر ملا۔ جہاں سے اس نے سفر کا آغاز کیا تھا۔

یہاں پر پھر مجھے قرآن کی ایک آیت یاد آ رہی ہے۔

"ولیس اللا انسان الا ماسعی"

مثبت توانائی، لطف، خوشی، رجوع، مقصدیت اور محبت سے لطف اندوز ہونے کے لیے... کیمیاگر، نسخہ کیمیا ہے۔

✲

دستک دستک دستک

شاہین رشید

عائشہ عمر

"ہیلو... کیسی ہو خوب صورت؟"
"جی... کون...؟"
"میرا مطلب ہے عائشہ! کیسی ہو؟"
"اچھا!" قہقہہ... "میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں۔"
"لوگوں کو تمہارا اصلی نام معلوم ہے؟"
"جی اب تو کافی لوگوں کو معلوم ہو گیا ہے۔ کیونکہ دیگر پروگرامز میں بھی آتی ہوں اور گلوکاری بھی شروع کردی ہے۔ لیکن خوب صورت تو پھر خوب صورت ہے۔ اب میری پہچان بن گیا ہے یہ نام۔"
"عائشہ! آپ نے مارننگ شوز کی میزبانی بھی کی ہے۔ کیسا رہا تھا یہ تجربہ؟"
"بہت اچھا تجربہ رہا... نئے نئے لوگوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ بات چیت میں مزا آتا ہے۔ صبح جلدی اٹھنے کی بھی عادت ہو جاتی ہے۔ بندہ فریش رہتا ہے۔"
"بلبلے کی وجہ سے اداکاری کم کر رہی ہیں یا شوق نہیں ہے؟"
"ٹائم ذرا کم ہی ملتا ہے کیونکہ اپنے آپ کو دیگر کاموں میں بھی تو مصروف رکھا ہوا ہے۔ بلبلے میں کام کرنے کا تو اپنا ہی مزا ہے۔ لیکن میں اب دیگر ڈراموں میں بھی آپ کو نظر آؤں گی۔ جیسے ڈراما سیریل "زندگی گلزار ہے" میں آپ مجھے دیکھ رہی ہیں۔"
"بہت اچھا سیریل ہے... آپ کو کیا رسپانس مل رہا ہے؟"
"بہت اچھا رسپانس مل رہا ہے۔ کیونکہ کہانی بہت اسٹرونگ ہے اور پھر ڈائریکٹر سلطانہ صدیقی صاحبہ کا سیریل تو ٹاپ کا ہی ہوتا ہے۔"
"عائشہ! آپ نے کہا کہ میں نے اپنے آپ کو دیگر کاموں میں بھی مصروف رکھا ہوا ہے تو دیگر کاموں سے کیا مراد ہے؟"
"جی دیگر کاموں سے مراد میری ماڈلنگ کی مصروفیات ہیں۔ آپ مجھے ریمپ پہ ماڈلنگ کرتے ہوئے بھی دیکھتی ہوں گی۔ پھر کمرشلز کی مصروفیات اور ساتھ میں گلوکاری بھی تو ہو گئی نا لائف بزی۔"
"کیوں نہیں... اور گلوکاری کے لیے کوئی پلاننگ ہے کیا؟"
"نہیں ایسی کچھ خاص تو نہیں۔ لیکن چونکہ اپنی گلوکاری کو ایک شکل دینا چاہتی ہوں تو بہت جلد میرا ارادہ اپنی میوزک البم لانے کا ہے اور اس کے لیے آج کل تیاریوں میں لگی ہوئی ہوں۔ دیکھیے کب تک منظر عام پہ آتا ہے یہ البم۔"
"ڈراموں میں کم نظر آنے کی وجہ مصروفیات ہیں یا سلیکٹو رول؟"
"سچ بتاؤں... مصروفیات تو ہیں ہی۔ مگر میں سلیکٹو رول کرنے کو ہی ترجیح دیتی ہوں۔ مجھے جب بھی سیریل میں کام کرنے کی پیش کش ہوتی ہے تو میں کہانی کو تو اہمیت دیتی ہی ہوں۔ ساتھ ہی یہ بھی دیکھتی ہوں کہ ٹیم کیسی ہے۔ مطلب کہ کون کون کام کر رہا ہے۔ ڈائریکٹر اور پروڈیوسر کون ہے اور جب سب کچھ میری مرضی کا ہوتا ہے تو پھر "اوکے" کر دیتی ہوں۔"
"لوگوں کو تو پیسہ کمانے کا شوق ہوتا ہے اور اس لیے وہ ہر طرح کے رول قبول کر لیتے ہیں۔ کیا آپ کو اس طرح کا کوئی شوق نہیں ہے؟"
"مجھے بھی بہت شوق ہے پیسہ کمانے کا اور میں کما بھی رہی ہوں، لیکن پیسے پر میں غیر معیاری یا ناپسندیدہ کام کو ترجیح نہیں دے سکتی۔ غیر معیاری کام تو ہر کوئی کر لیتا ہے۔ مگر معیاری کام کوئی کوئی کرتا ہے۔ شاید مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ جب کسی سیریل میں لوگ میرا نام پڑھتے ہوں گے تو یہ ضرور سوچتے ہوں گے کہ کوئی اچھا کام دیکھنے کو ملے گا۔"
"انسان کو اپنی صلاحیتوں کا خود بھی علم ہوتا ہے۔ تمہیں کب اندازہ ہوا کہ تم اس فیلڈ میں آؤ گی تو کامیاب رہو گی؟"
"مجھے تو بچپن سے ہی اندازہ تھا کہ مجھ میں ایک فنکارہ چھپی ہوئی ہے۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر مختلف انداز میں اداکاری کیا کرتی تھی اور مجھے یاد ہے کہ جب میں آٹھ یا نو سال کی تھی تو میں نے منزہ ہاشمی صاحبہ کے ایک شو میں شرکت کی تھی اور پھر گاہے بہ گاہے مختلف پروگراموں میں حصہ لیتی رہتی تھی۔"
"گویا کیمروں سے دوستی بچپن سے ہی ہے؟"

"جی جی... بالکل... کیمروں سے دوستی ہے۔"
"غیر ملکی ڈرامے جو آج کل ہمارے چینل سے پیش کیے جا رہے ہیں، دیکھتی ہیں؟"
"اپنے ڈراموں کو دیکھنے کے لیے ٹائم نہیں ہے تو غیر ملکی کیا دیکھوں گی اور جب بھی ٹائم ملے گا اپنے ملک کے ڈرامے دیکھوں گی۔ غیر ملکی نہیں۔ کیونکہ اپنے زیادہ اچھے ہوتے ہیں۔ ہمارے چینلز والے یہ نہیں سوچتے کہ اگر وہ دوسروں کے ڈرامے دکھائیں گے تو اپنے ڈراموں کو کتنا نقصان پہنچے گا۔"
"اور زندگی مزے کی گزر رہی ہے؟"
"جی الحمدللہ... بہت مزے کی گزر رہی ہے۔"

ذوالقرنین حیدر

"ہیلو سر! کیسے ہیں آپ؟"
"اللہ کا شکر ہے آپ سنائیں۔"
"کیا ہو رہا ہے آج کل؟"
"بہت کچھ... اللہ کا شکر ہے۔ اچھا رزق دے رہا ہے۔"

"آپ نے اپنے والد کی مخالفت مول لے کر اس فیلڈ میں قدم رکھا تھا۔ کوئی پچھتاوا تو نہیں؟"

"نہیں' اللہ کا شکر ہے کہ کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔ اصل میں ہمارے خاندان میں دور' دور تک کوئی اس فیلڈ میں نہیں تھا۔ اس لیے والد ڈرتے تھے کہ پتا نہیں کیا ہوگا۔"

"اور پہلے تو اس فیلڈ کی روزی بھی ہوائی تھی۔"

"روزی تو ہر فیلڈ کی ہوائی ہوتی ہے۔ بزنس ہے تو کبھی عروج' کبھی زوال۔ اور جاب ہے تو ہر وقت بندہ سولی پہ لٹکا رہتا ہے کہ کب جواب مل جائے' ہمیں آپ کی ضرورت نہیں ہے۔"

"پھر آپ نے اس فیلڈ میں اپنی جگہ بنائی۔ کاوش کس کی تھی۔ آپ کی یا یہ سب کچھ قسمت میں لکھا تھا؟"

"قسمت میں لکھا تھا۔ مگر میں تو ناواقف تھا۔ مجھے تو محنت کرنی تھی۔ سو اللہ تعالیٰ راستہ ہموار کرتا گیا اور میں کامیاب ہوتا گیا۔"

"پھر کس شعبے نے کامیابی سے ہمکنار کیا؟ رائٹنگ نے یا اداکاری نے؟"

"مجھے اللہ نے ہر طرح کی صلاحیتوں سے نوازا ہوا تھا۔ تھیٹر میں گیا تو کامیاب ہوا۔ لکھا تو کامیابی ملی اور جب ٹی وی پہ اداکاری کی تو اس میں بھی کامیابی ملی اور جب ہدایت کاری کی طرف آیا تو یہاں بھی کسی کو مایوس نہیں کیا۔"

"پھر بھی پہچان کس کام سے ملی؟"

"دونوں سے۔ ڈراما سیریل "کوشش" جو کہ بچوں کا سیریل تھا۔ میں نے لکھا بھی تھا اور اس میں' میں نے پرفارم بھی کیا تھا اور یہ سیریل بے انتہا مقبول ہوا تھا اور اسی کی وجہ سے مجھے بے حد شہرت ملی تھی۔"

"فیملی میں کوئی تھا جس کو لکھنے کا شوق تھا اور جن کو آپ نے فالو کیا ہو یا گھر سے باہر کی کوئی شخصیت جس سے آپ بہت متاثر رہے ہوں؟"

"لکھنے کا ادراک تو مجھے میرے والد صاحب سے ملا۔ میرے والد چوہدری شیر محمد پنجابی کے بہت اچھے شاعر تھے اور انہیں بہترین شاعری پہ گولڈ میڈل بھی ملا تھا اور میں سمجھتا ہوں کہ مجھ پر میرے والد کا اثر آیا ہے اور جہاں تک گھر سے باہر رائٹر کی بات کی تو ہر اچھا لکھنے والے نے مجھے متاثر کیا۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ تحریر میں میرا اپنا رنگ جھلکتا ہے۔ میں کسی کو فالو نہیں کرتا۔"

"اور اس بات میں کتنی صداقت ہے کہ مزاحیہ رول کرنے والے اندر سے دکھی ہوتے ہیں؟"

"ہوتی ہوگی مگر میرے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ آسودہ زندگی گزاری ہے اور گزار رہا ہوں۔ ہاں مزاحیہ فنکاروں میں مجھے منور ظریف اور لہری صاحب نے متاثر کیا اور یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے لہری صاحب کے ساتھ کام کرنے کا موقع بھی ملا۔"

"ذوالقرنین صاحب! بہت جلد آپ کا فیملی انٹرویو بھی کرنا چاہوں گی' دیں گے؟"

"ہاں۔۔۔ ہاں کیوں نہیں۔۔۔ مگر بیگم کی تصویر نہیں دوں گا۔" قہقہہ۔۔۔

☆ ☆ ☆

صبا قمر

"کیا حال ہیں۔۔۔ اور "ہم سب امید سے ہیں" میں واپسی مبارک ہو؟"

"حال ٹھیک ہیں۔۔۔ اور بہت شکریہ اور خیر مبارک۔"

"تم نے بتایا تھا کہ ابتدا میں یہ پروگرام مشکل لگتا تھا۔ پھر عادت ہوگئی۔ اب گیپ کے بعد کیا کیفیت ہے؟"

"سچی بات تو یہ ہے کہ سیاست سے مجھے کچھ لگاؤ نہیں تھا لیکن ڈائریکٹر یونس بٹ صاحب کی تحریر نے مجھ میں سیاست کی شدبد ڈال دی اور اب مجھے یہ پروگرام کرنے میں' کوئی مشکل پیش نہیں آتی۔ بلکہ اب تو میں انجوائے کرتی ہوں اور جب پروگرام بند ہوا تھا تو بہت مس کرتی تھی اس پروگرام کو۔"

"انسان کو بہت سی چیزیں ورثے میں ملتی ہیں۔ کیا اداکاری آپ کو ورثے میں ملی ہے یا قدرت کی طرف سے گفٹ ہے؟"

"ہاں مجھے بہت کچھ ورثے میں ملا لیکن اداکاری نہیں ملی۔ (ہنستے ہوئے) مذاق کر رہی ہوں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اداکاری مجھے ورثے میں نہیں ملی۔ کیونکہ ہم چھ بہن' بھائیوں میں کسی کو اس فیلڈ سے لگاؤ نہیں ہے۔ بس مجھے ہی تھا اور میرا ہی دل چاہتا تھا کہ میں اس فیلڈ میں آؤں' سو آگئی۔"

"ہم سب امید سے ہیں' دیکھ کر لگتا ہے کہ آپ میں مزاحیہ اداکاری کے جراثیم بھی کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔ پھر ہر وقت سنجیدہ اور دکھی رول کیوں کرتی ہو؟"

"ہاں۔۔۔ پتا نہیں کیوں پروڈیوسر' ڈائریکٹرز مجھے ایسے رول دیتے ہیں۔ میں تو بہت مختلف قسم کے رول کرنا چاہتی ہوں اور رول میرے' بہت اچھے بھی ہوتے ہیں۔ کافی چیلنجنگ بھی ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ناظرین مجھے' بہت پسند کرتے ہیں ان رولز میں۔"

"خیال نہیں' واقعی بہت پسند کرتے ہیں۔ فلم بھی کریں گی؟"

"مجھے پڑوسی ملک سے بہت آفرز آتی ہیں۔ لیکن میں اپنے ملک کی فلموں میں کام کرنا چاہوں گی۔ لیکن اس صورت میں جب اچھی فلمیں بننا شروع ہوجائیں۔ "بول" اور "خدا کے لیے" جیسی فلمیں۔"

"ہوں۔۔۔ اچھی سوچ ہے۔"

بندھن

عائشہ بخش ہمراہ عدنان امین

شاہین رشید

شادی ایک ایسا بندھن ہے، جو دو اجنبیوں کو ایک رشتے کا نام دے دیتا ہے۔ یہ رشتہ نازک بھی بہت ہوتا ہے اور مضبوط بھی۔ نازکی اور مضبوطی کا دارومدار بھی انہی دو اجنبیوں پہ ہی ہوتا ہے۔ پرانی کہاوت ہے کہ رشتے آسمانوں پہ بنتے ہیں اور اس سے انکار بھی نہیں۔ کیونکہ اکثریت ایسے جوڑوں کی ہوتی ہے جو سرے سے ایک دوسرے کو جانتے ہی نہیں ہیں۔ نہ کبھی دیکھا ہوتا ہے نہ کبھی بات کی ہوتی ہے۔ مگر بندھن میں بندھنے کے بعد اللہ تعالیٰ ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبتیں ڈال دیتا ہے۔ اور جب یہ محبتیں پروان چڑھتی ہیں تو پھر یہی زندگی بہت خوبصورت لگنے لگتی ہے۔

عائشہ بخش کو خبریں پڑھتے ہوئے تو کئی سالوں سے دیکھ رہے تھے۔ ایک منفرد انداز۔ خوبصورت لب و لہجہ اور جاذب نظر شخصیت رکھنے والی کی شادی ہوئی تو خیال آیا کہ "بندھن" کے لیے بات کریں۔ چاہتے تو فوراً" انٹرویو کر لیتے مگر وقفہ اس لیے دیا کہ ایک دوسرے کو سمجھ تو لیں۔ ایک دوسرے سے واقف تو ہو لیں۔ شروع شروع میں تو سب کچھ اچھا لگ رہا ہوتا ہے۔ آٹے دال کا بھاؤ تو سال دو سال میں پتہ چلتا ہے۔

"جی عائشہ بخش! کیسی ہیں اور زندگی کیسی گزر رہی ہے؟"

"جی! بالکل ٹھیک۔ الحمد اللہ زندگی بہت اچھی گزر رہی ہے۔"

"عائشہ! آپ جاب بھی کرتی ہیں، گھرداری بھی اور ماشاء اللہ اب تو بیٹا بھی ہے تو اتنی ذمہ داریوں میں "فیس بک" کے لیے ٹائم مل جاتا ہے؟"

"نہیں، نہیں۔ میں "فیس بک" پہ نہیں ہوتی، شکر ہے کہ آپ نے یہ بات پوچھ لی اور اب پلیز! اس انٹرویو کے ذریعے اس بات کو ضرور کلیئر کر دیں کہ میں فیس بک پہ نہیں ہوتی۔ میرا صرف ایک فین Page ہے جس پر میں کبھی کبھار کچھ لکھتی ہوں۔ میں اپنے نام کی اسپیلنگ میں Bakhsh لکھتی ہوں اور جو فیس بک پہ اسپیلنگ لکھی ہوئی ہوتی ہے، وہ Baksh ہے اور دونوں طرح کی اسپیلنگ سے 30 سے زیادہ اکاؤنٹ کھل جاتے ہیں۔"

"تو پھر یہ تصاویر۔ تمہاری، تمہارے میاں صاحب کی، بیٹے کی یہ سب کیا ہے؟"

"اسی لیے تو میں آپ کو کہہ رہی ہوں کہ آپ اپنے ڈائجسٹ میں یہ بات ضرور لکھیں کہ یہ Fake ہے۔ اور اس پیج نے مجھے اتنا تنگ کیا ہوا ہے کہ میں آپ کو بتا نہیں سکتی۔ اس پیج پر شاید 55 ہزار لوگ ایڈ ہو چکے ہیں۔ حالانکہ میں نے اس پر اپنی پرسنل کوئی چیز شیئر نہیں کی، نہ ہی کرتی ہوں۔ میں نے تو اپنی شادی کی تصاویر بھی شیئر نہیں کی تھیں۔ ابھی کچھ ہی عرصے پہلے میں نے اپنے بیٹے کے ساتھ ایک تصویر شیئر کی تاکہ لوگوں کو پتا چلے کہ اصلی پیج کون سا ہے۔ مگر میں پریشان ہوں کہ یہ کون لوگ ہیں۔ میری تصاویر کہاں سے لیتے ہیں۔ کب لگاتے ہیں اور انہوں نے مذہبی اور سیاسی تصاویر بھی میرے حوالے سے ڈالیں تو مجھے کچھ لوگوں نے کمپلین بھی کی کہ یہ سب کیا ہے۔ تب میں نے اپنے ذاتی پیج پہ ایک تصویر شیئر کی۔ میں نے تو ایک ایکٹویٹی کی اپنے پیج پر، مگر Fake والوں نے تو باقاعدہ ٹائم دیا کہ اتنے بجے شوہر کے ساتھ تصویر دوں گی اور فلاں ٹائم یہ اپنے بیٹے کے ساتھ تصویر دوں گی

میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ یہ کون لوگ ہیں، کون سا گروپ ہے، مجھے نہیں معلوم۔ انہی لوگوں نے میرا ایک اور پیج بھی بنا دیا ہے۔ میں اپنے آفس میں بھی لوگوں کو بتاتے بتاتے تھک گئی ہوں کہ یہ میں نہیں ہوں۔ تو پلیز پلیز! ایک تو آپ اس بات کو کلئیر کر دیں اور ساتھ میں میرا پیج ایڈریس بھی لکھ دیں۔"

http:// www. facebook. com /Ayshabakhsh. official

officialhttp://www. twitter. com /Ayshabakhsh. official

"بندھن کی طرف آتے ہیں۔ یہ بتائیں کہ کب ہوئی شادی اور سسرالی فیملی کے بارے میں بھی بتائیں۔"

جی! میری شادی 5 فروری 2012 کو ہوئی اور میرا بیٹا ماشاء اللہ 24 اکتوبر 2012 کو ہوا۔ میرے بیٹے کا نام "عارض عدنان" ہے اور میرے میاں صاحب کا نام "عدنان امین" ہے۔ عدنان کا تعلق پنجابی فیملی سے ہے۔ مگر میرے سسرال والے نواب شاہ میں رہتے ہیں اور ایگری کلچر بیک گراؤنڈ ہے ان کا۔ سسرالی فیملی

میں میرے ساس سسر ہیں۔ جیٹھ جیٹھانی ہیں جو کہ دبئی میں رہتے ہیں۔ دو نندیں ہیں۔ ایک شادی شدہ ہیں، وہ اسلام آباد میں رہتی ہیں اور ایک چھوٹی ہے وہ ابھی پڑھ رہی ہے۔ میرے شوہر سینئر سوفٹ ویئر کنسلٹنٹ ہیں، انہوں نے سوفٹ ویئر انجینئرنگ پڑھی ہے۔"

"عدنان صاحب سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی اور بندھن کیسے بندھا؟"

"میری شادی مکمل طور پر ارینج میرج ہے۔ عدنان کی فیملی اور میری فیملی کی ملاقات پنجاب میں ہوئی۔ میرے ننھیال کی ایک خاتون جو شادی کے بعد نواب شاہ چلی گئی ہیں ان کے ذریعے میرا رشتہ پہلے میرے ننھیال میں آیا اور پھر ان کے ذریعے سے میرے والدین تک آیا۔ پھر دونوں فیملیز کی ملاقات ہوئی۔ میری فیملی کراچی آئی اور پھر میری اور عدنان کی ملاقات فیملی کے ساتھ ہوئی، یعنی میں اپنی فیملی کے ساتھ تھی اور عدنان اپنی فیملی کے ساتھ تھے۔"

"عدنان —— تو پنجابی ہیں اور آپ؟ پہلی ملاقات میں عدنان کا کیا ریسپانس تھا اور آپ کے کیا احساسات تھے؟"

"میں بھی پنجاب کے شہر "پاک پتن" سے تعلق رکھتی ہوں۔ والدہ ہاؤس وائف ہیں اور والد لاء گریجویٹ ہیں۔ ہم چار بہن بھائی ہیں۔ میں سب سے بڑی ہوں۔ مجھ سے چھوٹی ایک بہن ہے اور اس سے چھوٹے دو بھائی ہیں۔ جہاں تک ملاقات میں احساس کی بات ہے تو میں نے تو سب کچھ اپنی فیملی پر چھوڑا ہوا تھا۔ بس میں یہ چاہتی تھی کہ جس طرح میں سمپل ہوں اور جس طرح کی سادہ لائف میں گزارتی ہوں۔ میرا لائف پارٹنر بھی ایسا ہی ہو تو والدین کو آئیڈیا تھا۔

ہاں! بات پکی ہونے سے پہلے میں نے یہ ضرور کہا تھا کہ میں جاب نہیں چھوڑوں گی اور اگر چھوڑوں گی بھی تو اپنی مرضی سے چھوڑوں گی۔ یہ بات میرے والدین کو بھی معلوم تھی۔ انہوں نے عدنان کے والدین کو بھی بتادی۔

میری پہلی ترجیح میری تعلیم تھی۔ میں کمیونیکیشن سائنسز میں ماسٹرز کیا ہے۔ تعلیم مکمل کرنے کے ایک سال بعد میری جاب شروع ہوگئی اور میں اس میں مصروف ہوگئی۔"

"لڑکیوں کو تو شادی کا بہت شوق ہوتا ہے؟"

"ہاں! ہوتا ہے۔ لیکن مجھے شوق نہیں تھا۔ نہ فیشن کا اور نہ ہی اس طرف توجہ دیتی تھی کہ شادی ہونی ہے تو اس طرح بن کے رہوں۔ بس! مجھے اپنی پڑھائی اور پھر اپنی جاب پیاری تھی۔ جبکہ لوگ کہتے تھے کہ بھئی! اب شادی کرلو۔ تو شادی تو تب ہی ہونی ہوتی ہے، جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے۔ جب ہم اس بات کو مانتے ہیں کہ نصیب اللہ تعالیٰ لکھتا ہے تو پھر اس بات کو کیوں نہیں مانتے کہ شادی کے لیے بھی ایک وقت مقرر ہے۔"

"لو میرج ہونی چاہیے یا ارینج میرج؟"

"ہم جس سوسائٹی میں رہ رہے ہیں اس میں آج کل ہمارے ہاں ویلیوز بالکل ختم ہوگئی ہیں۔ لوگ عزت و احترام نہیں دیتے۔ ہمارے یہاں لو میرج کو بری نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ کچھ لوگ لو میرج کو واقعی سنجیدہ لیتے ہیں۔ مگر زیادہ تر نوجوان اس کو سنجیدہ نہیں لیتے۔ اسی لیے ہمارے یہاں طلاق کا ریشو زیادہ ہوگیا ہے۔ ہم لوگ مادہ پرست ہوتے جارہے ہیں۔ اور میرے خیال میں عزت و احترام کا نام ہی پیار محبت ہے اگر عزت و احترام نہیں تو پیار محبت بھی نہیں ہے۔"

"شادی سے پہلے آپ نے کہا کہ جاب نہیں چھوڑوں گی۔ اور بات مان بھی لی گئی، مگر شادی کے بعد ایسا ہوا کہ بھئی! اب تو شادی ہوگئی ہے۔ لڑکی قابو میں آگئی ہے تو اپنی بات منوالو؟"

(ہنستے ہوئے)۔ "بھئی! میں کسی کی بات نہیں کروں گی۔ صرف اپنے میاں صاحب کی بات کروں گی اور میں آپ کو بتاؤں! کہ میرے میاں صاحب پہلے دن

سے آج تک میرے ساتھ بہت کوآپریٹو ہیں۔ ان کی تو خواہش ہے کہ مجھے اپنی لکھنے کی صلاحیت کو بھی سامنے لانا چاہیے۔ مگر میں ہی کہہ دیتی ہوں کہ ابھی میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ اور میرے فادر ان لاء میرے کام سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ تو ایسی کوئی بات نہیں کہ شادی کے بعد جاب کے لیے کوئی مشکل ہوئی ہو۔"

"شادی کے بعد عدنان صاحب کو اور سسرال کو کیسا پایا؟"

"میرے میاں صاحب بہت زیادہ کوآپریٹو ہیں اور میرے سسرال والے بھی۔ ہم اچھے میاں بیوی سے زیادہ اچھے دوست ہیں۔ ایک دوسرے کو سمجھنا، ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا اور عزت دینا۔ یہ سب باتیں ہمارے ریلیشن شپ میں شامل ہیں۔"

"مزاجاً" کیسے ہیں؟ غصے کے تیز ہیں یا نرم؟"

"میرا غصہ تیز ہے۔ مگر ان کا تیز نہیں ہے۔ مجھے سال میں ایک آدھ بار ہی غصہ آتا ہے جو کہ کافی خطرناک ہوتا ہے اور شکر الحمد اللہ اس ایک سال میں نہ مجھے غصہ آیا ہے اور نہ ہی ہمارے درمیان کوئی لڑائی جھگڑا ہوا ہے۔ بحث و مباحثہ ہوجاتا ہے۔ مگر لڑائی نہیں ہوتی۔"

"جوائنٹ فیملی ہے کیا؟" اور جوائنٹ فیملی ہونی چاہیے کہ نہیں؟"

"نہیں! جوائنٹ فیملی نہیں ہے اور جیسا کہ میں نے آپ کو بتایا کہ میرا سسرال نواب شاہ میں ہے، تو —— میں اکثر نواب شاہ جاتی ہوں۔ جیسے کوئی تہوار ہو اور ابھی عارض کی پیدائش کے بعد بھی اور جب بھی چھٹی ملتی ہے تو یا تو اپنی فیملی کے ساتھ وقت گزارتی ہوں یا پھر عدنان کی فیملی کے ساتھ۔ میں کہتی ہوں کہ جوائنٹ فیملی ہونی چاہیے۔ کیونکہ بیٹے کی پیدائش کے بعد کبھی کبھار کام کو مینیج کرنا مشکل ہوجاتا ہے تو پھر ایسے میں اپنے بزرگوں کی بہت قدر ہوتی ہے۔ تو پھر ہم ایسا کرتے ہیں کہ سارا دن تو میں گھر پر ہوتی ہوں۔ شام کو عدنان آجاتے ہیں تو بس مینیج ہوجاتا ہے۔"

"میاں صاحب کے دل میں گھر کرنے کے لیے کیا ضروری ہے؟ میاں کی خدمت ان کے گھر والوں کی خدمت یا پھر اچھا کھانا؟ کھانا آپ خود پکاتی ہیں؟"

"یہ تو میں نے کبھی سوچا ہی نہیں اور نہ ہی عدنان سے پوچھا کہ کیا ہونا چاہیے۔ الحمد اللہ ابھی تک ایسی کوئی پرابلم آئی ہی نہیں ہے اور نہ ہی کوئی آئیڈیا ہے۔ بس ہم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں ایک دوسرے کی ضرورتوں کا خیال رکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کی عزت کرتے ہیں۔ کھانا گھر پہ ہی پکاتی ہوں۔ ہمارے یہاں کھانا باہر سے نہیں آتا۔ میرے شوہر میرے ہی ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھانا پسند کرتے ہیں اور میں اپنی ذمہ داریوں کو بہت اچھی طرح سمجھتی ہوں۔"

"آپ روایتی بیوی کی طرح خدمت کرتی ہو یا کہتی ہو کہ آپ اپنا کام خود کریں میں بھی تو کما کر آتی ہوں۔"

"روایتی بھی نہیں ہوں اور نظر انداز کرنے والی بھی نہیں ہوں۔ جو میری ذمہ داری ہے میں نبھاتی ہوں۔ جیسے عدنان کی وارڈ روب ٹھیک ہو، کپڑے استری ہوں۔ چابی سے لے کر موبائل تک میں ان کی ہر چیز سنبھال کر رکھ رہی ہوتی ہوں۔ پھر گھر صاف ستھرا ہو۔ کچن صاف ستھرا ہو۔ وقت پر کھانا پک جائے۔ یہ سب

میری ذمہ داری ہے اور عدنان ایسے ہیں بھی نہیں کہ ہر چیز کے لیے مجھے آواز لگا رہے ہوں۔"

"کھانے میں کیا پسند ہے عدنان کو اور کیا گھر کے کاموں میں آپ کا ہاتھ بٹاتے ہیں؟"

"میں سبزیاں، دالیں زیادہ شوق سے کھاتی ہوں اور عدنان کو چاول زیادہ پسند ہیں۔ عدنان ہنستے ہیں اور کہتے ہیں کہ شادی سے پہلے میں نے اتنی سبزیاں نہیں دیکھی تھیں، جتنی شادی کے بعد دیکھی ہیں۔۔۔ تو میں کہتی ہوں کہ ابھی تو آپ نے کچھ بھی سبزیاں نہیں دیکھیں۔ عدنان کھانے کے معاملے میں بالکل بھی تنگ نہیں کرتے۔ جو میں پکاتی ہوں، کھا لیتے ہیں۔ میرے سسر کو میرے ہاتھ کا "چکن اچار" بہت پسند ہے۔ وہ فرمائش کر کے مجھ سے پکواتے ہیں۔ میں رات کو تقریباً" ساڑھے دس بجے گھر آتی ہوں اور گھر آکر روٹی پکاتی ہوں۔

عدنان

بہت انڈر اسٹینڈ کرتے ہیں۔ اور جی ہاں! کچن میں میرے ساتھ ہاتھ بٹاتے ہیں۔ مثلاً" مجھے کسی چیز کی ضرورت ہے تو میں کہتی ہوں کہ فلاں چیز پکڑا دیں اور بیٹے کو بھی جب میں گھر پر نہیں ہوتی، عدنان ہی سنبھالتے ہیں۔"

"شادی کے نقصانات ہیں یا فائدے؟"

(ہنستے ہوئے)۔ "ایسا تو کبھی سوچا ہی نہیں۔ ہاں جب شادی نہیں ہوئی تھی تو کبھی کبھار یہ ضرور احساس ہوتا تھا کہ شاید شادی کے بعد انسان کی کوئی لائف نہیں رہتی۔ کیونکہ ہماری سوسائٹی میں خواتین کو بہت کم عزت دی جاتی ہے اور لوگ شادی تو کر لیتے ہیں۔ مگر نبھانے میں مشکل ہوتی ہے۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ عدنان بہت کوآپریٹو ہیں اور بہت عزت کرتے ہیں میری۔ اس لیے کہہ سکتی ہوں کہ شادی کے نقصانات نہیں ہیں۔"

"منہ دکھائی میں کیا ملا تھا اور ہنی مون کہاں منایا تھا؟"

"منہ دکھائی میں پینڈنٹ ملا تھا اور ہنی مون پہ کہیں نہیں گئے تھے۔ دونوں ہی اپنی اپنی جاب پر واپس آ گئے تھے۔ میں ان سے کبھی کبھار کہتی ہوں کہ میرا ہنی مون "ڈیو" پڑا ہے۔ میں نے جتنی چھٹیاں لی تھیں، وہ نواب شاہ میں ہی گزاریں۔ ویسے میں ہنی مون کو ضروری نہیں سمجھتی، کیونکہ میں بہت پریکٹیکل ٹائپ کی لڑکی ہوں۔"

"اسلام میں چار شادیوں کی اجازت ہے۔ اگر خدانخواستہ عدنان صاحب کا موڈ بن گیا دوسری شادی کا تو آپ کا ری ایکشن کیا ہو گا؟"

"میں اپنے شوہر کو ایک بات کہہ دیتی ہوں کہ وہ دوسری شادی کرنا چاہیں تو مجھے کوئی ایشو نہیں ہے۔ بس! میری ایک شرط ہو گی کہ پھر مجھ سے کوئی واسطہ نہ رکھیں۔ میری نیچر میں زبردستی نہیں ہے۔ میں تو یہ کہتی ہوں کہ نہ میں اپنی ذات کسی پہ مسلط کرتی ہوں اور نہ ہی کوئی مجھ پر اپنی ذات مسلط کرے۔ میں بہت سیدھی سادی سی لڑکی ہوں۔ مجھ میں بناوٹ نہیں ہے۔"

"لڑکیوں کا کمانا کتنا ضروری ہے اور آپ اپنی کمائی کا زیادہ حصہ کس پر خرچ کرتی ہیں؟"

"اپنی کمائی کا زیادہ حصہ میں اپنی مرضی سے خرچ کرتی ہوں۔ شادی سے پہلے اپنے اوپر خرچ کرتی تھی اور اب میں اپنے اور اپنے بیٹے کے اوپر خرچ کرتی ہوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ خواتین کے لیے کمانا بہت ضروری ہے۔ آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں، اس کے لیے بہت ضروری ہے کہ خواتین اپنے پاؤں پہ کھڑی ہوں۔ اگر خدانخواستہ زندگی میں کوئی برا وقت آجائے تو لڑکی میں اتنی صلاحیت ضرور ہو کہ وہ اپنی فیملی کو سپورٹ کر سکے اور اگر خود مشکل حالات میں ہو تو اپنے آپ کو سنبھال سکے۔"

"میاں، بیوی کے درمیان کھٹ پٹ ہو ہی جاتی ہے۔ تو میاں بیوی کو اپنے مسائل خود حل کرنے چاہئیں یا بڑوں کی مدد لینی چاہیے؟"

"نہیں! اگر ہماری آپس میں کوئی بات ہو گی تو ہم اپنے مسائل کو خود ہی حل کریں گے۔ مجھے کسی کی مداخلت پسند نہیں، کیونکہ ہم خود بہتر انداز میں اپنے مسائل کو حل کر سکتے ہیں۔"

"ہمارے یہاں طلاق کا ایشو بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ قصور کس کا ہوتا ہے لڑکی کا یا لڑکے کا؟"

"میرے خیال میں دونوں کا ہی ہوتا ہے۔ کسی ایک پر الزام نہیں ڈال سکتے۔ کسی کیس میں لڑکی کا قصور زیادہ ہوتا ہے تو کسی میں لڑکے کا۔ میں تو یہ کہوں گی کہ طلاق کے معاملے میں سب سے زیادہ قصوروار والدین بھی ہوتے ہیں۔ ہماری روایات کی ویلیوز جو گر گئی ہیں۔ وہ والدین کی وجہ سے گری ہیں۔ والدین بہت سی ایسی باتوں کی اجازت دے دیتے ہیں، جو بچوں کے لیے بگاڑ کا سبب بنتی ہیں۔ والدین بچوں کی ایکٹوٹی پہ نظر نہیں رکھتے۔ انٹرنیٹ، کیبل اور موبائل نے سوسائٹی سے عزت و احترام کا عنصر ہی ختم کر دیا ہے۔ ہم جس کو خود اعتمادی کا نام دیتے ہیں۔ وہ خود اعتمادی نہیں، بلکہ بدتمیزی ہوتی ہے۔ آج لڑکے اور لڑکیاں جس چیز کو ضروری سمجھ رہے ہوتے ہیں، وہ حقیقت میں کہیں بھی ضروری نہیں۔ میں نے بہت پریکٹیکل لائف گزاری ہے اور وہ بھی میڈیا میں۔۔۔ تو میری نظر میں ان باتوں کی کوئی ویلیو نہیں ہے۔"

"مطلب منگنی کے بعد گھومنا پھرنا اور ایک ساتھ وقت گزارنا مناسب نہیں ہے؟"

"جب میری منگنی ہوئی تو عدنان کے گھر والوں سے میری بات ہوئی تھی۔ چھ ماہ ہماری منگنی رہی۔ ہماری جو ملاقات ہوئی، فیملی کے ساتھ ہوئی۔ نہ ہی فون پر ایسی بات ہوئی کہ فیوچر پلاننگ ہو رہی ہے یا لمبی لمبی باتیں ہو رہی ہیں۔ ایسا کچھ نہیں ہوا۔ عدنان اپنی جاب میں مصروف رہے۔ ملک سے باہر ان کا آنا جانا لگا رہا۔ کبھی ابوظہبی، کبھی دبئی تو کبھی جرمنی اور میں اپنی جاب میں مصروف رہی۔ شادی سے پہلے ملنا ملانا اور گھومنا پھرنا ان باتوں کو میں مناسب نہیں سمجھتی۔ چاہے لوگوں اور نوجوانوں کو برا ہی کیوں نہ لگے۔"

"آپ دونوں ایک دوسرے کو کس طرح بلاتے ہیں اور عدنان آپ کے لیے کیا چاہتے ہیں کہ ہر وقت تیار میک اپ اور فیشن کریں؟"

"نہیں! ایسا کچھ نہیں ہے۔ عدنان کو میں سادگی میں زیادہ اچھی لگتی ہوں۔ انہیں میں بغیر میک اپ کے ہی زیادہ اچھی لگتی ہوں۔ جب میں میک اپ کے ساتھ گھر آتی ہوں تو کہتے ہیں۔ تم میری والی عائشہ نہیں لگ رہیں۔ لباس میں مجھے شلوار قمیص پسند ہے اور ان کو بھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو نام لے کر ہی بلاتے ہیں۔"

"رومانٹک مزاج کون ہے؟ اور فضول خرچ کون ہے؟"

"عدنان رومانٹک مزاج زیادہ ہیں۔ فضول خرچ تو ہم دونوں میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔"

"اور اب چلتے چلتے یہ بتا دو کہ کمرے میں آکر عدنان نے پہلا جملہ کیا بولا تھا، آپ کو دیکھتے ہی۔"

(قہقہہ) "سچی بات ہے تو مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے کیا بولا تھا۔ میں نے آپ کو بتایا کہ عدنان کی فیملی گوجر نواب شاہ میں رہتی ہے۔ تو پہلے ہم گوجر گئے تھے۔ پھر نواب شاہ آئے تھے۔۔۔ کافی لوگ تھے وہاں خاندان کے اور سب سے میری ملاقات ہوئی۔ میں کافی دیر میں کمرے میں گئی تھی۔ اس وقت ہم دونوں ہی کافی تھک چکے تھے تو مجھے تو یاد نہیں کہ انہوں نے کیا کہا تھا۔ راستے بھر ـــــ میرے سسر کو میری بہت فکر تھی کہ یہ تھک گئی ہو گی۔ اس نے اتنا بھاری سوٹ پہنا ہے۔ وہ بالکل میرے والد کی طرح میری فکر بھی کرتے ہیں اور محبت بھی کرتے ہیں۔ جیسے ہی ہم گھر پہنچے انہوں نے سب سے کہا کہ بچی تھک گئی ہو گی۔ اس کا خیال رکھو۔ اس کو کچھ کھلاؤ پلاؤ۔"

"اور کچھ کہنا چاہیں گی؟"

"نہیں! بس بہت شکریہ۔"

"اور شکریہ عائشہ بخش! آپ کا بھی کہ آپ نے اپنی مصروفیات میں سے ہمیں ٹائم دیا۔"

رُخسانہ نگار عدنان

ایک تھی مثال

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشریٰ ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران، بشریٰ کا بھائی ہے۔ مثال، ذکیہ بیگم کی نواسی ہے اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ فوزیہ اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ نسیم بیگم مصلحتاً "بیٹا بہو" سے لگاوٹ دکھاتی ہیں۔ دوسری طرف ذکیہ بیگم کا کہنا ہے۔ ان کی بیٹی بشریٰ کو سسرال میں بہت کچھ برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ذکیہ بیگم اپنے بیٹے عمران کے لیے بھی لڑکیاں دیکھ رہی ہیں۔ پانچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بالآخر فوزیہ کا ایک جگہ نکاح طے پا جاتا ہے۔ نکاح والے روز بشریٰ دولہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔

۲

دوسری قسط

اسے لگا اس نے ظہیر کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ کہیں بہت قریب سے..... کہاں اسے بہت سوچنے پر بھی یاد نہیں آرہا تھا۔

نکاح ہوچکا تھا۔ اب اسٹیج پر قریبی عزیزوں کے ساتھ تصویریں بنوائی جارہی تھیں۔ بشریٰ کی طبیعت کچھ بوجھل سی تھی شاید تھکاوٹ کی وجہ سے یا کچھ اور.....

وہ سب سے ہٹ کر ایک طرف آکر بیٹھ گئی۔

مثال سب کے درمیان خوش خوش پھر رہی تھی۔
بشریٰ اسے دیکھتے ہوئے خود بخود مسکرانے لگی۔ اس کی ساری تھکن جیسے اترنے لگی۔ اسی وقت عدیل نے بھی اسے دیکھا۔ وہ بشریٰ کو یوں بیٹھے دیکھ کر کچھ متفکر سا ہوا۔ بشریٰ ابھی تو فوزیہ کے ساتھ بیٹھی تصویر بنوا رہی تھی اور اب یوں سب سے الگ تھلگ!

وہ دوسرے ہی لمحے اس کے پاس آکر فکر مند لہجے میں اس سے پوچھنے لگا۔
"تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے نا بشریٰ؟"
"ہاں ٹھیک ہوں۔ آپ کیوں آگئے وہاں سے۔ امی خفا ہوں گی۔ سب کے درمیان جاکر بیٹھیں۔ اچھا نہیں لگتا ہم دونوں ہی اس طرح الگ تھلگ ہو کر بیٹھ جائیں۔" بشریٰ کو فوراً نسیم بیگم متلاشی نظریں پریشان کرنے لگیں۔ وہ یقیناً بشریٰ اور عدیل ہی کو تلاش کر رہی تھیں۔
"فکر نہیں کرو میں ابھی وہیں سے تو آرہا ہوں۔ تم مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگ رہیں۔"
"ہاں! بس ایسے ہی طبیعت بوجھل سی ہو رہی تھی شاید تھکاوٹ کی وجہ سے" وہ سر دبا کر تھکے تھکے لہجے میں بولی۔

"تو تم جاکر آرام کرو۔ فنکشن تو تقریباً ختم ہی ہو گیا ہے۔" عدیل تشویش سے بولا۔ اسے بھی بشریٰ کا رنگ کچھ زرد سا لگ رہا تھا۔
"کیسی باتیں کر رہے ہیں عدیل! امی کا پتا ہے نا آپ کو۔ ابھی ہم دونوں کو غائب دیکھیں گی تو مہمانوں کا لحاظ کیے بغیر مجھے بولنا شروع ہو جائیں گی۔ پلیز جائیں آپ وہاں بیٹھیں سب کے درمیان" بشریٰ کچھ گھبراہٹ سے بولی نسیم اب واقعی متلاشی نظروں سے دونوں کو ادھر ادھر دیکھ رہی تھیں۔
عدیل نے بھی ماں کی طرف دیکھا تو گہرا سانس لے کر کھڑا ہو گیا۔
"میں تو یہی کہہ رہا تھا امی سے کہ اچھا بھلا خرچ ہو گیا۔ اس سے تو اچھا تھا ساتھ ہی رخصتی کر دیتے۔ کیا فائدہ اتنا پیسہ لگا کر بھی شادی کی ساری رسومات اسی طرح سر پر کھڑی ہیں۔" عدیل کو واقعی کوفت ہو رہی تھی۔ نسیم بیگم نے دل کھول کر اس موقع پر خرچ کیا تھا۔ کچھ یہی حال فوزیہ کا تھا۔
بشریٰ نے عدیل کے کہنے پر اپنے لیے نئے کپڑے نہیں بنوائے تھے۔ اس بار خرچ کو کنٹرول کرنا اس کے لیے بہت مشکل ہو رہا تھا۔
"مثال سے بھی کہیں۔ اب کچھ دیر کو آرام سے بیٹھ جائے۔ مسلسل پھرے جا رہی ہے، تھک کر خدانخواستہ کہیں بیمار نہ پڑ جائے۔" عدیل کو جاتے دیکھ کر بشریٰ پیچھے سے بولی۔
عدیل کچھ جواب دیے بغیر چلا گیا۔
بشریٰ ہولے ہولے اپنی کنپٹی دبانے لگی پھر سے اس کی نظریں ظہیر کے چہرے پر رک گئیں اور دوسرے لمحے وہ چونک کر رہ گئی۔
اسے یاد آگیا تھا کہ اس نے ظہیر کو کہاں دیکھا تھا۔
نہ صرف دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ بشریٰ کا مختصر سہی تعلق بھی رہ چکا تھا۔
وہ ایک دم سے ٹھٹک کر رہ گئی تھی مگر اب اس کو یہ سب یاد آنا بے محل اور بے فائدہ تھا۔ کاش اسے ذرا پہلے یاد آجاتا۔
وہ یک ٹک ظہیر کو دیکھے جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

عاصمہ تینوں بچوں کو ہوم ورک کروا رہی تھی۔ چھوٹی وردہ پاس ہی پرام میں بیٹھی غوں غاں کر رہی تھی جب فاروقی صاحب عفان کے ساتھ گلے میں پھولوں کے ہار ڈالے تمتماتے چہرے کے ساتھ کچھ تحائف لیے اندر داخل ہوئے۔
عفان نے ہاتھ میں پکڑی مٹھائی اور دوسرے تحفے ایک طرف میز پہ رکھے۔
"آگئے ابا جی!" عاصمہ مسکرا کر کھڑی ہو گئی۔
"آگئے.... ایک لمبے سفر سے واپس۔" بظاہر مسکراتے ہوئے مگر مغموم سے لہجے میں فاروق صاحب نے کہا۔ چہرے پر مسکراہٹ کے باوجود ہلکی ہلکی اداسی آنکھوں میں ہلکورے لے رہی تھی۔
عفان بھی باپ کا ساتھ دینے کو ذرا سا مسکرایا۔
"تو اچھا ہے نا ابا جی! آزاد ہو گئے خوامخواہ کے آزار سے۔ اب اپنی مرضی سے اٹھیں گے۔ جی چاہا تو سوتے رہیں گے رات دیر تک اپنی پسند کے ٹاک شوز دیکھیں گے آزادی تو پھر آزادی ہوتی ہے۔" عاصمہ نے ان کو بہلانے کی کوشش کی۔
"ہاں! یہ تو ہے۔"
"مما! دادا ابو کیا حج کر کے آئے ہیں؟" منجھلی اریشہ نے دادا کے گلے میں پڑے پھولوں کے ہار دیکھ کر اشتیاق سے پوچھا۔
"ان شاء اللہ میری جان! وہ بھی کرنے جائیں گے۔ ابھی تو سمجھو دنیا کے حج سے فارغ ہوئے ہیں۔" فاروق صاحب اریشہ کو پیار کر کے بولے۔
"سب لوگ ابا جی کی تعریفیں کر رہے تھے۔ ابا جی کی ایمان داری اصول پسندی اور سب سے بڑھ کر وقت کی پابندی۔ ابا جی! آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔ آپ کی شاندار سروسز کا سب نہ صرف اعتراف کر رہے تھے بلکہ یہ دیکھیں جو سب نے تحائف دیے اور تعریفی اسناد بھی۔" عفان نے باپ کو فخریہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔
"دادا ابا! ان گفٹ پیکس میں کیا ہے؟" گیارہ سالہ واثق نے آگے بڑھ کر میز پر پڑے تحفوں کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"یہ دفتر کے کچھ دوستوں نے اپنے طور پر دیے ہیں اور کچھ سب نے مل کر۔" فاروق صاحب کا لہجہ اب تھکا تھکا سا تھا۔
"عاصمہ! جلدی سے چائے لے آؤ بھئی۔ ابا جی تھک گئے ہیں۔ چائے پی کر کچھ دیر آرام کریں گے۔"
"نہیں بیٹی! چائے رہنے دو۔ ابھی کافی کچھ کھا کر آرہے ہیں۔ میں کچھ دیر آرام کروں گا۔" فاروق صاحب اٹھ کر جانے لگے۔
"دادا ابو! میں آپ کا سر دبا دوں؟" اریبہ دادا کا ہاتھ پکڑ کر معصومیت سے بولی۔
"دادا کی جان! آپ پڑھو اگر ہمارے سر میں درد ہوا تو ہم اپنی گڑیا کو خود سے آواز دے لیں گے۔" وہ اسے جھک کر پیار کرنے لگے۔
اریبہ مسکرا کر پھر سے بیٹھ کر اپنا ہوم ورک کرنے لگی۔
"ابا جی! کھانے میں کیا لیں گے؟ آج رات کو.... کیا بنا لوں؟" عاصمہ پیچھے سے بولی

"عفان سے پوچھ لو۔ مجھے تو شاید ہی بھوک لگے۔" فاروق صاحب کہہ کر باہر نکل گئے۔ دونوں کچھ دیر خاموش رہ گئے۔

"یہ اباجی کچھ زیادہ ہی اداس نہیں ہو رہے آج؟" عاصمہ آہستگی سے بولی۔

"ظاہر ہے اتنے سالوں کی روٹین ایک دم سے ختم ہو گئی۔ اداس تو ہوں گے ہی۔ خیر ہو جائیں گے آہستہ آہستہ عادی۔ تم مجھے تو ایک کپ چائے کا بنا دو۔" عفان واثق کی کاپیاں چیک کرنے لگا۔

"عفان! اباجی کو پینشن کتنی ملا کرے گی؟" عاصمہ جاتے ہوئے رک کر پوچھنے لگی۔

عفان فوری طور پر کچھ بول نہیں سکا۔

"وہ ان کی تنخواہ سے اچھا خاصا گھر کا خرچ نکلتا تھا۔ تینوں بچوں کو اتنے اچھے سکولوں میں داخل کرا رکھا ہے ہم نے ورنہ اکیلے آپ کی تنخواہ میں کہاں گزارہ ہو گا۔" وہ اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔

"پتا نہیں مجھے ٹھیک سے اندازہ نہیں ہے۔" عفان بتانا نہیں چاہ رہا تھا عاصمہ کو کچھ ایسا ہی لگا۔

"پھر بھی کچھ تو اندازہ ہو گا۔" وہ اصرار سے بولی۔

"یار! جاؤ تم چائے لے کر آؤ میرے لیے۔ سر میں درد ہے اب تم تحقیق شروع کر دو۔" عفان کچھ اکتا کر بولا تو عاصمہ مزید اصرار نہیں کر سکی۔

"ہاں بھئی! کیسی جا رہی ہے اسٹڈیز آپ لوگوں کی۔" عفان تینوں کی کاپیاں چیک کرنے لگا۔

"کہہ تو عاصمہ ٹھیک رہی ہے 'اباجی کی نوکری ختم ہونے سے فرق تو بہت پڑے گا۔'"

کاپیاں چیک کرتے ہوئے عفان رک کر سوچنے لگا۔

☼ ☼ ☼

بشریٰ کمرے میں آ کر بیٹھی ہی تھی کہ ذکیہ بھی آ گئیں۔ ابھی ابھی لڑکے والے رخصت ہو کر گئے تھے۔ فوزیہ اپنے کمرے میں کپڑے تبدیل کر رہی تھی۔ مثال اس کے ساتھ تھی۔ بشریٰ تھوڑی کمر ٹکانے کے خیال سے کمرے میں آ گئی۔

"لو دیکھو! یوں تو بڑی سیانی بنتی ہیں یہ نسیم بیگم اور رشتہ کہاں جوڑا بیٹی کا۔" ذکیہ بیڈ کے اوپر پیر رکھ کر ہولے ہولے اپنے پاؤں اپنے ہاتھوں سے دباتے ہوئے نخوت سے بولیں۔

بشریٰ نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا۔

"تو امی کو بھی یاد آ گیا۔" اس نے دل میں سوچا۔

"تمہیں کچھ یاد نہیں آیا بشریٰ!" وہ بشریٰ کو خاموش بیٹھے دیکھ کر بولیں۔

"کیا امی؟" وہ انجان بنتے ہوئے سرسری لہجے میں بولی۔

ذکیہ لمحہ بھر کو خاموش ہو گئیں جیسے بولنے کے لیے الفاظ کا انتخاب کر رہی ہوں۔

"امی! ایک بات کہوں۔" بشریٰ نے ان کی خاموشی کو غنیمت جانتے ہوئے آہستہ آواز میں کہا۔

"کون سی بات؟" ذکیہ کچھ چونکیں۔

"اب تو نکاح ہو گیا ہے نا۔" بشریٰ ہولے سے بولی۔ "اچھا نہیں لگے گا اگر یہ سب۔ میرا مطلب ہے عدیل کی امی یا فوزیہ کو پتا چلے گا' یوں بھی وہ تو ایک سرسری معاملہ تھا' کون سا کوئی ایسا رشتہ جڑا تھا ہمارا۔۔۔ پھر شاید عدیل کو بھی یہ بات اچھی نہ لگے۔" بشریٰ رک رک کر یوں بولی جیسے خود کو بھی سمجھا رہی ہو۔

"اتنے سال گزر گئے۔ میں تو یہ حیران ہوں ظہیر۔ اس وقت بھی اس کی عمر کوئی ایسی کم تو نہ تھی۔ کون سا بیس بائیس کا تھا اس وقت بھی تیس پینتیس کا تو ہو گا اب تو۔" سوچتے ہوئے ذکیہ اپنی انگلیوں پر گننے لگیں۔

بشریٰ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ جانتی تھی۔ ماں کو اب روکنا یا خاموش کرانا آسان نہیں ہو گا۔

"لو آٹھ سالوں میں تیس کا بھی رہا ہو کم سے کم تو اب اڑتیس انتالیس کا سمجھو۔ یوں تو یہ فوزیہ بی بی بھی کم سن نہیں۔ کب سے نسیم بیگم اس کا رشتہ تلاش رہی تھیں اور دیکھو جوڑ کا ملا بھی تو کون؟" وہ ٹھٹھا سا لگا کر ہنسیں۔

بشریٰ نے ناگواری سے ماں کو دیکھا مگر ذکیہ کا دھیان تو اس کی طرف تھا ہی نہیں۔

"جب تمہارے لیے یہ ظہیر کی ماں ہماری دہلیز اپنی جوتیوں سے گھس رہی تھی اس وقت بھی مجھے یہ لوگ کچھ اتنا بھائے نہیں تھے پھر بھی اچھا گھر بار اور خاندان دیکھ کر میں نے ہامی بھر لی تھی مگر چند ہی دنوں میں جو انہوں نے پر پرزے نکالے 'یاد ہے' تمہیں وہ سب بشریٰ۔"

ذکیہ جیسے صورت حال کا پورا تجزیہ کرنے پر تلی ہوئی تھیں مزا سا لے کر بولیں۔

"امی! خدا کے لیے چپ کر جائیں۔ گھر میں اس وقت مہمان اکٹھے ہیں جو کسی نے کچھ سن لیا تو۔" بشریٰ دہل کر بولی۔

"تو سن لے ایسا کون سا میں کوئی من گھڑت افسانہ سنا رہی ہوں۔" ذکیہ نڈر ہو کر بولیں۔

بشریٰ تلملا کر رہ گئی۔

"آج امی کوئی نہ کوئی تماشا کروا کے جائیں گی۔" وہ بول بھی نہ سکی۔

"آئے دن ان کا فرمائشی پروگرام چلنے لگا تھا اور دیکھو مزے کی بات ظہیر کی ماں یوں تو خاصی بھولی بھالی خود کو ظاہر کر رہی تھی نسیم بہن کے سامنے۔ مگر مجھے دیکھتے ہی جیسے اس پر پانی سا پڑ گیا۔ دائیں بائیں دیکھنے لگی جیسے بھاگنے کو راستہ ڈھونڈ رہی ہو۔" خود ہی ہنسنے لگیں۔

"اور بشریٰ! میں جو نسیم سے کچھ بول دیتی۔"

"امی! بس کر دیں خدا کے لیے۔ یوں بھی یہاں صرف رشتہ جڑنے والا سرسری معاملہ نہیں۔ باقاعدہ نکاح ہوا ہے اب اگر اس بات کی بھنک امی کو یا عدیل کو ہو گئی یا فوزیہ کو پتا چل گیا۔ ظہیر اس کی فیملی کو تو کیا کسی نے برا سمجھنا۔ الٹا میری شامت آ جائے گی کہ میری پہلے بھی کہیں منگنی ہوئی تھی اور ہم نے چھپایا۔" بشریٰ نے ماں کو سنگین حالات کا احساس دلانا چاہا۔

"اے لو! منگنی کہاں تھی وہ۔ خالی منہ زبانی کی بات تھی اور بس۔ میں پہلے ہی ان کی بدنیتی کو جان گئی تھی تو۔۔۔"

"امی! چائے پییں گی آپ؟" بشریٰ کنپٹی دباتی کھڑی ہو گئی یوں تو ذکیہ بیگم کو چپ کرانا مشکل تھا۔ بشریٰ نے اٹھ کر چلے جانے میں ہی عافیت سمجھی۔

"تم لیٹی رہو۔ تمہاری طبیعت کون سی اچھی ہے بلکہ میں تو کہتی ہوں عدیل کے ساتھ جا کر ڈاکٹر کو دکھا آؤ یا میں چلتی ہوں تمہارے ساتھ۔"

"نہیں! ٹھیک ہوں میں۔ یوں بھی ابھی گھر میں مہمان ہیں۔ امی بولیں گی کہ کیسے کمرے میں گھس کر بیٹھ گئی' میں دیکھوں ذرا باہر جا کر۔"

"بشریٰ! دیکھنے بھالنے کا۔۔۔ نوکرانی تو نہیں ہو تم ان کی۔" ذکیہ پھر اپنی ناگواری چھپا نہ سکیں تو بولنے لگیں۔

"امی! اپنے گھر میں کام کرنے سے کوئی نوکر نہیں بن جاتا۔" بشریٰ کو ماں کی بات اچھی نہیں لگی تو فوراً بول اٹھی۔

"پھر عدیل میرے ساتھ اتنے اچھے ہیں۔ میرا اتنا خیال رکھتے ہیں، کبھی انہوں نے میری کسی خواہش کو رد نہیں کیا تو اگر میں ان کی ماں بہن کا خیال رکھتی ہوں یا گھر کے کام کر لیتی ہوں تو کیا فرق پڑتا ہے امی!" بشریٰ تحمل سے ماں کو سمجھانے والے انداز میں بولی اگرچہ جانتی تھی ذکیہ سے اس موضوع پر بات کرنا فضول ہے۔

"تمہاری الٹی منطق۔ وہ ماں بیٹی تمہیں جوتی پر رکھیں اور تم ان کی دلداری کرتی رہو۔" وہ اسے اور اشتعال دلاتے بولیں۔

بشریٰ تاسف سے ماں کو دیکھتی باہر جانے لگی۔

"ہاں امی! وہ جو لڑکی آپ کو پسند آئی تھی۔ شام میں مجھے دکھا رہی تھیں عمران کے لیے۔ کچھ اتا پتا لیا آپ نے اس کا۔" بشریٰ کو جاتے جاتے یاد آیا تو رک کر پوچھنے لگی۔

"اونہوں دفع کرو اسے! بہروپیے ظہیر کی خالہ زاد ہے بھئی۔ میں نے تو اس دو نمبر خاندان میں کوئی رشتہ نہیں جوڑنا۔ لڑکی تو خاصی تیز طرار تھی میرے اتا پتا پوچھنے پر ہی جھٹ سے سمجھ گئی۔ شرما شرما کر ادائیں دکھانے لگی۔ میں تو اٹھ کر آ گئی۔" ذکیہ نے تفصیلاً جواب دیا تو بشریٰ گہرا سانس لے کر رہ گئی۔

"اس طرح تو امی! عمران کا رشتہ ڈھونڈنا اور بھی مشکل ہوتا جائے گا۔ آخر کوئی نہ کوئی تو پسند کرنا ہو گی نا!"

"کوئی نہ کوئی کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ کسی کو بھی بہو بنا کر لے آؤں، جو دل کو، آنکھوں کو بھائے گی، اس کے بارے میں سوچیں گے تم ذرا فارغ ہو لو تو میرے ساتھ چلنا۔ اس بار بوا نے جس لڑکی کا بتایا ہے وہ اچھے لوگ لگ رہے ہیں لڑکی بھی بہت خوب صورت ہے۔"

"آپ نے دیکھ لی لڑکی؟" بشریٰ نے کچھ الجھنے سے پوچھا۔

"نہیں! تمہارے بغیر تو نہیں دیکھ سکتی تھی نا۔ تصویر دکھائی تھی بوا نے۔ اچھی خاصی خوش شکل لڑکی ہے اور تو اور عمران کا بھی دل ٹک سا گیا تصویر دیکھ کر۔" وہ خوش ہو کر بولیں۔

"چلیں، یہ تو اچھا ہو گیا، میں فارغ ہوتی ہوں تو پھر چکر لگا آئیں گے اور ان لوگوں سے کہیے گا کہ زیادہ اہتمام نہ کریں۔ اچھا نہیں لگتا کہ صرف جا کر دیکھنا ہوتا ہے لڑکی کو اور اتنی مدارت کرائیں۔"

"لو یہ تو دنیا کا دستور ہے وہ الگ کرتے ہیں یاد نہیں تمہاری بار مجھے بھی ہر بار یونہی میز بھر کر سجانا پڑتی تھی میں نے تو کبھی ناک منہ نہ چڑھایا اور نہ کسی لڑکے والے نے منع کیا تو پھر ہم کیوں کریں ایسا۔"

بشریٰ تاسف بھری نظروں سے ماں کو دیکھ کر خاموشی سے باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

فاروق صاحب ٹیرس پر بیٹھے کوئی کتاب پڑھ رہے تھے۔ ان کے کمرے میں کتاب کی بڑی بڑی دو الماریاں تھیں گورنمنٹ سروس میں رہنے کے باوجود انہیں کتاب بینی کا خصوصی شوق تھا۔

"ابا جی! کھانا تو کھا لیں آکر۔ کافی ٹائم ہو گیا ہے اب تو۔" عاصمہ اندر آکر نرمی سے مسکرا کر بولی۔

انہوں نے مسکرا کر کتاب بند کرتے ہوئے عینک اتاری۔

"آج تو جیسے ہر ذمہ داری سے آزاد ہو کر ہلکا پھلکا ہو گیا ہوں میں اور دل چاہ رہا ہے کسی بھی روٹین کی پابندی نہ کی جائے۔" وہ خوشی بھرے لہجے میں بولے۔

"ابا جی! کھانا تو آپ کو کھانا ہی پڑے گا کیونکہ عفان کو آپ جانتے ہیں، وہ آپ کے بغیر ایک لقمہ نہیں لیں گے اور بچے بھی انتظار میں بیٹھے ہیں اب آپ آ ہی جائیں۔" عاصمہ ان کے ہاتھ سے کتاب لے کر الماری میں رکھتے

ہوئے بولی۔

"عاصمہ بیٹی! اسے الماری میں نہیں رکھو۔ میرے بیڈ کے سرہانے رکھو، بہت دلچسپ کتاب ہے، رات میں یہی پڑھوں گا۔" وہ اسے ٹوک کر بولے۔

"میں سوچ رہا تھا۔ گاؤں کا ایک چکر لگا آؤں۔"

"وہ کس لیے۔ ابھی تو موسم خاصا سرد ہے۔" عاصمہ بولی۔

وہ جیسے وجہ بتانے کے لیے کچھ سوچنے لگے۔

"مجھے اسلم بھائی کا فون آیا تھا۔ ہماری زرعی زمین پچھلے دو سالوں سے سیم و تھور کا شکار ہو کر رہ گئی ہے بلکہ بے کار ہی سمجھو۔ وہ چاہ رہا تھا میں ایک چکر لگا لوں گاؤں کا، سڑک کے نزدیک ہونے کی وجہ سے اس زمین کے اچھے دام مل سکتے ہیں۔" وہ سوچ سوچ کر بولے۔

"تو آپ زمین بیچ دیں گے؟" عاصمہ کچھ حیرانی سے بولی۔ فاروق صاحب کو اپنی اس آبائی زمین سے بہت پیار تھا۔

"بیٹا! گورنمنٹ سروس میں رہتے ہوئے کوشش کے باوجود میں تم لوگوں کے لیے اپنا گھر نہیں بنا سکا۔ اب عفان کی جاب بھی کچھ اتنی شان دار نہیں کہ وہ یہ کام کر لے پھر ماشاء اللہ سے بچوں کے اخراجات ہیں اور مہنگائی دن بدن کم ہونے کے بجائے بڑھتی جا رہی ہے۔ ایسے میں گھر کہاں چلے گا اور یہ کرائے کا گھر جیسے یکم تاریخ بھاگی چلی آتی ہے۔"

وہ رک رک کر گہری آواز میں بول رہے تھے۔

عاصمہ کو شک ہوا جیسے انہوں نے عاصمہ اور عفان کی ٹینشن والی بات سن لی ہو۔

"یوں بھی وہ بنجر زمین تین چار سالوں سے ہمیں کچھ نہیں دے رہی بلکہ مجھے اسلم بھائی کہہ رہے تھے کہ کوئی خانہ بدوش کنبہ اس پر خیمے گاڑے پچھلے دو ماہ سے بیٹھا ہے، یہ نہ ہو کہ قبضہ ہی ہو جائے۔" وہ اٹھتے ہوئے بولے۔

اپنے گھر کی حسرت تو کوئی عاصمہ کے دل سے پوچھتا۔

عفان تو اتنے سالوں سے اسے سوائے اگلے سال، اگلے سال کے دلاسے کے اور کچھ نہیں دے سکا تھا مگر ابا جی جتنے مزاج اور طبیعت کے اچھے تھے۔ دل کے بھی اتنے ہی اچھے تھے بلکہ عاصمہ کے مزاج اور خواہش کو جتنا وہ سمجھتے تھے، اتنا تو عفان بھی نہ سمجھ سکا تھا۔

"پھر تو ابا جی! آپ کو وہ زمین نکال ہی دینی چاہیے یہ نہ ہو کوئی قبضہ گروپ قابض ہو کر بیٹھ جائے تو پھر مسئلہ ہو جائے۔" وہ خوش ہو کر بولی۔

"میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔" وہ سر ہلا کر بولے۔

"اور ادھر بھی کسی ڈیلر سے کہہ چھوڑیں۔ کوئی اچھا سا گھر مناسب دام میں نظر میں رکھے۔" عاصمہ زیادہ دیر اپنے دل کی بے چینی کو چھپا نہیں سکی تھی بول پڑی۔

"جانتا ہوں۔ میری بیٹی کو اپنے گھر کی کتنی خواہش ہے بلکہ مجھے تو دکھ ہوتا ہے کہ ہم تمہیں اپنی چھت بھی نہ دے سکے۔ ہر لڑکی کے دل کی خوشی ہوتی ہے اور تم اتنے سالوں میں بھی اس سے محروم رہی ہو۔"

"اونہوں ابا جی! میں خوش ہوں بہت۔ آپ بہت اچھے ہیں، عفان اتنا خیال رکھتے ہیں۔ اللہ نے اتنے پیارے پیارے بچے دیے ہیں اور ایک آدھ کمی تو ہر ایک کی زندگی میں ہوتی ہی ہے نا۔ ان شاء اللہ وہ بھی دور ہو جائے گی آپ پریشان نہیں ہوں۔" وہ باپ جیسی شفقت رکھنے والے فاروق صاحب کو دیکھتے ہوئے نرمی سے بولی۔

"اللہ تمہیں خوش رکھے میری بچی! میں دو تین دن میں گاؤں جا رہا ہوں وہاں جو بھی صورت حال ہو گی، دیکھ کر

عفان کو بلا لوں گا اگر زمین کے اچھے دام مل رہے ہوئے تو پھر ہم دیر نہیں کریں گے اور واپس آتے ہی ان شاء اللہ گھر لے لیں گے۔ صبح ہی الیاس ایجنٹ سے گھر کے لیے بھی بولتا ہوں۔" وہ جلدی جلدی بولے جیسے انہیں یہ سب کہنے کے لیے اپنی ریٹائرمنٹ کے دن کا ہی انتظار تھا۔ عاصمہ کا دل لمحہ بھر کو خوف زدہ سا ہوا۔

"ابا جی یہ سب کچھ اتنی جلدی جلدی کرنا چاہ رہے ہیں۔ کہیں خدانخواستہ وہ ہم سے بچھڑنے والے تو نہیں.... اللہ نہ کرے۔" وہ خود ہی دہلتی باہر نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

"امی! مجھے تو حنا بہت پسند آئی ہے۔ اور عمران کے ساتھ جچے گی بھی خوب۔" بشریٰ عمران کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر بولی۔

ذکیہ تیز نظروں سے بشریٰ کو دیکھنے لگیں۔

"کیا ہوا امی ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں؟" بشریٰ کچھ ڈر کر بولی۔

"عمران تم سے کتنی محبت کرتا ہے۔ جانتی ہو ناں بشریٰ؟"

"امی!" بشریٰ پریشان ہو گئی۔

"قد دیکھا تھا تم نے اس حنا بیگم کا۔"

"امی! اتنا بھی چھوٹا نہیں تھا۔" بشریٰ دبے لہجے میں بولی جبکہ عمران کا یہ سنتے ہی موڈ آف سا ہو گیا تھا۔ اس نے ناگواری سے منہ ٹی وی کی طرف پھیر لیا تھا۔

"دیکھو بشریٰ! اب تم ڈنڈی مار رہی ہو۔ وہ ناٹی سی چھوٹی سی لڑکی بھلا کیا جچے گی اپنے عمران کے ساتھ۔ کہاں میرا گبھرو عمران اور کہاں وہ۔ بس رہنے دو۔ یوں تعریفیں کر کے میرا جی نہیں جلاؤ۔"

ذکیہ بیگم نے گویا بات ہی ختم کر دی۔

بشریٰ کو ایک دم سے ڈھیر سارا غصہ آگیا۔

"اب ایسی بھی کیا خود غرضی اگر ان کی اپنی بیٹی کا اللہ نے اچھی جگہ رشتہ کر دیا ہے تو وہ کسی اور کی بیٹی کا ہونے ہی نہیں دیں گی۔"

"امی! اگر آپ اس طرح لڑکیاں ریجیکٹ کرتی رہیں پھر تو خدانخواستہ عمران کی شادی کیسے ہو گی۔ میرا مطلب ہے۔"

"تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ میں اپنے بچے کا گھر نہیں بسانا چاہتی۔" وہ فوراً بولیں۔

"خدا کے لیے امی! اب میری بات کا الٹا سیدھا مطلب مت نکالیے گا دو تین سال سے ہم لڑکیاں دیکھ رہے ہیں اور سچی بات ہے مجھے تو اب آئے روز گھر گھر جا کر یوں لڑکیاں دیکھنا بہت برا لگ رہا ہے۔"

"تو ٹھیک ہے تم اگلی بار مت جانا۔ یہ بڑھیا جو ہے خوار ہونے کے لیے۔ گھٹنے گھسانے کے لیے۔" ذکیہ برا مان کر بولیں۔

بشریٰ بے بسی سے عمران کو دیکھ کر رہ گئی۔

"عمران! میں تمہارے لیے چائے لاؤں۔" وہ اٹھ کر جانے لگی تو اسے بے اختیار چکر سا آگیا۔ اس نے سنبھلنے کے لیے دیوار کا سہارا لیا۔

"کیا بات ہے بشریٰ! ٹھیک تو ہو ناں تم؟" ذکیہ دیکھ رہی تھیں۔ فوراً سے بولیں۔

"ٹھیک ہوں امی! ویسے ہی چکر سا آگیا تھا آپ پئیں گی چائے؟"

"تم رہنے دو میں آواز دیتی ہوں پروین کو، وہ بنا دے گی۔" ذکیہ نے اسے بیٹھنے کو کہا۔

"اور تم گئیں نہیں ڈاکٹر کو دکھانے۔ میں نے تمہیں اس روز بھی کہا تھا۔"

"امی! میں ٹھیک ہوں۔ یونہی ویک نیس ہے اور یہ مثال کہاں ہے عمران؟"

"کمرے میں گیم کھیل رہی تھی کمپیوٹر میں۔"

"میں پروین کو چائے کا کہہ کر آتی ہوں۔ خود سے تو اس پروین کو ہوش نہیں کہ آکر چائے پانی کا پوچھ لے کسی سے۔" ذکیہ بولتی ہوئی باہر نکل گئیں۔

بشریٰ عمران کو دیکھنے لگی۔

"عمران! تم امی کو سمجھاؤ نا۔" عمران کے متوجہ نہ ہونے پر اسے کہنا پڑا۔

"کیا... کیا سمجھاؤں؟" عمران چونک کر بولا۔

"اچھی بھلی تھی لڑکی جو ہم ابھی دیکھ کر آئے ہیں۔ پتا نہیں امی کسی ایک ذرا سی بات پر بھی کمپرومائز نہیں کر رہیں ایسے تو نہیں ہوتا کہ آدمی کو سب کچھ ہی مکمل اور بے عیب ملے۔" بشریٰ سمجھانے والے انداز میں بولی۔

"مگر آپی! اب امی بھی تو غلط نہیں ہیں نا!" عمران کچھ ناگواری سے بولا۔

"کیا مطلب؟"

"آپ ساتھ گئی تھیں۔ معلوم تو ہے آپ کو کہ لڑکی کا قد چھوٹا ہے تو پھر بھی۔" وہ جتا کر بولا تو بشریٰ کو بہت برا لگا اور وہ فوراً" کہہ بھی نہ سکی کہ اگر یہ سب مین میخ تمہاری بہن میں نکالی جاتی تو۔

"ایسا چھوٹا قد نہیں تھا حنا کا۔" وہ ذرا دیر بعد پھر سے ہمت نہ ہارتے ہوئے بولی۔

"آپی! میں سب کچھ برداشت کر سکتا ہوں مگر مجھ سے ٹھگنی لڑکیاں نہیں برداشت ہوتیں۔ ریئلی یوں جیسے زمین پر کچھ تلاش کر رہی ہوں ابھی جھک کر ڈھونڈنے لگیں اور پھر میرے ساتھ۔ آپ نے میری ہائیٹ کو دیکھا ہے نا.... سوری امی کا اوبجیکشن صحیح سا ہے۔"

عمران نے صفحہ ہی لپیٹ دیا۔ بشریٰ اپنے غصے کو دبا کر بیٹھ گئی۔

"مثال کو بلاؤ اور مجھے گھر چھوڑ آؤ۔" وہ کچھ دیر بعد بیزاری سے بولی۔

"رات کو چلی جایئے گا نا کھانا کھا کر۔" وہ بے نیازی سے بولا۔

"نہیں! میں گھر میں کہہ کر آئی تھی۔ شام میں آجاؤں گی۔ خواہ مخواہ امی ناراض ہوں گی۔ میں دیکھتی ہوں مثال کو۔" وہ اٹھ کر چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"عفان! مجھے یقین نہیں آرہا قسم سے۔" عاصمہ خوشی سے بے قابو ہوتے لہجے میں بولی۔

"بھئی ابھی تم اتنی خوش نہیں ہو، ابھی تو مجھے گاؤں جانے دو پھر وہاں جا کر پتا چلے گا کہ کتنے میں بھاؤ طے ہوا ہے زمین کا۔ کہیں ابا جی یوں ہی کوڑیوں کے مول تو نہیں پھینک رہے سب کچھ جبکہ وہ زمین سڑک کے کنارے ہے اب تو۔" عفان اپنا ضروری سامان سوٹ کیس میں رکھتے ہوئے بولا۔

"نہیں، ابا جی ایسے نا تجربہ کار تو نہیں اور پھر زمین داری کا جتنا تجربہ انہیں ہے۔ اتنا تو آپ کو بھی نہیں۔" عاصمہ وثوق سے بولی۔

"چلو دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔" عفان موضوع سمیٹتے ہوئے بولا۔

"ویسے بائی دا وے ہماری بیگم صاحبہ اتنی خوش کیوں ہیں اس زمین کے بکنے پر۔ پوچھ سکتا ہوں۔" عفان اسے

شوخ نظروں سے دیکھ کر بولا۔
"خیر یہ تو آپ جانتے ہیں۔ انجان بن رہے ہیں تو الگ بات ہے۔" وہ بھی کچھ شوخی سے بولی۔
"عاصمہ! میں بہت شرمندہ ہوں تم سے۔" عفان ایک دم سنجیدہ ہو کر بولا۔ عاصمہ کچھ پریشان سی ہو گئی۔
"کیا ہو گیا ہے عفان! سفر پر جاتے ہوئے ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں اور خدانخواستہ آپ مجھ سے کیوں شرمندہ ہونے لگے۔" وہ عفان کا ہاتھ تھام کر فکر مندی سے بولی۔ دونوں میں شادی کے اتنے سالوں بعد پیار و محبت کوئی جتانے والی چیز نہیں رہ گئی تھی مگر پھر بھی دونوں کے دل ایک ہی انداز میں سوچتے ایک ہی انداز میں دھڑکتے تھے اور دونوں کو اس کی خبر بھی تھی۔
"تمہیں شادی کے بارہ سالوں میں بھی اپنی چھت نہیں لے کر دے سکا۔" عفان گہری آواز میں بولا۔
"عفان پلیز۔ ایسی باتیں نہیں کریں۔ گھر تو وہ ہوتا ہے جس میں لوگ محبت سے پیار سے رہیں خواہ وہ اپنا ہو یا کرائے کا۔ اتنے سالوں میں آپ نے اباجی نے مجھے جتنی محبت، پیار، توجہ دی بیلقین جانیں۔ اس دوران تین بار گھر بدلے مجھے کبھی اس محرومی کا احساس نہیں ہوا۔ ہم سب اکٹھے ہیں ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔ ایک دوسرے کے احساسات کو سمجھتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر گھر کو جوڑنے والے اور کیا جذبات ہوتے ہیں۔" وہ جذباتی لہجے میں بولی۔ عفان اسے تشکر بھری نظروں سے دیکھ کر رہ گیا۔
"آپ نے ڈیلر سے گھر دیکھ رکھنے کے لیے کہہ دیا ہے نا؟" اسے پھر سے یاد آیا تو مشتاق لہجے میں پوچھنے لگی۔
"نگلی! اسلیے کچھ رقم ہاتھ میں تو آجائے پھر گھر بھی دیکھ لیں گے۔ پیسے جیب میں ہوں گے تو گھر تو ہم مہینہ بھر میں خرید لیں گے ان شاء اللہ!" عفان اسے پیار بھری نظروں سے دیکھ کر بولا۔
"پتا ہے عفان مجھے پرانے گھر، پرانی کوٹھیاں جن کے برآمدوں کے باہر بیلیں ہوں یا اونچے اونچے درخت بہت اچھے لگتے ہیں۔" وہ کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔
"پرانے گھر..... ہم کیا پرانا گھر خریدیں گے.... اور بھئی عورتوں کو تو چمکتی ٹائلوں اور پھسلتے پتھروں والے نئے گھر اچھے لگتے ہیں تمہاری الٹی منطق ہے۔" وہ ہنس کر بولا۔
"پتا ہے عفان! پرانے گھر دیکھ کر پتا چلتا ہے اس گھر کے مکین اس سے کتنی محبت کرتے ہیں کہ وہ اسے بیچنے کا ارادہ نہیں رکھتے اور ان کے گھر کے پتے بھی بار بار نہیں بدلتے۔" وہ آنکھوں میں آتی نمی کو صاف چھپا کر بولی۔
عفان اسے دیکھ کر رہ گیا۔
"اور ابھی تم کہہ رہی تھیں کہ کرائے کے گھر بدلنے سے تمہیں کچھ فرق نہیں پڑتا۔" وہ اس کے کندھوں پر ہاتھ جما کر بولا۔
"آپ کو دیر نہیں ہو رہی، اباجی انتظار کر رہے ہوں گے۔" وہ کچھ جھینپ کر بولی۔ وہ اسے محبت بھری نظروں سے دیکھتا رہا۔
"بچوں کا بہت خیال رکھنا عاصمہ!" وہ اسے دیکھتے ہوئے بولا۔
"آپ صرف تین دن کے لیے جا رہے ہیں، خدانخواستہ سال بھر کے لیے تو نہیں۔" وہ جتا کر بولی۔
"کیوں تمہیں اچھا نہیں لگ رہا کہ ہم اتنے عرصے کے بعد یوں فرصت سے ایک دوسرے کے اتنے پاس کھڑے ہیں۔" وہ اسی طرح بہت مشتاق نظروں سے اسے دیکھے جا رہا تھا۔
"ماشاء اللہ کیا فرصت ہے جناب کو سفر پر روانہ ہونا ہے۔ بھول رہے ہیں۔" عاصمہ چھیڑ کر بولی۔
"ہاں یار! نکلتا ہوں اب ورنہ راستے میں رات ہو جائے گی کافی۔ اباجی نے تاکید سے کہا تھا کہ دن کی روشنی میں گاؤں آجاؤں تو اچھا ہے۔" عفان کو بھی دیر ہو جانے کا احساس ہوا تو گہرا سانس لے کر سوٹ کیس اٹھا کر باہر کی

طرف چل پڑا۔
عاصمہ بھی اس کے ساتھ باہر کی طرف بڑھ گئی۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ عاصمہ دروازے سے باہر دور تک انہیں جاتا دیکھتی رہی۔

☼ ☼ ☼

"فوزیہ! ایسے کیوں پڑی ہو اور یہ تصویریں یوں کیوں پھینک رکھی ہیں سنبھال کر انہیں البم میں لگا دینا تھا نا۔" نسیم کمرے میں آئیں تو فوزیہ کو بیڈ پر آڑے ترچھے لیٹے دیکھ کر کچھ خفگی سے بولیں۔
نکاح کی تصویریں بستر پر ادھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔ وہ ایک ایک کر کے تصویریں اکٹھا کرنے لگیں۔
فوزیہ اسی طرح بے حس پڑی رہی۔
"کیا ہوا ایسے کیوں لیٹی ہو؟" نسیم کچھ تشویش سے بولیں۔
"یونہی!" فوزیہ بے دلی سے بولی۔
نسیم کچھ جانچتی نظروں سے بیٹی کو دیکھنے لگیں اور پھر تصویریں ایک ایک کر کے دیکھنے لگیں۔
"میری بیٹی حور لگ رہی ہے۔" وہ پیار سے تصویریں دیکھ کر بولیں۔
"حور کی بغل میں لنگور۔" فوزیہ اونچی آواز میں بڑبڑائی۔
نسیم بیگم بری طرح سے چونک کر اسے دیکھنے لگیں۔
"کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ ایسے کیوں بول رہی ہو۔" وہ کچھ ناراضی سے بولیں "اچھی بھلی تو ہیں۔ ماشاء اللہ ظہیر اچھا تو لگ رہا ہے اتنا۔"
"انکل ظہیر بولیں تو زیادہ صحیح رہے گا۔" فوزیہ بھرآئے ہوئے لہجے میں جیسے پھٹ کر بولی۔
نسیم بیگم جیسے بری طرح سے چونکیں۔
"کیا بک رہی ہو۔" غصے میں یہی نکل سکا منہ سے۔
"میں نہیں۔ وہ ارم کہہ کر گئی ہے۔ خوب میرا ریکارڈ لگا رہی تھی اور مذاق بھی۔"
"دماغ خراب ہو گیا ہے اس ارم کی بچی کا۔ خود کا تین جگہ رشتہ ٹوٹ چکا ہے ہو ہو کر..... ایسی حور تھی تو اس کے نصیب میں تو یہ ماڈل بھی نہ ہوا..... اے فوزیہ تو ایسے کچے کانوں کی کب سے ہونے لگی؟ جو جس نے کہا مان کر دل برا کر کے بیٹھ گئی۔ پاگل ہوئی ہے کیا۔ میری طرف دیکھ ذرا۔" نسیم اس کی دلجوئی کرنے کو آخر میں ذرا نرم لہجے میں بولیں۔
"امی! اس وقت مجھے کوئی بات نہیں کرنی۔ بس آپ جائیں۔" فوزیہ ماں کا ہاتھ جھٹک کر بولی۔
نسیم کا جی تو چاہا کھینچ کر اسے ایک تھپڑ لگائیں۔ خدا خدا کر کے تو بیٹی کو رخصت کرنے کی کوئی صورت بنی تھی اور یہ ناشکری؟
"پاگل ہو گئی ہے کیا اور تو اتنا بھی نہیں سمجھتی کمبخت! وہ جلتی ہے تجھ سے، اور وہ رشتے والی نسرین بتا رہی تھی مجھے کہ اس نے تو ارم کی ماں کو صاف جواب دے دیا ہے کہ اب وہ ارم کے لیے کوئی رشتہ نہیں لائے گی۔ سارے میں تو مشہور ہو گئی ہے۔ اس کی تین بار منگنی ٹوٹ چکی ہے اب وہ دل کے پھپھولے یہ تصویریں دیکھ کر نہیں پھوڑے گی تو اور کیا کرے گی اور تو اس کی باتوں میں آگئی ہے۔" نسیم بولتے ہی بیٹی کو بہلانے لگیں فوزیہ اس بار کچھ نہ بولی۔ یوں جیسے ماں کی بات اس کے دل کو لگی ہو۔
اس نے سیدھے ہو کر ماں کو دیکھا۔

تصویریں اس کے آگے کرتے پھر سے دکھاتے ہوئے نسیم کی آنکھوں میں فخر سا تھا۔

"دیکھ تو کیسے چاند سورج کی جوڑی ہے، جو دیکھے گا کمبخت حسد حرص سے جل مرے گا بڑی ہی ناشکری ہے فوزیہ تُو۔۔۔" نسیم بیٹی کو سمجھاتے ہوئے اس کے جذباتی پن کو نشانہ بنا رہی تھیں۔

کن اکھیوں سے تصویروں کو دیکھتی فوزیہ کو بھی ظہیر اتنی عمر کا تو نہیں لگا جتنا کمبخت یہ ارم بول رہی تھی۔

"انہیں ترتیب سے البم میں رکھ اور اب کوئی ضرورت نہیں ان حسد کی ماری سہیلیوں کو دکھانے کی۔ ایسا مہنگا جوڑا۔ اتنا اچھا سونے کا بھاری سیٹ نکاح میں اتنا کچھ لے آئے سسرال والے تو کیا شادی میں کم کریں گے اب نہ کوئی الٹی سیدھی بات سوچنا۔ میں دیکھوں جا کر کچن میں بشریٰ نے کھانا بنا لیا یا نواب زادی پلنگ توڑ رہی ہے۔" وہ کہتے ہوئے باہر نکل گئیں فوزیہ بڑے پیار سے تصویریں البم میں لگانے لگی اور رک رک کر بار بار ظہیر کی تصویروں کی طرف بھی دیکھتی جاتی تھی، خود بخود اس کے دل میں انوکھے جذبے بیدار ہونے لگے تھے۔

☼ ☼ ☼

"ارے صحیح کہہ رہے ہیں آپ!" بشریٰ بے یقینی سے عدیل کی طرف دیکھنے لگی۔

"تو اب اس میں جھوٹ کیا ہوگا بھلا۔" وہ دل نشیں مسکراہٹ سے بولا۔

"کتنے دنوں کے لیے جائیں گے؟" بشریٰ خوش ہو کر بولی۔

"ایک ہفتے کے لیے۔" عدیل مسکرا کر بولا۔

"ریلی! مجھے ابھی بھی یقین نہیں آ رہا عدیل!" وہ بے تحاشا خوش تھی۔

"یار! لگی بندھی روٹین سے دل بیزار ہو گیا تھا۔ بس کافی دنوں سے دل چاہ رہا تھا کہ کہیں آؤٹنگ پر چلا جائے۔ مثال کے ایگزام بھی ہو گئے ہیں فوزیہ کا مسئلہ بھی حل سمجھو، دو تین ماہ میں اس کی شادی ہو جائے گی تو پھر ہمارا نکلنا بہت مشکل ہو جائے گا گھر سے۔"

"آپ کتنے اچھے ہیں عدیل!" وہ بہت خوش تھی۔ اتنے عرصے کے بعد وہ دونوں اکٹھے کہیں آؤٹ اسٹیشن جا رہے تھے۔

"امی مان جائیں گی؟" اسے وسوسہ ستایا۔

"میں نے ان سے بات کر لی ہے۔"

"کیا۔۔۔ واقعی؟" عدیل تو اسے آج حیران ہی کیے جا رہا تھا۔

"ہاں یار! میں نے یہی سوچا تھا کہ میں تمہیں سرپرائز بعد میں دوں گا اور اس سرپرائز کا مزہ بھی تب ہی آتا جب امی سے میں اجازت لے چکا ہوتا ورنہ ان کے انکار پر تو کوئی فائدہ نہیں تھا تمہیں بتانے کا۔ خوامخواہ ہم دونوں میں جھگڑا ہو جاتا۔" عدیل اسے تفصیل بتانے لگا۔

"ارے واہ! آپ تو بہت عقل مند ہو گئے ہیں۔" وہ خوش ہو کر بولی۔

"دیکھ لو، پھر بھی تم کہتی ہو کہ مجھے تمہارا خیال نہیں۔"

"عدیل! کبھی کبھی مجھے ڈر لگتا ہے۔" وہ رک کر بولی۔

"اب کس بات سے ڈر لگتا ہے، میں تو سمجھ رہا تھا، آج کل تم سے زیادہ خوش اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔"

"کیا مطلب۔۔۔ وہ کس لیے؟" بشریٰ نا سمجھی سے بولی۔

"بھئی فوزیہ کا رشتہ ہو جانے سے تم جتنی خوش ہو، اتنی تو شاید فوزیہ بھی نہیں ہوگی۔" وہ اسے چھیڑ کر بولا۔

"آپ جو مرضی آج بول لیں، میرا لڑنے کا کوئی موڈ نہیں ہے۔" عدیل اس کی بات پر ہنس پڑا۔

بشریٰ محبت پاش نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ اتنے دنوں بعد دونوں اتنے خوشگوار موڈ میں یوں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

درمیان میں سوئی مثال نے باپ کے قہقہے کی آواز پر ذرا سی آنکھیں کھول کر دونوں کو دیکھا۔ انہیں خوش دیکھ کر پھر سے آنکھیں موندتے ہوئے عدیل کی کمر کے گرد اپنے بازو لپیٹ دیے۔

وہ بھی اسے جھک کر پیار کرنے لگا۔

"اور مثال کتنا خوش ہوگی جب صبح صبح اسے پتا چلے گا کہ ہم اسلام آباد اور مری جا رہے ہیں۔" بشریٰ بیٹی کو دیکھ کر بولی۔

"اور تم مجھ سے شرط لگا لو، یہ دادی اماں ابھی بھی جاگ رہی ہے۔"

"جی نہیں، مثال سو رہی ہے۔" بشریٰ اسے سوتے دیکھ کر بولی۔

"مثال جاگ رہی ہے جانو! آپ جاگ رہی ہو نا!"

"نہیں بابا۔۔۔ میں سو رہی ہوں۔" وہ اسی طرح آنکھیں بند کیے بولی تو دونوں ہنس پڑے۔

"اور پلیز، تم کل تک ساری پیکنگ کر لینا پرسوں ارلی مارننگ ہمیں نکلنا ہے، مطلب رات کو جلدی سونا ہے۔" عدیل اسے تاکید کرتے بولا۔

"عدیل! مجھے اپنی اور مثال کی تھوڑی بہت شاپنگ تو کرنا ہوگی۔ ادھر تو آج کل سنو فال ہو رہی ہے نا۔"

"میں شام میں آؤں گا آفس سے تو لے چلوں گا شاپنگ کے لیے۔ تم باقی کی پیکنگ کر لینا۔"

"ہاں! وہ میں کر لوں گی اس کی آپ فکر نہ کریں۔"

"بشریٰ! وہ عمران کے رشتے کا کیا بنا بھئی۔ تم تو لڑکی کو پسند کر آئی تھیں نا۔"

"ہوں کچھ بھی نہیں امی اور عمران کو لڑکی کا قد چھوٹا لگا۔" بشریٰ کچھ افسردگی سے بولی۔

"اور مجھے بالکل اچھا نہیں لگا۔ پتا نہیں کیوں پہلے لوگ مجھے ریجیکٹ کرتے تھے تو امی بہت دکھی ہوتی تھیں مگر اب بیٹے کے لیے وہ دوہرا معیار اپنائے ہوئے ہیں۔ بہت دل برا ہوا میرا اس بار شاید اس لیے کہ میں خود ایک بیٹی کی ماں ہوں۔" وہ مثال کو پیار کرتے ہوئے افسردگی سے بولی۔

"ہماری مثال کی قسمت تو ان شاء اللہ اتنی خوب صورت ہوگی کہ لوگ مثال دیں گے کہ ان کی بیٹیوں کی قسمت بھی مثال جیسی ہو۔" عدیل فخر سے بولا تو بشریٰ نے آہستگی سے آمین کہتے ہوئے ایک بار پھر گہری نیند سوتی مثال کو پیار کیا۔

دونوں اس کی نیند خراب نہ ہونے کے خیال سے آہستہ آواز میں باتیں کرنے لگے۔

☼ ☼ ☼

"مبارک ہو عاصمہ! زمین کا سودا ہو گیا ہے اور ہمیں کل پیمنٹ ہو جائے گی۔" عفان نے فون پر عاصمہ کو خوش خبری سنائی تو اسے جیسے اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں آیا۔

"آپ سچ کہہ رہے ہیں عفان؟"

"لو ابا جی سے خود بات کر لو۔ تمہیں یقین آ جائے گا پھر تو۔"

عفان نے فون ابا جی کو تھما دیا۔

اور عاصمہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مارے خوشی کے اس سے کچھ بولا ہی نہ گیا۔

ابا جی نے خود ہی اسے سب کچھ بتا کر فون بند کر دیا۔

اور وہ کتنی دیر تک اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرتی رہی۔

"اب ہمارا اپنا ایک ذاتی گھر ہو گا۔ میرا اپنا گھر۔ میرے بچوں کا گھر۔۔۔ گھر کے باہر میں خوب صورت سی نیم پلیٹ لگواؤں گی جس پر اباجی کا اور عفان کا نام لکھا ہو گا اور نیچے چھوٹا سا واثق بھی لکھا ہو گا۔"

سوچتے ہوئے اس کی آنکھوں میں خوامخواہ آنسو آئے چلے جا رہے تھے۔ وہ بار بار آنکھیں صاف کر رہی تھی۔

"مما! کیوں رو رہی ہیں آپ؟" واثق ابھی کرکٹ کھیل کر آیا تھا' ماں کو روتے دیکھ کر پریشان سا ہو گیا۔

"میری جان! یہ تو خوشی کے آنسو ہیں۔" وہ بے اختیار واثق کو ساتھ لپٹا کر بولی۔

"کیا مطلب؟" وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکا۔

"تمہارے دادا کی زمین تھی نا۔ اس کا سودا ہو گیا ہے۔" وہ خوشی سے کانپتی آواز میں بولی۔

"تو پھر۔۔۔ کیا ملا؟" وہ ابھی بھی کچھ نہیں سمجھ سکا تھا۔

"میری جان! اب ہم اپنا گھر لیں گے۔ اپنا خوب صورت سا گھر جس میں تم لوگوں کا الگ سے کمرہ ہو گا اور کھیلنے کے لیے کھلا صحن اور۔۔۔ اور بہت سے پھول پودے اور درخت ہم مل کر لگائیں گے۔" وہ پھر سے رونے لگی تھی۔

"تو مما! آپ رو کیوں رہی ہیں؟" واثق ابھی بھی پریشان تھا۔

"بالکل بھی نہیں۔ میں تو ہنس رہی ہوں۔" وہ روتے ہوئے ہنسنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"امی میں عدیل کے ساتھ ذرا شاپنگ کے لیے جا رہی تھی۔" بشریٰ تیار حلیے میں بولتی ہوئی لاؤنج میں داخل ہوئی اور بے اختیار ٹھٹک کر رک گئی۔

سامنے فوزیہ کی ساس زاہدہ بہت بے تکلف انداز میں صوفے پہ آلتی پالتی مارے بیٹھی تھیں اور نسیم بیگم سے خوش گوار موڈ میں باتیں کر رہی تھیں۔

بشریٰ کو اس لمحے شاپنگ پر جانے کا معاملہ کھٹائی میں پڑتا نظر آنے لگا۔ اس نے ست لہجے میں سلام کیا اور صوفے کے کنارے ٹک کر بیٹھ گئی۔ زاہدہ اس کا خوب تنقیدی نظروں سے جائزہ لے رہی تھیں جن میں طنز اور تضحیک کا عنصر زیادہ نمایاں تھا۔ بشریٰ کو خوامخواہ اپنی ہتک کا احساس ہونے لگا۔

"کچھ چائے وغیرہ لے آؤ پہلے زاہدہ بہن کے لیے پھر چلی جانا۔" نسیم بیگم نے حتی الامکان لہجے کو میٹھا بنانے کی کوشش میں کامیاب رہیں۔

"کسی خاص شاپنگ کے لیے جا رہی ہے بہن! آپ کی بہو؟" زاہدہ نے بطور خاص بہن پر زور دے کر پوچھا۔

"ہاں وہ صبح عدیل اور بشریٰ اسلام آباد اور مری جا رہے ہیں نا عدیل کو اسلام آباد میں آفس کا کوئی کام تھا تو سوچا بیوی بچوں کو ساتھ لے جائے۔"

نسیم نے وضاحت سے جواب دیا اگرچہ بشریٰ کو یہ اچھا نہیں لگا کہ اتنی تفصیل سے محترمہ کو آگاہ کیا جائے۔

"بچوں کو۔۔۔ کتنے بچے ہیں خیر سے عدیل میاں کے؟" زاہدہ ہونٹوں کو گول کر کے بولیں۔

"کتنی فسادی عورت ہے؟" بشریٰ دل میں تلملائی۔

"کہاں بہن! ایک بچی ہے۔ آٹھ سالوں میں بہو بیگم نے ایک پوتی دے کر ہری جھنڈی دکھا دی ہے۔" نسیم بیگم کی دکھتی رگ پر اس عورت نے کس ہوشیاری سے ہاتھ رکھا تھا۔

"کیوں خدا نخواستہ کوئی مسئلہ ہے؟" وہ بھولپن سے پوچھنے لگیں۔

"اللہ جانے۔ علاج تو بہت کرائے مگر ڈاکٹرز کہتے ہیں دونوں ٹھیک ہیں۔ بس اللہ کی طرف سے دیر ہے۔" نسیم

بیگم نے سرد آہ بھر کر نظریں بشریٰ پر جمائیں۔

"چچ چچ۔۔۔ پھر تو صاف جادو ٹونے کا معاملہ لگتا ہے۔" زاہدہ لہجے میں مقدور بھر ہمدردی سمو کر بولیں۔

"اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہم تو سمجھیں ناامید ہو چلے اب تو۔" نسیم بیگم کچھ بے زاری سے بولی تھیں۔ بشریٰ کو بہت برا لگا۔

"میں جاؤں پھر امی؟" وہ اور نہیں بیٹھ سکی۔

"کھانا ناں کچھ کھانے پینے کو تو لے آؤ پھر چلی جانا۔ واپسی تو تم لوگوں کی یوں بھی رات سے پہلے کہاں ہو گی؟" نسیم اب کے لحاظ مروت ہٹا کر بولیں۔

"جی میں لاتی ہوں۔" وہ مرے ہوئے لہجے میں کہہ کر جانے لگی۔

"بیٹی! برا نہیں ماننا۔ ساس بھی ماں کے برابر ہوتی ہے۔ اس کا کہا تو یوں بھی حق جانو کہ وہ تمہارے شوہر کی ماں ہوتی ہے۔ شوہر جسے خدا نے بھی مجازی خدا کہا ہے۔ خدا کے بعد اگر جسے سجدے کا حکم دیا جا سکتا تھا۔ اس عورت کی اطاعت اور فرماں برداری میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھنی چاہیے۔

بہن! میں ذرا پرانے خیالات کی ہوں۔ جی توڑ کر میں نے اپنی ساس کی خدمت کی تھی۔ بستر پر لٹا کر اسے چھ سال سمجھو ہاتھوں پر اٹھائے رکھا تھا۔ میں نے تو خوامخواہ آج کل کی لڑکیوں کو ساس سے ایسے اکھڑے لہجے میں بات کرتے دیکھتی ہوں تو بہت دل دکھ سا جاتا ہے۔" وہ بولے بغیر رہ نہیں سکی تھیں۔

بشریٰ کا جی چاہا اس فراڈ عورت کو یہیں کھڑے کھڑے چھ آٹھ اچھی اچھی سنائے جو کس صفائی سے دوسروں کو بے وقوف بنا رہی تھی۔

"نہیں بہن! آپ کچھ غلط نہیں۔ اصل میں تو آج کل ماؤں کی تربیت ہی کچھ ایسی ہے۔ بیٹیوں کو اگلے گھروں کے بارے میں تو کچھ بتاتی نہیں' صرف ادب تمیز اپنے ماں باپ کے لیے ہوتی ہے ان لڑکیوں کی نظر میں۔ خیر ہمیں تو عادت ہو گئی ہے اب سب کچھ برداشت کرنے کی۔"

نسیم بیگم یوں ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں جیسے پتا نہیں بہو کے ہاتھوں کتنے جبر سہہ چکی ہیں۔

"میری فوزیہ کی گھٹی میں اللہ کے فضل سے ایسا ادب تمیز لحاظ بھرا ہے۔ میں تو میں محلے کی کوئی خالہ جان بھی آجائے تو اس کے آگے بھی ایسے بچھی جاتی ہے۔ بہت ہی عاجزی ہے میری فوزیہ کی طبیعت میں۔"

اب بشریٰ سے مزید رکنا محال ہو گیا۔ وہ کچھ بھی کہے بغیر خاموشی سے باہر نکل آئی۔

"ویسے بہن! برا نہیں ماننا۔ شادی کے آٹھ سال بعد بھلا کیا تک بنتی ہے ہنی مون پہ جانے کی۔" بشریٰ کے قدم اس عورت کی بات پر وہیں رک گئے۔

"ہنی مون؟" بے چاری نسیم بشریٰ کی نظر میں کتنی بھی تیز طرار تھیں' مگر زاہدہ کے آگے اس وقت وہ بھی پانی بھرتی نظر آئیں۔

"اور نہیں تو کیا؟"

"میں سمجھی نہیں۔۔۔ وہ تو عدیل کو دفتر کا کام تھا تو۔۔۔" نسیم بیگم نے پھر سے وہ سبق دہرانا چاہا۔

"اے بہن! بہت ہی سادہ ہیں آپ تو' سچ جھوٹ کو نہیں پرکھ سکیں۔"

نسیم بیگم کچھ بول ہی نہ سکیں۔

"سب ڈراما ہے دفتر کے کام کا' مجھ سے لکھوا لو۔ دونوں نے مل کر گھومنے پھرنے کا پروگرام پہلے سے بنا رکھا تھا۔ دفتری کام کا بہانہ بنا کر تمہیں بس بے وقوف بنا رہے ہو اور کچھ بھی نہیں۔"

"ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے اس رشتے داری کو قائم ہوئے اور۔۔۔ فسادی عورت۔۔۔ فوزیہ بی بی! تم اپنی

خیر مناؤ۔" بشریٰ مڑ کر جانے لگی۔

"اور دیکھو بہن! کل کو تم نے بیٹی بیاہنی ہے پھر اس کے لیے کتنے اخراجات ہوتے ہیں' بہو بیٹا یوں سیر سپاٹوں پر رقمیں اڑاتے رہے تو آخر میں تمہیں ہی پریشان ہونا پڑے گا۔" وہ تو جیسے آج بشریٰ اور عدیل کا سیر سپاٹا منسوخ کرا کے ہی جانے والی تھیں۔

"اور صاف کہوں بہن! " تم نے اپنی بہو اور بیٹے کو بہت چھوٹ دے رکھی ہے۔ تمہارا عدیل تو اس بشریٰ کی مٹھی میں ہے' کل کو فوزیہ بیٹی اپنے گھر چلی جائے گی تو سوچو' یہ بشریٰ کیا تمہیں عزت دے گی اس گھر میں؟"

"ہاں! یہ تو میں بھی جب سوچتی ہوں تو کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ کیا کروں آخر میں تو اپنا راج پاٹ گھر بار سب کچھ ان غیر لڑکیوں کو سونپنا ہی پڑتا ہے۔" نسیم بیگم گلوگیر آواز میں بولیں۔

"طریقے اور ہوشیاری سے چلو تو بہت کچھ اپنے پاس رکھ کر انہیں قابو میں رکھا جا سکتا ہے۔"

"کیسے زاہدہ بہن!" نسیم بیگم ہوشیار ہو کر بولیں۔

"بہت سادہ ہیں نسیم بہن آپ۔۔۔ سنیے۔" وہ آہستہ آواز میں نسیم بیگم سے کچھ کہنے لگیں تو بشریٰ غصے میں پیر پٹختی وہاں سے چلی گئی۔

فوزیہ کو اپنی ساس کو چائے دینے کا کہہ کر وہ عدیل کے ساتھ خود ہی گھر سے نکل آئی۔

☼ ☼ ☼

"بھاڑ میں جائے منحوس عورت۔ میں کیوں اس کی خاطر مدارت کروں۔ ایسی مکار عورتیں کسی عزت کے لائق نہیں ہوتیں۔" وہ گاڑی میں بیٹھ کر بھی کڑھتی رہی۔

"مما! آپ کو غصہ آرہا ہے۔" مثال پیچھے سے اس پر جھک کر بولی۔ بشریٰ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"بھئی سوری! میں تو ٹائم پر نکل آیا تھا آفس سے مگر رستے میں اتنا رش تھا اور تمہارے سامنے میں تو اندر ہی نہیں آیا کہ مزید لیٹ نہ ہو جائیں' پھر بھی تمہارا موڈ آف ہے۔" وہ صفائی دیتے ہوئے بولا۔

"نہیں! موڈ کب آف ہے۔ وہ فوزیہ کی ساس آگئی تھیں۔" اسے بتانا ہی پڑا۔

"کیا۔۔۔ اور تم نے مجھے بتایا بھی نہیں۔" عدیل ایک دم پریشان سا ہو گیا۔ "امی ناراض ہوں گی کہ میں ان سے ملے بغیر باہر ہی سے تمہیں لے کر چلا آیا۔"

"نہیں ہوں گی۔ امی کو بتا آئی تھی۔" بشریٰ جلدی سے بولی کہ کہیں عدیل واپسی کے لیے گاڑی نہ موڑ لے۔

"اور یوں بھی وہ تھوڑی دیر کے لیے آئی تھیں۔ زیادہ بیٹھیں گی نہیں۔" بشریٰ عدیل کے سنجیدہ چہرے کو دیکھ کر پھر سے بولی۔

"یار! تمہیں مجھے اندر تو آنے دینا تھا۔ کوئی مسئلہ نہ ہو جائے۔" عدیل کو نئی فکر ستانے لگی۔

"کچھ نہیں ہوتا نا' میں مل تو آئی تھی ان سے اور انہیں بتا بھی آئی تھی کہ ہم جا رہے ہیں اور ہمیں دیر بھی ہو چکی ہے۔" بشریٰ دل میں پچھتا رہی تھی کہ عدیل کو کیوں بتایا۔

"عدیل! صبح ہم کتنے بجے نکلیں' جانے کے لیے۔" اس نے عدیل کا دھیان بٹانا چاہا۔ وہ کچھ دیر بول ہی نہیں سکا۔

"یوں کریں لعنت بھیجیں شاپنگ پر' گھر واپس چلتے ہیں۔ پہلے آپ اچھی طرح ان خاتون سے مل لیں۔ کورنش بجا لائیں۔ پھر اگر ٹائم بچا تو شاپنگ کے لیے نکل چلیں گے۔ یوں بھی شاپنگ کچھ اتنی ضروری نہیں ہے۔ چلیں واپس۔" بشریٰ کو بھی ایک دم سے غصہ آگیا۔

"ہم واپس جا رہے ہیں گھر ماما؟" مثال فوراً بے چین ہو کر بولی۔

"تم چپ کر کے بیٹھو۔" بشریٰ نے اسے بھی جھڑک دیا۔

وہ سہم کر آرام سے بیٹھ گئی۔

"اس کو خوامخواہ کیوں جھڑک رہی ہو۔" عدیل خفگی سے بولا۔

"آپ واپس چلیں بس۔" وہ ہٹیلے پن سے بولی۔ پہلے اس عورت نے بکواس کر کے موڈ خراب کیا اور اب یہ عدیل۔ اسے جیسے رونا ہی آنے لگا تھا۔

"اچھا خوامخواہ موڈ خراب کرنے کی ضرورت نہیں۔ کوئی نہیں واپس جا رہا۔ میں گھر جا کر امی سے بات کر لوں گا۔ یوں بھی ہم نے کون سی لمبی چوڑی شاپنگ کرنی ہے۔ وقت پر گھر پہنچ جائیں گے۔ موڈ ٹھیک کر و اپنا پلیز۔" عدیل اس کے پھولے ہوئے چہرے کو دیکھ کر قدرے نرمی سے بولا۔

"ٹھیک ہے میرا موڈ مگر عدیل! بہتر ہے' ہم گھر واپس چلیں۔"

وہ پھر بولی۔ عدیل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔

☼ ☼ ☼

"امی! یوں سمجھیں ہماری کوئی نیکی کام آگئی' جو اللہ نے ہمیں ظہیر اور اس کی ماں سے بچالیا۔"

واپسی پر عدیل کے نہ ماننے کے باوجود بشریٰ اصرار کر کے ذکیہ سے ملنے کے لیے آگئی تھی۔

"عدیل سفر پر جانے سے پہلے میں کم از کم امی سے کھڑے کھڑے تو مل لوں۔ یقین کریں زیادہ ٹائم نہیں لگاؤں گی۔" اس نے بدوقت عدیل کو منا ہی لیا تھا اور یہ عدیل کی خوبی تھی۔ بشریٰ کی کوئی بات ٹالتا نہیں تھا۔

"ہاں اور نہیں تو کیا۔ میں نے تو جب اِدھر اُدھر سے کچھ ایسی ویسی باتیں ان ماں بیٹے کے بارے میں سنیں' تب ہی میں کھٹک گئی تھی۔ اگرچہ تین مہینے کچا پکا ہی سہی رشتہ قائم رہا تھا تمہارا اور ظہیر کا۔" ذکیہ سرہلا کر بولیں۔

"اور کمال دیکھیں۔ میں ظہیر کو اور اس کی ماں کو فوزیہ کے رشتہ کے دوران پہچان ہی نہیں سکی۔"

"اور امی! یہ زاہدہ آنٹی بہت تیز ہیں۔ انہیں سب یاد آچکا ہے۔" صاف لگ رہا ہے اس وقت رشتہ نہ ہو سکنے کا بدلہ لے رہی ہیں امی کے کان بھر بھر کر۔"

"بھر لے جتنے مرضی' آخر کو کیا ہاتھ آئے گا۔ وہ اگر سیر ہیں محترمہ تو ان کی ہونے والی بہو سوا سیر ہے۔ دیکھنا کہ کیا کیا تماشے نہیں ہوں گے۔ ذرا فوزیہ کو اس کے گھر پہنچ تو لینے دو۔" ذکیہ ٹھٹھا لگا کر بولیں۔

"ہاں امی! یہ منظر تو واقعی دیکھنے والا ہو گا" اور وہ جو شام کو امی کے کان بھر رہی تھیں کہ تمہارا بیٹا تو اس چلتر بشریٰ کی مٹھی میں ہے۔ دیکھوں گی شادی کے بعد اپنے بیٹے کو کیسے قابو میں رکھیں گی خاتون۔" بشریٰ بھی مزا لے کر بولی۔ اسی وقت عدیل دیر ہو جانے کے خیال سے اسے بلانے کے لیے چلا آیا۔

"عدیل کو تو پتا نہیں چلا کہ تمہارا اور ظہیر کا پہلے رشتہ طے ہو گیا تھا؟" ذکیہ بیگم کو کچھ یاد آیا تو پوچھنے لگیں۔

"توبہ کریں امی! میں نے اپنی شامت لانی ہے۔ لاکھ عدیل مجھ پر جان چھڑکتے ہوں مگر اس طرح کی بات اگر انہیں پتا چل جائے۔۔۔ یہ مرد بہت شکی مزاج ہوتے ہیں باقی کی خالی تصویر کے خاکے میں خود سے رنگ بھر لیتے ہیں میں تو۔" وہ بولتے ہوئے مڑی اور پھر ٹھٹک کر رہ گئی۔ اس کے سامنے عدیل کھڑا اسے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

بشریٰ عجلت میں ماں کو خدا حافظ کیے بغیر ہی گھر سے نکل گئی۔

☼ ☼ ☼

"لیکن عفان! آپ تو کہہ رہے تھے، کل آجائیں گے۔ آج کا بھی سارا دن گزر گیا۔ آپ کا انتظار کرتے۔ اب تو رات ہوگئی ہے۔" عاصمہ متفکر سی فون پر عفان سے بات کر رہی تھی۔

"ہاں کہا تو تھا مگر دیکھو! ان کاموں میں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔ ابھی تو شاید کل کا دن بھی لگ جائے۔" عفان نے جواب دیا۔

"یہ نہ کہیں خدا کے لیے! میں اکیلی تھک گئی ہوں۔ گھر بچوں کو سنبھالتے سنبھالتے۔" عاصمہ بے حد تھکے ہوئے لہجے میں بولی۔

"مگر یہ بھی تو دیکھو نا زندگی بھر کا آرام بھی تو تمہیں ہی ملنے والا ہے۔ دو تین ملازم بھی رکھ لینا۔ شان دار سا گھر، گاڑی۔" عفان اسے لالچ دینے کو بولا۔

"خیر اب ایسا بھی نہیں، زندگی بھر خود ہی کام کیا ہے اپنے گھر اور بچوں کا۔ کام کرنا تو مجھے کبھی بھی نہیں دکھا مگر عفان! یوں اکیلا رہنا بہت تکلیف دہ ہے۔ آپ اور اباجی کے بغیر رہنا۔" عاصمہ افسردگی سے بولی۔

"یوں لگتا ہے جیسے سارا گھر خالی ہو۔ بچے بھی اتنے چپ ہیں نہ شرارتیں نہ ضدیں۔ وہ آپ دونوں کے سامنے ہی تنگ کرتے تھے مجھے۔"

"پھر تو اچھی بات ہے۔ تم مزے میں ہو۔ نہ ہماری ٹینشن نہ بچوں کی پریشانی یار! مزے کرو۔" وہ اسے چھیڑ کر بولا۔

"خدا کے لیے عفان! میں اب رو پڑوں گی۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔

"اچھا بابا! کل آجائیں گے ہم۔ شام سے پہلے گھر ہوں گے۔ تم پریشان نہیں ہو اور سنو! رات میں گھر کے لاک، دروازے اچھی طرح بند کر کے سویا کرو۔" عفان نے تاکیداً کہا۔

"کرتی ہوں۔ ہر بار یہ ہی نصیحت کرتے ہیں۔ آپ سے زیادہ مجھے اس بات کا خیال رہتا ہے پھر بچے بھی تو ہیں مما! وہ دروازہ بند کریں۔ مما چھت کا دروازہ لاک کیا۔ باہر کی کھڑکیاں بند کریں۔ تینوں کی طبیعت آپ پہ گئی ہے۔ احتیاط ہی احتیاط۔" وہ چڑ کر بولی۔

"تو یار! اچھی بات ہے نا احتیاط تو۔"

"عفان! وہ ایجنٹ ہے نا جسے آپ گھر دیکھ رکھنے کا کہہ گئے تھے، وہ آج آیا تھا۔ کہہ رہا تھا اس نے بہت زبردست تین گھر دیکھے ہیں ہمارے لیے۔" وہ ذرا پر جوش ہو کر بتانے لگی۔

"یار! یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ بس ہم آتے ہیں تو ان شاء اللہ پہلا کام یہ ہی کریں گے۔ تم بھی بس تیاری رکھو۔ موٹی موٹی پیکنگ شروع کر دو ہم نے تو بنا بنایا گھر لینا ہے۔ ٹرک کروا کے، سامان لدوایا اور بس شفٹ ہو گئے۔"

"ان شاء اللہ میں جتنی بے چینی سے اس گھڑی کا انتظار کر رہی ہوں، کوئی میرے دل سے پوچھے۔ بچے بھی بار بار پوچھتے ہیں۔ مما! نئے گھر میں کب جائیں گے۔" وہ اشتیاق سے بتانے لگی۔

"ان شاء اللہ بہت جلد۔ اب تم آرام کرو کل ہم نکلنے سے پہلے تمہیں فون کر دیں گے۔" عفان نے فون بند کرنا چاہا۔

"عفان! اباجی سے تو آپ نے بات کرائی نہیں میری۔"

"وہ سو گئے ہیں۔ تھک جاتے ہیں۔ دن بھر نہ جانے کہاں کہاں سے بچپن کے یار دوست ان سے ملنے آتے ہیں تو انہیں آرام کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔"

"وہ اپنی میڈیسن تو لے رہے ہیں نا باقاعدگی سے۔" وہ فکر مندی سے پوچھنے لگی۔ "اباجی دوا لینے کے معاملے میں بہت لاپروا ہیں آپ تو خیال کرتے ہیں نا!"

"ڈاکٹر صاحب! بالکل خیال کرتا ہوں اور پابندی سے انہیں ٹائم پر دے رہا ہوں۔ تم فکر نہیں کرو۔" عفان نے اسے تسلی دی۔ "اب تم سو جاؤ۔ صبح بچوں کو اسکول بھجوانا ہوگا تم نے۔" عفان نے اسے یاد دلایا۔ "میں بھی کافی تھک گیا ہوں۔ آرام کروں گا۔ یہاں تو یوں بھی صبح منہ اندھیرے ہی ہو جاتی ہے سب اٹھ جاتے ہیں۔"

"چلیں پھر آپ اپنا خیال رکھیے گا اور پلیز کل ضرور آجائیں۔ بہت اداس ہو گئی ہوں میں آپ کے بغیر کبھی اتنے دن اکیلے رہی بھی نہیں۔" عاصمہ پھر بے قراری سے بولی۔

"میں کب... رہا ہوں تمہارے بغیر۔ بہت عجیب سا لگ رہا ہے جیسے خالی خالی سا ہو گیا ہوں۔" عفان نے آہستگی سے کہا تو عاصمہ کو بہت خوشی سی محسوس ہوئی جدائی کا دکھ ان کا دل بھی تو سہہ رہا ہے۔ اس کڑی دھوپ میں صرف میں تو نہیں جل رہی۔ اس کی ساری اداسی ساری تھکن جیسے غائب ہو گئی اس نے مسکراتے ہوئے فون بند کرتے ہی وردہ کو گود میں اٹھا لیا اور عفان کو سوچ کر مسکرانے لگی۔

☼ ☼ ☼

"ظہیر کے ساتھ... تمہارا کیا تعلق تھا؟"

بشریٰ کو قطعاً توقع نہیں تھی کہ عدیل کے خراب موڈ کا نتیجہ گھر جاتے ہی یہ جملہ نکلے گا۔

فوری طور پر تو وہ کچھ سمجھ ہی نہ سکی، بس یوں ہی خالی خالی نظروں سے اسے دیکھے گئی۔ اس نے تو گھر آ کر نسیم بیگم کے طعنوں تشنوں کی بھی پروا نہیں کی تھی، جو ان کے گھر آتے ہی بولنا شروع ہو گئی تھیں۔

اور یہ پہلی بار تھا کہ عدیل ماں سے کوئی بھی بات کیے بغیر، فوزیہ کے خراب موڈ کا سبب جانے بغیر خاموشی سے اپنے بیڈ روم میں چلا آیا تھا۔

"بیوی نے اپنا دم چھلا بنا لیا ہے امی! جتنا مرضی آپ چیختی چلاتی رہیں، وہ حضرت کب سن رہے ہیں۔ ان کے کانوں میں آپ کی کوئی آواز نہیں پڑ رہی۔"

فوزیہ نے دونوں کو آگے پیچھے کمرے میں جاتے دیکھ کر جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ نسیم بیگم کے بولنے میں اور بھی تیزی آ گئی۔ مگر اب وہاں سننے کے لیے کوئی نہیں تھا۔ بشریٰ نے فق چہرے کے ساتھ کچھ بولنے کی کوشش کی۔

"خبردار! ایک لفظ جھوٹ تمہارے منہ سے نہیں نکلنا چاہیے بشریٰ! ورنہ میں بھول جاؤں گا کہ تم میری کون ہو اور... میں تمہارا کون؟"

اتنا سخت رویہ... ایسے ظالم رد عمل کی توقع کم از کم بشریٰ کو عدیل سے نہیں تھی۔ اس کا حلق جیسے کانٹوں سے بھر گیا۔ وہ کوشش کے باوجود کچھ بول نہیں پائی۔ آنکھوں میں ایک دم ہی ڈھیر سارا پانی اکٹھا ہو گیا۔

"میرے سامنے کوئی ڈراما کرنے کی ضرورت نہیں۔ تمہارے یہ آنسو اس وقت... اس وقت مجھ پر کچھ اثر نہیں کریں گے انڈر اسٹینڈ!" وہ پھر سے گرج کر بولا تو بشریٰ نے تیزی سے آنسو صاف کر کے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی مگر زبان تو اس کی جیسے جکڑی گئی تھی۔

"کیا تعلق تھا تمہارا اور ظہیر کا؟" اس نے اپنا سوال دہرایا۔

"کوئی تعلق... کوئی تعلق نہیں تھا... ہمارا اور خدانخواستہ کیوں ہونے لگا۔" اس نے گلے میں پھنسی ہوئی آواز نکالی مگر پھر بھی جسم ہلکا ہلکا کانپ رہا تھا اور آواز کی کپکپاہٹ تو اور بھی نمایاں تھی۔

"کیوں اتنا برا شخص ہے وہ کہ تمہیں اس سے تعلق رکھنے پر بھی شرم آنے لگی؟" عدیل طنز سے بولا اور ان آٹھ سالوں میں وہ پہلی بار نسیم بیگم کا بیٹا لگا تھا۔ وہ اس سے ڈری بھی پہلی بار ہی تھی اس طرح۔

"عدیل! جس طرح آپ کا پروپوزل آیا تھا میرے لیے' اسی طرح آپ سے پہلے ظہیر کا بھی آیا تھا اور کچھ دن بات کچی پکی چلتی رہی تھی۔" اسے احساس ہوا کہ اب اگر اس نے سنبھل کر ٹھیک ٹھیک جواب نہ دیے تو پھر عمر بھر خود کو کوستی رہے گی' اس لیے اب کے قدرے مضبوط لہجے میں بولی۔

"کچی پکی..... یا پکی۔" وہ جتا کر بولا۔

"ایسا کچھ ہوتا تو ہم کیوں آپ سے کچھ چھپاتے۔" وہ بھی ڈٹ کر بولی۔

"ہم..... " وہ زور دے کر بولا۔

"تم جب یہ سب جانتی تھیں تو جب فوزیہ کے لیے ظہیر کا رشتہ آیا' اس وقت تم نے یہ بات کیوں نہیں کی۔"

"عدیل!" وہ تڑپ کر رہ گئی۔

"تمہارے دل میں چور تھا نا۔"

"عدیل!" اسے خود بھی پتا نہیں چلا کہ اس کی آواز باہر تک گئی۔

"سچی بات پر اتنا واویلا؟" وہ بھی مزے سے بولا۔

وہ جیسے ایک دم نڈھال سی ہو گئی۔

"ذرا سی معمولی بات کو آپ نے کیا رنگ دے ڈالا ہے۔" وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی۔

"مجھ پر تو شاید آپ کو یقین نہیں۔ مگر اللہ کی قسم پہ تو آپ کو یقین آئے گا نا۔ میں کبھی قسم نہیں کھاتی..... مگر آج اللہ کی قسم کھا کر کہہ رہی ہوں اور عدیل! آپ کو یقین کرنا پڑے گا۔ مجھے بالکل بھی ظہیر یاد نہیں تھا۔ اس کا چہرہ نہ پروپوزل والی بات عین نکاح والے دن مجھے احساس ہوا کہ میں ظہیر سے پہلے بھی مل چکی ہوں۔ مطلب دیکھ چکی ہوں۔" وہ جلدی سے بولی۔

"تم لوگوں نے یہ رشتہ کیوں چھوڑا تھا۔" بہت دیر کی خاموشی کے بعد وہ اس پر نظر جما کر بولا۔ بشریٰ فوری طور پر کوئی جواب نہ دے سکی۔

"تم لوگوں نے رشتہ چھوڑا تھا یا انہوں نے جواب دیا تھا؟" وہ پھر سے بولا۔

"ہم..... ہم نے جواب دیا تھا۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"کیوں؟" وہ پھر سے دہرا کر بولا۔

"ہمیں پتا چلا تھا کہ وہ..... یہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔" وہ سر جھکا اعتراف کر کے بولی۔ عدیل اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا رہا۔

"میری بہن نے کبھی تمہارے ساتھ اتنا برا تو نہیں کیا کہ تم اس طرح بدلہ لیتیں۔" وہ سخت آواز میں بولا۔

"نہیں..... خدا کے لیے میں بتا چکی ہوں۔ مجھے یاد نہیں تھا۔"

"تو اپنی اماں جان سے پوچھ لیتیں۔ انہیں تو اس صدی کے شروع میں ہونے والے چھوٹے بڑے سب واقعے یاد ہوتے ہیں۔" وہ طنز سے بولا۔ وہ اسے دیکھ کر رہ گئی۔

وہ جیسے نڈھال ہو کر سر تھام کر بیٹھ گیا۔ وہ بھی اس کے پاس بیٹھ گئی اور آہستگی سے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر کچھ بولنے لگی تھی کہ اس نے زور سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"عدیل پلیز..... یہ تو قسمت کے کھیل ہوتے ہیں۔ اس وقت یہ رشتہ میرے نصیب میں نہیں تھا۔ خدا گواہ ہے۔ اگر مجھے یاد آجاتا تو میں ضرور آپ کو بتاتی اور فوزیہ سے مجھے خدانخواستہ کوئی دشمنی کیوں ہونے لگے گی۔ میری کوئی بہن نہیں میں نے ہمیشہ اپنی بہن..... "

"بس کرو یہ جھوٹ سچ ملانا۔ سو جاؤ۔ میرے سر میں پہلے ہی بہت درد ہو رہا ہے۔" وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر تکیہ

سیدھا کر کے لیٹ گیا۔ بشریٰ بے بس نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

وہ کچھ دیر یوں ہی بیٹھی رہی۔

ان کی شاپنگ بھی یوں ہی پڑی تھی کچھ مثال کے کپڑے بھی رکھنے والے تھے۔ اب پتا نہیں صبح انہوں نے جانا تھا یا نہیں..... وہ بیٹھی لب چباتی رہی۔ اتنی ہمت ہی نہیں ہو سکی کہ وہ جو آنکھوں پر بازو رکھے یوں اجنبی بنا لیٹا ہے اس سے پوچھ ہی لے۔

"سو جاؤ کیوں میرے سر پر سوار ہو کر کیا بیٹھ گئی ہو۔ نہیں نیند آ رہی تو باہر چلی جاؤ اور لائٹ آف کر دو۔" وہ کروٹ لیتے ہوئے کر خفگی سے بولا تو وہ آہستگی سے اٹھی اور لائٹ آف کر کے اس کے برابر آ کر لیٹ گئی۔

کتنی دیر تک اسے نیند نہیں آئی کہ اس جرم کی سزا جو نہ اس سے سرزد ہوا نہ جس کے وقوع ہونے میں ہی اس کا کوئی ہاتھ تھا۔ اس کے سر پر لگا دیا گیا تھا۔

وہ آنکھوں میں آئی نمی کو مسل کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"ارے مگر آپ نے تو بتایا ہی نہیں کہ آپ اتنی جلدی آجائیں گے۔ ابا جی کہاں ہیں۔ اکیلے آئے ہیں کیا؟" عاصمہ دروازہ کھول کر کچھ پریشان سی عفان کے ساتھ آتے ہوئے بولی۔

"بہت ایمرجنسی میں آیا ہوں۔ سب کچھ ریڈی تھا صرف ابا جی کے اور دوسری پارٹی کے سائن تھے۔ وکیل پٹواری گواہ سب موجود اور ابا جی کے اوریجنل ڈاکومنٹس ندارد۔" عفان جھلائے ہوئے انداز میں کہتا سیدھا ابا جی کے کمرے میں بنی الماری کی طرف بڑھا۔

"اُفوہ! سانس تو لے لیں۔ میں پانی لے کر آتی ہوں آپ کے لیے۔ سفر سے آئے ہیں بیٹھ تو جائیں۔" عاصمہ جلدی سے پانی لاتے ہوئے بولی۔

"ایمان سے ایک ہفتہ غارت ہو گیا۔ اب تمہیں پتا ہے مزید چھٹی بھی نہیں مل سکتی اور کل میری آخری چھٹی ہے۔ ابا جی بھی حد کرتے ہیں سب سے ضروری کاغذ ہی لے جانا بھول گئے۔ اب گاؤں کوئی ساتھ کی گلی میں تو ہے نہیں۔" عفان پانی کا پورا گلاس چڑھا کر جھلائے ہوئے انداز میں بولا۔

"اچھا چلیں ہو جاتا ہے ایسا۔ اب ان کی عمر ایسی ہے۔ کہاں سب کچھ یاد رہتا ہے۔ آپ تسلی سے کاغذ نکال لیں۔ میں کھانا بنا رہی ہوں کھا کر جائیں گے اب آپ۔" وہ کچن کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

"نہیں یار! بہت دیر ہو جائے گی۔" عفان الماری سے مختلف فائلیں نکالتے ہوئے بولا۔

"کوئی دیر نہیں ہوتی ذرا دیر میں بچے بھی آنے والے ہیں۔ اتنے اداس ہو رہے ہیں آپ کے بغیر مل کر جائیے گا۔"

"لو مل گئے۔ یہ پیپرز تھے۔ ذرا سے کام کے لیے اتنی دور آنا پڑا۔" وہ فائل میں سے پیپرز نکالتے ہوئے باقی کی چیزیں احتیاط سے الماری میں رکھنے لگا۔

"کیا پکا رہی ہو آج عاصمہ؟" وہ فارغ ہو کر کچن ہی میں آ گیا۔

"گوبھی گوشت ہے آپ کی پسند کا۔ میں نے سوچا آج تو آپ نے آجانا ہے تو۔" عاصمہ پھیکی سی مسکراہٹ سے بولی۔

"ہاں دیکھو ابھی نکلوں گا تو واپسی ظاہر ہے..... ادھر بھی ساری قانونی کارروائی میں وقت تو لگے گا۔ مجھے تو لگتا ہے آج بھی واپسی مشکل ہے۔" وہ وہیں کرسی پر بیٹھ گیا۔ عاصمہ جلدی جلدی سالن بھوننے لگی۔ فریج سے آٹا نکال

کر رکھا اور دوسری طرف توا چولہے پر رکھا۔
"آپ کوشش تو کیجیے گا واپسی کی۔"
"یار! میں تو خود تنگ آگیا ہوں۔ ابا جی بھی بے زار ہوئے پڑے ہیں۔ اب ایک اور دن کی مشکل تو ہے۔" عفان سلاد کاٹنے لگا۔
"عفان! کتنے میں سودا ہوا ہے۔ یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں۔" بہت دنوں سے دل میں مچلتا سوال آخر اس کے لبوں پر آہی گیا۔
"اچھا میں نے تمہیں نہیں بتایا۔" وہ کچھ حیران سا ہوا۔
"کب؟ میں تو منتظر ہوں کہ آپ بتائیں گے۔" وہ جتا کر بولی۔
"تمہارے خوابوں میں سمجھو سارے رنگ بھرنے والے ہیں۔" وہ مسکرا کر بولا۔
"اب بتا بھی دیں مجھ سے اور صبر نہیں ہوتا۔" وہ بے صبری سے بولی۔
"اچھا تو گیس کرو! کتنے میں زمین نکلی ہوگی۔"
"عفان..... میں نے کبھی کسی چیز کا بھی سودا نہیں کیا۔ یقین کریں مجھے بالکل آئیڈیا نہیں..... اب خود سے بتا دیں نا!" وہ بہت منت سے بولی۔
"بہت بھولی ہیں بھئی ہماری بیگم۔" وہ مسکرا کر بولا "ڈیڑھ کروڑ میں ڈن ہوا ہے اور پتا ہے اچھی کہ لو یا بری بات یہ ہے کہ وہ لوگ پیمنٹ کیش کی شکل میں کر رہے ہیں' حالانکہ میں اس چیز کے حق میں نہیں تھا۔ وہ چیک بنا دیتے یا ڈرافٹ مگر ابا جی نہیں مانے کہ اس میں فراڈ کا چانس ہو سکتا ہے مگر اس میں رسک بھی بہت ہے اور فائدہ بھی کہ آتے ہی گھر کا سودا کرلیں گے۔"
"یہ تو اچھی بات ہے۔ آپ کے پاس اگر ٹائم ہوتا تو آپ ظفر بھائی کے ساتھ جا کر ایک دو گھر ہی دیکھ آتے۔" اس نے پھرتی سے روٹی توے سے اتار کر عفان کے آگے کھانا لگا دیا۔
"نہیں یار ——— بالکل بھی ٹائم نہیں۔ اب جو بھی ہو گا واپسی پر ان شاء اللہ۔" وہ جلدی جلدی کھانا کھانے لگا۔
عاصمہ روٹیاں پکا کر اس کے پاس ہی بیٹھ گئی اور اس سے باتیں کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"اب کیا باقی کا رستہ اسی طرح کٹے گا؟" عدیل کو سنجیدگی سے گاڑی چلاتے دیکھ کر بشریٰ بول ہی پڑی مثال دونوں کو وقتاً "فوقتاً" دیکھ رہی تھی۔
مما پاپا کی لڑائی ہوئی ہے۔ وہ قیاس تو کر چکی تھی مگر دونوں کے خراب موڈ کو دیکھ کر پوچھنے کا حوصلہ نہیں ہوا تھا۔
"کیوں کیا ہوا ہے؟" عدیل اسی سنجیدگی سے بولا۔
بشریٰ شکر کر رہی تھی کہ صبح اٹھ کر عدیل نے پروگرام ملتوی نہیں کیا۔ صرف اتنا ہوا کہ وہ لوگ پروگرام سے ایک گھنٹہ لیٹ گھر سے نکلے۔ نسیم بیگم اور فوزیہ کے موڈ اسی طرح برہم تھے۔
عدیل کچھ دیر کے لیے ماں کے کمرے میں گیا تھا۔ انہیں دفتر کے کام کی مجبوری کا کہہ کر شاید ان کا موڈ کچھ نارمل کر آیا تھا کیونکہ بشریٰ جب مثال کو لے کر ملنے گئی تو نسیم بیگم نے کچھ خاص سخت رویہ اختیار نہیں کیا۔ اگرچہ فوزیہ نے اس کے سلام کا جواب دیا نہ مثال کے گلے لگنے پر اسے پیار کیا۔

وہ مثال کو لے کر خاموشی سے نکل آئی۔
"آپ کوئی بات نہیں کریں گے؟" وہ پھر سے بولی۔
"تم کرو، میں سن رہا ہوں۔" وہ پھر سے اسی لہجے میں بولا۔
"عدیل! اس سارے قصے میں میرا کیا قصور ہے؟ میری تو سمجھ میں نہیں آرہا۔"
"بشریٰ! وہ چیپٹر میں نے کلوز کر دیا ہے۔ اب اس پر کوئی بات نہیں ہوگی اور ہاں!" وہ رک کر مثال کو دیکھنے لگا جو اپنی گڑیا سے باتیں کر رہی تھی۔
"تم امی یا فوزیہ سے بھی کوئی ذکر نہیں کرو گی کہ پہلے تمہارا....."
"میں جانتی ہوں عدیل! لیکن وہ زاہدہ آنٹی۔ اگر انہوں نے خود سے کچھ بتا دیا۔ کل بھی وہ امی سے ایسی باتیں کر رہی تھیں جس سے امی کا دل میری طرف سے کھٹا کر سکیں۔ بہت غلط غلط باتیں کیں انہوں نے لیکن میں خاموش رہی۔"
"تمہیں آئندہ بھی خاموش رہنا ہو گا تمہارا تو کچا پکا معاملہ تھا۔ ٹوٹا اور بات آئی گئی ہو گئی۔" وہ جتا کر بولا۔
"لیکن میری بہن کا نکاح ہوا ہے۔ تم سمجھ رہی ہو نا اس بات کو؟"
"میں جانتی ہوں عدیل! اور خدا نہ کرے کہ اب کچھ ایسا ہو جو اس رشتے کو خراب کرے۔ آپ فکر نہیں کریں' میں پوری کوشش کروں گی کہ کم از کم میری طرف سے کچھ نہ ہو۔ آپ ٹینشن نہیں لیں۔ مجھے یقین ہے زاہدہ آنٹی بھی اس معاملے کو بگاڑنا نہیں چاہیں گی۔" وہ اسے تسلی دیتے ہوئے بولی۔
"ہوں! ایسا ہی ہو اللہ کرے۔" وہ گہرا سانس لے کر بولا۔
"مما! اگر آپ دونوں کی صلح ہو گئی تو پلیز کوئی اور اچھی بات کرلیں۔" مثال آگے کو جھک کر بولی تو دونوں ہنس پڑے۔

☼ ☼ ☼

انہیں اسلام آباد میں بہت اچھا ہوٹل ملا تھا۔ انہیں تین دن یہاں ٹھہرنا اور تین دن مری میں۔ پہلا دن تو یوں ہی گھومتے ہوئے گزر گیا۔ بشریٰ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اتنے سالوں بعد دونوں کو یوں اکٹھے ساتھ رہنے اور گھومنے پھرنے کا موقع ملا تھا۔
عدیل کا موڈ بھی بہت خوش گوار تھا۔ وہ اس رات والی تلخی کو قطعاً "بھلا چکا تھا اور بشریٰ کا بھی اسے یاد کرانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔
"عدیل! آج تھوڑی شاپنگ کرلیں امی اور فوزیہ کے لیے۔ میں چاہ رہی ہوں کہ ہم فوزیہ کے جہیز کے لیے کچھ زبردست سے آئٹم خرید لیں۔ جو اس کو بہت پسند آئیں۔" وہ شوہر کی دل جوئی کو بولی اور یہ سچ بھی تھا کہ اسے بہرحال فوزیہ کی شادی کی خوشی تھی۔
دونوں کے تعلقات شادی کے بعد سے اب تک کچھ اتنے خوش گوار بھی نہیں رہے تھے۔ فوزیہ' بشریٰ کو کچھ خاص پسند نہیں کرتی تھی۔ وہی نند' بھاوج والی چپقلش پہلے دن سے جاری تھی۔ جس میں کبھی کمی آجاتی اور کبھی شدت۔ فوزیہ اگر اچھی نند نہیں تھی تو بشریٰ بھی ذرا الگ تھلگ سی رہتی تھی۔ پھر بھی دونوں میں روبرو لڑائی والی بات کبھی نہیں ہوئی تھی۔
بشریٰ دل میں خوش تھی کہ کم از کم فوزیہ کی رخصتی کا امکان پیدا ہو ہی چکا تھا تو وہ خوش خوش اپنے گھر جائے۔
"یہ تو اچھی بات ہے۔ امی نے بھی مجھ سے کہا تھا۔ لیکن میں نے کہا تھا کہ ہم اتنی زیادہ شاپنگ نہیں کر سکتے۔

ظاہر ہے گاڑی میں سب کچھ کہاں آسکتا ہے۔" عدیل بولا۔
"رکھ لیں گے پیچھے ڈگی بھی تو ہے۔" بشریٰ مصر رہی۔
اور اس نے واقعی فوزیہ کے جہیز کے لیے بہت زبردست کراکری اور کچھ قیمتی کپڑے بھی خرید لیے۔ مثال کی پسند کے کھلونے اور کچھ دوسری چیزیں خریدیں' کل ان کا مری جانے کا ارادہ تھا۔
جیسے ہی وہ ہوٹل کے کمرے میں داخل ہوئے۔ بشریٰ سنبھلتے سنبھلتے بھی بری طرح سے چکرا کر بیڈ پر گری۔ عدیل اور مثال اسے پکارتے رہ گئے۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

"مما! پاپا اور دادا کل آجائیں گے نا؟" اریبہ اور واثق اس کے ساتھ مل کر دھلے ہوئے کپڑے رسی سے اتار کر اندر لائے تھے۔ وہ انہیں بیٹھ کر تہ کرنے لگی۔
"ان شاء اللہ بیٹا! ابھی پاپا کا فون آیا تھا۔ سب کام ہو گئے۔ امید ہے وہ کل صبح ہی نکل پڑیں گے۔ تم بس دعا کرنا وہ ساتھ خیریت کے گھر آجائیں۔"
عاصمہ بہت خوش تھی۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو عفان کا فون آیا تھا کہ ساری ڈیل بخیریت ہو گئی ہے۔ رقم انہیں مل گئی ہے۔
ابا جی نے بھی عاصمہ سے بات کرتے ہوئے اسے دل سے مبارک باد دی تھی۔ ان کی آواز اسے کچھ کمزور لگی تھی مگر خوش وہ بہت تھے۔
عاصمہ ان سے زیادہ خوش تھی کہ انہوں نے جاتے ہوئے اس سے جو وعدہ کیا تھا' وہ پورا کیا تھا۔
وہ اسے اس کی چھت دلانے جا رہے تھے۔
اس نے جب رندھی آواز میں ابا جی کا شکریہ ادا کیا تو وہ برا مان گئے۔
"نہیں شکریہ تو ہمیں تمہارا ادا کرنا چاہیے۔ اتنے سال تم نے زبان پر کوئی گلہ' شکوہ لائے بغیر گزار دیا۔ اب ہماری باری ہے تمہارا اور بچوں کا حق ادا کرنے کی۔"
وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔
"مما! میری فرینڈ ہے رملہ! اس نے اپنا گھر لیا ہے۔ اتنا شاندار ہے' اس کے گھر میں لان بھی ہے اور سوئمنگ پول بھی۔" اریبہ اسے بتانے لگی۔
"اب ہم اتنا ہی بڑا گھر نہیں لیں گے۔ سارے پیسے گھر لینے میں تو نہیں لگا دینے نا۔ ہے نا مما!" واثق عقل مندی سے بولا۔
"جی مما کی جان! اب دیکھو یہ فیصلہ تو تمہارے پاپا اور دادا ہی کریں گے کہ ہمیں کتنے میں گھر لینا ہے اور باقی رقم کا کیا کرنا ہے۔" یہ بات تو اس نے سوچی بھی نہیں تھی۔ نہ عفان سے پوچھی تھی۔
اسے بے اختیار اپنے کم سن بیٹے پر پیار آیا۔ دور کی کوڑی لایا تھا۔
"اچھا مگر گھر میں لان تو ہونا چاہیے نا اور درخت بھی جس پر جھولا لگائیں گے۔" اریبہ ٹھنک کر بولی۔
"ان شاء اللہ ضرور چھوٹے موٹے لان والا گھر ہی لیں گے۔" عاصمہ اسے پیار کرکے بولی۔

☆ ☆ ☆

"مبارک ہو عدیل صاحب! آپ کی مسز ایکس پیکٹڈ ہیں۔" ڈاکٹر بشریٰ کو چیک کرنے کے بعد یقینی لہجے میں مسکراتے ہوئے بولی تو دونوں بے یقینی سے اسے دیکھنے لگے۔

"ایسے کیا دیکھ رہے ہیں آپ... کیا آپ کو یقین نہیں آرہا؟" ڈاکٹر بھی دونوں کے تاثرات دیکھ کر مسکرائی۔
"ڈاکٹر صاحبہ... ہم تو... بالکل ناامید ہو چکے تھے۔" عدیل کپکپاتی آواز میں بولا۔
"اونہوں... ناامیدی تو کفر ہے عدیل صاحب اور آپ کی تو ماشاء اللہ سے ایک بیٹی بھی ہے پہلے سے۔ اکثر کیسز میں دیر ہو جاتی ہے۔ باقی تو اللہ کے کام ہیں۔ بہرحال آپ کو مبارک ہو۔ ابھی انہیں کسی میڈیسن کی ضرورت نہیں' انہیں کمزوری ہے۔ پھل' دودھ اور جوس دیں۔ پندرہ دن بعد دوبارہ چیک کرائیں تو انہیں کچھ میڈیسن اسٹارٹ کرائی جائیں گی۔" وہ انہیں دیکھ کر بولی۔
"مگر ڈاکٹر صاحبہ کل تو ہم مری جا رہے تھے۔" بشریٰ کو یاد آیا۔
"اب آپ کو گھر جا کر کچھ دن صرف ریسٹ کرنا ہے۔ کیونکہ آپ کافی عرصہ بعد دوبارہ پریگننٹ ہوئی ہیں۔ اس لیے احتیاط ضروری ہے۔" ڈاکٹر نے فوراً" کہا تو دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔
"لیکن ہمیں گھر جانے کے لیے بھی تو سفر کرنا پڑے گا ڈاکٹر صاحبہ!" عدیل نے توقف سے کہا۔
"وہ آپ کریں مگر احتیاط سے۔ جو باتیں میں نے کہی ہیں ان پر عمل کریں۔ انہیں ہر قسم کی ٹینشن سے دور رکھیں۔ خوش رہیں اور اچھی صحت مند خوراک دیں اور کچھ دن بیڈ ریسٹ' اوکے!"
"جی ڈاکٹر صاحبہ! بہت شکریہ۔" دونوں خوش خوش باہر آگئے۔
"مجھے یقین نہیں آرہا عدیل!" بشریٰ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔
"تو مجھے کون سا یقین آرہا ہے۔ بشریٰ! اتنے سالوں بعد... اتنے علاج کرائے ہم نے اور اب دیکھو بغیر کسی گمان خیال کے..."
"اللہ بہت مہربان ہے۔" بشریٰ رندھے گلے سے بولی۔
"بہت مہربان... بہت زیادہ۔ ہم ہی اسے بھول جاتے ہیں۔ مثال کو بتا دیں ہوٹل جا کر؟" وہ شرارت سے بولا۔
"اونہوں... بالکل نہیں' ابھی اسے ان باتوں کی کیا سمجھ۔" اس نے گھورا۔
"اچھا بھئی۔ امی کو تو جلدی سے فون کرکے یہ خوش خبری سناؤں۔" وہ موبائل پر نمبر ملانے لگا۔
بشریٰ مسروری اسے دیکھنے لگی۔ اسے فوزیہ کی ساس کے طعنے یاد آنے لگے تو اس نے سر جھٹک دیا۔

☆ ☆ ☆

رات بہت اندھیری تھی۔ ایک تو بار بار لائٹ جارہی تھی۔ دوسرے سردی بھی بہت تھی۔ آدھی رات کے بعد جو لائٹ گئی تو پھر آنا ہی بھول گئی۔

عاصمہ کو نیند نہیں آرہی تھی۔ اس نے اٹھ کر بچوں کے کمرے میں ایمرجنسی لائٹ جلائی اور پھر صحن کی طرف آگئی۔

آسمان کا رنگ عجیب مٹیالا سا ہو رہا تھا۔ جیسے کوئی آندھی رکی ہوئی ہو۔

"بھلا اس موسم میں کب آندھیاں آتی ہیں۔"

وہ خود ہی دل میں ہنسی، مگر اس ہنسی میں عجیب سی بے چینی تھی۔

"شاید میں کبھی اتنے دن اکیلی جو نہیں رہی، اس لیے دل گھبرا رہا ہے۔" وہ خود ہی تاویل گھڑنے لگی۔

زور، زور سے شائیں شائیں ہوا چلنے لگی۔ ہمسائے کے گھر میں لگے اونچے درخت کے پتے زور، زور سے شور مچانے لگے۔

سردی بہت بڑھ گئی تھی۔ اس نے شال اپنے کندھوں کے گرد لپیٹی۔

"پتا نہیں گاؤں میں موسم کیسا ہوگا۔ عفان تو کہہ رہے تھے وہ صبح نماز پڑھنے کے بعد نکل آئیں گے۔ اگر بارش ہوگئی تو کہیں انہیں دیر سے نکلنا نہ پڑے۔ یا اللہ! موسم بالکل ٹھیک رہے۔ کچھ بھی نہ ہو اب تو۔ وہ دونوں صبح جلدی آجائیں تو میرا جی ٹھہرے۔ کیسی فضا میں اداسی سی ہے۔ بچوں نے کھانا ٹھیک سے کھایا، نہ میں نے، دل ہی نہیں کر رہا تھا۔"

وہ انگلیوں پر ان کے جانے کے دن گننے لگی۔

"کل جب آئیں گے تو بس شام میں ہی گھر دیکھنے چلیں گے۔ یہ کرائے کا ٹوٹا پھوٹا گھر، جس پر مالک مکان ایک روپیہ مرمت کے نام پر لگانے کو تیار نہیں۔ اب یہاں اور رہنے کو جی نہیں کرتا۔ اللہ کرے ہمارا بھی نیا لش پش کرتی ٹائلوں والا گھر ہو، جسے میں سجاؤں، سنواروں اور خوب صاف ستھرا رکھوں۔

وہ دل میں بہت سارے منصوبے بنانے لگی۔

"اور وہ جو میں نے چھوٹی کمیٹی ڈال رکھی ہے اس سے اپنے بیڈ روم کا نیا فرنیچر لاؤں گی اور ساتھ میں میچنگ پردے بھی اور......"

یہاں تک ہی سوچ پائی تھی کہ پھر گھبرا کر بے کل سی اٹھ کھڑی ہوئی اور اندر بچوں کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ ذرا دیر میں بارش ہونے لگی۔

عاصمہ کو جانے کب آڑے ترچھے ہو کر بیٹھے بیٹھے نیند سی آگئی۔ وہ گہری نیند سو گئی۔ صبح آنکھ بھی دیر سے کھلی۔ ستم پیشتر بچوں کو تیار کرکے اسکول بھیجا تھا۔ پھر موبائل پر فون کیا مگر فون بند تھا۔

"سرپرائز دینا چاہتے ہوں گے۔" وہ مسکرا کر جلدی جلدی صفائی میں جُت گئی۔ کچھ دیر میں فون کی گھنٹی بجی۔ اس نے تیزی سے کال ریسیو کی اور کال ریسیو کرنے کے بعد اسے لگا گردشِ وقت اور دنیا سب کچھ تھم کر رہ گیا۔

کاش اس نے یہ کال کبھی ریسیو نہ کی ہوتی۔

وہ کسی پتھر کے بت کی طرح ساکت تھی۔ سیل فون اس کے ہاتھ سے پھسل کر کب زمین پر گرا۔ سیل کی بیٹری، سم سب نکل کر فرش پر بکھر گئے۔ مگر وہ تو جیسے ہوش و خرد سے بے گانہ ہو چکی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

مصباح علی

اس گھر میں ہر صبح کا آغاز معمول کی طرح ہوتا۔ خوب گھی میں تلتے پراٹھوں کی خوشبو نیچے سے بھاپ اڑاتی گرتی ابلتی چائے، کہیں سے پاپوں کے چُر چُر کرنے کی آوازیں تو کہیں بھاری بھاری بیگ اٹھا کر منہ بسورتے بچے اور ساتھ ساتھ بڑی بھابھی کی کرخت آواز جو موٹر سائیکل پر بیٹھے اپنے بچوں کے بیگوں میں لنچ بکس ٹھونستے ہوئے نصیحت کر رہی تھیں۔

"یہ کھا کر آنا، ورنہ ماروں گی..." ڈھیٹ سے بچے منہ چڑھا چڑھا کر ماں کو خدا حافظ کرنے لگے۔ بھائی جان کو الگ جلدی تھی، تیزی سے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور یہ جا، وہ جا۔

اوپر سے چاچی خالہ کے بچے بیگ لٹکائے، ہاتھوں میں رجسٹر پکڑے، تیز تیز سیڑھیاں اترے۔ اپنی سائیکلیں درست کرنے لگے۔ انہیں بھی اسکول جانے کی جلدی تھی۔ ایک وہ ہی تھا، جو بڑے اطمینان سے چائے سُڑک سُڑک کر پی رہا تھا۔

ماریہ نے اپنے سلکی بالوں کی ڈھیلی ڈھیلی چٹیا بنائی۔ ہلکا سا لپ گلوس موٹے موٹے ہونٹوں پر پھیرا، سفید دوپٹا برائے نام سر پر ٹکایا اور دھپ دھپ سیڑھیاں اترنے لگی۔

"ارے! آرام سے اترا کر۔ ساری جوتوں کی مٹی میری چائے میں چلی گئی۔" تائی خالہ چائے کو چمچے کے ساتھ اچھالتے ہوئے خاصا زور سے بولیں۔ ان کا اوپن ایریا باورچی خانہ سیڑھیوں کے نیچے ہی تھا۔ اس لیے ہر آتے جاتے کو ضرور ٹوکتی تھیں۔

"کبھی مِڈیوں کو چلتے دیکھا ہے... جو اسے کہہ رہی ہیں۔" تائی خالہ کے پیچھے کھڑا اسد چپ کیسے رہ سکتا تھا۔ چائے میں بھیگا پاپا منہ تک لے جاتے ہوئے زور سے بولا۔

"بس وقت میرے منہ نہ لگنا۔" وہ کہہ کر بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔

"کیوں اس وقت لیڈی ڈیانا لگ رہی ہو، بلکہ وہ تو مر گئی ہیلری... ہیلری کلنٹن کی سیٹ پر بیٹھ گئی ہو، ہو بہو

اس وقت منہ نہ لگوں؟"

"ہونہہ۔" وہ ناک چڑھا کر تیزی سے پرانا سا پردہ پرے کرتی ہوئی باہر نکل گئی' جہاں کالج وین والا مسلسل ہارن بجا رہا تھا۔

ان کی ہر صبح کا آغاز اور شام کا اختتام ایک دوسرے سے اچھی خاصی نوک جھونک پر ہی ہوتا تھا۔ اکثر جب وہ کالج سے آتی تو پہلے اسی سے ٹکرا جاتی۔ دو چار تلخ جملوں کا تبادلہ ہوتا۔ ایک دوسرے کو برے برے القابات سے نوازتے' بڑوں سے ڈانٹ سن کر وہ اوپر اپنے پورشن میں چلی جاتی اور وہ اپنی سیلن زدہ بیٹھک میں گھس جاتا۔ انہوں نے اپنے ساتھ دوسروں کا جینا بھی حرام کر رکھا تھا۔ چاچی خالہ تو ہر وقت اکلوتی بیٹی کے بدلتے تیوروں سے پریشان رہتیں۔ کوئی چیز اس کی ناک کے نیچے آتی ہی نہ تھی۔ وہ اب بھی نیچے صحن میں بیٹھی بہن کے پاس ماریہ ہی کا رونا رو رہی تھیں۔

"میں کیا کروں آپا! کم بخت کسی کام کو ہاتھ ہی نہیں لگاتی۔ یہ ہی لچھن رہے تو آگے جا کر جانے کیا کرے گی۔"

"تو کیوں پریشان ہوتی ہے۔ سر پر پڑے گی تو خود ہی عقل آجائے گی۔ بی اے کر لینے دے اسے۔۔۔ پھر آرہی ہوں میں تیرے بھائی کے ساتھ مٹھائی لے کر۔" چھوٹی بہن کو پریشان دیکھ کر بڑی بہن کا دل پسیج گیا۔

ماریہ اوپر سیڑھیوں کے پاس بیٹھی رسالہ پڑھ رہی تھی۔ ان کی آوازیں سن کر رسالہ پٹخا اور خوب چلا کر بولی۔

"تائی خالہ! یہ اپنی روشن تجویز رہنے دیں۔ مجھے اپنی نسل نہیں بگڑوانی' اس نیلسن منڈیلا کی اولاد پیدا کر کے۔"

"اوہ۔ ہیلو۔" اسد باہر سے آرہا تھا' بات سمجھ میں آتے ہی ہاتھ نچا کر بولا۔ "مجھے بھی کوئی شوق نہیں ہے بھورے بچے کھلانے کا۔"

"دفع منہ! تم بے غیرتوں کو شرم تو چھو کے نہیں گزری۔" چاچی خالہ کو تو اچھا خاصا غصہ آگیا پھر ما... کے خوب لتے لیے۔

"تم دونوں ہی غلط کہہ رہے ہو۔" بڑی بھابھی جو اندر منی کو سلا رہی تھیں' بولتے ہوئے باہر نکلیں۔

"بالفرض تم دونوں کی شادی ہوگئی اور بچے بھی ہوئے تو کم از کم کالے یا بھورے نہیں ہوں گے۔ بلکہ دھاری دار ہوں گے۔ زیبرا کراسنگ کا کام انجام دیں گے۔"

"ہائے! اللہ نہ کرے۔" تائی خالہ نے توبہ کرتے ہوئے دونوں گالوں کو پیٹا۔ "تیرے منہ میں خاک۔۔۔ میری نسل کیوں عجوبہ بنے۔" پھر انہوں نے دوہتھڑ اپنے قریب جگہ بناتی "دور اندیش بہو" کو جڑے۔

تائی خالہ کی عادت ہی کچھ ایسی تھی۔ ایک منٹ لگتا تھا انہیں پٹڑی سے اترنے میں اور ایک لمحے میں ہی دل موم کی طرح پگھل بھی جاتا۔

تائی خالہ اور چاچی خالہ دونوں سگی بہنیں تھیں۔ ایک ہی گھر میں بیاہی گئیں۔ رشتے مضبوط ہوئے تو محبتیں اور بڑھ گئیں۔ چاچی خالہ اوپر والے پورشن میں تھیں۔ ان کی ایک بیٹی اور دو بیٹے تھے۔ بیٹے چھوٹے تھے جو ابھی نویں' دسویں میں پڑھ رہے تھے۔ ماریہ دونوں بھائیوں سے بڑی تھی۔ اور بی اے میں پڑھ رہی تھی۔ ایک تو اکلوتی بیٹی' اوپر سے رنگ بھی اچھا خاصا گورا تھا۔ وہ اپنی ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دیتی تھی۔ نین نقش تو خیر واجبی تھے۔ گول گول آنکھیں' توپ جیسی ناک' موٹے موٹے ہونٹ۔۔۔ پر وہ کیا کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں سفید رنگت ہی اصل حسن کی سند ہے' تو اس اعتبار سے وہ واقعی ملکہ حسن تھی۔

تائی خالہ کے پاس دو کمروں کے علاوہ بیٹھک بھی تھی۔ ان کی تین بیٹیاں اور دو بیٹے تھے۔ بڑے بیٹے اور تینوں بیٹیوں کی شادی ہوگئی تھی۔ جن کے اپنے دو دو' تین تین بچے تھے۔ لمبا چوڑا' مگر سب سے چھوٹا بیٹا اسد ایم کام کر کے نوکری کی تلاش میں تھا۔ گھر بھر کا تھا تو سب سے پڑھا لکھا' صحت مند شخص' مگر رنگ بھی اللہ نے خوب سیانے کوے جیسا ہی دیا تھا۔ یوں تو اوپر نیچے والے سارے ہی ماشاءاللہ گہرے سانولے تھے مگر اسد ان سب پر بازی لے گیا تھا۔ ان سب کے بیچ ایک وہ ہی نہ جانے کس پر گئی تھی۔ تائی خالہ تو صاف کہتیں تھیں۔

"دائی تندور والے پٹھان کی بڑی بہو تھی۔ ہو سکتا ہے پیدائش کے وقت رنگ اس کا چرا لیا ہو۔"

جب کبھی اس کی شادی کا ذکر ہوتا تو خوب اترا اترا کر سب کو یوں دیکھتی' جیسے اس کے لیے کوئی پرنس آسمان سے اتر کر آئے گا۔ چاچی خالہ اس کے نخروں سے پریشان رہتیں تو تائی خالہ کو اپنے پڑھے لکھے بیٹے کے روزگار کی فکر۔

"اے اللہ! آج تو اسے کامیاب کر ہی دے۔" وہ انٹرویو پر جانے کی تیاری کرتے ہوئے ماں کی دعائیں سمیٹ رہا تھا۔ سیڑھیوں کے ساتھ بڑا سا واش بیسن تھا۔ جس پر چھوٹا سا بدنما آئینہ لگا ہوا تھا۔ وہ آئینے میں دیکھتے ہوئے بڑی محنت سے بال جما رہا تھا۔ وہیں چھوٹی سی ڈبیا میں رکھی وائٹننگ کریم ذرا سی ہاتھ میں نکال کر منہ پر رگڑنے لگا۔ کریم خاصی سوکھی ہوئی تھی۔ رگڑنے میں محنت بھی کرنی پڑ رہی تھی۔

"اوہو۔۔۔ بڑی لشک پشک ہو رہی ہے۔" وہ نیچے اترتے ہوئے اپنی آنکھوں کو مٹکاتے ہوئے بولی۔ وہ اس وقت اپنا موڈ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا سو خاموشی سے آئینے میں دیکھتے ہوئے کریم لگاتا رہا۔

"بے شک اور بھی لگالو۔ بھینس پر تو تیزاب بھی اثر نہیں کرتا۔" وہ چڑا کر تیزی سے بڑی بھابھی کے کمرے میں گھس گئی۔ اسد کو غصہ بہت آیا مگر ادھار کسی اور وقت پر اٹھا دیا۔

وہ بھابھی سے تلے ہوئے بینگن بنانے کی ترکیب پوچھنے آئی تھی۔ وہ کھانے میں خود صرف بینگن ہی پکاتی تھی' صرف اسے ایک پلیٹ بھیج کر چڑانے کے لیے۔ اس نے جھٹ پٹ ترکیب پوچھی اور تین گز کا صحن عبور کر کے سیڑھیوں کی طرف بڑھی۔ سیڑھی کی گرل کے پاس ہی اسد کے بڑے بھائی کی موٹر سائیکل کھڑی تھی' جو آج صبح ماں کے کہنے پر چھوڑ کر گئے تھے۔ اسد اسے کپڑے سے چمکا رہا تھا۔ وہ پاس سے گزرتے ہوئے "بینگن" کہہ کر تیزی سے سیڑھیاں چڑھ گئی۔

"اللہ کرے کسی دن تیزی سے چڑھتے ہوئے نیچے گرو اور تمہاری ٹانگ ٹوٹ جائے' چہ چہ۔ پھر کیسی لگے گی بیساکھی سے چپکی زرد چھپکلی۔" وہ اندر تک جل بھن گیا تھا' کتنا صبر کرتا۔

چاچی خالہ اور تائی خالہ دونوں اس کی کامیابی کے لیے دعاگو تھیں۔ دونوں ہی کی خواہش تھی کہ اس کی نوکری جلد لگ جائے۔ تائی خالہ کے بڑے بیٹے نے باپ کی دکان سنبھالی تھی۔ جس سے گھر کا لگا بندھا خرچ چل رہا تھا۔ تایا خالو بھی شام کو اس کی دکان پر بیٹھ جاتے۔ چچا خالو انکم ٹیکس کے دفتر میں اصول پسند ہیڈ کلرک تھے۔ ان کا بھی گزارہ بس چل ہی رہا تھا۔ ان ہی کے محکمے میں ایک سیٹ خالی ہوئی تھی' جہاں آج اسد انٹرویو دے کر خوشی خوشی لوٹا تھا۔

☆ ☆ ☆

سورج خاصا ڈھل چکا تھا۔ جاتی گرمیوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی شام نگر میں اتر رہی تھی۔ اسد نے بھتیجا بھتیجی کو گود میں بٹھا رکھا تھا اور پرجوش انداز میں اوپر منہ کیے زور زور سے نوکری ملنے کی مکمل تفصیل سنا رہا تھا۔ تائی خالہ' چاچی خالہ دونوں قریب بیٹھی واری صدقے جا رہی تھیں۔ اس نے خوشی میں بچوں کو بائیک کی سیر کروانے کا پروگرام بنایا۔ ازراہ ہمدردی اوپر بھی ہانک لگائی۔

"اگر کوئی بھوری ڈڈی جانا چاہے تو وہ بھی آسکتی ہے۔ آج مابدولت بہت خوش ہیں۔"

اس نے جل کر اوپر سے ایک بینگن اٹھا کر اسے دے مارا۔ "مجھے شوق نہیں ہے بن مانس کے ساتھ گھومنے کا۔" تائی خالہ چلا کر بولیں۔

"اے لڑکی! ذرا آرام سے جل گئی میرے کماؤ بیٹے سے۔ دیکھنا تو سہی محکمے والے گاڑی بھی دیں گے۔ کتنا پیارا لگے گا گاڑی چلاتا ہوا اور تیرے ساتھ اگلی سیٹ پر میں نے ہی بیٹھنا ہے۔" اگلی بات وہ بیٹے کی طرف منہ کر کے بڑے لاڈ سے بولیں۔

"ہاں تائی خالہ! آگے ایک بینر بھی لگوا لینا" "او بابا کے بچھڑے رشتے دار۔" وہ سیڑھی کی گرل پر جھولتی مزے لے کر بولی۔ چاچی خالہ کو غصہ آگیا۔ جوتی اتار کر اسے دے ماری۔

جہاں چاچی خالہ اس کی بدتمیزی پر کلس رہی تھیں وہیں وہ مزے سے اسے جوتی پڑتے دیکھ کر محظوظ ہو رہا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے اسے جوتی پڑنے کی "مبارک باد" دی۔

نوکری لگنے سے نہ تو اس کے مزاج میں کوئی تبدیلی آئی اور نہ وہ بی اے کے پیپر زدے کر بھی کچھ بدلی۔

پہلی تنخواہ ملنے پر اس نے دوستوں کی دعوت کر رکھی تھی۔ بھابھی اور وہ بیٹھی کھیر میں چمچہ چلا رہی تھیں۔ شامت کے مارے نے کالی جینز پر بہت خوب صورت سی اورنج شرٹ پہن لی اور اپنے کالے سلکی بالوں میں انگلیاں چلاتا کمرے سے نکلا۔

"بھابھی! کیسا لگ رہا ہوں۔" خوب اتراتے ہوئے بھابھی سے پوچھا گیا مگر نظریں بھابھی کے قریب بیٹھی کھیر کے اندر چمچہ چلاتے وجود پر تھیں۔ اس نے گردن ذرا کی ذرا اٹھا کر دیکھا۔ اس کے منہ سے ہنسی کا فوارہ پھوٹ پڑا۔

"بھابھی! ایسے لگ رہا ہے، کوئلے کی کان میں آگ لگ گئی ہو۔" اس کی ہنسی رکنے میں نہ آرہی تھی۔

اسد کو سچ مچ غصہ آگیا۔ اس نے فوراً" شرٹ اتار کر چولہے کی طرف پھینک دی اور کمرے میں چلا گیا۔ لمبا چوڑا، نک سک سے تیار وہ اس شرٹ میں اچھا خاصا پرکشش لگ رہا تھا۔ بھابھی کو بھی ماریہ کی بات اور انداز، دونوں ہی برے لگے۔ وہ منہ سے تو کچھ نہ بولیں۔ مگر ناراضی کے اظہار کے طور پر کھیر والا چمچہ اس کے ہاتھ سے لیا اور کھیر میں زور، زور سے چلانے لگیں۔

☼ ☼ ☼

تائی خالہ کو روز ... کی بڑھتی نوک جھونک کا اندازہ بخوبی ہونے لگا۔ وہ اپنا فیصلہ بدلنا چاہتی تھیں۔ ایک شام دونوں بہنیں چھت پر بیٹھی تھیں۔ ماریہ دوسری چارپائی پر دوپٹا سر سے پاؤں تک تانے لیٹی تھی۔ باتوں کے دوران تائی خالہ نے اسد کے باس کا ذکر چھیڑ دیا۔ باس کی تعریفیں بیان کرتے ہوئے پھر اپنے بیٹے پر اس کی عنایتیں بتانے لگیں۔ باتوں کے دوران ان کا چہرہ خوشی سے چمک رہا تھا۔

"ایسے ہی تھوڑی مہربان ہے وہ۔۔۔ ہمارے گھر آنا چاہ رہا ہے۔" وہ بہت رازدارانہ انداز میں بتا رہی تھیں۔ "اکلوتی بیٹی ہے اس کی۔۔۔ اسی کے لیے سلسلے میں آنا جانا کرنا چاہتا ہے۔ میری تو خواہش تھی کہ ماریہ، مگر۔۔۔" وہ قریب لیٹی ماریہ کی طرف دیکھتے ہوئے حسرت سے بولیں۔

"آپا! تم تو کہتی تھیں بچی ہے، خود ہی عقل آجائے گی۔" چاچی خالہ مرے مرے لہجے میں بولیں۔

"میرا کیا ہے، میں تو اب بھی کہتی ہوں، مگر۔۔۔ اب اسد نہیں مانتا۔ کہتا ہے اگر میں اسے اتنا ہی برا لگتا ہوں تو روز، روز گھر میں ڈراما ضرور لگواتا ہے۔"

دونوں بہنیں سر ہاتھوں میں تھامے بیٹھی رہیں۔

☼ ☼ ☼

اسد کے رشتے کی دبی دبی باتیں ہونے لگیں۔ ماریہ خوامخواہ ہی سب سے روٹھی روٹھی پھرتی۔ کبھی صبح صبح ہی چھت پر جا کر بیٹھ جاتی، کبھی سرِ شام چادر تان کر سو جاتی۔ ماں سے بھی بلاوجہ لڑتی۔

"میری شادی اس سے پہلے کرو۔ مجھے نہیں رہنا کالے کلوٹوں کے درمیان۔" چچی خالہ تو اس کے منہ سے شادی کی بات سنتے ہی حیران رہ گئیں۔ دن بدن وہ ان کے لیے وبال بنتی جا رہی تھی۔ انہوں نے ایک دو رشتہ کرانے والیوں سے بات کی۔ چند ہی دن میں دھڑا دھڑ رشتے آنے لگے۔ کبھی سبزی والوں کے۔ کبھی کریانے والوں کے۔ اب ایک پولیس والے کا رشتہ آیا جو چچا خالو نے رشوت خور کہہ کر ٹال دیا۔ ماریہ تو سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گئی۔

"ہر رشتے کو کیوں انکار کر دیتے ہیں۔ اگر وہ رشوت خور ہے تو گھر میں کون سے سور پل رہے ہیں۔"

"ہائیں۔۔۔ یہ کیا بک رہی ہے؟" چاچی خالہ کی تو حیرت سے آنکھیں ابل پڑیں۔ "اتنی بے غیرت لڑکی میں نے آج تک نہیں دیکھی۔ کم بخت! اپنے منہ سے ہی شروع ہو گئی۔"

"کیوں، اب بات کرنے کے لیے کسی اور کا منہ مانگوں۔۔۔ بس میں نے کہہ دیا نا، پہلے میری شادی ہو گی۔ اب جو بھی رشتہ آئے، انکار مت کرنا۔" وہ بے غیرتی کے تمام ریکارڈ توڑ رہی تھی۔

"دودھ دہی والے کا آیا ہوا ہے، اب کیا پہلوانوں کے سپرد کر دیں؟" چاچی خالہ نے کھا جانے والی نظروں سے اسے گھورا۔

"جہاں مرضی پھینک دیں۔۔۔ مگر۔۔۔ اس۔ سے۔۔۔ اس سے پہلے۔۔۔" وہ ناک سکیڑتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ وہ اس گھر سے جلد از جلد نکل جانا چاہتی تھی۔ شاید اسد کی زندگی میں کسی کو دلہن بن کر آتا دیکھ نہیں سکتی تھی یا کوئی اور دشمنی تھی اس سے۔

چاچی خالہ اس کی بدتمیزی پر کڑھ رہی تھیں۔ ساتھ ڈر بھی تھا، کہیں گھر میں اس کی ہٹ دھرمی کا شور نہ مچ جائے۔ انہوں نے اپنی تلاش تیز کر دی۔ اللہ اللہ کر کے ایک جگہ بات طے ہو گئی۔ لڑکے کی کپڑے کی دکان تھی۔ گھر بھی ٹھیک ٹھاک تھا۔ دو چار دن آنا جانا ہوا۔ گھر کے ہر فرد کو رشتہ پسند آگیا۔ لڑکے والوں کو ان سے بھی زیادہ جلدی تھی۔ اسد کے رشتے والی بات تو درمیان میں ہی رہ گئی۔ جانے بات بھی تھی یا اس نے ماں کے سامنے شوشا ہی چھوڑا تھا۔ مگر ماریہ کی شادی کی تیاریاں زوروں پر ہونے لگیں۔ روز چاچی خالہ، تائی خالہ اور بھابھی کے ہمراہ بازار جاتیں۔ ڈھیروں شاپروں سے لدی گھر آتیں۔ بھابھی نے تو ماریہ سے بھی کئی بار کہا۔

"تم بھی بازار چلا کرو۔"

"وہ شاپنگ کے لیے ساری زندگی پڑی ہے۔" کہہ کر اٹھ جاتی۔ ماریہ خاصی چپ چپ رہنے لگی۔ گھر میں بھی امن چین ہو گیا۔ ہر کوئی اپنی تیاری کرنے میں مصروف تھا۔ چاچی خالہ جہیز اکٹھا کرنے میں مصروف تھیں۔ اس کی خاموشی کو کسی نے محسوس نہیں کیا۔

اسد بھی تھکا تھکا سا دیر ہی سے گھر آتا۔ پوچھنے پر دفتری مصروفیت کا بہانہ کر کے چارپائی پر کمبی تان کر سو جاتا یا سونے کی بھرپور اداکاری کرتا۔

ماریہ کا چہرہ خاصا بجھتا جا رہا تھا۔ مگر فرصت کسے تھی، جو کوئی غور کرتا۔ پہلے بھی وہ اکثر پلنگ پر پڑی سوتی رہتی یا دبے قدموں سے چھت ناپتی رہتی تھی۔

اور تو اور بقر عید بھی آرام سے گزر گئی۔ ورنہ عید کے دنوں میں ایک ہنگامہ بپا ہوتا۔ ماریہ محلے میں کسی کا کالا بیل دیکھ کر اس کا نام "اسد" رکھ دیتی تو اسد بھی قربانی کے لیے ڈھونڈ کر سفید بھیڑ لے کر آتا اور اس پر مہندی سے بڑا بڑا "ماریہ" لکھ دیتا۔ نام لے لے کر گھاس کھلاتا۔ پھر قربانی کے بعد گوشت منہ بنا، بنا کر کھاتا۔

"ماریہ کا گوشت کتنا کڑوا نکلا۔"

وہ بھی بخشنے والی کہاں تھی۔ ہمسائیوں کے گھر سے گوشت آتا تو زور سے کہتی۔ "اسد کا گوشت اس کی رنگت سے بھی کالا نکلا۔"

مگر اس عید پر کوئی ہنگامہ نہ ہوا۔ اس کی شادی کی تاریخ ربیع الاول کے بعد کی رکھی گئی تھی۔ زندگی کے گھڑیال نے وہ دن بھی لا کھڑا کیا۔

رات کو مہندی کی ہلکی پھلکی تقریب ہوئی۔ اسد کے دفتر میں کام بہت تھا۔ وہ شرکت نہ کر سکا۔ دونوں بہنوں کے میکے اور سسرالی رشتہ دار تھے تو مشترکہ ہی مگر تھے ڈھیر سارے۔ اس لیے چھوٹا سا گھر بھی خاصا بھرا ہوا تھا۔ بارات تو شام کی تھی، مگر تیاریاں صبح سے ہی شروع تھیں۔ گھر کے باہر شامیانے میں دیگوں کے انبار لگے تھے۔ چچا خالو باورچی کو ہدایات دے رہے تھے۔

"کھانا بھی عمدہ ہو اور خرچا بھی کم آئے۔" بار بار کاغذ پر لکھ لکھ کر حساب لگاتے۔ تایا خالو ڈیکوریشن والے کو ہدایت دے رہے تھے۔ اسٹیج کس طرح کا ہو۔ کتنا بڑا رکھنا ہے۔ خواتین کے شامیانے میں

پردے کا مکمل انتظام ہو' وغیرہ وغیرہ۔ بھائی جان چھت پر چڑھے' بلکہ آدھے دیوار پر جھکتے ہوئے لائٹنگ والے کا دماغ کھا رہے تھے۔

"یار! یہ "خوش آمدید" کا بورڈ یہاں لگا دو۔ تھوڑا اور ادھر کرو۔" وہ دیوار پر ہاتھ مار' مار کر سمجھا رہے تھے۔

پانچ مرلے کا گھر مچھلی بازار بنا ہوا تھا۔ تائی خالہ ماسی کو ہدایات دے رہی تھیں۔ چاچی خالہ اکلوتی بیٹی کی جدائی پر "سُوں سُوں" کرتی ناشتے کا بچا کھچا سامان بھابھی کے ساتھ مل کر سمٹوا رہی تھیں۔

اوپر ایک کمرے میں دو چار مہمانوں کے علاوہ ایک کونے میں ماریہ اپنا سر گھٹنوں میں دیے بیٹھی تھی۔ تائی خالہ کی بڑی بیٹی قریب آکر آہستگی سے بولی۔

"تمہیں پارلر کب جانا ہے۔ تمہارے ساتھ میں چلوں گی۔" اسے شاید اپنی شادی کا دن تازہ کرنا تھا۔

"مجھے ضرورت ہی نہیں ہے۔" ماریہ رُوکھے انداز میں بولی۔ اس کی گول آنکھیں خاصی سوجی ہوئی لگ رہی تھیں' مگر گردن کی اکڑ میں ذرا فرق نہیں آیا تھا۔

"لو بھلا! پھر کیسے اچھی لگو گی؟" اس نے اپنے پروگرام پر پانی پھرتا دیکھا تو ناک چڑھا کر بولی۔

"چلو بھئی! سب نیچے چلیں۔ یہاں دلہن تیار ہوگی۔" بڑی بھابھی ایک بازو پر سرخ لہنگا ڈالے' ایک ہاتھ میں سامان سے بھرا تھیلا پکڑے بغل میں ایک موٹی سی دوشیزہ کو لیے کمرے میں آگئیں۔

دولہا کی بہن نے بیوٹیشن کا کورس کر رکھا تھا۔ اسے ہنر آزمانے کا بہترین موقع ملا۔ بھائی کی فرمائش کا نام دیتے ہوئے اپنی خدمات لے کر حاضر ہوگئی تھی۔ اب انکار کون کرتا۔ وہ بڑی مہارت سے کبھی کوئی کریم ملتی۔ کبھی اسفنج سے رگڑے لگا کر پوڈر کی تہہ چڑھاتی۔ ماریہ خاموشی سے اپنے رخساروں پر اس کی سختیاں برداشت کر رہی تھی۔ جتنی تیزی سے اس کے ہاتھ چل رہے تھے' زبان اس سے ... تیز ... چل رہی تھی۔ باتوں کے دوران کل پہنچنے والے جہیز پر بھی تبصرہ کر رہی تھی۔ فلاں پیز اچھی نہیں تھی۔ فلاں چیز کا تو فیشن ہی نہیں رہا۔ نندوں کے سُوٹ زیادہ ہی سستے لے لیے۔ ماریہ جانے کیوں خاموش تھی۔ وہ صبر کرنے والی تھی تو نہیں۔ وہ تو جواب میں دس سُنا کر بھی چپ نہ کرے مگر اب اتنی خاموشی سے اپنے جہیز کی برائیاں سُن رہی تھی۔ یہ بڑی حیران کن بات تھی۔

☆ ☆ ☆

اسد منہ اندھیرے ہی آفس چلا گیا۔ اس کے ایک قریبی کولیگ کو شادی کا پتا تھا' وہ اسے کام میں مگن دیکھ کر بہت ہی حیران ہوا۔

"اب اتنی بھی کیا فرض شناسی کہ بندہ گھر کی شادی بھی اٹینڈ نہ کر سکے۔"

اسد خاموشی سے اپنے کام میں لگا رہا۔ دھیان تو جانے کہاں تھا مگر انگلیوں کی پوریں کمپیوٹر کی بورڈ پر اور تیز چلنے لگیں۔ اس کے خیالوں کی رو گھر میں دلہن بنی ماریہ کے ارد گرد بھٹک رہی تھی۔

"بس بارات آنے میں چند گھنٹے ہی رہ گئے ہیں۔" اس نے تھکا تھکا سر کرسی کی پشت سے ٹکا دیا۔

ماریہ بھی خاموشی کا بُت بنی کبھی اپنی جلد بازی کو کوس رہی تھی۔ کبھی منہ پر زور' زور سے اسفنج رگڑتی اور قینچی جیسی چلتی موٹی نند کی زبان کو۔ اس نے اپنے آنسو بڑی مہارت سے گول گول آنکھوں میں روکے ہوئے تھے۔ نچلے صحن سے کئی آوازیں آرہی تھیں۔ آہستہ آہستہ آوازیں زور پکڑنے لگیں۔

بھابھی تیزی سے اوپر آئیں۔ دھاڑ سے دروازہ کھولا۔ ان کا منہ غصے سے سُرخ ہو رہا تھا۔ وہ چلّا کر بولیں۔

"جاؤ! دفع ہو نیچے' تمہیں لینے آئے ہیں۔"

دولہا کی بہن اس اچانک بے عزتی پر بوکھلا گئی۔ بھابھی کا رویہ' چنگاریاں' برساتی آنکھیں دیکھ کر اس نے جلدی جلدی اپنا سامان تھیلے میں ڈالا اور نیچے کی طرف دوڑ لگائی۔ ماریہ حیرانی سے کبھی بھابھی کو تکتی' کبھی اپنی نند کو۔

اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ بھابھی اپنا سر تھامے اس کے قریب بیٹھ گئیں۔

چاچی خالہ روتے ہوئے کمرے میں آرہی تھیں۔ وہ کبھی اپنے مرنے کی بددعائیں کرتیں۔ کبھی بھوری کی قسمت کو روتیں۔

"ہائے ناس ماری۔ تیری جلدی نے یہ دن دکھایا۔ کم بخت دو بچوں کا باپ نکلا۔" وہ بے چاری روئے جا رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

دراصل لڑکے کا بھائی نکاح کا رجسٹر لے کر پہلے ہی آگیا تھا تاکہ فارم بارات آنے سے پہلے ہی پُر ہو جائے۔ جو معاملات طے کرنے ہیں' پہلے ہی ہو جائیں' تاکہ نکاح کے وقت بدمزگی نہ ہو۔

چاچی خالہ نے مہمان داری کے فرائض نبھاتے ہوئے بیٹھک میں ماسی کے ہاتھ چائے بھجوادی۔ ماسی اسے دیکھتے ہی پہچان گئی۔ وہ پہلے ان کے گھر بھی کام کر چکی تھی اور اچھی طرح جانتی تھی کہ پہلے طلاق صرف جہیز کی کمی کے باعث ہوئی تھی۔ بدبخت لالچی بہت تھے۔ وہ تو زور' زور سے شروع ہو گئی۔ نہ صرف دو بچوں کا بتایا' بلکہ سسرال کا اتا پتا بھی بتا دیا۔

بھائی جان نے دولہا کے بھائی کا گریبان پکڑ لیا۔ چچا خالو چکرا کر گر پڑے۔ اندر عورتوں کو پتا چلا' وہ رونے پیٹنے لگیں۔ ہر فرد غم و غصے میں تھا۔ سب کو یہ پریشانی تھی' اب لوگوں کو کیا جواب دیں۔ تایا خالو ہمیشہ کی طرح جذبات میں آگئے۔

"وہ الو کا پٹھا کہاں ہے۔ اس کے باپ نے اس وقت دفتر کھول رکھا ہے؟" وہ گھڑی پر سات کا ہندسہ دیکھ کر آگ بگولہ ہو رہے تھے۔ "تو کیوں پریشان ہوتا ہے۔ نکاح آٹھ بجے ہی ہوگا۔" وہ بھائی کو چکراتے دیکھ کر بوکھلا گئے۔

آخر کار بھائی جان اسد کو ڈھونڈ ہی لائے۔ مہمان آنے شروع ہو گئے۔ نکاح خواں کو بلایا گیا۔ سمجھ' نا سمجھی' حیرت' خوشی' عجیب ہی عالم میں اسد نکاح کے بعد ہاتھ اٹھائے خدا تو کیا مانگ رہا تھا۔ کبھی چچا خالو کی شکر گزار آنکھوں کو دیکھ رہا تھا۔ کبھی باپ کی فخر سے تنی گردن۔ بھائی جان خوشی میں چھوٹے بھائی کے گلے لگے۔ انہوں نے اسے بہت زور سے بانہوں میں بھینچا۔ اسد کا کمرا جھٹ پٹ مہمانوں کے قبضے سے چھڑوا کر مہندی کے دن والی سجی کرسی سے لپٹے رنگ برنگے کاغذی پھول اور ربنوں سے آن کی آن میں تیار کر دیا۔ حیران پریشان چھوٹی بھابھی کو بھی ایسی افراتفری میں فرض نبھانا یاد آگیا۔ انہوں نے حجلۂ عروسی میں جاتے اسد کو دروازے پر روکا اور ایک مخملی ڈبیا اسے تھما دی۔

"اس وقت تو یہی ہے' تم یہی دے دینا۔"

اسد نے ڈبیا غور سے دیکھی۔ اس میں وہی بریسلٹ تھا جو بھائی نے بھابھی کو دیا تھا۔ اس نے بہت شکر گزار نظروں سے بھابھی کو دیکھا۔ بھابھی نے پیار سے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ اس نے ڈبیا اپنی جیب میں رکھ لی۔ اسد نے وہی سبز اپر پہن رکھا تھا۔ جس پر ماریہ اسے بینگن کہتی تھی۔ اب وہی بینگن اس کی خدمت میں پیش ہونے چلا تھا۔

اسد بڑے فخر سے کمرے میں داخل ہوا۔ سلام کے بعد کچھ دیر بیٹھا رہا۔ الفاظ بھی تو کچھ ترتیب دینے تھے۔

ماریہ نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور بھابھی کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے پہل کا مظاہرہ کیا۔ اس نے پرس سے ایک چھوٹی ڈبیا نکالی۔ بالکل بھابھی کی ہدایات پر چلتے ہوئے بڑی ادا سے "سوری" کہا اور ڈبیا اس کی طرف بڑھا دی۔

وہ فرطِ مسرت سے کھل گیا۔ "سوری" کی تو امید ہی نہیں تھی۔ اس نے پیار سے ڈبیا کھولتے ہوئے پوچھا۔ "اس میں کیا ہے؟"

ایک موٹا سا چمکتا ہوا بھنورا "بھوں بھوں" کرتا آزاد ہو کر اڑا۔ ماریہ کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔

"یہ بھابھی نے کیا بے ہودہ مذاق کیا ہے۔" اسے دل ہی دل میں بھابھی پر بہت غصہ آیا۔

اسد کو ماریہ پہ غصہ تو آیا مگر خاموش رہا۔ اسے ما...

سے ایسی ہی امید تھی۔ لیکن خیر۔ اس نے سر کو جھٹکا۔

"مگر میں تمہاری طرح کمینہ نہیں ہوں۔" اس نے کہہ کر مخملی ڈبیا نکالی۔ ماریہ نے شرمندگی سے سر جھکاتے ہوئے کلائی آگے بڑھادی۔ اسد نے اس کے شرمسار چہرے پر ایک نظر ڈالی اور مسکرا کر ڈبیا کھولی۔

پتلی سی زرد چھپکلی نے ماریہ کے لہنگے پر چھلانگ لگائی۔

اسد بوکھلا کر کھڑا ہو گیا۔ ماریہ نے چیخیں مارتے ہوئے لہنگا جھٹکا۔ بیڈ سے چھلانگ ماری اور ایک ہی جست میں ہانپتی کانپتی دروازے سے باہر تھی۔ وہ باہر کھڑی خوف سے لال پیلی ہوتی لمبے لمبے سانس لے رہی تھی۔ وہ بے چارہ بھی سر جھکا کر باہر آگیا۔

بیڈ پر بچھی سرخ مخمل کی چادر پر زرد چھپکلی کا راج تھا۔ کالا بھنورا بھوں بھوں کرتا ٹیوب لائٹ سے ٹکریں مار رہا تھا۔ وہ دونوں لاچار سے اپنے کمرے سے باہر کھڑے تھے۔ بھائی بھابھی کو پہلے ہی اس صورت حال کا پتا تھا۔ پوری کمینگی سے دانت نکالتے ہوئے اپنی خدمات لے کر حاضر ہوئے۔

"آخر آگیا نا اونٹ پہاڑ کے نیچے۔" بھابھی خوب ہنستے ہوئے بولیں۔

"پہاڑ کے نیچے نہیں۔ کوہ طور کے نیچے۔" ماریہ ادھار رکھنے والی کہاں تھی۔ دوپٹا اتار کر گولا بنایا اور پھینکنے ہی والی تھی کہ اسد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر دوپٹا چھین لیا اور دانت کچکچا کر بولا۔

"صحیح کہا تم نے کوہ طور۔ اب یاد رکھنا! جلا کر اپنی طرح سیاہ کردوں گا۔" اسد نے ماریہ کی آنکھوں میں آنکھیں گاڑ کر کہا۔ ساتھ ہی اس کا چوڑیوں سے بھرا ہاتھ زور سے دبایا۔ ماریہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تھا کہ اسد کی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں عجیب سی چمک محسوس کر کے اس کا منہ کھلا ہی رہ گیا۔

وہ دونوں آمنے سامنے بے حد قریب کھڑے ایک دوسرے کو تک رہے تھے کہ بھابھی کی شوخ سی آواز پر دونوں چونکے۔

"آپ دونوں شاید بھول رہے ہیں کہ آپ دونوں اب صرف کزن نہیں رہے۔ میاں بیوی بن چکے ہیں۔ اپنے لڑنے کا انداز اور جگہ بدل لیں۔"

"مطلب؟" وہ دونوں ایک ساتھ بولے۔

"مطلب رومانٹک انداز میں لڑیے اور اپنے کمرے میں جا کر لڑیے۔" بھابھی مسکرا کر بولیں۔ اسد نے ایک دم اس کا ہاتھ چھوڑا۔ ماریہ نے تیزی سے اپنا دوپٹا اس کے ہاتھ سے چھڑایا اور کمرے میں بھاگی مگر بیڈ پر چھپکلی دیکھ کر الٹے پاؤں پلٹی اور اسی تیزی سے اپنے پیچھے آتے اسد سے ٹکرا گئی۔

"اپنے گورے رنگ کی قسم کھا کر کہو کہ آئندہ میرا احترام کرو گی تو یہ چھپکلی بھگاؤں؟" اس نے سینے پر ہاتھ باندھے۔

"پہلے تم اپنے توے جیسی رنگت کی قسم کھاؤ کہ مجھ سے محبت کرو گے؟" اس نے اٹھلا کر جواباً کہا۔

"اوکے۔" اسد نے گردن ہلائی۔

"مجھے اپنے گورے رنگ کی قسم تمہاری عزت کروں گی۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ اسد مسکرایا اور پلاسٹک کی چھپکلی اٹھا کر جیب میں رکھ لی۔

"تم۔ کالے بینگن۔" ماریہ کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اسد زور سے قہقہہ لگا کر بیڈ پر دھم سے بیٹھ گیا۔

"تم قسم کھا چکی ہو۔" وہ پھر ہنسا۔ ماریہ کچھ دیر تو یونہی کھڑی رہی پھر مسکرا کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"اب ساری عمر نبھاؤں گی اپنی قسم۔" اسد نے چونک کر اسے دیکھا پھر مطمئن ہو کر مسکرا دیا۔

دونوں کو یقین آگیا کہ اس نوک جھونک کے ساتھ بھی ان کی زندگی اچھی گزرے گی۔

فرحانہ ناز ملک

ہادی کو جھولے میں بڑی احتیاط سے سلانے کے بعد میں نے طمانیت بھری سانس کھینچی۔ توبہ ہے چھٹانک بھر کے بچے نے انگلی پر نچا ڈالا تھا۔ واقعی بڑے سچ کہتے ہیں۔ بچے پالنا آسان کام نہیں۔ دس ماہ کا ہادی ایسا بلا کا شرارتی تھا کہ اس کے جاگنے کے دوران مسلسل میری چک پھیریاں لگی ہوتی تھیں۔

کبھی اس کے ہمراہ بیڈ کے نیچے۔۔۔ تو کبھی اس کے تعاقب میں سیڑھیوں پہ۔۔۔ سچ مچ دماغ گھوم جاتا تھا۔ تب ہی تو اسے سلانے کے بعد سکون سا محسوس ہوتا تھا۔

جیسا کہ ابھی محسوس ہو رہا تھا۔ ہلکی پھلکی ہو کر میں نے گلے میں پڑا دوپٹا کھینچ کر سائیڈ تکیے پر رکھا اور خود بیڈ پر لیٹ گئی۔ جھولا قریب ہی رکھا تھا۔ آہستگی سے ہلا ڈالا۔

کام میرے سر پر اتنے تھے نہیں کہ بیٹے کے سو جانے کے بعد میں ان میں جُت جاتی۔ ویسے بھی میں بڑی "نازوں پلی بیوی" ہوں۔ میرے میاں نے مجھے ہاتھ کا چھالا بنا رکھا ہے۔

یہ تو "بیٹے صاحب" نے آکر جتایا کہ زندگی آرام، سکون کے علاوہ بھی کچھ ہوتی ہے۔ تکیے کے نیچے رکھی کتاب کھولی ہی تھی کہ موبائل گنگنا اٹھا۔

"چلو جی۔۔۔ صاحب بہادر آج پھر سیل فون بھول گئے۔" کمپیوٹر ٹرالی پر دھرے موبائل کی طرف میرا دھیان اب گیا تھا۔ میاں جانی اپنا سیل فون اکثر گھر میں بھول جایا کرتے تھے۔ ایسے میں میری موجیں ہو جاتیں۔ جی بھر کر کارڈ کا خاتمہ کرتی۔ اس وقت بھی موبائل کی گھر موجودگی سے مجھے بڑی راحت محسوس ہوئی۔ گھر میں پی ٹی سی ایل ہونے کے باوجود میں میاں کی جیب موبائل استعمال کر کے ہلکی کرتی۔ یوں ہی۔۔۔ عادتاً۔

اس بات پر راحیل اکثر کہتے ۔۔۔ تھے کہ اپنا الگ سے لے لو۔ لیکن مجھے ایسی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ دو، ایک دوستیں تھیں، جنہیں ایس ایم ایس بھیجنے کا شوق راحیل کے موبائل پر ہی پورا ہو جاتا تھا۔ الگ لینے کی ہنج میں نے کبھی نہیں پالی تھی۔

اس وقت بھی میں نے فوراً" سیل فون اٹھالیا۔ تب تک اسے چپ لگ گئی تھی۔

میں نے دیکھا، کوئی نیا نمبر تھا۔ جو آج سے پہلے راحیل کے موبائل پر کبھی نہیں آیا تھا۔

"ہوگا کسی کا۔" کندھے اچکا کر، سیل فون ہاتھ میں لیے میں دوبارہ ۔۔ لیٹ گئی اور بجائے سونے کے گیم کھیلنے لگی۔

ابھی دو منٹ بھی نہیں ہوئے تھے کہ اسی نمبر کی مسڈ کال دوبارہ موصول ہوئی۔

میں قطعی اہمیت نہ دیتی، اگر جو اگلے دس منٹ تک مزید مسڈ کال موصول نہ ہوتیں۔ میں سیل فون آف کرنے کا ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ مسیج ٹون گنگنا اٹھی۔

تیوری چڑھا کر میں نے فوراً" مسیج پڑھنا اسٹارٹ کیا اور پڑھنے کے بعد تو چکرا کر رہ گئی، لکھا تھا۔

"میں سیف ہوں اور آپ سے دوستی کا خواہاں ہوں۔ میں نے آپ کو دیکھا ہوا ہے۔ آپ اکثر اسپتال چوک سے گزرتی ہیں۔ پلیز جواب دیں، میں منتظر ہوں۔"

"پاگل کا بچہ۔" ہنسی بھی آئی اور پریشانی بھی ہوئی کہ یہ بندہ کہاں سے نکل آیا ہے کہ جس نے مجھے دیکھ بھی رکھا ہے۔ جبکہ میں تو نقاب میں ہوتی ہوں۔ صرف آنکھیں ہی نظر آتی ہیں۔ خیر نظر انداز کر کے میں نے آنکھیں موند کر سونا چاہا، لیکن کہاں جی۔ یہ سیف صاحب لسوڑھا ہی بن گئے پورے۔ جی بھر کر مسڈ کالز دیں ۔۔۔ رسپانس نہیں ملا تو ایک اور مسیج بھیج دیا۔

"خوب صورت گرے آنکھوں والی ہدیہ۔۔۔ میں منتظر ہوں۔"

"ہا۔۔۔!" اب کی بار میں دھک سے رہ گئی۔ کون گدھا ہے، جو میری آنکھوں کا کلر ہی نہیں نام بھی جانتا ہے۔ یقیناً" کوئی جان پہچان والا ہوگا۔ یہی سوچ کر میں نے اس کا نمبر ڈائل کیا کہ ٹریس کر سکوں، آیا گدھا ہے یا گدھی۔ پر دوسری طرف سے فون ریسیو ہی نہیں کیا گیا۔ تب میں نے زچ ہو کر مسیج ٹائپ کر کے بھیجا۔

"جہنم میں جاؤ۔ دوبارہ کال کی تو تھانے کی ہوا کھلا دوں گی۔" اب یہ میری عقل پر ماتم کرنے کا مقام تھا کہ سیل فون آف کرنے کی سوچ دوبارہ میرے ذہن میں نہیں آئی۔

چند لمحوں کے توقف کی دیر تھی۔ ایسا مسیج موصول ہوا کہ میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ بڑے پیارے سے پھڑکتے ہوئے دل والا پکچر مسیج تھا۔ جس کے نیچے "آئی لو یو ہدیہ" درج تھا۔ غصے کے ساتھ ساتھ مجھ پر گھبراہٹ بھی سوار ہو گئی کہ کون لوفر پیچھے پڑا ہے۔ لرزتے ہاتھوں سے میں نے موبائل پر گرفت مضبوط کی۔ تینوں بھیجے گئے ایس ایم ایس ڈیلیٹ کرنے کے بعد نمبر ٹائپ کرنے لگی۔۔۔ پر بیلز بجتی رہیں، فون ریسیو نہیں کیا گیا۔

"کون ہو سکتا ہے۔" سوچ سوچ کے دماغ شل ہو گیا۔

اس دوران میں ایک اور رومانٹک سا پکچر مسیج موصول ہوا۔ دو پرندے شاخ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ نیچے "سیف اینڈ ہدیہ" لکھا منہ چڑا رہا تھا۔ بہت بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ لیکن عقل ابھی بھی سوتی رہی۔ جاگتی تو سیل فون ہی آف کر دیتی۔ پر میں اسی کو چمٹی رہی۔ اچھا خاصا سلگتے ہوئے میں نے اسی نمبر پر مسیج بھیجا اور ایسی ایسی گالیاں لکھیں کہ یقیناً" پسینے پسینے ہو گیا ہوگا پڑھ کر۔ یہی نہیں اگلی نسلوں تک کو سبق دے گا کہ بیٹا آئندہ کسی کو موبائل پر تنگ نہ کرنا۔

اس کے بعد میں نے اپنی "دو کی سہیلی" نگی کو مسیج بھیج کر پورا قصہ سنایا۔ ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ کتنی اور کون کون سی گالیاں دی ہیں۔ جواب میں اس نے بھیجا۔

"خیال کرنا تھا کچھ۔۔۔ ایسی بے ہودہ گالیاں دے دیں۔ کوئی اپنا تمہیں پاگل نہ بنا رہا ہو۔" پڑھ کر میں نے چند لمحوں کے لیے سوچا ضرور۔۔۔ واقعی اگر ایسا ہو گیا تو وہ "اپنا" کیا سوچے گا کہ اتنی مہذب اور معصوم سی نظر آنے والی ہدیہ نے "گالیوں" میں پی ایچ ڈی کر رکھی ہے کیا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہ اس اپنے نے مجھے تنگ کرنے کا سوچا کیوں؟ پہلا قصور اس کا بنتا ہے۔ مجھے تو بطور رد عمل غصہ آنا ہی آنا تھا۔ ایسی سچویشن میں گالیاں ہی دی جاتی ہیں۔ پھولوں کے ہار نہیں پہنائے جاتے۔ یہی سب کچھ میں نے نگی کو بھی لکھ بھیجا۔

بہر حال۔۔۔ شام میں راحیل آئے تو میں خلاف معمول بوکھلائی ہوئی تھی۔

"کارڈ تو ختم کر دیا ہوگا تم نے؟" تھوڑا بہت ریسٹ کر لینے کے بعد وہ سیل فون کی جانب بڑھے ہی تھے کہ میں نے جھپٹ کر اٹھالیا۔

"نہیں۔۔۔" ہونٹ پھیلا کر کھسیاہٹ چھپانی چاہی۔

"اور ابھی اسے میرے ہی پاس رہنے دیں۔ نگی کا فون آنا ہے۔" میرے دل کا چور تھا جو مجبور کر رہا تھا کہ موبائل میں اپنے پاس رکھوں۔ حالانکہ میں نے کوئی غلط حرکت تو کی ہی نہیں تھی، لیکن پھر بھی۔۔۔ احتیاطاً" اٹھالیا کہ "سیف صاحب" کی مسڈ کالز میاں صاحب کے آنے سے پیشتر متواتر آتی رہی تھیں۔

"او کے۔۔۔ لیکن چارجنگ پر لگا دو، سگنل ڈاؤن ہو رہے ہیں۔" کندھے اچکا کر انہوں نے کہا اور لاؤنج میں چلے گئے۔ اب یقیناً" ٹی وی پر کسی بھی نیوز چینل کی روزی روٹی کھلنی تھی۔

اطمینان کا سانس لینے کے بعد میں نے سیل فون چارجنگ پہ لگا دیا۔

مگر نامعلوم مسڈ کالز نے خاموشی گناہ سمجھ لی تھی شاید۔ کئی بار موصول ہوئیں۔۔۔ یہاں تک کہ راحیل لاؤنج سے چنگھاڑے۔

"ہدیہ۔۔۔ موبائل میرے پاس لے آؤ، کس کا نمبر ہے؟"

"او گاڈ!" میں اچھی خاصی بوکھلا اٹھی۔ میرا فی الحال پڑاؤ بھی بیڈ روم میں ہی تھا۔ "یاسمین بنگ کر رہی ہے، آپ کا نمبر نہیں۔"

حلق پھاڑ کے میں نے اپنی دوست کا نام لے کر جھوٹ بولا۔ لیکن در حقیقت مجھے شک بھی یاسمین پر

ہی تھا۔ وہ بدتمیز کئی بار مجھے تنگ کر چکی تھی۔

"اور یہ تم آج بیڈ روم میں کون سے چلے کاٹ رہی ہو۔ باہر آؤ۔ مجھے چائے بنا دو۔"

"آپ کو مٹھی میں کرنے کے لیے چلّہ کاٹ رہی ہوں اور صبر کریں' چائے بھی مل جائے گی۔" بیڈ روم سے ہی ہانک کر میں نے جواب دیا۔ راحیل کا قہقہہ کمرے تک سنائی دیا تھا۔

"ماشاء اللہ۔ ابھی اور کتنا مٹھی میں کرنا ہے۔ میری صبح شام تمہیں دیکھ دیکھ کر ہوتی ہے اور تم چلّے کاٹ رہی ہو۔ خیال رکھنا' کہیں الٹے نہ ہو جائیں' بجائے مٹھی میں آنے کے میں باہر ہی نہ نکل جاؤں۔" راحیل کے شوخ سے جملے میں اس وجہ سے نہ سن سکی کہ ان کے بولنے کے دوران ہی میرے "نام و نہاد عاشق" کی مس کال آگئی تھی۔

اب تو میری پریشانی دوچند ہو گئی۔ اگر یہ کالز اس وقت بھی آگئیں جس وقت موبائل راحیل کے پاس ہوتا ہے تو کیا ہو گا اور یہ "سیف علی خان" کا جانشین میسج بھیجنے میں بھی دیر نہیں لگاتا۔

بیٹری فل ہو جانے کے بعد میں نے کچن کی راہ لی۔

"اسے تصویر بنا کر گلے میں لٹکا لو۔" لاؤنج میں سے گزرتے ہوئے راحیل کا جملہ ہوائی حملے کی صورت سر پر گرا۔ انہوں نے یقیناً میرے ہاتھ میں موبائل دیکھ لیا تھا۔

کچن میں آکر میں نے چائے کا پانی چڑھایا۔ ساتھ ہی نگی کو میسج بھی ٹائپ کرنے لگی۔

"نگی۔ یاسمین مجھے تنگ کر رہی ہے' مجھے پورا یقین ہے' یہ یاسمین ہے۔ ہنڈرڈ پرسنٹ۔" اس کا جواب فوراً موصول ہو گیا۔

"عقل کو ہاتھ مارو اور اپنے قیافے اپنے ہی پاس رکھو۔ ہمیشہ غلط نکلتے ہیں۔ جو بھی تنگ کر رہا ہے' کرنے دو۔ رسپانس دے کر اسے زیادہ سر پہ سوار نہ کرو' خوامخواہ چمٹ جائے گا۔" میں نے اچھے بچوں کی طرح نگی کی مان لی اور جی جان سے چائے بنانے میں مگن ہو گئی۔

رات دس بجے جب میں ہادی کو سلانے میں لگی ہوئی تھی۔ راحیل نے پکارا۔ میں نے گردن موڑ کر انہیں دیکھا۔ وہ موبائل ہاتھ میں لیے بٹن پش کر رہے تھے۔

"ہدیہ۔ یہ نگی نے کیسا میسج بھیجا ہے۔ کون تنگ کر رہا ہے۔ خوامخواہ کون چمٹ جائے گا۔"

میرا تو رنگ ہی فق ہو گیا۔ جلدی میں نگی کا میسج ڈیلیٹ نہیں کر سکی تھی۔

"وہ۔ اصل میں نا۔ یاسمین۔" خوب لمبی وضاحتیں دے کر میں نے راحیل کی پرسوچ نظروں کا زاویہ بدلا تھا اور اس کوشش میں اچھی خاصی ہانپ بھی گئی۔ جس پل میں ہادی کو کاٹ میں سلا رہی تھی۔ اس وقت راحیل سرتاپا لحاف میں گم تھے اور نہ جانے کیوں مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ہنس رہے ہیں۔ لیکن خوامخواہ کیوں ہنسیں گے؟ اپنا ہی خیال جھٹکتی میں دوسری سائیڈ پہ آلیٹی۔

"میری طرف دیکھو۔" میرے پلٹنے سے پہلے ہی انہوں نے خود میری ڈائریکشن اپنی جانب پھیری۔

"کیا ہے۔ نیند آرہی ہے مجھے۔" سارا دن ہادی کے ساتھ لگے رہنے کی وجہ سے رات ہوتے ہی میری آنکھیں بند ہونے لگتی تھیں۔

"سو جانا۔ پہلے سرپرائز تو سن لو۔"

"صبح۔ ابھی نیند آرہی ہے۔" لیکن۔ راحیل کو سامنے والی پاکٹ سے نیا نویلا موبائل نکالتے دیکھ کر میری آنکھیں وا ہو گئیں۔

"یہ۔؟" مزید کچھ کہنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔ راحیل نے کوئی نمبر ٹائپ کیا تھا اور بیل میرے موبائل پر آئی کہ جو سائیڈ ٹیبل پر پڑا تھا۔

پہلے تو میں عجیب تذبذب میں گھری راحیل کی مسکراتی صورت گھورتی رہی۔ پھر ایک خیال کوندے کی مانند لپکا تو جھپٹ کر سائیڈ ٹیبل سے موبائل اٹھا لیا۔ مسڈ کال اسی نمبر سے دی گئی تھی کہ جس نے آج سارا دن مجھے ٹینشن میں رکھا تھا۔

"راحیل۔" بس نہیں چل رہا تھا میں سرتاج کو کیا کچھ کہہ ڈالوں۔ ان کے ہاتھ میں نیا موبائل دیکھ کر ساری اسٹوری سمجھ میں آگئی تھی کہ "سیف صاحب" ہی درحقیقت "راحیل صاحب" ہیں۔

"آپ نے مجھے تنگ کیا۔" میں اٹھ کر بیٹھ گئی۔ پارہ ہائی ہو گیا تھا۔

"میرا دل کر رہا ہے میں آپ کو۔"

"بس' بس فل اسٹاپ۔" راحیل بھی اٹھ بیٹھے۔

"تو ڈانٹ۔ تو مور گالیاں۔ پہلے ہی تم نے مجھے اتنی بے ہودہ گالیاں دی ہیں۔" میرے گرد بازو پھیلا کر انہوں نے ہنستے ہوئے کہا پر مجھ سے تو مسکرایا بھی نہ گیا۔

یہ سوچ کر کہ کتنے فضول میسج بھیجے تھے صبح انہوں نے۔ میرا دماغ کھول رہا تھا۔ راحیل کا دانت نکالنا بالکل بھی برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

"ہاتھ ہٹائیے۔ اور دور ہو کر بیٹھیں مجھ سے۔ زہر لگ رہے ہیں آپ مجھے۔" ان کا بازو ہٹانے کے بعد یہ سب کہا تو آواز ہی رندھ گئی۔ مجھے اپنی اس ٹینشن کا سوچ کر ہی رونا آنے لگا تھا کہ جو شوہر صاحب کی وجہ سے آج مقدر کا حصہ بنی تھی۔

"ہدیہ یار۔ وہ سب تو مذاق تھا۔ نیا موبائل لیا تو میں نے سوچا۔"

"آپ نے سوچا کسی اور کو نہ سہی بیوی کو ہی پاگل بنا لوں۔ بلکہ پاگل کیا۔ اس کا امتحان لے لوں آیا یہ "سیف" کے رومانس کا جواب مثبت دیتی ہے یا نہیں۔" روتے ہوئے میں نے یہ سب کہا تو راحیل بالکل چپ سے رہ گئے۔

"غلط سمجھ رہی ہو تم۔ میں نے تو یوں ہی مذاق کیا تھا' چھیڑ رہا تھا۔"

"جی نہیں' غلط آپ کہہ رہے ہیں۔" میں زور دے کر بولی۔

حقیقتاً راحیل کا یوں گھٹیا میسج بھیج کر تنگ کرنا مجھے اپنی بے عزتی محسوس ہو رہا تھا۔ یعنی میری۔ اپنی بیوی کی۔ ان کی نظر میں صرف اتنی وقعت۔ اتنی اہمیت ہے کہ وہ جب چاہیں جیسے چاہیں مذاق کے نام پر میری حرمت' پاس داری اور محبت کا امتحان لیتے رہیں۔

میں نے طنزیہ کہا۔ "چھیڑنے کا انتہائی مناسب طریقہ ایجاد کیا ہے آپ نے۔ یعنی کہ۔ جس کسی کو بھی اپنی بیوی کی وفاداری پر اعتبار نہ ہو۔ اس کی محبت پر شک ہو' وہ آپ کے ایجاد کردہ اس جدید طریقے سے استفادہ کرے۔ فوراً پتا لگ جائے گا کہ بیوی مخلص ہے یا فراڈ۔ اور پلیز آپ میرے متعلق بھی بتا دیجیے۔ کیا نتیجہ اخذ کیا آپ نے۔ آپ کی بیوی کتنی با اعتبار اور پارسا ہے۔"

"کیسی نہ سمجھ میں آنے والی فلمی باتیں کر رہی ہو تم۔ میں کیوں تم پر شک کروں گا۔ تم میری عزیز از جان ہو۔ میری بہت پیاری۔"

"بس چپ ہو جائیں۔" ہاتھ اٹھا کر میں نے نروٹھے پن سے کہا۔ "میری ان تعریفوں کا ثبوت آپ نے دے دیا ہے' مہربانی۔"

"ہدیہ۔ ہدیہ۔" راحیل جھنجلا سے گئے۔

"چھوٹے سے مذاق کو تم نے پہاڑ جتنا بنا لیا ہے۔ یار اصولاً تو مجھے ناراض ہو جانا چاہیے۔ اتنی۔ عظیم الشان گالیوں سے نوازا ہے تم نے۔ مت پوچھو' پڑھ کر کیا حالت ہوئی۔"

"سکون مل گیا ہو گا کہ بیوی پاکیزہ ہے' دوسروں کا میٹر ڈاؤن کرنے والی اور میری وفادار' فرماں بردار' اطاعت گزار۔" ان کی بات اچک کر میں نے جلے بھنے لہجے میں کہا تو وہ گہری ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئے۔

"تم سے تو میں جیت نہیں سکتا۔ لیکن پلیز' میرے مذاق کو تم غلط رنگ مت دو اور دیکھو! اسپیشل تمہارے لیے اتنا مہنگا سیل فون بھی خریدا ہے۔"

"آپ ہی کو مبارک ہو۔" میں نے تڑخ کر کہا۔ "میرے ہاتھ میں ہو گا تو مجھے اپنی بے عزتی یاد دلائے گا۔" کہتے ہی میں کروٹ بدل کر لیٹ گئی۔

"نگی سچ کہتی ہے... بڑی عمر کے "شوہر" شکی مزاج ہوتے ہیں۔" دوسری طرف منہ کیے میں نے قدرے بلند آواز میں نگی کا وہ مشہور زمانہ قول دہرایا۔ جسے سن کر میرے میاں بلبلا اٹھے تھے۔ خیر سے سولہ سال بڑے ہیں مجھ سے۔

"ہدیہ..." میری پشت پر ان کی پراحتجاج چنگھاڑ ابھری تھی۔

"سونے دیں، دن بھر بہت تنگ ہوئی ہوں۔ اب اور سکت نہیں۔" لاتعلق سے انداز میں کہہ کر میں نے لحاف میں سر گھسا لیا تھا۔ یقیناً" چھوٹا سا مذاق ہو سکتا تھا، اگر جو میں نے "قول نگی" یعنی "بڑی عمر کے شوہر شکی ہوتے ہیں" نہ سنا ہوتا۔ اب تو مجھے واضح لگ رہا تھا کہ راحیل نے مجھے چیک کرنے کے لیے ہی یہ حرکت کی۔ اگلی صبح مجھ سے رہا نہیں گیا۔ منہ ہاتھ دھوتے ہی نگی کو بتایا کہ وہ تنگ کرنے والا میرا سرتاج تھا۔ یاسمین بے چاری نہیں ہے۔ اس کا جوابی مسیج بلا تاخیر ملا۔

"بڑی عمر کے مرد شکی مزاج ہوتے ہیں۔ ویسے... راحیل بھائی نے تمہیں اتنی پیاری پیاری گالیاں سن کر تھینکس نہیں بولا۔"

میں بے چاری مسکرا بھی نہ سکی۔

ذہن کے پردے پر ایسی بہت سی باتیں ابھر رہی تھیں کہ جنہیں مدنظر رکھ کر نگی اپنا قول مشہور زمانہ دہراتی تھی یہ کہ بڑی عمر کے شوہر شکی مزاج کے ہوتے ہیں۔

☼ ☼ ☼

دو سال قبل... تین، چار رشتوں کے کوائف امی، ابو نے میرے سامنے رکھ کر مجھ سے میری چوائس پلس مرضی معلوم کرنی چاہی تو میں نے مشرقی لڑکیوں کی طرح "جو آپ کی پسند" کہہ کر ساری ذمہ داری ان ہی پہ ڈال دی۔ ان ہی رشتوں میں سے ابو کو اپنے دوست کے بیٹے راحیل میں جانے کون سی خوبیاں نظر آئیں کہ انہوں نے اس رشتے کو شرف قبولیت بخش کر عزیز و اقارب کو۔ حیران کر دیا۔

"ہائے... اتنی معصوم بچی کے لیے آدھی عمر کے مرد کو پسند کر لیا، ایسی بھاری تھی بچی۔"

"قریشی صاحب سے داماد ذرا ہی چھوٹا ہوگا۔"

"ارے تو اچھا ہے، سسر، داماد "ہم عمر" ہوں گے تو دوستی رہے گی۔" مایوس ہوئے لوگوں کی چہ میگوئیاں بھی ابو کا فیصلہ نہ بدل سکیں۔ ویسے بھی لوگوں کا جلاپا منہ سے نکل رہا تھا۔ خیر خواہی کے کلمات نہیں تھے۔

ان سب باتوں سے قطع نظر راحیل مجھے بہت پسند آئے۔ کسی شہزادے کی آن بان رکھنے والے... پوری محفل پر چھا جانے والی شخصیت کے حامل۔

میری خوشی کے برعکس میری فرینڈز کے سارے گروپ کو بھی راحیل کی بڑی عمر پر اعتراض تھا۔

"ہدیہ... تمہارے فیانسی میرے بڑے ماموں کے ہم عمر ہیں۔" کنول نے اپنے بے حد صحت مند، نکلی ہوئی توند والے "آدھے گنجم آدھے بالم" ماموں سے راحیل کو ملا کر مجھے سخت ذہنی جھٹکا پہنچایا تھا۔ بلبلا کر میں نے اسے گھوریاں دی تھیں۔

"کتنے نائس ہیں راحیل... میں تو اٹھتے بیٹھتے دعا مانگتی ہوں کہ ہر کسی کو بڑی عمر کا شوہر ملے۔"

"ہائے نہیں۔" سب نے کورس میں فلمی چیخ ماری تھی۔ "اللہ نہ کرے، ایسی بددعا مت دو۔"

"اور ویسے بھی ہمیں ہم عمر منگیتر دستیاب ہیں۔" نگی نے فخریہ کہا تھا۔

"ہاں، ہاں... نکے کا کے۔" میں نے طنزیہ سر ہلا کر کہا۔

"تمہارا ابوڑھا بابا۔" امبر نے کلس کر بدلہ چکایا۔

"جی ہاں ہدیہ صاحبہ... آپ کے فیانسی تو اتنے بڑے ہیں کہ میرے ماموں اپنے بیٹے کو راحیل بھائی کے پاس یہ سکھا کر بھیجتے تھے کہ "دادا ابا آپ شادی کب کریں گے؟" کنول نے گویا معلومات فراہم کی تھیں۔ سن کر سب کی کھی کھی گونجی۔ میرا منہ بن گیا۔ اس کے ماموں راحیل کے دوست تھے۔

"جو بھی کہو، میرے نزدیک بڑی عمر کے مرد بطور شریک زندگی ہیرا ہیں۔ بیوی کی یوں کیئر کرتے ہیں جیسے کسی چھوٹی بچی کی۔" میں نے ناصحانہ انداز اپنایا۔ سن کر سب کی "او... و... و" بلند ہوئی۔

"میری یہ بات بھی پلو سے باندھ لو، بڑی عمر کے مرد بے حد شکی مزاج ہوتے ہیں۔" نگی نے اپنا قول پہلی مرتبہ تب دہرایا تھا۔

"ایویں ہی... سر نہ کھاؤ میرا۔" میں نے تب اس کا قول ہوا میں اڑا دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اور شادی کے بعد بھی اڑاتی رہی۔

راحیل بالکل میری توقعات کے مطابق نکلے۔ بے حد کیئرنگ اینڈ لونگ۔ ایسے میں مجھے کہاں خیال آتا تھا کہ "بڑی عمر کے مرد شکی مزاج ہوتے ہیں۔" حالانکہ بہت ساری باتیں ایسی ہوئیں کہ جو اگر مجھ سے نادانستہ نظرانداز ہوئیں تو نگی کو اپنے قول کے عین مطابق محسوس ہوئیں۔ دو، ایک آپ کے گوش بھی گزار کر دوں۔

"6 ستمبر کے آنے سے پہلے... کیبل آپریٹرز نے "ویڈیو چینل" پر "الفا براوو چارلی" لگانا شروع کر دیا۔ یہ ڈراما مجھے تب سے پسند تھا جب یہ فرسٹ ٹائم آن ایر ہوا تھا۔ سو اس بار یہ دوبارہ لگنا شروع ہوا تو میری خوشی دیکھنے لائق ہوگئی۔ روزانہ ڈراما لگنے کے ٹائم میں سب کام چھوڑ چھاڑ ٹی وی سے چپک کر بیٹھ جاتی۔ حتیٰ کہ راحیل اور ان کے کسی بھی کام کو نظرانداز کر دیتی۔ پوری اقساط میں نے نہایت دل جمعی سے دیکھیں۔ جب ختم ہوگیا۔ تب راحیل کے سامنے اداسی کے عظیم الشان مظاہرے بھی کر ڈالے۔

"ہائے راحیل! اتنی جلدی ختم ہوگیا۔ کتنا اچھا ٹائم پاس ہو جاتا تھا۔ سچ مجھے یہ ڈراما بہت اچھا لگتا ہے۔" میرے یہ کلمات راحیل نے نو ریسپانس دے کر سنے تھے۔ میں نے بھی زیادہ اہمیت نہیں دی۔ کیونکہ راحیل کون سا ڈراموں کے بہت رسیا تھے۔ چند ہفتے

بمشکل گزرے۔ "الفا براوو" رات گئے پی ٹی وی سے
دوبارہ چالو ہو گیا۔ میری تو عید ہو گئی۔ چھوٹی چھوٹی سی
باتیں مجھے بے پناہ خوشی دیتی تھیں۔ اب تو میرے
پسندیدہ ڈرامے کی بات تھی۔ میں کیسے خوش نہ ہوتی۔
اس مرتبہ بھی یہ ڈراما میں نے کافی خشوع خضوع
سے دیکھا۔ اتنا کہ ایک رات راحیل نے جل بھن کر
پوچھا۔ "کس کو اتنے غور سے دیکھنے کا شوق ہے۔ گل
شیر، کاشف یا فراز؟"
میں ٹھہری کند ذہن... نہ تو ان کے غصیلے موڈ کی
پروا کی، نہ جملے کا مطلب سمجھ سکی۔ بلکہ آگے سے مزید
اشتیاق ظاہر کرتے ہوئے جواب دیا۔
"شہناز کو... آپ دیکھیں تو سہی، کیا کمال کی لڑکی
ہے اور راحیل... سب کہتے ہیں، اس کی شکل مجھ سے
بہت ملتی ہے۔ ہے نا..." بطور رد عمل انہوں نے اپنا وہ
ہنکارا بھی بھرنا گوارا نہیں کیا۔ جو اکثر و بیشتر مجھے آگ
لگا جاتا تھا۔
گاڑی کی غیر موجودگی میں اگر جو کبھی موٹر بائیک پر
کہیں جانا ہوتا تو راحیل ٹوک ٹوک کر مجھے عاجز کر دیا
کرتے۔
"یوں نہ بیٹھو... یوں بیٹھو... یہ میرے کندھوں
سے اچک اچک کر کے دیکھتی ہو... کتنا آکورڈ لگتا
ہے۔ سر جھکا کر، سائیڈ پر رخ روشن پھیر کر بیٹھا کرو۔"
"خوامخواہ ہی۔" میں ناراض ہو جاتی۔ "اللہ میاں
نے اتنا لمبا قد جو دیا ہے۔ رخ روشن آپ کے کندھے
سے اوپر نظر تو آئے گا ہی اور میں کمر جھکا کر کیوں
بیٹھوں۔ چک پڑ جائے گی۔" بعد میں نگی کے سامنے
ان باتوں کا تذکرہ بلا ارادہ کر دیا تو وہ کھی کھی کرتے ہوئے
مجھے شکی مزاج شوہر کی بیوی کہنے لگی۔ لیکن...
یہ سب تو بہت عام سی باتیں تھیں۔ میرا دھیان
ان پر اور جیسی دیگر بہت سی باتوں پر شاید ہی کبھی گیا
ہو۔ راحیل اتنے سوئٹ سے ہیں کہ مجھے ان کے
متعلق نگی کا یہ "عظیم الشان" لقب سخت ناگوار لگتا
تھا۔
اور آج کا پورا دن... سوئٹ سے میاں جانی کی طرف
سے ایسی ٹینشن گلے پڑی کہ وہ کونین سے بھی کڑوے
لگ رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے، میری ناراضی کی وجہ
سے وہ بے سکون ہو گئے ہیں۔ لیکن آپ ہی انصاف
کیجیے۔
اگر— میں اس طرح ان کو تنگ کرتی... اور آگے
سے یہ دل پشوری کی خاطر ہی سہی... مجھے خوش کن
رسپانس دے دیتے تو کیا میں ان سے قطع تعلق کر لیتی؟
نہیں نا۔ لیکن... خدانخواستہ بوریت کے ہاتھوں تنگ
آئی، میں سیف سے تھوڑی سی بھی فری ہو جاتی تو
انہوں نے میری سالہا سال کی پارسائی ایک طرف رکھ
کر... میرا اگلا دیا دینا تھا، ہے نا!
میرا خیال ہے۔ انہیں اس شرارت کی سزا میری
چند روزہ ناراضی کی صورت میں ملنا ہی چاہیے، آپ کا
کیا خیال ہے؟ ویسے... جاتے جاتے آپ مجھے اپنی
رائے بھی بتا دیں۔
"کیا بڑی عمر کے مرد واقعی شکی مزاج شوہر ثابت
ہوتے ہیں؟"
میرا خیال تو یہ ہے بڑی عمر یا چھوٹی عمر کا مسئلہ نہیں
محبت، ہی شکی مزاج ہوتی ہے۔ اسے ہر دم تائید تازہ کی
ضرورت ہوتی ہے یہ سکون سے نہیں رہنے دیتی۔ ہر
دم ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے۔

محبتوں میں عجب ہے دلوں کو دھڑکا سا
کہ جانے کون کہاں راستہ بدل جائے

کیا خیال ہے؟

سحرش بانو

شراکتِ جاں ماہا شہرین

اس نے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے چہرے پر نظر ڈالی۔

آنکھوں میں نمی، ہونٹوں پر نوحے اور چہرے پر ڈھیر سارا پچھتاوا۔ کیا وہ لوگ جو، جو چاہیں پالیں، ان کے چہرے ایسے ہوتے ہیں۔۔۔ تھکن زدہ اور پژمردہ؟

نم آنکھیں تو ان لوگوں کی رہتی ہیں جو اپنا سب کچھ

ناولٹ

کھو دیتے ہیں یا کسی کا چین چھین لیتے ہیں۔ اس کا بھی تو سب کچھ کھو گیا تھا یا شاید اس سے وہ سب چھین لیا گیا تھا۔

وہ محبتوں اور شفقتوں بھرے آنچل جن کی چھاؤں تلے اس نے اپنی عمر عزیز کے ساڑھے سترہ سال گزارے تھے۔ وہ لب جن سے ہر وقت اس کے لیے دعائیں پھوٹتی تھیں۔۔۔ اب بھولے سے بھی اس کا نام بھی نہ لیتے ہوں گے۔

اس نے ایک لمبی سی سانس خارج کی اور آئینے کے سامنے سے ہٹ گئی۔ ہولے ہولے قدم اٹھاتی وہ بستر پر آ کے بیٹھ گئی۔ اس نے بیڈ پر پڑا سرخ رنگ کا وہ مخملیں البم کھولا۔ جس میں اس کے تمام پیاروں کے پیارے پیارے سے چہرے تھے۔ وہ حویلی سے آتے ہوئے یہ البم ساتھ لے آئی تھی سب سے چھپا کر، ورنہ حویلی کے مکین تو شاید اسے یہ حق بھی کبھی نہ دیتے کہ وہ انہیں تصویر کی صورت بھی اپنی ساتھ رکھے۔ اتنی نفرت ہو گئی تھی انہیں شہرین آغا علی سے۔ اس کا جرم بھی تو بہت بڑا تھا۔ ناقابل معافی۔ اس نے خود اپنے اوپر سے ان کا اعتماد توڑا تھا۔ ان کی پرسکون زندگیوں میں کیسا بڑا طوفان لائی تھی وہ۔ کس لیے؟

صرف ایک شخص شاہان حیدر کے لیے اس نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔

پچھلے چار سال اس نے اپنوں سے الگ ہو کر کیسے گزارے تھے، یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ چار سال پہلے

اس پر حویلی کے دروازے بند کردیے گئے تھے اور اس کی وجہ کوئی اور نہیں، وہ خود تھی۔ جس نے سب کی نظروں میں خود کو گنوایا تھا۔ ایک شاہان حیدر کو پانے کے لیے۔

تو کیا شاہان حیدر اسے مل گیا تھا؟

اس نے خود سے سوال کیا اور اندر سے آنے والے جواب پر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☼ ☼ ☼

آج پھر اس کی یاد بے حد شدت سے اس پر حملہ آور ہوئی تھی۔ وہ کب سے کمرا بند کیے یوں ہی سوگ کی کیفیت میں بیٹھا تھا۔ کمرا مقفل تھا۔ ایسی حالت میں اسے کوئی ڈسٹرب نہیں کرتا تھا۔ وہ صوفے پہ بیٹھا کب سے سگریٹ پہ سگریٹ جلائے جا رہا تھا۔ وہ اتنی سگریٹ اسی وقت پیتا تھا۔ جب وہ اسے اتنی شدت سے یاد آئی تھی۔ وہ یعنی شزا علی۔۔۔ جس کے ساتھ اس نے جینے مرنے کی قسمیں کھائی تھیں۔ ہر دکھ ہر سکھ ساتھ بتانے کا وعدہ کیا تھا۔ وہ شزا علی اب اس کی زندگی میں کہیں بھی نہیں تھی۔ وہ بے وفا نہیں تھی۔ نہ وعدہ فراموش نہ خود غرض، بلکہ وہ تو رشتوں اور محبتوں کو بچانے کے لیے کچھ بھی کر سکتی تھی حتیٰ کہ اس نے شاہان حیدر کی محبت کو بھی قربان کر دیا تھا۔

اور اسے ایسا کیوں کرنا پڑا تھا کیا وجہ تھی کہ وہ دونوں جو بچپن ہی سے گویا ایک دوسرے کے لیے بنے تھے۔ جن کی ہر صبح اک دوسرے کے بغیر ادھوری اور نامکمل تھی۔ وہ کیسے جدا ہو گئے تھے۔ کس کی وجہ سے؟

ایک سترہ سالہ شہرین آغا علی کے لیے ان کی محبت قربان کر دی گئی تھی۔ انہیں ایک دوسرے سے الگ کر دیا گیا تھا۔ کیا حویلی کے کل مختاروں کے لیے شہرین آغا علی، شاہان حیدر اور شزا سے زیادہ اہم تھی جو اس کی خوشی کے لیے ان کی خوشیاں بھینٹ چڑھا دی گئی تھیں؟

"شہرین آغا علی!" اس نے سگریٹ کا ایک کش بھرتے ہوئے تلخی سے سوچا۔

"تم ہمیشہ نامراد ہی رہو گی۔ میری زندگی میں تمہیں کبھی کوئی مقام نہیں مل سکے گا اور شزا علی نے کیا کہا تھا اس سے؟" اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے جیسے یاد کرنے کی کوشش کی۔

"شاہان! وہ تم سے بہت پیار کرتی ہے۔ اس کے پیار کی قدر کرنا۔ ماضی کو بھلا دینا اور اسے اپنی زندگی میں وہ ہی مقام دینا جو اس کا بنتا ہے۔" وہ اس کے تصور سے مخاطب تھا۔

"ہاں شزا! تم نے ٹھیک کہا تھا۔ میں نے اسے وہ ہی مقام دیا ہے جس کی وہ حق دار تھی۔ کبھی آ کر دیکھو شزا! تمہارا حق چھیننے والی آج خود بھی تہی دست اور تہی داماں ہے۔ شہرین آغا علی سے شہرین شاہان حیدر بن کر بھی وہ ادھوری ہے۔ وہ میرے حوالے سے نہ کل معتبر تھی نہ آج ہے اور نہ آئندہ ہو گی۔ وہ تمام عمر یوں ہی خالی دامن رہے گی۔ میری محبت، میری توجہ کا کوئی ایک لمحہ بھی اس کے کاسۂ دل میں کبھی نہیں گرے گا۔"

اس نے سگریٹ کا دھواں فضا میں تحلیل کرتے ہوئے سوچا، پھر سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دی۔ سگریٹ کی ڈبیا تیزی سے خالی ہوتی جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

باہر بارش پورے زوروں سے برس رہی تھی اور اندر اس کی آنکھیں۔ بڑی سی کھڑکی کے سامنے سے پردے ہٹائے وہ کب سے برستی بوندوں کو دیکھ رہی تھی۔ گہرے رنگ کے اس سادہ سے لباس میں حزن و ملال کی تصویر بنی کھڑی تھی۔ ہلکے رنگ کبھی بھی اس کے پسندیدہ نہیں رہے تھے۔ اسے تو بے حد شوخ، کھلتے ہوئے رنگ بھاتے تھے جیسی وہ خود تھی شوخ و چنچل۔

خاموشی اور شہرین دو بالکل متضاد چیزیں تھیں اور بارش کی تو وہ دیوانی تھی۔ ادھر بارش شروع ہوتی ادھر شہرین، شاہان اور شزا کا ہاتھ تھام کر لان میں۔ پھر بارش میں کرکٹ، فٹ بال کھیل کر مزا لیا جاتا پھر بارش میں نہانے کی وجہ سے جو بخار اور زکام ہوتا تو مما اور واجان کی ڈانٹ۔

کتنا ترس گئی تھی وہ اس ڈانٹ کے لیے۔ کاش! وقت کو قید کیا جا سکتا یا پھر اچھے وقت کو کسی بہت قیمتی چیز کی طرح الماری میں سنبھال کر رکھا جا سکتا کہ جب دل چاہتا اس وقت کو نکال کر اپنے سینے سے لگا لیا جاتا۔ اس نے ایک انگلی سے آنکھ میں آئی نمی کو جھٹکتے ہوئے سوچا۔

"ارے بیٹا! تم یہاں کھڑی ہو۔ میں تمہیں کب سے ڈھونڈ رہی ہوں۔" رحمت بوا دروازے سے اندر آتے ہوئے بولیں اور اس کے قریب پہنچ کر چونک گئیں۔

"ارے شہرین بیٹا! تم رو رہی ہو؟" ان کے سوالیہ انداز پر اس کے ہونٹوں پر اک اداس سی مسکان ابھری اور پھر فوراً معدوم ہو گئی۔

"میں اپنی زندگی میں موجود خسارے گننے لگوں نا بوا! تو میرے ہاتھ کی تمام پوریں ختم ہو جائیں مگر خسارے کبھی ختم نہ ہوں۔ تو ایک ایسی لڑکی جس کی زندگی میں اس قدر خسارے ہوں اس کی آنکھیں نم نہ ہوں گی؟" اس نے کھڑکی سے ہٹتے ہوئے پوچھا۔ رحمت بوا حویلی سے اس کے ساتھ آئی تھیں اور تب سے اب تک اس کے ساتھ تھیں۔

"میں ایک ایسی لڑکی ہوں بوا! جس نے ایک شخص کو پانے کے لیے اپنا سب کچھ گنوا دیا اور جس کے لیے گنوایا وہ بھی اسے نہیں ملا۔ چار سال ہو گئے ہیں ہماری شادی کو۔" آنسو ایک قطار کی صورت اس کے چہرے پر بہے جا رہے تھے۔ وہ چہرہ جو کبھی بہت گلابی ہوا کرتا تھا اب اس پر زردی کھنڈی تھی اور اس کی شہد رنگ آنکھیں جو ہر وقت مسکراتی سی دکھتی تھیں اب ان شہد رنگ آنکھوں میں ہر وقت نمی رہتی تھی۔ ان آنکھوں نے نمی کا ذائقہ آج سے ساڑھے چار سال پہلے ہی چکھا تھا ورنہ ان سے پہلے ان آنکھوں میں بھی بھلا کب نمی آئی تھی۔

"اور ان چار سالوں میں شاہان نے کبھی چار منٹ کے لیے بھی میرے چہرے کی طرف نگاہ نہیں کی۔ اتنی نفرت ہے انہیں مجھ سے۔" اس نے سسکی لی بوا رحمت کا دل دکھ سے بھر گیا تھا۔ پتا نہیں اس لڑکی کا جرم بڑا تھا یا سزا؟

"نہیں بیٹا! ایسے نہیں سوچتے۔" وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے پاس آ کھڑی ہوئیں۔ "شاہان بیٹے کو غصہ ہے بس۔ جس دن اس کا غصہ اتر گیا وہ ٹھیک ہو جائے گا بچے! تم یوں پریشان مت ہو۔" وہ بہت نرمی سے اس کا سر تھپک رہی تھیں۔

مگر وہ بے خودی کے عالم میں بولتی چلی گئی۔

"انہوں نے کہا بہت محبت کرتی ہو مجھ سے۔ چلو تمہاری محبت کو آزماتے ہیں۔ تم اپنی محبت کا ہر رنگ مجھ پر آزمانا۔ شاید وہ مجھ پر اثر کر جائے اور میں اپنی نفرت کا ہر داؤ آزماؤں گا۔ دیکھتے ہیں جیت کس کا مقدر بنتی ہے اگر میں ہار گیا تو تمہیں اپنی زندگی میں وہ مقام دے دوں گا جو کسی بھی شوہر کی زندگی میں بیوی کا ہوتا ہے اور اگر میں جیت گیا تو جو میں مانگوں گا وہ دینے سے تم انکار نہیں کرو گی۔ کیسی شرط لگائی تھی انہوں نے بوا۔"

اس کا چہرہ اس وقت سرخ ہو رہا تھا اور آنکھیں شدت گریہ سے سوجتی جا رہی تھیں۔

"میں نے ان چار سالوں میں اپنی محبت کا ہر رنگ ان پر آزمایا اور ہر صبح اس امید پر ان کی آنکھوں میں جھانکا ہے کہ شاید وہاں اس نفرت میں کمی ہو۔ جو ان کی آنکھوں سے میرے لیے جھانکتی ہے مگر اس نفرت میں رتی برابر بھی کمی نہیں آتی۔ کیا نفرت محبت سے زیادہ اثر رکھتی ہے شاید میری محبت ہی کھوکھلی ثابت ہوئی۔"

اس نے کرسی کی پشت سے سر ٹکا دیا۔

☼ ☼ ☼

رات کھانے کی ٹیبل پر وہ دونوں ہی موجود تھے۔ تین سالہ زوہیب کب کا سوچکا تھا۔ علی شیر نے شہزا کی جانب دیکھا تو اس کی آنکھیں سرخ سی نظر آئیں۔

"شہزا۔" اس نے پکارا۔ وہ اس کے لیے پلیٹ میں بریانی نکال رہی تھی۔ سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

"تم روتی رہی ہو؟"

"نہیں۔ میں کیوں روؤں گی بھلا۔" وہ ہلکا سا مسکرائی اور بریانی کی ڈش ٹیبل پر رکھ دی۔ اب وہ اس کی پلیٹ میں سلاد ڈال رہی تھی۔

"پھر تمہاری آنکھیں سرخ کیوں ہو رہی ہیں؟" علی نے ایک نظر اپنے سامنے رکھی پلیٹ پر ڈالنے کے بعد دوبارہ اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔

"آئی انفیکشن ہو گیا ہے۔" شہزا نے لاپروائی سے سر جھٹکا۔ "اسی لیے آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔"

"تو چلو ابھی ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔" وہ فکرمندی سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ اس نے اپنی پلیٹ سے ابھی ایک نوالہ تک نہیں لیا تھا۔

"علی پلیز! ذرا سا انفیکشن ہے ابھی آئی ڈراپس ڈالوں گی تو ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ پلیز کھانا شروع کریں اور پلیز میری اتنی کیر مت کیا کریں۔ آپ تو مجھے بہت نازک مزاج بنا دیں گے۔" وہ ہلکے سے ہنسی تو علی شیر بھی مسکرا دیا۔

ہلکے آسمانی رنگ کے شلوار قمیص پر سفید کلر کا سویٹر پہنے کندھوں پر اپنے سیاہ کالے بال بکھرائے کالی گھور آنکھوں والی لڑکی جس کی سفید رنگت میں گلابی سی گھلی تھی علی شیر کو بہت عزیز تھی۔ علی شیر کو شہزا علی سے پہلے روز سے ہی محبت ہو گئی تھی اور اب ہر گزرتا دن اس محبت میں اضافہ کر رہا تھا۔

"تمہارے لیے ایک بہت گڈ نیوز ہے۔" علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہم بہت جلد پاکستان جا رہے ہیں۔ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ بزنس وائنڈ اپ کرکے اب ہمیں پاکستان شفٹ ہو جانا چاہیے۔ بزنس تو وہاں بھی ہو سکتا ہے نا۔"

وہ مطمئن انداز میں کہہ رہا تھا اور شہزا خوش گوار حیرت میں گھرتی جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

پورا ہفتہ مصروفیات میں گزارنے والا شاہان اتوار کے دن خاصی دیر سے اٹھتا تھا۔ آج بھی وہ ساڑھے گیارہ بجے اٹھا تھا۔ بوا کو ناشتے کے متعلق ہدایت دیتا وہ نہانے کے لیے چلا گیا۔ وہ کچن میں اس کے لیے ناشتا بنا رہی تھی۔ نرم اور خستہ پراٹھے سنہری آملیٹ اور کڑک دار چائے۔

وہ اتوار کو ناشتا بڑے اہتمام سے کرتا تھا۔ وہ شروع سے اس کے لیے کھانا' ناشتا وغیرہ خود ہی بناتی تھی مگر اس کی لاعلمی میں ' ورنہ وہ تو شاید اس کے ہاتھ کا بنا کھانا چکھتا تک نہیں۔

خود وہ ایک چائے کے کپ پر مشتمل ناشتا پہلے ہی کر چکی تھی۔ دونوں کا ناشتا' لنچ' ڈنر ایک ساتھ کبھی نہیں ہوتا تھا۔

بہت پہلے ایک بار اس نے کھانے پر شاہان کا ساتھ دینے کی کوشش کی تو وہ کھانے کی ٹیبل سے بغیر کھائے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ تب سے وہ احتیاط کرنے لگی تھی۔

ان دونوں کا کھانے کا وقت الگ تھا۔ بیڈروم الگ تھا اور جینے کا انداز بھی۔ ایک بے تحاشا محبت لٹاتا وجود تھا تو دوسرا بے تحاشا نفرت لٹاتا۔

وہ خاصے فریش موڈ میں نیچے اترا تھا۔ ڈائننگ ٹیبل پر ناشتے کے لوازمات سجے تھے۔

"ایک بات تو طے ہے بوا! آپ کے ہاتھ میں ذائقہ بہت ہے۔"

اس نے پراٹھے کا لقمہ توڑا۔ بوا نے مسکرا کر اس کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی مگر شہرین کی بے حد سختی سے دی گئی ہدایت یاد آ گئی کہ شاہان کو کبھی مت بتایئے گا کہ ان کے سارے کام میں کرتی ہوں۔ وہ ہلکی سی ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گئیں۔

"اچھا بوا میں ذرا مارکیٹ جاؤں گا۔ کچھ شاپنگ کرنی ہے۔" وہ کہیں بھی جاتا تھا' بہرحال بتا کر جاتا تھا۔ بوا سر ہلاتی ناشتے کے برتن اٹھا کر کچن کی طرف چلی گئیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی کچن سے باہر آئی۔

"آپ مارکیٹ جا رہے ہیں شا۔۔۔؟" اس نے بمشکل خود کو شاہان کہنے سے روکا تھا۔ بہت عرصہ ہوا اس نے یہ اختیار چھین لیا تھا کہ وہ اسے اس کے نام سے پکارے۔

"ہاں کیوں؟"

"وہ مجھے اپنی کچھ چیزیں لینا تھیں تو میں بھی آپ کے ساتھ چلوں؟" اس نے ڈرتے ڈرتے اپنی بات مکمل کی۔

"ڈرائیور کو لسٹ بنا کر دے دینا' وہ لے آئے گا۔"

"نہیں' وہ میری کچھ ذاتی چیزیں تھیں تو اس لیے۔۔۔" وہ اٹھ کر چلا تو پیچھے سے وہ بولی۔

"ٹھیک ہے کل بوا کے ساتھ جا کر لے آنا۔" اس نے بغیر مڑے جواب دیا۔

"مگر میں آپ کے ساتھ کیوں نہیں جا سکتی؟" اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اس کے جملے نے شاہان کے اندر آگ سی بھر دی تھی۔ وہ ایک دم مڑا اور اس کے مقابل کھڑا ہو گیا۔

"اس لیے شہرین آغا علی!" اس نے بہت چبا چبا کر اس کا نام لیا تھا۔ "کہ تم میرے ساتھ میری گاڑی میں سفر کرو' اتنی تمہاری اوقات نہیں ہے۔ اس بات کو ہمیشہ اپنے دماغ میں رکھنا۔"

ایک دم اس پر بے تحاشا ٹھنڈا پانی ڈال دیا گیا تھا۔ وہ وہاں سے جا چکا تھا۔ جبکہ وہ ابھی تک وہیں کسی بت کی طرح کھڑی رہ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ ٹرے میں دو کپ کافی کے رکھے لان میں آئی۔ اس نے کالے رنگ کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ بالوں کی ڈھیلی سی چٹیا بنا کر ایک کندھے پر ڈال رکھی تھی۔ صاف ستھرا سادہ چہرہ کسی بھی ہار سنگھار کے بغیر تھا۔ اس نے ٹرے ساریہ کی طرف بڑھائی۔ اس نے ایک کپ اٹھا لیا۔ جب کہ دوسرا کپ شہرین نے اٹھا لیا۔

ساریہ کافی دیر سے آئی بیٹھی تھی وہ دونوں ادھر ادھر کی باتیں کر رہی تھیں جب ساریہ نے ایک دم اس سے کہا۔

"شہرین! تم اپنے گھر والوں کو منانے کی کوشش کرو۔" اس کے اس طرح کہنے پر وہ چونک گئی۔

"تمہیں کیا لگتا ہے ساریہ! میں نے یہ سب نہیں کیا ہوگا۔" اس نے اداسی سے سانس بھری۔

"میں نے اس حویلی کے ایک ایک بندے سے اتنی بار معافی مانگی ہے کہ اب مجھے لگتا ہے میرے پاس الفاظ بھی ختم ہو گئے ہیں مگر وہ حویلی کے مکین جن کے دل کبھی موم کے بنے تھے' اب شاید کسی سخت پتھر میں تبدیل ہو گئے ہیں۔ تمہیں پتا ہے ساریہ! میں نے ایک بار حنا سے کہا کہ کیا مجھے ان سب لوگوں کو منانے کے لیے اپنی جان دینی پڑے گی تو اس نے کہا۔

"پلیز شہرین! پھر وہی ڈراما کر کے تم اب کیا منوانا چاہتی ہو۔ اب کیا چھیننا ہے۔ اب اگر تم سچ مچ بھی مر جاؤ تو شاید ہم میں سے کسی کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہ نکلے۔" اس نے اپنے کپ میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"اور دا جان جو مجھے اپنی جان کہا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنا دل اس قدر سخت کر لیا ہے کہ وہ میری آواز تک نہیں سننا چاہتے اور میرے ماں باپ۔۔۔ انہیں تو شاید اب یاد بھی نہیں کہ ان کی ایک بیٹی بھی تھی۔"

"تم حویلی چلی جاؤ شہرین! ان سب سے معافی مانگنے۔" ساریہ جھولے سے اٹھ کر اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

"نہیں ساریہ! یہ ممکن نہیں ہے۔ جن لوگوں کے چہروں پر ہمیشہ اپنے لیے محبت دیکھی۔ ان کے چہروں پر اپنے لیے نفرت دیکھنا بہت دشوار ہے۔ میں حویلی تب ہی جاؤں گی' جب ان سب کے دل میں موجود اپنے لیے نفرت ختم کر لوں گی۔"

صبح ہی سے اس کی طبیعت مضمحل سی تھی۔ سر میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا مگر وہ طبیعت کی خرابی نظر انداز کر کے آفس آ گیا تھا۔ آغا انٹرپرائزز کی لاہور برانچ وہی

ہینڈل کرتا تھا۔ اس نے اپنے دکھتے سر کو ایک ہاتھ سے دباتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے انٹر کام اٹھایا۔ سر کا درد اچانک ہی شدت اختیار کر گیا تھا۔

"آج کی ساری میٹنگز کینسل کر دو اور دیگر تمام مصروفیت بھی کل کے لیے اٹھا رکھو۔"

"آر یو او کے سر؟"

"ہاں! میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔ میں گھر جا رہا ہوں۔"

وہ اپنا موبائل فون اور گاڑی کی چابی اٹھاتے ہوئے بولا تھا۔ گھر پہنچتے پہنچتے بھی بخار خاصا تیز ہو چکا تھا۔ پورچ میں گاڑی رکی تو کچن میں شامی کباب بناتی شہرین چونک گئی۔

"شاہان آج اتنی جلدی کیوں واپس آگئے بوا! پلیز ذرا پتا تو کریں۔" اس نے کبابوں کا مسالا مکس کرنا چھوڑ دیا اور رحمت بوا کو مخاطب کیا۔ بوا تھوڑی ہی دیر میں گھبرائی بوکھلائی نیچے آئیں۔ "شاہان کو تو بہت تیز بخار ہو رہا ہے۔ اسے تو ہوش ہی نہیں۔" ان کی بات پر اس نے فکر مندی سے اوپر بند دروازے کی طرف دیکھا پھر جلدی سے سنک میں ہاتھ دھو کر ساریہ کی مدد سے ڈاکٹر بلایا۔ ڈاکٹر دوائی اور تسلی دے کر چلا گیا۔

وہ اس کے سرہانے ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھ رہی تھی۔ وقفے وقفے سے اس کا بخار بھی چیک کر رہی تھی جو اب خاصا کم ہو گیا تھا۔

رات کا نجانے کون سا پہر تھا، جب شاہان کی آنکھ کھلی تھی۔ سرہانے بیٹھے وجود پر نظر پڑی تو چونک گیا۔

"شکر ہے آپ کو ہوش آگیا۔" شہرین نے اپنی آنکھوں کی نمی صاف کرتے ہوئے تشکر کا سانس لیا پھر ہاتھ بڑھا کر اس کا ماتھا چھوا۔ بخار خاصا کم تھا۔ تب ہی شاہان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ شہرین کے وجود میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔

"بہت پیار کرتی ہو مجھ سے؟" اس نے شہرین کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہ تیزی سے پلکیں جھکا گئی۔

"جواب دو۔" اس نے ہاتھ پر دباؤ بڑھایا تو وہ ایک نظر اسے دیکھ کر رہ گئی تھی۔ وہ آج سے چار سال پہلے والی شہرین ہوتی تو جھٹ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتی "ہاں کرتی ہوں۔ بے تحاشا پیار کرتی ہوں۔" مگر وقت نے دوسری بہت ساری چیزوں کے ساتھ اس پر بھی اپنا اثر ڈالا تھا۔

اس کے گلابی چہرے پر لرزتی گھنی پلکیں۔ شاہان نے چار سال بعد اسے اتنے قریب سے اور اتنے غور سے دیکھا تھا۔ وہ چونک گیا۔ رات کا فسوں اور حق ملکیت ایک دم ہی اس کے اندر جاگ اٹھا۔

"چلی جاؤ یہاں سے۔" اس نے یک دم ہی اسے کھردرے لہجے میں کہا۔

"نہیں۔ میں آپ کو اس حال میں چھوڑ کر نہیں جا سکتی۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔

"میں نے کہا نا چلی جاؤ۔" اب اس کا لہجہ پہلے سے بھی سخت ہو گیا تھا۔

"اور میں نے بھی کہا نا کہ نہیں جاؤں گی۔"

"ٹھیک ہے مت جاؤ۔" اس نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی۔ "مگر نتائج کی ذمہ دار تم خود ہو گی۔"

اس کا انداز ایک دم تبدیل ہوا اور شہرین کا دل سینے میں پھڑپھڑا کر رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"سچ آپی! آپ واقعی پاکستان آ رہی ہیں۔"

"ہاں۔" اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

"او ویری گڈ آپی! آپ کو نہیں پتا میں کتنی ایکسائیٹڈ ہو رہی ہوں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا۔"

"ارے اس میں یقین نہ کرنے والی کون سی بات ہے۔ مجھے ایک نہ ایک دن تو واپس آنا تھا نا۔" فون کانوں سے لگائے وہ حنا سے باتیں بھی کر رہی تھی اور ساتھ ساتھ کپڑے تہہ کر کے بھی رکھتی جا رہی تھی۔

"آپی! ایک بات پوچھوں؟ حنا ذرا سا جھجک گئی۔

"ہاں کہو۔" اس نے اپنا گلابی دوپٹہ تہہ کر کے رکھا۔

"آپی! وہ سب جو چار سال پہلے ہوا تھا۔ وہ ہم سب نے بہت مشکل سے بھلایا ہے۔ کہیں آپ کے آنے

پر پھر وہ ویسا ہی کچھ نہیں ہو جائے۔" حنا کی آواز میں اندیشے تھے۔ شہزا کپڑے چھوڑ کر کھڑی ہو گئی۔

"تم نے ایسا کیوں سوچا حنا! ہم سب اپنی زندگیوں میں سیٹ ہو گئے ہیں۔ وقت حالات سب کچھ تبدیل ہو چکا ہے۔ ہماری سوچوں کے محور بدل چکے ہیں۔"

"تو کیا آپ شایان بھائی کو بھول چکی ہیں؟" حنا نے اسے بیچ میں ہی ٹوک دیا۔ وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہو گئی۔

"یہ سچ ہے حنا کہ میں نے شاہان سے تب محبت کرنی شروع کی، جب مجھے اس لفظ کا مطلب بھی معلوم نہ تھا اور یہ بھی سچ ہے کہ آج چار سال گزرنے کے بعد بھی میں اسے اپنے دل سے نہیں نکال سکی ہوں مگر ان دونوں سے بڑا اور آفاقی سچ یہ ہے کہ میں علی شیر کی بیوی ہوں اور اپنے تین سال کے بیٹے کی ماں ہوں۔ میرے لیے ان دونوں سے اہم اب کچھ بھی نہیں ہے۔ تمہیں پتا ہے حنا! کسی مرد سے محبت عورت کی زندگی کے بس کچھ ہی سالوں پر محیط ہوتی ہے۔ اس سے زیادہ محبت عورت کے بس کا روگ نہیں ہوتی۔ وہ چاہے تب بھی نہیں اور جب عورت ماں بن جاتی ہے نا تو اس کی تمام محبت کا محور و مرکز اس کی اولاد بن جاتی ہے۔ یہ تمام عمر کی محبت تو بس مرد ہی کرتا ہے کبھی ایک ہی چہرے سے کبھی مختلف چہروں سے اور مجھے یہ اعتراف کرنے میں بھی کوئی عار نہیں ہے کہ میں بہت خوش قسمت ہوں۔" وہ اب شیشے سے ہٹ کر بیڈ پر آ بیٹھی تھی۔

"مجھے اپنی زندگی میں دو مخلص ترین لوگوں کی محبت ملی جن کی محبت میں کوئی کھوٹ نہیں تھا۔ اگر شاہان حیدر جیسا پیارا شخص تقدیر نے مجھ سے چھین لیا تو علی شیر جیسا قدر دان ساتھی بھی عطا کر دیا۔ جنہوں نے آج تک مجھ سے میری گزشتہ زندگی کے متعلق کوئی سوال جواب نہیں کیا۔ جنہوں نے پوری عزت کے ساتھ مجھے اپنے گھر اور دل میں جگہ دی۔ بہت عزت بہت قدر ہے میرے دل میں ان کے لیے اور مجھے لگتا ہے مجھے تیزی سے ان سے محبت ہوتی جا رہی ہے۔"

وہ اب بیڈ پر بہت سکون سے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے لبوں پر بہت خوب صورت مسکان تھی۔

☼ ☼ ☼

بہت دنوں بعد اسے اپنی زندگی اتنی خوب صورت اور ہلکی پھلکی لگی تھی۔ اسے اپنے جینے کا جواز مل گیا تھا۔ اس کی پریگننسی رپورٹ مثبت آئی تھی اور اسے لگا۔ اب وہ ساریہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہہ سکتی ہے۔

"یہ دیکھو! یہ ہے میرے جینے کی وجہ، میری زندگی کا سبب میرا بچہ۔" وہ ہلکا سا مسکرائی۔

وہ اس وقت چھت پر کھڑی تھی۔ نجانے کتنے دنوں بعد اس نے کھلی فضا میں سانس لیا تھا۔ اس کا میرون آنچل ہوا کے دوش پر لہرا رہا تھا اور اس کے سنہری بال جو ایک کیچر لگا کر اس نے پچھلے کھلے چھوڑ رکھے تھے ہوا ان سے چھیڑ خانی میں مصروف تھی۔ اس نے آسمان پر نگاہ کی تو پرندے غول در غول اپنے گھونسلوں کی طرف اڑ رہے تھے۔ سورج غروب ہو رہا تھا۔ شام آ رہی تھی۔ اس کے پیچھے قدموں کی آہٹ ابھری۔ اس نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ یہاں تک کہ چاپ اس کے قریب آ کر رک گئی۔

"میں نے اس دن تم سے ایک سوال کیا تھا۔" آنے والے نے اس سے سوال کیا۔

"کیسا سوال؟" اس نے مڑے بغیر ہی پوچھا۔

"تم مجھ سے کتنا پیار کرتی ہو؟" اس نے اپنا سوال دہرا دیا۔

"کیا آپ کو کسی ثبوت کی ضرورت ہے؟" شہرین نے سورج پہ نگاہ جمائی۔ وہ تیزی سے غروب ہو رہا تھا۔ اندھیرا بہت تیزی سے پھیلتا چلا جا رہا تھا۔

"اگر میں کہوں ہاں تو۔" شاہان نے اب سگریٹ سلگا لیا تھا۔ وہ اس کے لیے جان کی قربانی دینے چلی تھی اور اسے کیا ثبوت چاہیے تھا بھلا؟

"اور اگر میں پوچھوں کیا تو؟" اس نے اپنا آنچل شانے پر درست کیا اور منڈیر پر ذرا آگے جھکی۔ وہ آج

خود اس کے پیچھے آیا تھا۔ یہ بات ابھی تک اسے حیرت میں ڈالے ہوئے تھی۔

"میں چاہتا ہوں۔" وہ ذرا سا رکا۔ سگریٹ کا کش لیا اور دوبارہ گویا ہوا۔

"تم اس بچے کو ختم کردو۔"

"واٹ؟" وہ ایک جھٹکے سے مڑی۔

وہ اسے اس چھت سے دھکا دے کر نیچے گرا دیتا۔ ابھی کے ابھی اس کے سینے میں خنجر اتار دیتا تو ذرا سی بھی تکلیف نہ ہوتی مگر جو اس نے کہا تھا وہ برداشت نہیں کرپائی۔

"کیا کہہ رہے ہیں آپ؟" وہ اس کے مقابل آ کھڑی ہوئی۔ "یہ آپ کا اپنا بچہ ہے۔"

"نہیں ہے یہ میرا بچہ۔" وہ کرختگی سے چلایا۔ "یہ میری بھول ہے۔ میری ہار ہے اور میں اپنی بھول اور ہار کو یاد رکھنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ دیکھو میری بات سنو!" وہ اب نرمی سے اسے شانوں سے تھامتے ہوئے بولا۔

"تم اسے ختم کردو۔ اس کے بعد ہم نئی زندگی شروع کریں گے۔ جیسا تم چاہو گی میں ویسا ہی بن جاؤں گا مگر اس کے لیے تمہیں میری بات ماننا ہوگی۔ تم اچھی طرح سوچ لو۔ تمہارے پاس دو دن کا وقت ہے۔" اس نے اپنے ہاتھ اس کے شانوں سے ہٹائے اور واپس جانے کے لیے مڑا۔

"کبھی نہیں۔" پیچھے سے آنے والی آواز پر وہ ٹھٹک کر رکا۔

"مر کے بھی نہیں۔" وہ اس کی پشت پر نگاہ جمائے بول رہی تھی۔ یہ شخص جسے وہ کسی دیوتا کی طرح پوجتی چلی آرہی تھی۔ اس قابل تھا بھلا کہ وہ اس کی خاطر اپنا بچہ ختم کردے؟

"دو دن تو کیا دو سال بھی مہلت دو تب بھی میرا جواب نفی میں ہوگا۔"

وہ نڈر لہجے میں بولی تھی۔ تب ہی وہ مڑا۔ اور ایک ایک قدم اٹھاتا اس کے روبرو کھڑا ہوگیا تھا۔ گہرا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ آسمان پر تاروں کی مدھم روشنی تھی۔ خدا جانے چاند کہاں تھا۔

"ایسا تو تمہیں کرنا ہی پڑے گا شہرین شاہان حیدر! ورنہ دوسری صورت میں تمہیں اپنے نام کا دوسرا حصہ ہٹانا پڑے گا۔ میں ایک لمحہ نہیں لگاؤں گا تمہیں اپنی زندگی سے نکالنے میں۔"

وہ اس کی زندگی میں بھلا کہیں تھی؟ جو وہ نکالنے کی بات کررہا تھا۔ تاریکی بے حد بڑھ چکی تھی۔ شہرین کو لگا اس کی روح جسم کا ساتھ چھوڑتی جارہی تھی۔ کیا شاہان حیدر کوئی ایسی چیز تھا کہ اسے پانے کے لیے اسے ایک کبیرہ گناہ کرنا تھا۔ کسی کی بلی چڑھانی تھی۔ کسی کو قتل کرنا تھا اور کسی بھی کون؟ اپنی اولاد۔۔۔ نہیں، وہ ایسا کبھی نہیں کرے گی۔ کسی صورت، کسی قیمت پر بھی نہیں۔ کیا ہو جائے گا۔ اس کی زندگی سے شاہان حیدر چلا جائے گا تو وہ مرجائے گی۔ یہ ہی ہوگا نا تو ہو جائے۔ مگر وہ ایسا نہیں کرے گی۔

☼ ☼ ☼

حویلی کی خوشیاں یوں لگتا تھا لوٹ آئی تھیں۔ شہزا علی کی واپسی نے جیسے ان در و دیوار میں روح سی پھونک دی تھی۔ وہ سب ہی اسے خوش اور مطمئن دیکھ کر مطمئن ہوچکے تھے۔ وہ "فردا" فردا" سب ہی سے مل چکی تھی سوائے شاہان اور شہرین کے۔ جب ہی کھانے کے بعد جب سب ہال کمرے میں بیٹھے خوش گپیاں لگا رہے تھے اس نے اچانک ان کے متعلق پوچھا۔

"شاہان اور شہرین نہیں آئے؟"

اس کے سوال نے زوہیب سے کھیلتے داجان کو، بزنس ڈیل ڈسکس کرتے حیدر آغا اور احتشام آغا کو، کونے میں بیٹھی اپنی ماں اور نازیہ چچی کو، چائے کے کپ ٹرے میں رکھتی فضا چچی کو، کونے میں بیٹھے شہریار حیدر کو، میگزین دیکھتی حنا کو اور دروازے سے اندر آتے حسام آغا کو ساکت کردیا تھا۔ کمرے میں یکدم ہی سناٹا پھیل گیا تھا۔ اس نے الجھن بھری نظروں سے سب کو دیکھا اور کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ کونے میں رکھا ٹیلی فون بج اٹھا۔

☼ ☼ ☼

اسپتال کے یخ ٹھنڈے کوریڈور میں ٹہلتے ٹہلتے اس کی ٹانگیں شل ہوچکی تھیں۔

ڈیلیوری تک کا وقت مانگا تھا شہرین نے اس سے وہ اس کی زندگی سے نکل جائے گی مگر تب تک وہ یہیں رہے گی۔ اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا تھا۔ اب اتنی انسانیت تو اس میں باقی ہی تھی۔ اس نے اجازت دے دی۔

"پیشنٹ کی حالت بے حد خراب ہے۔ ماں یا بچے میں سے کسی ایک کی جان بچائی جاسکتی ہے۔ آپ پلیز یہاں دستخط کردیں۔" گوری چٹی ڈاکٹر نے ایک فائل اسے تھما دی۔ دستخط کرنے کے بعد اس کے اندر عجیب سی بے چینی پھیلنے لگی تھی۔

دل میں یہ عجیب پکڑ دھکڑ شروع ہو رہی تھی۔ رحمت بوا بنچ پر بیٹھی مسلسل تسبیح پر مختلف دعائیں پڑھ رہی تھیں۔ اس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا تو وہ چونک گیا۔ مڑ کر دیکھا تو داجان کھڑے تھے۔ وہ ایک دم ان کے گلے لگ گیا تھا۔

"داجان! دعا کیجیے وہ بچ جائے۔" اس کے منہ سے بے اختیاری میں الفاظ نکلے تھے۔

"دعا کیجیے داجان! میں کلاس میں فرسٹ پوزیشن لوں۔"

ان کے ذہن میں ایک دم ہی اس کے الفاظ گونجے تھے۔ وہ ماضی میں پہنچ گئے۔ گزرا وقت کسی فلم کی طرح ان کی آنکھوں کے سامنے چلنے لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

اپنی پوری شان و شوکت سے کھڑی اس حویلی میں رہنے والے تمام مکین بھی پوری شان، پورے وقار و عزت سے زندگی گزار رہے تھے۔ ان کا زمانے میں ایک نام و مقام تھا۔ عزت تھی۔

داجان یعنی آغا علی کے تین بیٹے تھے۔ سب سے بڑے حیدر آغا تھے۔ ان کے تین بچے تھے۔ سب سے بڑا شاہان حیدر چھ فٹ سے نکلتے قد، چوڑے شانے، مضبوط جسم مگر نرم سا دل رکھنے والا، سرخ و سفید رنگت کے ساتھ براؤن آنکھیں اسے سینکڑوں میں نہیں، ہزاروں میں نمایاں کرتی تھیں۔ شاہان کے بعد شہریار اور حنا جڑواں تھے۔

حیدر آغا سے چھوٹے احتشام آغا کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ سب سے بڑی شہزا اس کے بعد ندا اور سب سے چھوٹا فیضان تھا۔

احتشام صاحب سے چھوٹے حسام تھے۔ اور ان کی ایک ہی بیٹی تھی۔ داجان کی جان، ماما بابا کی لاڈلی اور سب کی آنکھوں کا تارہ شہرین آغا علی۔ آغا علی نے اس کے نام کے ساتھ اپنا نام جوڑا تھا۔ وہ ایک شرارتی اور کھلنڈری سی لڑکی تھی۔ جس کی حویلی میں سب سے زیادہ شاہان اور شہزا کے ساتھ بنتی تھی۔

شہزا اور شاہان ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ اس بات سے سوائے شہرین کے سب ہی چھوٹے بڑے آگاہ تھے۔ وہ سولہ سال کی تھی انڈر میٹرک مگر وہ سب ابھی تک اسے ایک بچی ہی سمجھتے تھے۔ اس کی تمام ضدیں مان لی جاتی تھیں۔ اس کی تمام خواہشیں بن کہے پوری کردی جاتی تھیں۔ شاہان تھکا ہوا ہونے کے باوجود اس کے ساتھ کرکٹ کھیلنے چل دیتا تھا۔ وہ اس کی ہر بات مان لیتا تھا۔ وہ اسے اپنی لٹل فرینڈ کہتا تھا۔ اس کی بہت کیئر کرتا تھا۔ شاہان حیدر کو "حقیقتا" شہرین آغا علی بہت عزیز تھی۔ وہ اس کی ہر برتھ ڈے پر سب سے پہلے وش کرتا تھا۔

"مجھے اچھا نہیں لگتا کوئی میری فرینڈ کو مجھ سے پہلے برتھ ڈے وش کرے۔"

ایک دفعہ وہ دونوں کرکٹ کھیلتے ہوئے شور مچا رہے تھے۔

"شہرین! تم تیسری بار آؤٹ ہوچکی ہو اور ابھی بھی مان نہیں رہی ہو۔" شاہان نے غصے سے بال زمین پر پھینکی۔ جبکہ شہریار اور حنا اس کی کھلم کھلا بے ایمانی پر کب کے ناک آؤٹ کرچکے تھے۔

"اچھا نا شاہان! دس از لاسٹ ٹائم پلیز!" اس نے لجا کر کہا۔

"تونیور۔ بیٹ دو مجھے۔" آج شاہان پھر اڑ گیا تھا۔
"اچھا! لے لیں تو باری آپ کی۔" اس نے شرارت سے بلا ہوا میں لہرایا تھا۔
"اچھا جی تو یہ بات ہے۔ ابھی بتاتا ہوں تمہیں۔"
وہ اس کے پیچھے بھاگا تھا۔ وہ آگے آگے بھاگ رہی تھی جبکہ شاہان اس کے پیچھے تھا۔ جب ایک دم اس نے اس کی کلائی پکڑ کر اپنی جانب کھینچا۔ وہ ایک دم اس کے سینے سے ٹکرائی تھی۔ شہرین کے پورے وجود میں سنسناہٹ سی دوڑ گئی تھی۔ بلا اس کے ہاتھ سے گر گیا اور چہرے پر ایک دم سُرخی چھا گئی تھی۔
"آپ بیٹنگ کرلیں شاہان۔" اس نے پست لہجے میں کہا اور اپنی کلائی کھینچی، جو ابھی تک شاہان کے ہاتھ میں تھی۔ جبکہ وہ اس کی حالت سے بے خبر کہہ رہا تھا۔
"ہار گئیں نا!"
"ہاں ہار گئی۔" شہرین نے بے خود سے لہجے میں اعتراف کیا۔
تب سولہ سال کی عمر میں اس پر پہلی بار انکشاف ہوا تھا کہ اسے شاہان حیدر سے محبت ہو گئی ہے۔ کتنے دن تو وہ خود سے بھی یہ اعتراف کرنے میں ڈرتی رہی۔ ہاں مگر اس کی آنکھوں کی چمک میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کے نوخیز جذبوں میں شاہان حیدر کے نام سے ہلچل مچ جاتی تھی۔
والی پہلی تصویر شاہان حیدر ہی کی تھی۔"
اس کے دل پہ نقش ہونے والی پہلی تصویر شاہان حیدر ہی کی تھی۔
حویلی کے تمام مکین اپنی زندگیوں میں بے حد خوش اور مطمئن تھے۔ وہ سب مل جل کر رہتے تھے۔ کسی کی ذات کسی دوسرے کے لیے مسئلہ نہ تھی۔ "جب انسان کو اس کے تمام حقوق پوری خوش اسلوبی سے ملیں وہ کسی کے لیے مسئلہ نہیں بنتا۔" یہ داجان کا قول تھا اور وہ اس پر پوری طرح عمل بھی کرتے تھے۔
سو حویلی میں کسی سے ناانصافی نہیں کی جاتی تھی اس لیے راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا مگر ان کی پُرسکون زندگیوں میں طوفان تب آیا تھا جب ایک دن۔۔۔

☆ ☆ ☆

"سرپرائزنگ نیوز۔"
وہ اپنے بیڈ روم میں بیٹھی میوزک سے لطف اندوز ہو رہی تھی جب حنا دھاڑ سے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تھی۔
"اس دن ندا کے سسرال والے آئے تھے نا۔ تب عامر بھائی کی چچی بھی ساتھ تھیں۔ انہیں اپنے بیٹے کے لیے شنزا آپی بھا گئیں سو انہوں نے شنزا آپی کا رشتہ مانگ لیا۔ اب چونکہ ندا کے سسرال کا معاملہ ہے اس لیے فوراً انکار تو نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے داجان نے ایک زبردست فیصلہ کیا ہے۔ شنزا آپی اور شاہان بھائی کی انگیجمنٹ کا۔"
"واٹ؟" اسے چار سو چالیس واٹ کا کرنٹ ہی تو لگا تھا۔
"ہاں اور میں کتنی خوش قسمت ہوں میری دونوں بھابھیاں کتنی خوبصورت ہوں گی ایک شنزا تمبی اور دوسری تم۔" حنا پُرجوش سی بول رہی تھی۔
"شنزا اور شاہان۔۔۔ کبھی نہیں۔" حنا اس کی بات پر چونکی۔
شاہان کی شادی شنزا سے نہیں، مجھ سے ہوگی۔"
اب کرنٹ لگنے کی باری حنا کی تھی۔
"شہرین تم پاگل تو نہیں ہو گئی ہو؟" وہ اُلجھے سے بولی۔ "اپنی اور شاہان بھائی کی عمر میں فرق پتا ہے؟"
"ہاں پتا ہے مجھے سب کچھ۔ میں ان سے محبت کرتی ہوں۔ اور محبت یہ سب نہیں دیکھتی۔" اس نے حنا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا تھا۔
"اور شاہان شنزا آپی کو چاہتے ہیں۔ تمہیں پتا ہے؟"
"جھوٹ بکواس۔" اس کے نازک دل کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا۔
"یہ نہ تو جھوٹ ہے نہ ہی بکواس۔ یہ بالکل سچ ہے شہرین اور تم اسے مان لو۔ دیکھو!" وہ اب رسان سے اسے سمجھا رہی تھی۔ "شہریار تمہیں بہت پسند کرتا ہے۔ تمہیں بہت خوش رکھے گا۔"
"شٹ اپ حنا میری شادی صرف شاہان سے ہوگی ورنہ کسی سے نہیں اور پلیز تم چلی جاؤ یہاں سے۔ لیو می الون پلیز۔"
حنا غصے سے وہیں کھڑی رہی۔ اسے جمے دیکھ کر وہ تن فن کرتی فضا کے کمرے میں پہنچ گئی۔
"مما! کیا شاہان شنزا سے شادی کر رہے ہیں؟"
"ہاں بیٹا! ابھی صرف منگنی ہو رہی ہے۔ شادی دو سال بعد کریں گے۔"
"مگر کیوں شاہان شنزا سے ہی شادی کیوں کر رہے ہیں؟"
"اس لیے کہ یہ داجان کا فیصلہ ہے۔"
"مما پلیز! آپ داجان سے کہیں وہ اپنا یہ فیصلہ واپس لے لیں۔" اس نے ان کا ہاتھ پکڑ کر لجاجت سے کہا۔
"کیونکہ شاہان کی شادی مجھ سے ہوگی۔" خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے اس نے اپنی بات مکمل کی۔
"شہرین! تم ہوش میں تو ہو۔ کیا فضول بکواس کر رہی ہو؟" وہ اس کے پاس سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ ان کے کرخت لہجے پر وہ بھی ہتھے سے اکھڑنے لگی۔
"ہاں! میں ہوں میں اپنے ہوش میں۔ لیکن مما! میں آپ کو بتا رہی ہوں۔ آپ چاہے مجھے کچھ بھی کہیں۔ شاہان کی شادی مجھ سے ہی ہوگی ورنہ میں اپنی جان دے دوں گی۔"

☆ ☆ ☆

رات کا نجانے کون سا پہر تھا۔ وہ ننگے پاؤں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے شاہان کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ اسے اپنی محبت پانے کے لیے ہر حد تک جانا ہے۔ یہ تھی اس سترہ سال کی جذباتی سی لڑکی کی سوچ۔
دروازہ ہلکا سا بجا کر وہ اندر داخل ہوئی۔ وہ سامنے ہی بیڈ پر نیم دراز موبائل کے ساتھ مصروف تھا۔
"ارے شہرین تم اس وقت؟" وہ ذرا سا حیران ہوا تھا۔ وہ نرم قالین پر پاؤں رکھتی اس کے بیڈ کے قریب آ کھڑی ہوئی تھی۔
"شاہان آپ۔۔۔" اس کے لب ذرا سے کپکپائے "آپ شنزا سے شادی کر رہے ہیں نا۔ پلیز شاہان ایسا مت کیجیے۔" اس کی بات پر شاہان کی آنکھوں میں الجھن سمٹ آئی تھی۔
"آپ مجھ سے شادی کر لیجیے پلیز شاہان! میں محبت کرتی ہوں آپ سے۔ میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ آپ۔۔۔"
چٹاخ کی آواز کے ساتھ اس کے منہ پر تھپڑ پڑا تھا۔ محبت کی پہلی خیرات اس کی جھولی میں آ پڑی تھی۔
"بند کرو اپنی فضول بکواس۔ کون سی تھرڈ کلاس مووی دیکھی ہے تم نے، جو اس طرح کی بے ہودہ گفتگو کر رہی ہو۔" وہ دبے لہجے میں چیخ اٹھا۔
"یہ فضول بکواس نہیں ہے شاہان۔" وہ تڑپ کر سیدھی ہوئی۔ وہ اس کی محبت کو فضول کہہ رہا تھا وہ کیسے برداشت کرتی۔ "یہ سچ ہے شاہان میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ آپ کے ساتھ اپنی زندگی گزارنا چاہتی ہوں اور اگر ایسا نہ ہوا تو میں مر جاؤں گی۔" وہ سسک اٹھی تھی۔
"چلی جاؤ یہاں سے تم احمق لڑکی!" وہ خود پر ضبط کرتے ہوئے بولا تھا۔
"شاہان! میں سچ مچ مر جاؤں گی۔" وہ منمنائی۔
"تو جاؤ مر جاؤ۔" وہ سخت لہجے میں کہہ کر رخ پھیر گیا تھا۔
اس کے بعد وہ داجان کے پاس گئی تھی۔
"داجان! پلیز آپ تو میری بات سمجھیے۔ آپ کو تو سب سے زیادہ پیار مجھ سے ہے نا تو کیا میری یہ چھوٹی سی خواہش پوری نہیں کریں گے۔ آپ تو بن کہے میری ہر آرزو پوری کر دیتے ہیں۔ میری ہر خواہش آپ نے ہی تو پوری کی ہے۔" وہ ان کے قدموں میں بیٹھی التجا کر رہی تھی۔ جبکہ وہ کسی سنگی مجسمے کی طرح خاموش بیٹھے تھے۔

"پلیز داجان! کچھ تو کہیے نا۔" اس نے ان کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر انہیں اپنی جانب متوجہ کرنا چاہا۔ وہ رو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے قطرہ قطرہ آنسو نکل کر نیچے گرتے جا رہے تھے۔

"تم نے مجھے بولنے کے قابل چھوڑا ہی کب ہے۔ بہت مان تھا مجھے تم پر۔ تم نے اسے توڑ دیا شہرین!"

"پلیز داجان! یوں مت کہیں آپ شہزا کی شادی علی شیر سے کر دیجیے نا۔ اور شاہان کو میرا بنا دیجیے۔" وہ آنکھوں میں امید لیے ان سے مخاطب تھی۔

"بس شہرین!" وہ ایک دم کھڑے ہوئے تھے۔ "جس طرح تم مجھے عزیز ہو۔ اسی طرح وہ بھی میرے بچے ہیں اور مجھے بہت عزیز ہیں۔ ان دونوں کی خوشی ایک دوسرے کے سنگ ہے۔ میں تمہارے لیے ان کی خوشیاں داؤ پر نہیں لگا سکتا۔ آئندہ میں تمہارے منہ سے اس طرح کی کوئی بات نہ سنوں۔ اب جاؤ یہاں سے۔"

ان کے لہجے میں سختی در آئی تھی۔ شہرین کی آنکھوں میں بے یقینی کے ساتھ ناامیدی بھی تھی۔

☼ ☼ ☼

شہرین نے اپنی جان لینے کی کوشش کی۔

جس نے بھی سنا، اپنی جگہ ساکت رہ گیا تھا۔ بہت مشکل سے اس کی جان بچائی گئی۔ داجان ڈھے سے گئے تھے۔ کچھ بھی تھا، وہ انہیں بہت پیاری تھی۔ اور ان کی پیاری پوتی نے کیسی تکلیف سہی تھی۔ یہ تصور ہی ان کے لیے سوہان روح تھا۔ حسام آغا اور فضا آغا کے لیے یہ وقت کسی قیامت سے کم نہ تھا۔ ان کی اکلوتی اولاد اس وقت ہسپتال میں زندگی اور موت کی کشمکش میں تھی۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو کیا وہ جی پائیں گے؟ پورے اڑتالیس گھنٹوں بعد اسے ہوش آیا تھا اور یہ اڑتالیس گھنٹے انہوں نے جیسے سولی پر گزارے تھے۔

"آپ کیا سمجھتی ہیں، آپ نے مجھے بچا لیا تو میں واقعی بچ جاؤں گی؟ نو مما! میری زندگی اب صرف شاہان کے ساتھ مشروط ہے۔ میں تب تک اپنی زندگی ختم کرنے کی کوشش کرتی رہوں گی جب تک شاہان مجھے نہیں مل جاتے یا میری زندگی ختم نہیں ہو جاتی۔"

اور اس کی اس بات پر باہر کھڑی شہزا ڈر گئی تھی اور اس نے اپنا فیصلہ داجان کو سنا دیا تھا۔

"داجان! آپ علی کی والدہ کو کھانے پر بلا لیجیے۔ میں اس حویلی کی خوشیوں کے لیے ہر طرح کی قربانی دینے کو تیار ہوں۔"

☼ ☼ ☼

وہ پچھلے برآمدے کی سیڑھیوں پہ بیٹھی مٹی پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچ رہی تھی جب وہ آندھی طوفان بنا اس سے جواب طلب کرنے آیا تھا۔

"کیوں کیا تم نے ایسا شہزا میرے ساتھ بہت دور تک جانے کا فیصلہ کر کے اب اپنے قدم واپس کیوں موڑ رہی ہو؟" وہ بہت رنج سے پوچھ رہا تھا۔

زندگی میں بہت دفعہ ہمیں اپنی پلاننگ، اپنی خواہشات کے برخلاف بھی جینا پڑتا ہے۔ ساری توقعات پوری نہیں ہوتیں۔ ساری زندگی خود کو سامنے رکھ کر فیصلے نہیں کیے جا سکتے۔ کبھی کبھی کوئی ایک رشتہ بچانے کے لیے کسی دوسرے رشتے کی قربانی ناگزیر ہوتی ہے۔"

"میری محبت ہی ملی تھی تمہیں قربان کرنے کے لیے؟" وہ بہت دکھ سے پوچھ رہا تھا۔

"میں نے محبت قربان نہیں کی محبت میں قربانی دی ہے۔ اگر آپ محبت کرتے ہیں تو اسے کسی نہ کسی مقام پر ثابت بھی کرنا پڑتا ہے اور محبت کو بھلا قربانی سے زیادہ کس چیز سے ثابت کیا جا سکتا ہے۔ فرض کرو شاہان! میں خود غرض بن کر تمہیں پا لوں تو کل کیا میں خوش رہ سکوں گی۔ نہیں شاہان! وہ تمہارے بغیر مر جائے گی اور میں کسی کی قبر سے اپنی سیج کے لیے پھول اکٹھے نہیں کر سکتی۔"

اس نے دیکھا آسمان سے بارش برسنے لگی تھی۔ وہ کچھ کہے بغیر پلٹ گیا۔

"سنو شاہان!" اس نے پیچھے سے پکارا۔ "ماضی کو بھلا دینا اور مستقبل پر نگاہ رکھنا۔ وہ تم سے بہت محبت کرتی ہے اور اس نے اپنی محبت ثابت بھی کی ہے۔ اسے زندگی میں وہی مقام دینا جس کی وہ حق دار ہے۔"

کیسی لڑکی تھی وہ۔ بھلا کوئی انسان ایسا بھی ہوتا ہے، جو اپنی محبت خود کسی دوسرے کی جھولی میں ڈال دیتا ہے۔ شہرین آغا علی نے اپنی محبت کی بھیک جن لوگوں سے مانگی تھی انہوں نے اسے خالی ہاتھ لوٹایا تھا۔ اور جس سے نہیں مانگی تھی، اس نے اپنا سب کچھ بن کہے اس کی جھولی میں ڈال دیا تھا۔

آگے کی کہانی بے حد واضح تھی۔ شہزا احتشام شہزا علی شیر بن کر وہ سب کچھ پا چکی تھی جس کی کسی بھی لڑکی کو آرزو ہوتی ہے عزت، مان، چاہت... اور شہرین آغا علی شہرین شاہان حیدر بن کر بھی ادھوری تھی۔ اس کے تمام رشتے اس سے دور ہو گئے تھے۔ حویلی کے دروازوں کی طرح اس میں بسنے والے مکینوں کے دلوں کے دروازے بھی بند ہو گئے تھے۔ اور اب وہ چار سال تک ان بند دروازوں پر دستک دیتے دیتے اب ہار چکی تھی۔

اور وہ چلی گئی تھی دور بہت دور۔ اس دیس جہاں جانے والے کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔ اس نے ایک بار ساریہ سے کہا تھا۔ وہ حویلی تب جائے گی جب ان سب کے دل اپنی طرف سے صاف کر لے گی۔ اور واقعی وہ حویلی تب ہی آئی تھی، جب وہ سب اس سے راضی ہو گئے تھے، لیکن انہیں راضی کرنے کی کتنی بڑی قیمت چکائی تھی اس نے۔

تین دن ہو گئے تھے اس کی تدفین ہوئے۔ اور تین دن سے وہ سکتے کی کیفیت میں تھے۔ ان کی شہرین مر چکی ہے۔ انہیں اب تک یقین نہیں آیا تھا۔ کتنی بار رو کر اس نے معافی مانگی تھی۔ پھر ان کا دل اتنا سخت کیسے ہو گیا تھا۔

"میں ہمیشہ تمہارے لیے دعا گو رہا ہوں شہرین! میں تم سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتا میری بچی!" وہ سسک اٹھے۔

انہیں پتا ہوتا کہ وہ اتنی جلدی چلی جائے گی تو وہ ایک لمحے کے لیے بھی اسے اپنی نظر سے دور نہ کرتے۔

چار سال پہلے انہوں نے اسے دیکھا تھا۔ جب وہ شاہان کے ساتھ رخصت ہو رہی تھی۔ رخصتی کے وقت وہ ان کے قریب کھڑی ہو کر کیسی آس بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی کہ وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے دعائیں دیں گے۔ وہ اپنی نئی زندگی شروع کرنے جا رہی تھی اور اس مقام پر اس کے سب اپنے اس سے ناراض تھے مگر اسے یقین تھا اس کے داجان اس سے کبھی ناراض نہیں ہوں گے مگر انہوں نے اسے کیسا مایوس کیا تھا۔

اپنی ہر کلاس میں جب اس کے امتحانات ہوتے تھے وہ کیسے ان کے پاس آ کر کہتی تھی۔ "داجان! دعا کیجیے گا میں کلاس میں فرسٹ آؤں۔" اور وہ اس کے ماتھے پر بوسہ دے کر کیسے اس کے لیے دعاؤں کے خزانے لٹاتے تھے اور اب جب کہ وہ اپنی زندگی کا اتنا اہم امتحان دینے جا رہی تھی تو وہ اس سے رخ موڑے کھڑے تھے۔ جانے سے پہلے وہ کیسے اپنی ڈبڈبائی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی اور آج چار سال بعد انہوں نے اسے دیکھا تو اس کی آنکھیں بند تھیں ان سے دعا کی التجا کرنے والے ہونٹ کیسے جامد تھے۔ وہ ان سے مایوس ہو گئی تھی۔ کیا اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ انہیں کبھی بھی راضی نہیں کر سکے گی؟

☼ ☼ ☼

شہر خموشاں میں پھیلی خاموشی اسے اپنی روح میں سرائیت کرتی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ تھکے تھکے قدموں سے چلتا اس تازہ بنی قبر پر آیا تھا۔ قبر کے سرہانے بیٹھ کر اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے ہی تھے کہ ذہن میں کسی کی آواز گونجنے لگی۔

"جی نہیں، مجھے شہریار کا نہیں شاہان کا پارٹنر بننا ہے۔"

کوئی سریلی آواز گونجی تھی۔ لوڈو کھیلتے ہوئے وہ ہمیشہ

اس کی پارٹنر بنتی تھی۔

جینز شرٹ پہنے سنہری بالوں کی اونچی سی پونی ٹیل بنائے وہ سیڑھیاں اتر رہی تھی۔

آپ کو پتا ہے شاہان آپ نے جو تین ماہ اٹلی میں گزارے ہیں نے آپ کو کتنا مس کیا۔ میرا دل کسی چیز میں نہیں لگ رہا تھا۔"

اور انار کلی فراک پاجامے میں ملبوس اپنے سنہری بال کندھوں پہ بکھرائے وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ "پلیز شاہان! یہ چوڑیاں مجھ سے نہیں پہنی جارہیں۔ آپ پہنادیں۔ مما مصروف ہیں۔"

جینز کے ساتھ سفید اونی سوئیٹر پہنے، گلے میں مفلر ڈالے وہ اس کے ساتھ ٹیرس پہ کھڑی تھی۔ "پتا ہے شاہان! میرے سب سے قریبی دوست آپ ہیں۔ میں اپنے دل کی ہر بات بس آپ ہی سے شیئر کرتی ہوں۔"

اور ایک بار جب وہ اس سے کسی بات پر روٹھا تھا تو کیسے اس کی جان پر بن آئی تھی۔ "آئی ایم سوری شاہان! پلیز مجھے معاف کردیں۔ مجھ سے خفا مت ہوں شاہان ورنہ مجھے تمام رات نیند نہیں آئے گی۔"

اور جب وہ ایک بار بیمار ہوگیا تھا تو کیسے وہ اس کے لیے پریشان تھی۔ "پلیز شاہان! یہ سُوپ پی لیں۔ میں خود اپنے ہاتھوں سے بنا کر لائی ہوں۔" وہ پہلی بار اس کی وجہ سے کچن میں گئی تھی اور سُوپ کے لیے سبزیاں کاٹتے ہوئے تین جگہ سے اس کی انگلی کٹی تھی۔

اور ننگے پاؤں اس کے کمرے میں آتی وہ لڑکی غم کی شدت سے کیسی نڈھال تھی۔ "شاہان آپ شزا سے شادی مت کریں۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں شاہان مجھے مت ٹھکرائیں" اور اس نے اس کی محبت کا جواب کیسے دیا تھا ایک تھپڑ کی صورت میں۔

اسے وہ دن یاد آیا، جب وہ گاڑی سے نکل کر اس کے پیچھے پیچھے لاؤنج تک آئی تھی۔ میرون لہنگے میں ملبوس وہ سترہ سالہ دلہن جس کا استقبال کسی نے خوب صورت مسکراہٹ اور مہکتے پھولوں کے ساتھ نہ کیا تھا۔ لاؤنج میں حیران و پریشان سی کھڑی تھی۔ وہ اپنے کمرے میں جاچکا تھا اور دروازہ بند کرلیا تھا۔ وہ خود ہی سیڑھیاں چڑھ کر کمرے کے دروازے تک پہنچی تھی۔

وہ اندر جانا چاہتی تھی جب وہ ایک دم باہر نکلا تھا۔ دروازے پہ کھڑے بنے سنورے وجود پر اس کی نظر پڑی تو کڑواہٹ اندر تک پھیل گئی تھی۔

"اس کمرے تک آنے کے لیے یہ سب کیا ہے تم نے۔" وہ تلخ لہجے میں اس سے پوچھ رہا تھا۔ "سوچنا بھی مت کہ کبھی تم اس کمرے کی دہلیز بھی پار کرسکو گی۔"

اس کے لہجے میں ایسی نفرت تھی کہ سامنے کھڑا وجود برف ہوگیا تھا۔ "ہاں مگر جب تم دوسروں کی زندگیوں میں زبردستی داخل ہوسکتی ہو تو کمرے میں کیوں نہیں۔" شہرین کے ہونٹ پھڑپھڑا کر رہ گئے تھے۔

"شاہان آپ..." وہ التجائیہ لہجے میں کچھ کہنے لگی تھی، جب اس نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا تھا۔

"بس آئندہ کبھی اپنی گندی زبان سے میرا نام لینا۔ میں برداشت نہیں کروں گا۔" کتنی تذلیل تھی اس کے انداز میں۔ "نیچے والے کمرے میں تمہارا سامان رکھ دیا ہے۔ وہیں تک محدود رہنا۔" وہ درشت لہجے میں کہہ کر پلٹ گیا تھا۔

اور اس کی برتھ ڈے پر وہ جب اس کے لیے سُرخ گلابوں کا بُوکے لائی تھی تو اس نے کتنی حقارت سے ان پھولوں کو نیچے مسل دیا تھا۔

"کتنی تذلیل کروں تمہاری اس سو کالڈ محبت کی کہ یہ میرا پیچھا چھوڑ دے۔"

وہ نفرت سے پوچھ رہا تھا جب کہ زردی کھنڈے چہرے والی وہ لڑکی کیسے خاموش سی کھڑی تھی۔

"بہت پیار کرتی ہو مجھ سے؟" وہ ایک ایک قدم اٹھاتا ہوا اس کے مقابل آکھڑا ہوا تھا۔ "تو چلو تم اپنی محبت کا ہر رنگ مجھے پر آزماؤ۔ میں اپنی نفرت کا ہر داؤ آزماتا ہوں۔ فاتح وہی ہوگا جو جیت جائے گا۔"

اور واقعی اس نے اپنی نفرت کا ہر انداز اس پر آزما ڈالا تھا۔ چار سال تک وہ اس کی بیوی رہی تھی۔ اس نے اسے ایک لباس تک خرید کر نہیں دیا تھا۔ وہی کپڑے چار سال تک چلاتی رہی تھی جو وہ حویلی سے اپنے ساتھ لائی تھی۔ وہ اس سے غافل نہیں تھا۔ جانتے بوجھتے یہ سب کرتا تھا۔ وہ اسے زچ کردینا چاہتا تھا۔ اسے ہرانا چاہتا تھا۔ وہ یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ شہرین آغا علی کی محبت ایک وقتی جذبہ تھی۔ جو ذرا سی ناموافق ہوا چلتے ہی اڑن چھو ہوگئی۔

وہ اس کے لیے کھانے بناتی ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں اس کا کمرا صاف کرتی ہے۔ اس کے کپڑے اپنے ہاتھوں سے دھو کر استری کرتی ہے۔ یہ سب اس کے علم میں تھا۔ کتنی ہی بار اس کا دل چاہا تھا۔ شہرین آغا علی کی قربت کے لیے۔ وہ اس کی بیوی تھی شرعی اور قانونی اور وہ ایک مرد تھا مگر اس کی انا نے اسے روکے رکھا تھا اور ایک دن جب وہ انا پر پاؤں رکھے ساری حدیں توڑ گیا تھا۔

تو وہ کتنے دن خود کو لعنت ملامت کرتا رہا تھا اور جب اس نے شہرین کے امید سے ہونے کی خوش خبری سنی تو اس کا سارا وجود مضطرب ہوگیا تھا۔ اور جب اس نے بچہ ختم کرنے کی بات کی تو وہ کیسے ڈٹ گئی تھی۔ اس کی ہر زیادتی کو خاموشی سے سہنے والی شہرین شاہان حیدر اس کی اس زیادتی کو برداشت نہیں کرے گی۔ وہ اس سے نفرت کرے۔ اسے دھتکار دے۔ اپنی زندگی کے کسی ایک بھی لمحے میں اس سے محبت نہ کرے۔ یہاں تک کہ وہ اسے اپنی زندگی سے نکال دے۔ وہ برداشت کرلے گی مگر وہ اتنا بڑا گناہ نہیں کرے گی۔

"تمہیں جانے کی کتنی جلدی تھی شہرین! ایک بار مڑ کر دیکھتیں تو میں تمہیں بتاتا کہ مجھے... تم سے کتنی محبت ہوگئی ہے۔ وہیں ہسپتال میں کھڑے کھڑے یا شاید... یہ میرے دل میں تھی مگر میں نے اسے اپنی نفرت و انا کے نیچے چھپا رکھا تھا۔ شاید... میں شزا کے سامنے شرمندہ ہونے سے بچنا چاہ رہا تھا۔ مجھے اعتراف ہے شہرین... میں بزدل تھا۔ نہ میں تمہاری طرح شزا کے لیے ایکشن لے سکا نہ ہی تمہیں اپنا بنا سکا..." وہ یک دم بلک کر رو پڑا تھا۔

"میرا دل بہت بے چین ہے شہرین ان بیس سالوں میں کوئی ایک بھی لمحہ سکون کا نہیں گزرا۔ پلیز! مجھے معاف کردو۔ مجھے معلوم ہے، جس دن تم مجھے معاف کردو گی، اس دن مجھے سکون مل جائے گا۔" اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکل کر شفاف فریم پہ جاگرے تھے۔ اس نے اپنے ہاتھ سے انہیں پونچھا تھا۔

پچھلے بیس سال سے یہ اس شخص کا روز کا معمول تھا۔ جس میں آج تک کوئی خلل نہیں پڑا تھا۔ اس نے تصویر واپس رکھی۔ اپنی آنکھیں ٹشو سے صاف کیں۔ فریم لیس گلاسز آنکھوں پر جما کر مڑا ہی تھا کہ کوئی پیچھے سے آکر اس سے لپٹ گیا۔

شہرام شاہان ہو بہو اپنی ماں کی کاپی تھا۔ وہ ہی رنگت وہ ہی آنکھیں، وہ ہی ہنسی اور وہ ہی شوخی و شرارت۔ وہ اسے دیکھتا تو لگتا اس کے سامنے شہرین شاہان آگئی ہو۔ اس وقت بھی وہ وارفتگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جب شہرام نے شرارت سے پوچھا۔

پاپا! میری شکل مما سے بہت ملتی ہے نا۔" پھر اس کے اثبات میں سر ہلانے پر وہ ہنسا۔

"پاپا! اگر مجھے دیکھ کر آپ یوں کھو جاتے ہیں تو مما کو دیکھ کر آپ کا کیا حال ہوتا ہوگا۔" اس کی شرارت پر اس کے مسکراتے لب بھینچ گئے تھے۔

"آپ کو پتا ہے پاپا!" وہ اب کرسی سے اٹھ کر ان کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا تھا۔

"مما میرے خواب میں آئی تھیں اور وہ مجھ سے کہہ رہی تھیں اپنے پاپا کا بہت خیال رکھا کرو۔" وہ ان کے کندھے پہ ہاتھ رکھے انہیں بتا رہا تھا۔

"آپ مما سے بہت محبت کرتے ہیں نا... مجھے مما نے خواب میں آکر بتایا ہے۔ آپ نے مما کے بعد بہت تنہا زندگی گزاری ہے اس لیے مما مجھ سے یہ بھی کہہ رہی تھیں کہ اپنے پاپا سے کہنا خوش رہا کریں۔"

شہرام کی بات پر اس نے مسکرا کر اسے دیکھا۔ اس کے اندر ہلکی سی سکون کی لہر ابھری تھی۔ اسے یقین ہو چلا تھا شہرین ان کی محبت سے غافل نہیں ہے۔

☆ ☆ ☆

عنبرین اعجاز

اندیشہ ہائے دور دراز

سنہری کنارے والے سفید نفیس کپ میں بھاپ اڑاتی گلابی کشمیری چائے اور اس کی سطح پہ تیرتے باریک کترے ہوئے سبز پستے اور بادام کب سے داریہ کی توجہ کے منتظر تھے۔ بچپن سے ہی یہ داریہ کی پسندیدہ ترین چائے تھی۔ شادی بیاہ کی تقریبات میں شرکت کرنے کا اس کا سب سے بڑا مقصد ہی یہ ہوتا کہ کھانے کے اختتام پر کم از کم دو کپ گلابی چائے ضرور نوش جاں کرے گی لیکن آج مہندی کی رسم میں خوب ڈھولک پیٹنے اور چلا چلا کے گیت گانے کے بعد جب وہ تھک ہار کے اپنے شوہر کے پاس آ بیٹھی تو ثریا بوا نے چپکے سے گلابی چائے کے دو کپ اس کے سامنے میز پہ دھر دیے۔ داریہ نے سوالیہ نظروں سے ثریا بوا کی طرف دیکھا جو مسکراتی ہوئی پلٹ گئی تھیں۔ معاً اسد نے جھک کے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

"یہ میرا آرڈر تھا۔ میں نے تمہاری پھپھو اور کزن سے کہہ دیا تھا کہ آپ سب کے گلے تو اسٹین لیس اسٹیل کے ہیں مگر ہماری بیگم کا گلا خالصتاً "کلاسیکل" ہے، اس لیے گیت سنگیت کے سیشن کے اختتام پر فوری طور پر کشمیری چائے مکمل لوازمات سمیت حاضر ہونی چاہیے۔"

اسد نے تفصیل سے آگاہ کیا تو داریہ کے ہونٹوں پہ ایک رسیلی سی مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔ اسد اس کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کا بہت خیال رکھتا تھا اور داریہ کے دل میں اس کے لیے بہت بڑی جگہ بن گئی تھی۔

چائے بہت گرم تھی اور سردی بھی عروج پہ تھی۔ ڈھولک بجا بجا کے ہاتھ ڈبل روٹی کی طرح پھول گئے تھے۔ اس دوران پھپھو کی بڑی بہو نے ایک اہم اعلا کیا۔ بلاشبہ یہ سب کے لیے کسی خوش گوار سرپرا سے کم نہ تھا، سوائے داریہ کے۔ یہ بریکنگ نیوز کے بعد ہر چیز داریہ کے لیے اپنی کشش کھو بیٹھی ۔ حتیٰ کہ اس کے پہلو میں بیٹھا اس کا بے حد کیئرنگ شوہر بھی۔

فراز پورے دس سال بعد امریکہ سے پاکستان آ تھا۔ اپنی ایرانی نژاد بیوی دل نشین اور تین بیٹوں ہمراہ وہ اپنی سب سے چھوٹی لاڈلی بہن کی شادی شرکت کرنے آرہا تھا۔ کرسمس اور نیو ایر کی چھٹی میں رش کے باعث وہ مہندی کی رات نہ پہنچ سکا بلکہ ابھی روانہ ہو رہا تھا۔ اپنی آمد کی پیشگی اطلاع ا نے ایئرپورٹ سے دے دی تھی۔ یہ خبر موصول ہو ہی گھر بھر کی خوشیوں میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

واپسی پہ داریہ کی آزردگی میں بھی خاطر خواہ اضا ہو چکا تھا۔ درد کی لہریں اندر ہی اندر کہیں گہرائی اٹھنے لگیں اور دماغ تو جیسے سن ہو گیا تھا۔ کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ آپ بے گناہ ہوتے ہوئے کسی مجرم، گناہ گار کی طرح عدم تحفظ کا شکار ہو جا ہیں اور سربازار رسوا ہونے سے ڈرتے ہیں جبکہ ا مجرم پورے اعتماد کے ساتھ کُل عالم سے آنکھ سے ملا کے یوں پرسکون گفتگو کرتا ہے جیسے کچھ ہوا ہی ہو۔

داریہ بے گناہی کے باوجود موقع پرستی اور مفاد کی بھینٹ چڑھ گئی۔ رسوائیوں کی صلیب پر لٹکا دی اور فراز راتوں رات ترقی کے زینے پھلانگتا رشک بزنس مین کی مثال بن گیا۔ تمام رشتے دار کسی مقناطیسی کشش کے زیر اثر اپنے آپ اس کی طرف کھنچتے چلے گئے اور داریہ کے راستے میں الزامات کی فصل دور دور تک کاشت ہوتی رہی۔ بچپن کے طے کردہ منہ زبانی رشتے کی بھلا کیا وقعت و اہمیت تھی۔

داریہ ایک عرصے تک شدید ذہنی کرب اور اذیت کا شکار رہی پھر رفتہ رفتہ حالات نارمل ہونے لگے۔ اسد کا پروپوزل قبول کر لیا گیا۔ پھپھو کی فیملی سے بھی جو گلے شکوے تھے، رفع ہو گئے۔ سب کچھ پہلے جیسا ہو گیا۔ صحت مند اور دراز قد فراز کی وجاہت اور سحر انگیز شخصیت کے سامنے اسد کا منحنی سا وجود پھر اوپر سے کم آمیز طبیعت، کم گوئی اور شرمیلا پن۔ نظریں اور سر ہمہ وقت جھکائے رکھتا، شرافت کا بے بس پتلا.....!

اگر کسی من پسند چیز کا چھن جانا صبر ہے تو کسی ناپسندیدہ چیز کے ساتھ اچھے طریقے سے گزارا کرنا اور اسے قبول کر لینا بھی تو صبر ہی ہے نا۔ داریہ صبر کے دونوں مراحل کو بطریق احسن طے کر گئی تھی۔

میک اپ صاف کرنے کے بعد اس نے اپنی جڑواں بچیوں سویرا اور اجالا کے کمرے کا رخ کیا۔ سوئی ہوئی بچیوں کے ماتھے پہ پیار دیتے ہوئے وہ اپنے کمرے میں آ گئی۔ اسد گہری نیند میں تھا۔ داریہ کو پہلی بار اس کے چہرے پہ بچوں جیسی معصومیت اور ملائمت کا احساس ہوا۔

اسد کو آفس اور بچیوں کو اسکول روانہ کرنے کے بعد جونہی تھوڑی سی تنہائی میسر آئی تو ماضی کے دریچوں سے تلخ یادوں نے دستک دینا شروع کر دی۔ خیالات جھٹکنے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی لیکن کامیابی نصیب نہ ہوئی۔ ٹی وی کے چینلز بدلتی رہی۔ ہر مارننگ شو اس کی طبیعت کو مزید بوجھل اور مکدر کرتا رہا۔

کچن میں کام والی برتن دھو رہی تھی اور با آواز بلند باتیں بھی کر رہی تھی۔ حسب معمول اس کے خوبرو شوہر نے اسے بڑی بے رحمی سے بلاوجہ جی بھر کے زدوکوب کیا تھا۔ آج کل وہ "تیسری" کے چکر میں تھا۔ داریہ اس کے ظلم اور ستم ظریفی کی دردناک داستان غائب دماغی سے سن رہی تھی اور ہوں ہاں میں جواب دے رہی تھی۔ کام والی کے رخصت ہوتے ہی اس نے کنڈی لگائی اور اپنے کمرے میں آ کے وارڈ روب اور سوٹ کیس میں سے تمام فارمل اور فینسی کپڑے نکالے اور بیڈ پہ ڈھیر کر دیے۔

اگرچہ اس نے پہلے سے ہی طے کر رکھا تھا کہ شادی کے موقع پر اسد کی فیورٹ ساڑھی پہنے گی جو اسد بطور خاص سنگاپور سے اس کی شادی کی سالگرہ کے گفٹ کے طور پر لایا تھا۔ ایمرلڈ گرین اور رسٹ کے خوبصورت امتزاج اور نفیس کام والی یہ ڈیزائنر ساڑھی اس کے متناسب سراپے پہ عجب بہار دکھاتی تھی۔ لیکن وہ اچانک ہی الجھن میں پڑ گئی تھی۔ جیولری کا ڈیزائن بھی بڑا گھسا پٹا لگنے لگا اور ہیئر اسٹائل تو بہت ہی عام سا۔ اب اتنے کم وقت میں کسی اچھے پارلر سے

اپائنٹمنٹ بھی نہیں مل سکتی تھی۔

اس نے آج تک اپنی ذات سے متعلق کبھی اتنا نہیں سوچا تھا۔ خاص طور پر ہار سنگھار کو لے کر تو کبھی اتنا سوچ بچار نہیں کیا۔ اور تو اور اپنی شادی کے روز بھی دلہن کی سج دھج کے حوالے سے تمام تر معاملات سے وہ یکسر بے پروا اور بے فکر تھی۔

اور بقول بڑی آپا اور بھابھی کے، داریہ کی اپنی ذات سے یہی لاپروائی اس کا مقدر لے ڈوبی تھی۔ اگر وہ بھی اپنی ہم عصر اور ہم عمر لڑکیوں کی طرح ہر وقت خود کو بنا سنوار کر رکھتی تو شاید فراز اسے مسترد نہ کرتا۔

لیکن پاپا اور بھائیوں کی رائے تھی کہ پھر وہ کوئی اور بہانہ بنا کے انکار کر دیتا۔ اس شخص کی نیت ہی صاف نہیں تھی۔ اس کی زندگی کا اولین مقصد کسی شارٹ کٹ طریقے سے جلد از جلد دولت کا حصول تھا۔ اسی مقصد کی تکمیل کا خواب لے کر وہ امریکہ چلا گیا اور جب دلنشین سے ملاقات ہوئی تو داریہ کی واجبی شکل اور کم صورتی کا بھونڈا سا بہانہ بنا کر اسے فی الفور مسترد کر دیا۔

آنسو ٹپ ٹپ کرکے داریہ کی آنکھوں سے گرنے لگے۔ یہ وہی داریہ تھی جو صرف فراز کی پسند کے رنگ زیب تن کرتی تھی اور پھر اسی فراز نے داریہ کو تن تنہا سیاہ تاریکیوں میں دھکیل دیا تھا۔ داریہ کے سامنے ہر رنگ اور ہر اسٹائل کے مہنگے اور قیمتی کپڑے بکھرے پڑے تھے۔ وہ رنگوں اور جگمگاہٹوں میں گھری بیٹھی تھی کیونکہ اسد کو داریہ پر ہر رنگ اور ہر انداز اچھا لگتا تھا۔ داریہ اس قدر کنفیوز تھی کہ اسے اسد سے ہی مشورہ کرنا پڑا۔ اسد نے بلا تامل اسی ساڑھی کا انتخاب کیا اور اسد کی تائید میں سویرا اور اجالا نے بھی۔ بے شک اس فیملی کے تمام ممبرز میں زبردست انڈر اسٹینڈنگ تھی اور سب کی پسند بہت ملتی جلتی تھی۔ قد آدم آئینے میں وہ ہر زاویے سے اپنا سراپا تنقیدی نظروں سے جانچ رہی تھی۔ اگر وہ فراز کی سراہتی نظروں میں اپنے لیے ستائش دیکھ لیتی تو اسے آئینے کی ضرورت ہرگز نہ پڑتی۔

سرخ بتی پر کار رکی ہوئی تھی۔ باہر سخت سردی تھی اور بارش بھی ہو رہی تھی۔ ونڈ اسکرین پہ وائپر مستقل چل رہے تھے۔ پچھلی سیٹ سے دونوں بچیوں کے شوخیوں بھرے قہقہے ابھر رہے تھے۔ داریہ نے کن اکھیوں سے اسد کا سر تاپا جائزہ لیا۔ اس کا ہیر اسٹائل، ڈریسنگ اور شخصیت کو لے کر وہ خود بخود فکر مند سی ہو گئی حالانکہ گزشتہ دس برس سے وہ اس کے اسی انداز کو دیکھنے کی عادی تھی لیکن آج پہلی بار اس کا دل چاہا کہ وہ اپنی شخصیت کو تبدیل کر لے۔ بتی سبز ہوتے ہی کار اسٹارٹ ہوئی اور داریہ کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اگر سرما کی شدید ترین سردی نہ ہوتی تو لوگ اس کی کپکپی کو واضح طور پر نوٹ کرتے۔ اسے ٹینشن ہونے لگی اور ٹینشن میں سردی کا احساس مزید بڑھ جاتا ہے۔

برائیڈل روم میں اپنی دلہن بنی کزن سے ملاقات کرنے اور اسے دعاؤں سے نوازنے کے بعد وہ اسد اور بچیوں کو لیے ایک خاموش اور قدرے پرسکون گوشے میں بیٹھ گئی۔ اگر اس کے بس میں ہوتا تو اپنے ساتھ ساتھ اسد کو بھی برقعہ اور نقاب اوڑھا کے لاتی۔ نہ جانے فراز اسے اور اس کے شوہر کو کیسی تمسخر بھری نظروں سے دیکھے گا پتا نہیں وہ کیسے برداشت کر پائے گی اس بے عزتی کو۔

خوف، وسوسوں اور اندیشوں میں گھری داریہ اس وقت چونک گئی، جب بیک وقت کئی آوازیں اس کی سماعت سے ٹکرائیں۔

"یہ رہے ہمارے فراز بھائی!" فراز کی بھابھی کی شوخ آواز سنائی دی۔

"یہ میری بہو ہے، دلنشین!" پھپھو نے ایک خاتون سے اپنی ایرانی بہو کا تعارف کرایا۔

داریہ کا دل اچھل کے حلق میں آ گیا۔ صدیوں کی ہمت اور حوصلہ جمع کرکے اس نے بمشکل تمام شور وغل کے تعاقب میں موجود جمگھٹے کی طرف نظر دوڑائی۔ نظر اٹھنے کی دیر تھی کہ داریہ پلکیں جھپکانا ہی بھول گئی بلکہ اس کی آنکھیں حیرت کے مارے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

سامنے کھڑا دراز قد شخص جو چالیس نہیں، ساٹھ کے پیٹے میں لگتا تھا گوشت کا ایک پہاڑ تھا۔ اس کے فربہی مائل کلین شیو چہرے کی کھال لٹک رہی تھی۔ یونانی نین نقش ڈھلک چکے تھے اور اب وہ کسی ظالم بے رحم رشین پولیس مین کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ چہرے کی سفید گلابی رنگت کی جگہ زردی چھائی ہوئی تھی۔ جو بھی اس سے سلام دعا کرتا، حیرت سے انگشت بدنداں رہ جاتا۔ عقب میں کھڑی دلنشین بھی گوشت کی تہوں میں لپٹی ہوئی تھی۔ تیکھے تیکھے نقوش اب گول گول سے اور پھیلے پھیلے سے تھے۔ چاند اور سورج کی اس جوڑی کو جیسے گرہن سا لگ گیا تھا۔

شرمندہ سی پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ وہ وقت اور عمر کو ہی قصوروار ٹھہراتا رہا۔

داریہ نے اپنے برابر بیٹھے اسد کی طرف چور نظروں سے دیکھا۔ قد اگرچہ درمیانہ تھا لیکن دبلی پتلی اسمارٹ جسامت میں وہ اپنی عمر سے کئی برس چھوٹا لگتا تھا۔ حتیٰ کہ داریہ کو اس کے چہرے پر نور کی جھلک بھی واضح طور پر دکھائی دینے لگی۔ ایک شرمیلی سی مسکان از خود اس کے لبوں پہ اٹھ آئی۔

"اف میرے خدایا! یہ میں نے کیا غلطی کر ڈالی۔ نہ کبھی خود پہ توجہ دی اور نہ ہی اپنے شوہر پر۔ مجھے یہ احساس کیوں نہ ہوا کہ میرا لائف پارٹنر بھی اتنا جاذب نظر اور کم عمر دکھائی دیتا ہے کہ کوئی بھی اپنی تمنا کا جال اس پہ پھینک سکتا ہے اور بیوی کی وارفتگی اور محبت سے محروم یہ شخص باآسانی۔"

مزید سوچنے کی داریہ میں تاب نہ تھی۔ "کیا شریف انسان کو حسن متاثر نہیں کرتا؟ کیا اسے محبت کی ضرورت نہیں ہوتی۔"

اسی دوران فراز اور دلنشین داریہ اور اسد کی ٹیبل پہ پہنچ چکے تھے۔ داریہ نے بھی حیرت اور تاسف کے ملے جلے تاثرات لیے دونوں میاں بیوی سے سلام دعا کی۔ داریہ کو پہچاننے میں فراز کو لحہ بھی نہ لگا۔ داریہ کو "سوکھی مرچ" اور "سینخ سلائی" کہنے والا یہ مغرور انسان آج دل ہی دل میں اسے سراہتا جا رہا تھا اور ستائشی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"واؤ داریہ! تم تو اب بھی ویسی کی ویسی ہو۔ وقت نے تمہارا کچھ نہیں بگاڑا۔ ابھی بھی چوبیس سے زیادہ کی نہیں لگتیں۔ لگتا ہے اپنی فٹنس کا حد سے زیادہ خیال رکھتی ہو۔"

فراز نے اپنی بتیسی کی نمائش کرتے ہوئے اپنی رائے کا برملا اظہار کیا۔ اسد کو فراز کا یہ بے باکانہ انداز ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔

"جی بالکل درست کہا آپ نے! جب شوہر اتنا ہینڈ سم، اسمارٹ اور کم عمر دکھائی دے تو بیوی کو تو اپنا خیال رکھنا ہی پڑتا ہے نا۔ خود پہ بہت محنت کرنا پڑتی ہے۔"

داریہ نے جھٹ سے جواب دیا اور بڑی لگاوٹ سے اسد کے کندھے پہ اپنا نازک ہاتھ رکھا۔ اس اعتماد بھری مسکراہٹ نے داریہ کی شخصیت کے سحر کو اور بھی دوچند کر دیا تھا۔

اسد نے حیرت اور خوشی کے ملے جلے جذبات آنکھوں میں سموئے داریہ کی طرف دیکھا جو ممنونیت اور تشکر بھری نظروں سے اسد کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ بے شک وقت نے داریہ کا مکمل ساتھ دیا تھا اور بگڑا ہوا کل بھی سنوار دیا تھا۔ وہ صدق دل سے اپنے رب کی شکر گزار تھی کہ اس کا حال اس کے ماضی سے بہتر تھا۔ وہ مطمئن تھی اور دعاگو تھی کہ اس کا مستقبل اس کے حال سے بھی اچھا ہو۔ انداز فکر بدلنے سے انداز نظر اپنے آپ بدل گیا تھا۔

شیریں ملک

میری ذات سے تیری ذات تک

"کبھی فرصتیں جو نصیب ہوں، چلے آنا میرے پاس تم
ہیں ادھورے کتنے معاملے میری ذات سے تیری ذات تک"

اپنی پرسکون سی زندگی میں مگن اکثر وہ مضطرب ہو جاتی۔ تھوڑی دیر کے لیے سہی لیکن ڈھیروں اضطراب اس کی ذات میں سمٹ آتا۔ وہ تھکنے سی لگتی ایسا لگتا کہ زندگی میں ایک بہت بڑا خلا ہے، جو پر ہو نا رہ گیا ہو۔ الجھن تھی کہ دور ہونے کا نام ہی نہ لیتی۔ اور

ناولٹ

وہ بڑی مشکل سے اپنی معمول کی زندگی میں واپس لو[ٹ]
پاتی۔

☼ ☼ ☼

سعد حسن بخاری ابھی ابھی قبرستان سے لوٹا تھا۔ آج وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی پیاری دادی ماں کو دفنا [کر] آرہا تھا۔ یہ اس کی اٹھائیس سالہ زندگی کا دوسرا بڑا دکھ تھا۔ پہلا دکھ اس وقت ملا، جب وہ لاء کے آخری سال میں تھا اور اس وقت اسے یہ اطلاع ملی تھی کہ اس کے امی، ابو جو حج کرنے گئے ہوئے تھے۔ اب کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ ایک حادثے کا شکار ہو کر وہ اسی مقدس سرزمین پر اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔

سعد اپنے والدین کا اکلوتا اور بے حد لاڈلا بیٹا تھا۔ اس خبر نے اسے توڑ کر رکھ دیا۔ اگر دادی ماں نہ ہوتیں تو شاید وہ اپنی تعلیم بھی مکمل نہ کرپاتا لیکن دادی ماں نے اسے بہت سہارا دیا۔ اتنا پیار اور توجہ دی کہ وہ امی، ابو کی یادوں کو سینے سے لگائے ان کے خواب پورا کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی امی کو بہت شوق تھا کہ ان کا سعد وکیل بنے۔ وہ اسے جلد از جلد وکیلوں والا کوٹ پہنے دیکھنا چاہتی تھیں۔

ان کی اور دادی ماں کی دعاؤں سے آج وہ ایک کامیاب وکیل تھا اور آج اسے اپنی زندگی کا دوسرا بڑا دکھ ملا تھا۔ اس کی دادی ماں ہمیشہ کے لیے اس کا ساتھ چھوڑ گئیں۔ وہ اس عمر میں بھی صحت مند تھیں۔ اچانک باتیں کرتے کرتے ان کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمودار ہوئے اور بے ہوش ہو گئیں۔ پریشانی کے عالم میں انہیں ہسپتال لے کر گیا۔ ڈاکٹر[ز]

بتایا کہ انہیں ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ فوری طبی امداد دے کر انہیں بچا تو لیا لیکن وہ صحت یاب نہ ہو سکیں۔ تین دن ہسپتال میں رہنے کے بعد ان کو دوسرا شدید دورہ پڑا اور وہ اسے دنیا میں اکیلا چھوڑ گئیں۔ سعد یہ سوچ رہا تھا کہ جتنا دکھ اسے آج ہوا ہے' اتنا دکھ تو اپنے امی ابو کی وفات پر بھی نہ ہوا تھا کیونکہ اس وقت اسے دلاسا دینے والی اس کی شفیق دادی ماں تھیں' جو اپنے بیٹے اور بہو کا غم بھلائے اپنے پوتے کو خوش کرنے کی کوشش کرتی رہتیں' لیکن آج بخاری ولا سنسان پڑا تھا۔ آج اسے کوئی تسلی دینے والا نہ تھا۔ آج اس کے پاس دادی کی پر شفقت آغوش نہ تھی' جو اسے اپنے سائے میں لے لیتی۔ آج اس کے پاس کوئی کندھا نہ تھا جس پر سر رکھ کر وہ رو سکتا۔ آج اسے یہ گھر ویران لگ رہا تھا' حالانکہ گھر مہمانوں سے بھرا پڑا تھا' جو گاؤں سے آئے تھے اور ابھی تک یہیں تھے۔

سیف چاچو مسلسل اس کے ساتھ تھے۔ وہ اس کے ابو کے سگے بھائی تو نہ تھے لیکن ایسے چچا زاد بھائی اور دوست تھے کہ بھائیوں سے بڑھ کر تھے۔ گاؤں کی حویلی اور زمینوں کا انتظام ان ہی کے ہاتھ میں تھا۔ وہ سعد سے بہت پیار کرتے تھے اور اب بھی اس کا بہت خیال رکھ رہے تھے۔ لیکن اسے گھر کی ویرانی سے وحشت ہو رہی تھی۔ پیار کرنے والی ہستی ہی نہ رہی۔ دادی ماں کی شفقت ایسے چھتنار درخت کی چھاؤں کی مانند تھی جس میں بیٹھ کر وہ اپنے سارے دکھ بھول جاتا تھا لیکن اب وہ چھاؤں نہ رہی۔ اب سعد بخاری کے لیے دعا کرنے والے ہاتھ نہ رہے تو پھر وحشت تو ہونی تھی۔ بے سکونی تو ہونی تھی۔

☼ ☼ ☼

سعد تو پہلے بھی سنجیدہ سا تھا' لیکن اب تو جیسے اپنی ہی ذات میں سمٹ کر رہ گیا تھا۔ دادی ماں کو فوت ہوئے تقریباً" تین ماہ ہو چکے تھے۔ لیکن پھر بھی سعد کو لگتا' جیسے ابھی ابھی دادی ماں اس کے پاس سے اٹھ کر گئی ہوں۔ گھر میں داخل ہوتے ہی سعد کی آنکھوں کی بھیگنے لگتی۔ لیکن آج وہ دادی ماں کی باتیں یاد کر رہا تھا جو انہوں نے اس سے ہسپتال میں کی تھیں۔

آج اس کے دوست سیرت مصطفیٰ نے اسے شادی کا مشورہ دیا تھا۔ اس نے دوست ہونے کی حیثیت سے اس کی تنہائی کا بہترین حل پیش کیا تھا۔ اور ساتھ ہی اس کی یہ مشکل بھی حل کرنے کی کوشش کی تھی کہ کس سے شادی کرے کیونکہ سعد کے ساتھ ساتھ سیرت بھی جانتا تھا کہ ارسہ ملک' سعد کو پسند کرتی ہے۔ سیرت مصطفیٰ' سعد بخاری اور ارسہ ملک تینوں بہت اچھے دوست تھے۔ تینوں نے مل کر لاء کیا تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد سیرت اور سعد نے تو پریکٹس شروع کر دی جبکہ ارسہ اپنی ماں کی این جی او چلانے لگی۔ اس نے کبھی کھل کر اپنی پسند کا اظہار نہ کیا لیکن اس کا جھکاؤ سعد کی طرف بہرحال تھا۔ سعد کو بھی وہ اچھی لگتی تھی' لیکن ابھی شادی کے بارے میں سوچا نہ تھا۔

آج بھی سیرت کے کہنے پر اس نے ہنس کر ٹال دیا' لیکن اسے دادی اماں کی باتیں یاد آ گئیں۔ جب انہوں نے ہسپتال میں اس سے کہا تھا۔

"سعدی! میری ایک بات مانو گے؟" اور وہ جوان کی بیماری کی وجہ سے بہت پریشان تھا' ایک دم ان کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے بولا۔

"دادی ماں! پہلے کب آپ کی بات نہیں مانی' جو اس طرح پوچھ رہی ہیں؟"

اسے دادی ماں یوں ہسپتال کے بیڈ پر پڑی بہت دکھ دے رہی تھیں۔ وہ ان کی وجہ سے بمشکل خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

"سعدی! میری زندگی کا کچھ بھروسا نہیں ہے۔ میں نے سیف سے اس کی بیٹی صفیہ کے لیے تمہاری بات کی ہے۔" وہ بے حد سنجیدہ تھیں۔

"دادی ماں! گاؤں کی لڑکی میرے ساتھ کیسے گزارا کر پائے گی؟"

"وہ بہت اچھی لڑکی ہے' تمہاری زندگی سنور جائے گی۔ تمہیں کوئی اور لڑکی تو پسند نہیں ہے؟" دادی ماں نے اسے مشکوک نظروں سے دیکھا تھا۔

"ارے نہیں دادی ماں! بھلا میں آپ کے ہوتے ہوئے یہ جرأت کر سکتا ہوں۔" نجانے کیوں ارسہ کی شبیہہ اس کے ذہن کے پردے پر لہرائی۔

"میری ایک بات یاد رکھنا میرے بچے! "بخاری ولا" کو صفیہ بخاری جیسی ہی لڑکی کی ضرورت ہے۔ تم تو کبھی سیف کے گھر گئے نہیں' لیکن میں تو اس سے ملی ہوں' وہ بالکل ویسی ہے' جیسی بہو میں چاہتی ہوں۔ بے شک اس کے پاس دنیاوی تعلیم اتنی زیادہ نہیں' لیکن وہ قرآن پاک کی حافظ ہے۔ شرم و حیا اور عزت و ناموس والی ایک باکردار لڑکی ہے۔ اپنی دادی ماں کی یہ بات یاد رکھنا۔ وہ لڑکی تیری زندگی میں روشنی بکھیر دے گی۔"

اور اس کے بعد ان کی طبیعت ایسی بگڑی کہ سنبھل ہی نہ سکا۔ یہ باتیں یاد کرتے ہوئے بھی سعد بخاری کے آنسو اس کا گریبان بھگو چکے تھے۔ وہ خود کو ہسپتال کے اسی کمرے میں محسوس کر رہا تھا' جہاں وہ دادی ماں کا ہاتھ پکڑے یہ سب باتیں سن رہا تھا۔ وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ اگلے پندرہ منٹ میں وہ گاؤں جانے کے لیے تیار تھا۔ گھڑی دیکھے بغیر جو شام کے پانچ بجا رہی تھی اور یہ سوچے بغیر کہ رات کو جب وہ سیف چاچو کے گھر پہنچے گا تو انہیں کیا جواب دے گا کہ وہ ان کے گھر کیوں آیا ہے۔ اور وہ بھی پہلی دفعہ۔

یہ نہیں تھا کہ وہ گاؤں کبھی گیا ہی نہ ہو' لیکن وہ جب بھی جاتا تھا' چھٹیوں میں اپنے دوستوں کے ساتھ ہی جاتا اور اپنی حویلی میں قیام کرتا' جو سیف چاچو کی دیکھ بھال کی وجہ سے اپنی اسی حالت میں تھی جب اس کے امی ابو اسے چھوڑ کر گئے تھے۔ وہ اپنی حویلی میں ہی ان سے دعا سلام کرتا اور ان کے اصرار کے باوجود کبھی ان کے گھر نہ گیا۔ کبھی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔ لیکن آج وہ ان کے گھر جا رہا تھا اور خاص طور پر جا رہا تھا۔

تین گھنٹے کی مسافت کے بعد وہ سیف چاچو کی حویلی کے سامنے تھا' چوکیدار اسے مہمان خانے میں بٹھا کر جا چکا تھا۔ سیف بخاری مہمان خانے میں آئے تو انہیں سعد کو دیکھ کر خوش گوار سی حیرت ہوئی۔

"یہ آج میں کیا دیکھ رہا ہوں۔ میرا بیٹا مجھ سے ملنے آیا ہے۔" وہ اس سے بغل گیر ہوتے ہوئے پیار سے بولے وہ شرمندہ سا ہو گیا۔

"تم ادھر مہمان خانے میں کیوں چلے آئے۔ اندر حویلی میں چلو' ورنہ تمہاری چچی خفا ہوں گی۔"

"نہیں چاچو! میں یہیں ٹھیک ہوں۔ دراصل مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔" وہ ان کی بات کے جواب میں بڑے اعتماد سے بولا۔

وہ اس کے انداز پر ٹھٹکے۔ "ضروری بات بھی کر لینا' لیکن پہلے کچھ کھا پی تو لو۔ اتنی دور سے آئے ہو اور ویسے بھی رات کے کھانے کا وقت تو ہو چکا ہے۔" انہوں نے سنبھلتے ہوئے کہا۔

"نہیں چاچو! پہلے آپ میری بات سن لیں۔" وہ ان کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ اب کی بار انہیں بیٹھنا پڑا۔

"چاچو! آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میرا بڑا اب آپ کے سوا کوئی نہیں' جو بات کرے۔ اس لیے مجھے خود ہی یہ جرأت کرنا پڑ رہی ہے۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو میں آپ کی بیٹی صفیہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" اتنی بڑی بات کرتے ہوئے اس کا اعتماد بحال تھا' سیف بخاری ایک دم خاموش ہو گئے۔

"چاچو! یہ دادی ماں کی خواہش تھی۔ آپ پلیز کوئی بھی جواب دینے سے پہلے اس بات کو ذہن میں رکھیے گا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں' میں آپ کی بیٹی کو بہت خوش رکھوں گا۔ اسے مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔" اب کی بار سیف بخاری کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"سعد! مجھے یقین ہے کہ میری بیٹی کو تم سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ لیکن تمہیں تو میری بیٹی سے شکایت ہو سکتی ہے نا۔ دیکھو بیٹا! میں جانتا ہوں' تمہیں اپنی دادی ماں سے بہت پیار ہے اور تم ان کی کوئی بات رد نہیں کر سکتے۔ لیکن بیٹا! زندگی کے اتنے بڑے فیصلے جذبات میں آ کر نہیں کرتے کہ بعد میں پچھتاوے کے

سوا کچھ نہ بچے۔ تم خود پڑھے لکھے اور سمجھ دار ہو۔ یوں کسی کی پسند کے لیے اپنی ساری زندگی جذباتیت کی نذر نہیں کرتے۔"

"لیکن چاچو! وہ میری دادی ماں تھیں، اس دنیا میں مجھے ان سے زیادہ کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ اگر وہ یہ سوچتی تھیں کہ میری شریک حیات آپ کی بیٹی ہونی چاہیے تو اس سے بڑا کوئی سچ ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ میرے فیصلے کو جذباتیت نہ کہیں۔ میں نے یہ فیصلہ سوچ کر کیا ہے۔" اس نے ان کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"بچے! وہ تمہارا ساتھ نہیں دے سکے گی۔ وہ ایک کم پڑھی لکھی گاؤں کی سادہ سی لڑکی ہے اور تم ٹھہرے اعلا تعلیم یافتہ اور شہر میں رہنے والے۔ وہ تمہاری زندگی سے مطابقت نہیں رکھتی۔ بجائے اس کے کہ بعد میں رنجشیں پیدا ہوں، ہمیں ابھی سے حقیقت کو مان لینا چاہیے۔"

وہ اسے ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ باپ ہونے کی حیثیت سے یہ ان کے لیے بڑی خوشی کی بات تھی کہ سعد بخاری جیسا کامیاب شخص ان کی بیٹی کا طلب گار تھا، لیکن وہ اس حقیقت سے بھی آشنا تھے کہ ان کی سادہ سی بیٹی شاید اس کامیاب انسان کی توقعات نہ پوری کر سکے۔ سعد ایک دم اٹھ کر ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

"چاچو! میں بے شک ایک تعلیم یافتہ شہری سہی لیکن آپ یہ بات کیوں بھول رہے ہیں کہ میں آپ کا بھتیجا ہوں، آپ کا خون ہوں، پھر آپ کو وسوسے کیوں ستا رہے ہیں۔ کیا آپ کو مجھ پر اعتماد ہی نہیں؟" وہ ان کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

سیف بخاری بے بس سے ہو گئے۔ ان کی تین بیٹیاں تھیں۔ بیٹا تو تھا نہیں بڑی دو بیٹیوں، آمنہ اور ہاجرہ کی شادی یہیں گاؤں میں کی تھیں، صفیہ ان کی سب سے لاڈلی اور چھوٹی بیٹی تھی۔ وہ اس کی وجہ سے تھوڑے پریشان بھی تھے کیونکہ خاندان میں اس کے جوڑ کا کوئی لڑکا نہ تھا۔ اس کے خالہ اور ماموں کے بیٹے اس سے چھوٹے تھے۔ انہیں کیا خبر تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی بیٹی کے لیے سعد بخاری کو منتخب کیا ہے جس کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے اور پھر اللہ تعالیٰ پر بھروسا کرتے ہوئے انہوں نے قدموں میں بیٹھے سعد کی پیشانی چوم لی۔

"مجھے اپنے خون پر اعتماد ہے۔ وہ کبھی مجھے اپنے فیصلے پر شرمسار نہیں ہونے دے گا۔" سعد ان کی بات پر تشکر سے مسکرا دیا۔

یوں صرف ایک ہفتے کے اندر اندر صفیہ بخاری اپنے گاؤں کی حویلی سے بخاری ولا میں آگئی۔ دونوں طرف سے شادی بہت سادگی سے کی گئی تھی۔ سعد اپنے اس فیصلے پر بہت مطمئن تھا کہ اس نے اپنی دادی ماں کی آخری خواہش کو پورا کر دیا۔

تھوڑے ہی دنوں میں سعد کو اندازہ ہو گیا کہ صفیہ ایک اچھی لڑکی ہے۔ کم گو سی، اپنے کام سے کام رکھنے والی اور شوہر کی ہر بات کو حکم کا درجہ دینے والی۔

☼ ☼ ☼

آج اتوار تھا سعد لاؤنج میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا اور ساتھ ہی ٹی وی پر خبریں بھی لگا رکھی تھیں۔ گاہے بگاہے ادھر بھی نظر ڈال لیتا۔ صفیہ آج صبح سے کچن میں مصروف تھی۔ ملازمہ سے ہی اسے پتا چلا تھا کہ سعد کو سرسوں کا ساگ بہت پسند ہے۔ اس نے خاص طور پر گاؤں فون کر کے ساگ کے لیے کہا ہوا تھا جو ہفتے کی شام کو اللہ وسایا (ملازم) دے گیا تھا۔

اور آج اتوار کو صفیہ کھانے میں سعد کی پسندیدہ ڈش بنانا چاہتی تھی۔ ساتھ میں دیسی گھی کے پراٹھے اور میٹھے میں اس نے گاجر کا حلوہ بنایا تھا۔

شادی سے پہلے اس نے صرف سعد کا نام سنا تھا، وہ بھی دادی ماں کی وجہ سے، جو اس کے ابو کی چچی لگتی تھیں۔ ان کی باتوں میں صرف ان کے پوتے کا ذکر ہوتا تھا۔ صفیہ نے ان کا خود سے لگاؤ خاص طور پر محسوس کیا تھا۔ اسے خود بھی وہ شفیق سی دادی ماں اچھی لگتی تھیں، لیکن اسے اندازہ نہ تھا کہ وہ دلہن بن کر ان کے پوتے کے گھر ہی آ جائے گی۔ وہ یہاں بہت سے اندیشوں اور وسوسوں میں گھری ہوئی آئی تھی، لیکن سعد کی نرم خوئی کی وجہ سے جلد ہی یہاں گھل مل گئی اور اسے کوئی اندیشہ نہ رہا بلکہ اچھی مشرقی لڑکی طرح شوہر کی محبت دل میں گھر کرتی گئی اور اب وہ بہت مطمئن تھی۔

سعد جب اپنی دلچسپی کی ساری خبریں پڑھ چکا تو وہ اخبار ایک طرف رکھ کے کچن کی کھڑکی کی طرف دیکھنے لگا، جو لاؤنج میں کھلتی تھی وہاں سے صفیہ کام کرتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ گہرے نیلے کپڑوں پر سفید اور نیلے رنگ کی چنری سر پر اوڑھے وہ بہت سادہ سی لگ رہی تھی۔ سعد نے اس کو صرف شادی کے پہلے دو تین دن ہی ہلکے میک اپ میں دیکھا تھا۔ اس کے بعد سے وہ بالکل سادہ حلیے میں رہتی۔ بالوں کو چٹیا میں باندھے رکھتی۔ وہ دبلی پتلی، لانبے قد کی، پرکشش نقوش والی گندمی رنگت والی لڑکی تھی۔ نجانے کیوں سعد بھی کبھی اس کا موازنہ ارسہ سے کرنے لگتا اور پھر خود ہی اپنی بے وقوفی پہ خود کو سرزنش کرنے لگتا۔ ان دونوں میں کوئی چیز مشترک نہ تھی۔

ارسہ حد سے زیادہ گوری رنگت والی، بہت خوب صورت، الٹرا ماڈرن اور اعلا تعلیم یافتہ لڑکی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ سعد ارسہ سے پیار کرتا تھا لیکن وہ اس کی دوست تھی اور وہ اس کے لیے پسندیدگی کے جذبات رکھتا تھا۔ اکثر یہ بھی سوچ اسے ستاتی کہ دادی ماں نے صفیہ میں ایسا کیا خاص دیکھا تھا جو اتنا بڑا دعوا کیا کہ بخاری ولا کو صفیہ جیسی لڑکی کی ضرورت ہے۔

"چائے۔"

وہ اپنی سوچوں میں گم تھا۔ جب صفیہ نے اس کے سامنے چائے کا کپ رکھ کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔

"صفیہ! ایک بات پوچھوں۔" وہ چائے رکھ کر دوبارہ کچن میں جانے لگی تھی، ایک دم رکی۔

"جی پوچھیں!"

"تم لپ اسٹک اور کاجل کیوں نہیں لگاتیں؟" تھوڑی دیر پہلے کی سوچیں نوک زبان تک آ گئیں۔

"آئندہ لگایا کروں گی۔" نرم سی مسکراہٹ جو سعد سے بات کرتے ہوئے عموماً" اس کے ہونٹوں پہ رہتی، اب بھی ابھری اور وہ دوپٹا صحیح کرتے ہوئے اندر چلی گئی۔

سعد نے حیرانی سے اس کے رویے کو نوٹ کیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ اس کی بات پر اعتراض کرے گی۔ ظاہر ہے، اس کی عادت نہیں تھی مگر اس نے مسکراتے ہوئے سر تسلیم خم کر دیا۔

اور پھر صفیہ نے اپنا کہا سچ کر دکھایا۔ اب اس کی آنکھیں ہر وقت کاجل سے سجی رہتیں اور لبوں پر ہلکے رنگ کی لپ اسٹک ضرور لگاتی۔

سعد کو کبھی کبھی اس کی حد سے بڑھی فرماں برداری سے چڑ ہونے لگتی۔ وہ ایک وکیل تھا، لوگوں کو اپنے دلائل سے قائل کرتا تھا، یوں ایک دفعہ کے کہے پر صفیہ کا ہر بات بلا چوں وچراں ماننا اسے عجیب سا لگتا لیکن وہ اس کا اظہار نہیں کرتا۔ اسے کیا خبر تھی کہ صفیہ کی جن خطوط پر تربیت ہوئی تھی وہ ان سے کیسے انکاری ہو سکتی ہے اور کیسے اپنے شوہر کی جائز باتوں سے اختلاف کر سکتی ہے۔

☼ ☼ ☼

موسم سرما کا ایک بہت ہی چمکیلا سا دن تھا۔ نرم نرم سی دھوپ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ سعد کا موڈ بہت اچھا تھا۔ آج اس کا کام زیادہ نہ تھا، اس لیے وہ کورٹ سے جلد ہی گھر آ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یوں جلد گھر واپس آ کر وہ صفیہ کو سرپرائز دے گا۔ مگر جب وہ گھر میں داخل ہوا تو صفیہ نظر نہ آئی۔ عموماً" وہ اسے لاؤنج میں ہی ملتی تھی۔

"سیما! بی بی کہاں ہیں؟" کچن میں کام کرتی ملازمہ سے اس نے پوچھا۔

"جی وہ اندر کمرے میں ہیں۔"

اس کا جواب سن کر وہ کمرے کی جانب چل دیا اور جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو صفیہ صوفے کے اوپر پاؤں کیے گھٹنوں پر ٹھوڑی ٹکائے اپنے ہی خیالوں میں گم تھی۔ وہ حیران ہوا کہ اس نے سعد کے اندر آنے کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔

"السلام علیکم!" سعد نے بلند آواز میں اسے اپنی جانب متوجہ کیا تو اس نے دیکھا صفیہ رو رہی ہے۔ اس کو دیکھ کر وہ ہڑبڑا کر فوراً" اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آج آپ جلدی گھر آ گئے۔" دوپٹے سے اپنا چہرہ صاف کرتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"صفیہ! تم رو رہی تھیں۔۔۔ کیوں؟" وہ اس کے یوں تنہا اپنے کمرے میں بیٹھ کر رونے پر حیران ہوا تھا۔

"نہیں تو۔ میں نے کیوں رونا ہے۔ آپ بیٹھیں میں کھانا لگواتی ہوں۔"

"صفیہ! میں نے جو پوچھا ہے، اس کا جواب دو۔" سعد نے اس کا بازو پکڑ کر اسے روکا۔

"وہ اصل میں مجھے امی، ابو اور گھر بہت یاد آ رہا ہے۔ بہت دن ہو گئے ہیں نا، ملنے نہیں گئی۔ اکیلی تھی تو کچھ زیادہ ہی شدت سے یاد آ گئے تو شاید آنسو نکل آئے۔ اور تو کوئی بات نہیں۔"

اس نے ایک دفعہ پھر اپنا نم چہرہ صاف کرتے ہوئے اپنے رونے کی وضاحت کی تو جیسے اس پر گھڑوں پانی گر گیا۔

آج ان کی شادی کو تقریباً" ڈیڑھ ماہ ہو چکا تھا۔ اسے خیال کیوں نہ آیا کہ صفیہ اس کی طرح اکیلی نہیں ہے۔ اس کے ماں، باپ اور بہنیں ہیں، جو اسے یاد آتے ہوں گے۔ سیف چاچو نے دو دفعہ چکر لگایا تھا لیکن اسے پھر بھی خیال رکھنا چاہیے تھا کہ صفیہ کو میکے لے کر جانا چاہیے۔

"صفیہ! اگر مجھے یاد نہیں رہا تو تم ہی مجھے یاد کرا دیتیں۔ میں تمہیں ملانے لے جاتا۔ یوں اکیلے میں یاد کرنے کی بجائے ملنا زیادہ بہتر تھا نا۔" وہ اس سے استفسار کر رہا تھا۔

"میں نے سوچا آپ بہت مصروف رہتے ہیں۔ جب فارغ ہوں گے تو پھر چلیں گے۔" لبوں پہ مخصوص مسکراہٹ سجائے وہ اطمینان سے بولی۔

"صفیہ! مصروفیت تم سے زیادہ اہم نہیں۔ یہ بات ہمیشہ یاد رکھنا اور اب پانچ منٹ کے اندر تیار ہو جاؤ، ہم ابھی گاؤں جا رہے ہیں۔"

"آپ سچ کہہ رہے ہیں۔" اس کی بات ابھی پوری بھی نہ ہوئی کہ وہ خوشی سے بولی۔

"بالکل سچ! آ جاؤ۔"

اور پھر وہ پانچ منٹ بعد گاؤں جا رہے تھے۔

"آپ مجھے گاؤں چھوڑ کر آ جائیں گے؟" گاڑی میں ایک دم صفیہ کی آواز ابھری۔

"تمہارا دل کیا کہتا ہے؟" سعد نے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ وہ آف وائٹ چادر پیشانی تک اوڑھے بہت پاکیزہ لگ رہی تھی۔

"میرا دل تو کہتا ہے کہ جتنے دن میں وہاں رہوں، آپ بھی وہیں رہیں۔" اس کی بات پر سعد کے پاؤں ایک دم بریک پر پڑے تھے۔

"کیا کہا تم نے؟" اتنے دنوں میں یہ پہلی بات تھی جو صفیہ نے بے تکلفی سے کی تھی۔ اس کا حیران ہونا بنتا تھا۔ اس کے اس طرح پوچھنے پر صفیہ خود میں سمٹ گئی۔

"جلدی جلدی گاڑی چلائیں، سردی بڑھ رہی ہے۔" سعد کے شرارت سے دیکھنے پر اس نے اس کا دھیان گاڑی کی طرف کرایا تو اس نے بھی مسکراتے ہوئے گاڑی دوبارہ اسٹارٹ کر دی۔

☼ ☼ ☼

سعد نے صفیہ کے دل کا کہا مان لیا کیونکہ وہ خود بھی تو اس کا عادی ہو چکا تھا۔ اس لیے اتنی مصروفیت کے باوجود سعد نے اپنے اسسٹنٹ وکیل کو فون کر کے کام کے بارے میں سمجھا دیا اور تین دن تک صفیہ کے ساتھ حویلی میں رہا۔ اسے خود بھی یوں ایک فیملی کے ساتھ ٹائم گزارنا بہت اچھا لگ رہا تھا۔ صفیہ کی بہن آمنہ اور ہاجرہ بھی اطلاع ملتے ہی ان سے ملنے آ گئیں۔ ان کے بچوں کی وجہ سے اور بھی رونق ہو گئی۔ رات کو جب وہ اپنی بہنوں کے پاس بیٹھی ان سے باتیں کر رہی تھی تو آمنہ آپی اس سے سعد کے بارے میں پوچھنے لگیں۔

"صفیہ! تو سعد بھائی کے ساتھ خوش تو ہے نا؟"

"آپی! آپ اندازہ بھی نہیں کر سکتیں کہ میں کتنی خوش ہوں۔ میں جانتی ہوں آپ میرے دور ہونے کی وجہ سے پریشان رہتی ہیں، لیکن آپ یقین کریں، سعد بہت اچھے ہیں۔" وہ سادگی سے بولی۔

"نجانے کیوں صفو! مجھے خدشے ستاتے رہتے ہیں کہ سعد بھائی اتنے خوبصورت، پڑھے لکھے بڑے وکیل ہیں۔ ساتھ لڑکیاں بھی کام کرتی ہوں گی، ان سے دوستی بھی ہو گی اور تو ویسے بھی معصوم سی ہے۔ تجھے تو کچھ پتا بھی نہیں چلنا۔" صفیہ ان کے خدشے پر مسکرا دی۔

"آپا! آپ ہی آمنہ آپی کو سمجھائیں۔ سعد ایسے نہیں ہیں۔ وہ بہت سنجیدہ اور لیے دیے رہنے والے انسان ہیں۔ خوبصورت اور پڑھا لکھا ہونے کا مطلب یہ تھوڑا ہی ہے کہ ان کی لڑکیوں سے ضرور دوستی ہو گی، ایسی بات ہوتی تو مجھ سے شادی کیوں کرتے۔ آپ بس میرے لیے دعا کریں۔ آپ فکر نہ کیا کریں، میں اپنے گھر میں بہت خوش ہوں۔"

اس نے رسان سے کہا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی بہنیں اس کی طرف فکر مند رہتی ہیں، اس لیے ان کو تسلی دینے لگی۔ وہ بھی مطمئن ہو کر اس سے اپنے سسرال اور بچوں کی باتیں کرنے لگیں۔

صفیہ کی بہنوں نے تو اپنی محبت میں اپنے خدشات کا اظہار کیا لیکن سیف بخاری اور رقیہ نے ایسا کوئی سوال نہ کیا اور نہ ہی کسی خدشے کا اظہار کیا۔ وہ اپنی بیٹی کی آنکھوں اور چہرے سے خوشی کی تحریر پڑھ سکتے تھے اور یہ چیز ان کو مطمئن کرنے کے لیے کافی تھی۔ سعد اور صفیہ کے آنے کی وجہ سے وہ دونوں بہت خوش تھے۔ وہ تین دن وہاں رہے اور بہت خوبصورت سا وقت گزار کر واپس لوٹ آئے۔

جب وہ بخاری ولا میں پہنچے تو سعد گیٹ پر ہی رک گیا کیوں کہ چوکیدار ہاتھ میں کوئی چیز پکڑے ان کی طرف ہی آ رہا تھا۔

"سلام صاحب! دو دن پہلے ارسہ بی بی آئی تھیں۔ یہ کارڈ دے کر گئی ہیں کہ آپ کو دے دوں۔" چوکیدار نے کارڈ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ سعد نے کھول کر دیکھا تو ارسہ کی شادی کا کارڈ تھا۔

"ارسہ کی شادی ہو رہی ہے۔" وہ زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔

"ارسہ کون ہے؟" صفیہ نے ارسہ کا نام پہلی دفعہ سنا تھا۔ اس لیے پوچھنے لگی۔

"میری... کولیگ ہے۔" نجانے کیوں وہ دوست کہتے کہتے رکا تھا۔ کیا خبر صفیہ کو اچھا نہ لگے۔

"تم میرے ساتھ شادی میں چلوگی؟" وہ وہیں کھڑے کھڑے اس سے پوچھ رہا تھا۔

"اگر ان کے ہاں عورتوں کے لیے الگ سے انتظام ہوا تو چلوں گی۔"

"کیوں "الگ سے انتظام کیوں؟" سعد نے ایک دم پوچھا۔

"میں پردہ کرتی ہوں' اس لیے مخلوط محفلوں میں نہیں جاتی۔" وہ اپنے مخصوص انداز میں نرمی سے کہتے ہوئے اندر کی جانب چل دی۔ مگر وہ وہیں کھڑا رہ گیا۔

بعض باتیں کتنی چھوٹی ہوتی ہیں کہ ہم دھیان ہی نہیں دیتے' لیکن وہ چھوٹی سی بات اپنے اندر کتنا معنی لیے ہوتی ہے۔

"میں مخلوط محفلوں میں نہیں جاتی۔"

اس چھوٹے سے فقرے پہ وہ سوچ رہا تھا کہ ہمیں مخلوط محفل میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ ہماری بدقسمتی کی انتہا ہے کہ برائی' برائی محسوس نہ ہو' بلکہ وقت کی ضرورت اور ماحول کا تقاضا لگے۔

وہ خود سے مخاطب ہوتا اندر کی جانب چل دیا۔

ارسہ کی شادی کا سن کر وہ کافی مطمئن ہو گیا تھا۔ نجانے کیوں دل سے ایک نادیدہ سا بوجھ ہٹ گیا تھا۔ وہ ارادتاً "نہ سہی لیکن ارسہ کی دل آزاری کا باعث ضرور بنا تھا اور اب اس کی شادی کا سن کر اسے اطمینان ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

آج سعد اور سیرت دونوں ارسہ کی مہندی کے فنکشن میں آئے ہوئے تھے۔ آج سے پہلے سعد اس طرح کے فنکشنز سے خوب محظوظ ہوا کرتا تھا لیکن صفیہ کا صرف ایک فقرہ سننے کے بعد آج وہ پورے ماحول کا بغور جائزہ لے رہا تھا اور اسے یہاں کچھ بھی ٹھیک نہیں لگ رہا تھا۔ خاص طور پر ارسہ ملک خود۔

وہ اپنے ہونے والے شوہر نہال ملک کے ساتھ بے تکلفی سے گھوم پھر رہی تھی۔ اس نے عنابی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ جس کے بارڈر پر سنہری موتیوں کا کام ہوا تھا۔ اس کا گلا کافی گہرا تھا۔ بلاؤز بھی کچھ چھوٹا تھا اس لیے کمر کا کچھ حصہ بھی نظر آ رہا تھا اور پھر روایتی شرم و حیا کے بجائے اس کی بے تکلفی اور شوخی...

"کیا آج میں زیادہ اچھی لگ رہی ہوں جو سعد بخاری کی نظریں مجھ سے ہٹ ہی نہیں رہیں۔" وہ اپنے خیالوں میں گم تھا' جب نجانے کب ارسہ اس کے پاس آ گئی اور بڑی بے تکلفی سے بولی۔ وہ اس کو بہت جتاتی نظروں سے دیکھ رہی تھی' جیسے یہ جتانا چاہ رہی ہو کہ سعد اس جیسی لڑکی کو کھو چکا ہے۔

سعد کی نظروں میں ایکدم صفیہ کی شبیہہ ابھری تھی اور دل میں جیسے بے پناہ احترام موجزن ہو گیا۔ صفیہ سے ملنے کے بعد اسے ارسہ پُر اعتماد اور بے تکلف نہیں بلکہ ماڈرن تہذیب کی گود میں پلی ایک بے باک لڑکی لگ رہی تھی۔

"ارسہ! میری طبیعت ٹھیک نہیں تم پلیز برا نہ ماننا' میں زیادہ دیر یہاں ٹھہر نہیں سکتا۔" یہ کہہ کر وہ رکا نہیں اور وہاں سے آ گیا۔ یہ سوچے بغیر کہ ارسہ نے اس کے یوں چلے آنے کو کیا معنی پہنائے ہوں گے اور سیرت کو بھی نہیں بتایا' جو کسی مہمان سے باتوں میں مگن تھا۔

"شکر ہے میرے ساتھ صفیہ نہیں آئی۔ نجانے وہ میرے بارے میں کیا سوچتی۔" سعد گاڑی میں بیٹھے

صفیہ کے بارے میں سوچ رہا تھا۔

"یہ جگہ اس کے قابل بھی نہ تھی۔ وہ تو یہاں ایک پل بھی نہیں رہ سکتی۔ میں اسے کبھی اس طرح کی محفلوں میں آنے کے لیے مجبور نہیں کروں گا۔ کبھی نہیں۔" صفیہ کے ایک فقرے نے اس کی پوری سوچ کو بدل کر رکھ دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

صفیہ دو تین دنوں سے محسوس کر رہی تھی کہ سعد کچھ بے چین سا ہے۔ اس نے اپنی پریشانی اس پہ ظاہر نہیں کی تھی اور صفیہ نے بھی پوچھنے کی کوشش نہ کی۔ وہ اس انتظار میں تھی کہ شاید وہ خود ہی بتا دے گا۔

آج بھی وہ آفس سے آ کر چائے پیتے ہوئے اخبار پڑھ رہا تھا۔ یہ اس کی روٹین کا حصہ تھا کہ اسے دن کے جس حصے میں بھی فرصت ملتی وہ اخبار ضرور پڑھتا تھا۔ لیکن آج اس نے اخبار بھی نہیں پڑھا اور صوفے کی پشت سے سر ٹیک کر آنکھیں موند لیں۔ صفیہ جو اس کے صبح کے لیے کپڑے پریس کر رہی تھی۔ گاہے گاہے اس پر بھی نظر ڈال رہی تھی۔ آج رہ نہ سکی کام سے فارغ ہو کر اس کے پاس آ گئی۔

"سعد! آپ کو کوئی پریشانی ہے تو مجھ سے کیوں نہیں شیئر کرتے؟" سعد جو آنکھیں موندے بیٹھا تھا' ایکدم آنکھیں کھول کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ اس کے سامنے نیچے کارپٹ پہ بیٹھی تھی اور اپنا ہاتھ اس کے گھٹنے پہ رکھ کر بڑی نرمی سے پوچھ رہی تھی۔ سعد جب سے ارسہ کے گھر سے آیا تھا' بے چین سا تھا۔ اسے خود بھی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا چیز بے چینی کر رہی ہے۔ لیکن یہ بھی اندازہ نہ تھا کہ اس کی پریشانی صفیہ بھی بھانپ لے گی۔

"تمہیں کیسے معلوم کہ میں پریشان ہوں؟" وہ ہنستے ہوئے اسے دیکھ رہا تھا۔

"میں دو تین دن سے نوٹ کر رہی ہوں' آپ کی سوچیں کچھ منتشر سی ہیں' کسی کام میں دلچسپی نہیں لے رہے' ڈھنگ سے کھانا بھی نہیں کھا رہے اور مجھ سے بھی ٹھیک طرح سے نہیں بول رہے۔" وہ تفصیل سے اسے بتاتی بہت اپنی سی لگی تھی۔

"تم نے صحیح اندازہ لگایا کہ میری سوچیں منتشر سی ہیں' لیکن میں تمہیں ایک بات بتاؤں' حقیقت میں مجھے خود بھی نہیں معلوم کہ میں پریشان کیوں ہوں۔" وہ بے بسی سے اس کے سامنے اعتراف کر رہا تھا۔

"میری ایک بات مانیں گے؟" اب کے اس نے اپنے دونوں ہاتھ سعد کے ہاتھوں پہ رکھ دیے۔ آواز میں پھولوں کی سی نرمی تھی۔

"ایسے بات کروگی تو کیسے انکار کر سکتا ہوں۔"

"آپ نماز پڑھا کریں۔ دل خود بخود پر سکون ہو جائے گا۔ کوئی وسوسہ کوئی اندیشہ نہیں رہے گا۔ مسائل خود بخود حل ہوتے جائیں گے۔ اپنے رب کے ساتھ لو لگا کر دیکھیں۔ دل میں بے چینی کے لیے جگہ ہی نہیں رہے گی۔ یہ میرا یقین ہے۔ آپ بھی آزما کر دیکھیں۔" سعد اس کے لہجے کی سچائی میں ڈوب کے ابھرا تھا۔

"سعد! آپ کو شاید میری یہ جرأت بری لگے۔ لیکن میں یہ بات کیے بغیر نہیں رہ سکی۔" صفیہ نے اس کی خاموشی کو کوئی اور معنی پہنائے تھے۔

"صفیہ! ہماری شادی کو دو مہینے ہو گئے ہیں اور تم مجھے آج میری کوتاہیوں کا احساس دلا رہی ہو۔ جو باتیں آج کر رہی ہو' یہ پہلے کیوں نہ کیں؟ کیوں سب کچھ جانتے بوجھتے مجھے غلطی کا احساس نہ دلایا؟" اب کے وہ دکھ سے بولا تھا۔

"اس لیے سعد کہ نہ میں رتبے میں آپ کے برابر تھی اور نہ علم میں۔ اسی احساس کے تحت میں زبان سے نہ بولی' لیکن اپنے ہر عمل سے آپ کو ضرور باور کرایا۔ میں جان بوجھ کر آپ کے سامنے نماز پڑھتی۔ آپ کے سامنے قرآن پاک پڑھتی تاکہ آپ کو بھی احساس ہو جائے۔ میں شاید اب بھی آپ کو اسی خاموش طریقے سے جتلاتی لیکن آج آپ کی بے چینی دیکھی نہ گئی تو یہ باتیں کہنی پڑیں۔"

صفیہ کے بولنے سے اتنا ضرور ہوا تھا کہ وہ اپنی بے

چینی کی وجہ جان گیا تھا کہ وہ اتنی پاک باز اور اچھی لڑکی کے قابل نہیں تھا۔ یہ تو اس کے رب کا کرم ہے' جو اس نے اس کے نصیب میں صفیہ جیسی پاکیزہ لڑکی لکھی۔ سعد نے جھک کر صفیہ کی تصبیح پیشانی چوم لی تو وہ سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ اٹھنے لگی مگر سعد نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ بٹھالیا۔

☼ ☼ ☼

کچھ دلوں کی سرزمین بڑی زرخیز ہوتی ہے۔ جب وہاں اچھی باتوں کے بیج بوئے جاتے ہیں تو نیکی کی فصل بڑی جلدی تیار ہوجاتی ہے۔ یہی سعد بخاری کے ساتھ ہوا۔ اس نے بہت جلد صفیہ کی ساری باتوں کو اپنا لیا تھا۔ اب وہ مطمئن اور مسرور رہنے لگا تھا۔

شادی کے ڈیڑھ سال بعد جب اس کے ہاں جڑواں بچوں کی پیدائش ہوئی تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ میمونہ اور عبداللہ نے آکر ان کے گھر کو واقعی جنت بنا دیا۔ وہ اپنے رب کا جتنا بھی شکر ادا کرتا کم تھا' جس نے اسے صفیہ جیسی بیوی اور میمونہ اور عبداللہ عطا کیے۔

اب اسے ارسہ بھولے سے بھی یاد نہ آتی۔ نہ وہ ملی اور نہ ہی اس نے ملنے کی کوشش کی۔ صفیہ کے ساتھ رہتے ہوئے وہ یہ حقیقت تو جان گیا تھا کہ لڑکے اور لڑکی کی دوستی کی ہمارے دین اسلام میں کوئی گنجائش نہیں۔ ویسے بھی کچھ عرصے بعد وہ دبئی شفٹ ہوگئی۔ اسے اب اس کی کوئی خبر نہ تھی البتہ سیرت سے اس کی دوستی ابھی بھی قائم تھی لیکن اس دوستی میں بھی سعد نے احتیاط کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔

اس احتیاط کا ادراک سعد کو اس دن ہوا تھا' جب ایک کیس کو سیرت کے ساتھ ڈسکس کرتے ہوئے آفس میں ہی شام کے سات بج گئے۔

"یار! بس کرو' ویسے بھی جو پوائنٹس رہتے ہیں' کلائنٹ کی موجودگی میں ہی ڈسکس ہوسکتے ہیں اور اب مجھے بھوک بھی ستا رہی ہے۔ دوپہر کو بھی کچھ خاص نہیں کھایا تھا۔" سیرت تھک بھی چکا تھا' بھوک نے بھی ستایا تو وہ فائل بند کرتے ہوئے کرسی سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا مجبوراً سعد کو بھی کام ختم کرنا پڑا۔

"ایک تو تمہاری اس عادت سے میں بہت تنگ ہوں جو تمہیں کام کے دوران بھوک ستانے لگتی ہے۔ اگر کچھ دیر اور کام کرتے تو مجھے آسانی ہوجاتی۔" سعد بولتے ہوئے اپنی چیزیں بھی سنبھالنے لگا۔

"اچھا! اب بتاؤ ڈنر کے لیے کہاں چلیں؟" سیرت اپنا کوٹ بازو پہ ڈالتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

"پتا نہیں کیوں یار! جب سے میری شادی ہوئی ہے کھانے کے لیے میرا صرف گھر جانے کو ہی دل کرتا ہے۔ مجھے اب ہوٹل وغیرہ کے کھانے اچھے نہیں لگتے۔" سعد نے جیسے اس کو اپنا ارادہ بتایا۔

"اس کا مطلب ہے کہ بھابھی بہت اچھا کھانا بناتی ہیں تو بس! پھر آج ایسا کرتے ہیں کہ میں بھی تمہارے ساتھ تمہارے گھر چلتا ہوں اور بھابھی کے ہاتھ کا کھانا کھالیتا ہوں' کیونکہ کائنات میکے گئی ہوئی ہے اور ملازمہ کو میں نے کھانا بنانے سے منع کیا ہوا ہے۔" وہ بے چارگی سے بولا تو سعد کو ہنسی آگئی۔

"سیرت! اتنی مسکینی بھی اچھی نہیں۔ لیکن تم فکر نہ کرو میں ابھی صفیہ کو فون کرتا ہوں کہ وہ اچھا سا ڈنر تیار کرے ہم گھر آرہے ہیں۔" سعد نے موبائل اٹھاتے ہوئے کہا۔

"رہنے دے یار! ایسے ہی چلتے ہیں۔ جو بنا ہوگا' کھالیں گے' بھابھی کو کیوں زحمت دیتا ہے۔" سیرت نے کہا تو سعد نے بھی اس کی بات مان لی اور دونوں سعد کے گھر آگئے۔

پہلے جب بھی سیرت ان کے گھر آتا تھا بے تکلفی سے اندر چلا جاتا تھا۔ آج بھی وہ سعد کے ساتھ ہی اندر جانے لگا تھا کہ سعد نے قدم روک لیے اور وہیں سے سیرت کو لیے ڈرائنگ روم کی طرف آگیا۔ سیرت حیرانی سے سعد کو دیکھ رہا تھا۔

"سیرت! تم برا نہ ماننا' دراصل صفیہ پردہ کرتی ہے' تو میں تمہیں اس لیے ڈرائنگ روم میں لے آیا۔" وہ تھوڑا شرمندگی سے بولا تھا۔

"تو تم کیوں شرمندگی سے زمین میں دھنسے جارہے ہو' جلدی سے یہیں کھانا لاؤ' اس شرمندگی سے کام نہیں چلے گا۔" سیرت کے ہلکے پھلکے سے انداز پر سعد تشکر سے اسے دیکھتا ہوا اندر چل دیا۔

وہ سیدھا کچن میں آیا' جہاں صفیہ سیما کے ساتھ مل کر کھانا بنا رہی تھی۔

"صفیہ! میرے ساتھ میرا دوست سیرت آیا ہے۔ کھانے میں کیا بنایا ہے۔" سلام کے بعد سعد نے صفیہ سے کھانے کے بارے میں پوچھا۔

"میں نے تو اچار گوشت اور مکس سبزی بنائی ہے لیکن سیما کی فرمائش پر ماش کی دال بنائی ہے اور اسے مکھڈی حلوہ بنانا سکھایا ہے تو وہ بھی ہے۔ اور سلاد رائتہ تو ہے ہی۔ آپ مجھے فون پر سیرت بھائی کے آنے کا بتادیتے تو میں کچھ اور بھی بنالیتی۔"

سعد اس کی باتوں پر مسکرا دیا۔

"سیما کی فرمائش پر ماش کی دال" اس نے اپنی زندگی میں پہلی دفعہ دیکھا کہ کسی نے اپنے ملازم کی فرمائش پوری کی ہو۔

"یہی کافی ہے۔ تم بس کھانا ڈرائنگ روم میں بھجوا دو۔"

"کھانا واقعی بہت مزے کا ہے۔ اب مجھے پتا چلا کہ تیرا دل ہوٹل کے کھانے کو کیوں نہیں کرتا۔ ویسے ایک بات تو بتا! بھابھی روزانہ تیرے لیے اتنا اہتمام کرتی ہیں؟" کھانے کے بعد سیرت کا تبصرہ اور سوال سعد کو مزا دے گئے۔

"سیرت! تجھے کھانا اچھا لگا' بڑی بات ہے اور اگر زیادہ اچھا لگا ہے نا تو آئندہ لنچ بھی کیفے سے کرنے کی بجائے گھر سے منگوالیا کریں گے۔" سعد نے مسکراتے ہوئے کہا۔

اور پھر واقعی سیرت کی فرمائش پر سعد کا لنچ گھر سے آنے لگا۔ صفیہ مزے مزے کے کھانے بنا کر ان کو بھیجتی اور ہوٹلوں کے کھانے سے ان کی جان چھوٹی۔

لیکن اس چھوٹے سے واقعے کے بعد سعد بہت محتاط ہوگیا۔ وہ اس طرح کہ پہلے یہ بھی بے تکلفی سے سیرت کے گھر جاتا تھا۔ کائنات بھابھی سے بھی گپ شپ کرتا تھا' لیکن جب سے اس نے سیرت کو ڈرائنگ روم میں بٹھایا تھا' اس کے بعد سے وہ جب سیرت کے گھر جاتا تو خود بھی ڈرائنگ روم میں ہی بیٹھتا یہ اور بات کہ کائنات بھابھی حال احوال پوچھنے ڈرائنگ روم میں بھی آجاتیں۔ دوستی تو عمر بڑھنے کے ساتھ مزید گہری ہوتی گئی لیکن گھروں میں بے تکلفی سے آنے جانے کی رسم ختم ہوگئی۔

☼ ☼ ☼

زندگی بڑی سبک روی سے گزر رہی تھی۔ آج بھی وہ بڑے خوش گوار موڈ میں گھر آیا تھا لیکن وہ دنگ رہ گیا۔ صفیہ کی اتنی اونچی آواز اس نے پہلے کبھی نہ سنی تھی۔ وہ تو بہت دھیما اور بہت نرمی سے بولتی تھی لیکن آج تو اس کی آواز لاؤنج سے باہر آرہی تھی۔

سعد جب اندر داخل ہوا تو اور بھی حیران ہوا وہ سیما پر برس رہی تھی۔ وہ تو ملازموں کے ساتھ بہت شفقت سے بولتی تھی۔ آج یقیناً "کوئی بڑی بات ہوئی ہے۔ وہ یہی سوچتے ہوئے ان کے پاس آگیا۔

"صفیہ! کیا ہوا ہے' کچھ تو خیال کرو' وہ بے چاری رو رہی ہے اور تم ڈانٹے جارہی ہو۔"

"آپ اسے بے چاری تو ہرگز نہ کہیں۔ میں نے اسے کتنی دفعہ منع کیا ہے۔ لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ میری بات کو یہ کوئی اہمیت ہی نہیں دیتی۔" غصے کی شدت سے وہ بولتے ہوئے کانپ رہی تھی۔

"سیما! تم جاؤ' چائے لاؤ اور تم ادھر بیٹھو۔" سعد نے سیما کو کچن میں بھیج کر اسے وہیں لاؤنج میں پڑے صوفے پر بٹھایا۔ جگ سے خود پانی ڈال کر گلاس اس کی طرف بڑھایا۔

"لو پانی پیو!" صفیہ نے آرام سے پانی پی لیا۔

"اب بتاؤ! کیا ہوا ہے جو تم اتنا روڈلی بول رہی تھیں۔" جب سعد کو لگا کہ اس کے اعصاب نارمل ہونے لگے ہیں تو اس نے پوچھا۔

"آپ نہیں جانتے اس کو ٹی وی دیکھنے کی عادت

"رہ گئی ہے اور میں یہ برداشت نہیں کر سکتی۔" وہ اب بھی غصے سے بولی۔

"صفیہ! یہ تو ایسی قابل اعتراض بات نہیں کہ تم اس پر غصہ کرو۔ اگر وہ فارغ وقت میں ٹی وی دیکھتی ہے تو اس میں کیا حرج ہے؟" وہ حیران ہوا۔

"مجھے اس کے ٹی وی دیکھنے پر کوئی اعتراض نہیں تھا، لیکن اب کچھ دنوں سے یہ پڑوس سے سن کر انڈیا کے ڈرامے اور چینلز دیکھتی ہے۔ مجھے تو پتا بھی نہ چلتا اگر بچوں کے ساتھ آگے پیچھے کام کرتے ہوئے ان ڈراموں کی کچھ آوازیں میرے کان میں نہ پڑتیں۔ آپ جانتے ہیں ان کے ہر ڈرامے میں پوجا پاٹ والا منظر ضرور ہوتا ہے۔ وہ پوجا بے شک ڈرامے کا ایک سین ہوتا ہے، لیکن وہ سین ٹی وی کے ذریعے ہوتا تو ہمارے گھر میں ہے نا، وہ مندروں اور ناقوس کی بجتی گھنٹیاں، وہ پورے پورے بھجن ہمارے گھر میں پڑھے جاتے ہیں، ٹریفک کے شور کی وجہ سے اذانوں کی آوازیں تو گھروں تک پہنچ نہیں سکتیں، لیکن بھجن ضرور یاد ہو جائیں گے۔ اب بچوں پر اس کے جو اثرات مرتب ہوں گے ان کا ذمہ دار کون ہے؟ میں اور کسی کو تو نہیں، لیکن اپنے گھر کی ذمہ داری کو پورا کرنے کی اہلیت ضرور رکھتی ہوں۔ اسی لیے میں نے اس سے کہا تھا کہ اگر تمہیں ٹی وی دیکھنے کا بہت شوق ہے تو کوئی پاکستانی چینل دیکھ لیا کرو۔ حیا تو خیر ان میں بھی مفقود ہو چکی ہے، لیکن بہرحال شرک تو نہیں ہوتا، پر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔" وہ بولے جا رہی تھی اور سعد ایک دفعہ پھر اسی کیفیت میں تھا، جب صفیہ نے اسے نماز کے لیے کہا تھا۔

"کل بھی میں باہر لان میں بیٹھی میمونہ کا سوئیٹر بن رہی تھی۔ بچے کھیل رہے تھے اور سیما پڑوس میں کام کرنے والی شازیہ سے باتیں کر رہی تھی۔ جو ہمارے گھر میلاد کا کہنے آئی تھی اور پھر وہیں سیما سے باتیں کرنے لگی۔ میری سختی کی وجہ سے سیما جو ڈرامے نہ دیکھ سکی، وہ شازیہ سے سن رہی تھی۔ میں تو یہ سن کر دنگ رہ گئی کہ انہیں کافروں کے بتوں کے نام تک یاد تھے جنہیں وہ بھگوان کہتے ہیں۔ پھر مجھے غصہ نہ آتا تو کیا ہوتا۔ اس شازیہ کو تو میں نے بھگایا اور اسے رسان سے سمجھایا کہ یہ سب کچھ گناہ کے زمرے میں آتا ہے۔ لیکن آج پھر وہی تماشا۔ میں مغرب کی نماز پڑھ رہی ہوں اور یہ ٹی وی کے آگے۔ آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ مجھ سے نماز پڑھنی مشکل ہو گئی۔ جب کانوں میں لغو آوازیں آ رہی ہوں تو دل اور دماغ کیسے یکسو ہو سکتے ہیں۔ بس پھر مجھ سے بھی برداشت نہیں ہوا اور مجھے مجبوراً" غصہ کرنا پڑا۔ ورنہ گھر کی برکت تو ختم ہوتی ہی ہے۔ لیکن بچوں کے ذہن ابھی کچے ہیں وہ خود کو اس متصادم تہذیب کے بڑھتے ہوئے شکنجے سے کیسے بچائیں گے؟" بولتے ہوئے اس کی آواز آج بھی رندھ گئی۔

"مجھ سے ایسی باتیں برداشت نہیں ہوتیں، اس لیے اونچا بول گئی، آپ مجھے معاف کر دیں۔" سعد جو اس کی باتوں کو اپنے دل میں اترتا ہوا محسوس کر رہا تھا، اس کی معافی والی بات پر حیران ہوا۔

"میری امی کہتی ہیں جب سارے دن کا تھکا ہارا شوہر گھر میں داخل ہو تو گھر میں سکون ہونا چاہیے۔ اگر کوئی شدید مسئلہ بھی ہو تو اسے تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد بتانا چاہیے۔ ورنہ تھکے ہوئے ذہن کے ساتھ وہ آپ کی صحیح بات کو بھی غلط معنی پہنا سکتا ہے۔ لیکن آج میں نہ چاہتے ہوئے بھی آپ کو پریشان کر گئی۔ آئندہ خیال رکھوں گی۔" وہ اب نادم سی لگ رہی تھی۔

"پتا ہے صفیہ! جب تم ایسی باتیں کر رہی ہوتی ہو تو میرا دل کرتا ہے، تم ایسے ہی بولتی رہو اور میں سنتا رہوں۔" وہ اسے پیار سے اپنی نظروں میں سموتے ہوئے بولا وہ گہرے سبز سوٹ میں، بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔

"میں ابھی نیوز چینلز کے علاوہ سارے چینلز لاک کر دیتا ہوں۔ پھر تمہیں ایسی کوئی شکایت نہیں ہوگی۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"میں کھانا لگاتی ہوں۔ آج آپ کی پسند کی بریانی

اور شامی کباب بنائے تھے لیکن باتوں میں کچھ یاد نہیں رہا۔" وہ اپنا دوپٹا صحیح کر کے کچن میں چلی گئی تھی، لیکن سعد اس سے نظر نہیں ہٹا سکا تھا۔

وہ سوچ رہا تھا کہ صفیہ کیسی باتیں کرتی ہے جن کے بارے میں ہم سوچنے کی بھی زحمت گوارا نہیں کرتے۔ ابھی پچھلے ہفتے ہی تو وہ سیرت کے گھر گیا ہوا تھا اور اس کا سات آٹھ سالہ بیٹا دانیال ہندی زبان میں کچھ پڑھ رہا تھا۔ سعد نے جب پوچھا کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے تو سیرت نے ہنستے ہوئے کہا۔

"سلمان خان فیورٹ ہے اس کا اس نے فلم میں کوئی بھجن پڑھا تھا۔ وہ صاحبزادے نے بھی یاد کر لیا۔" اس وقت سیرت کی بات اسے بالکل بری نہیں لگی تھی۔ بلکہ وہ ہنسنے لگا تھا۔ کیونکہ وہ تتلا کر بولتا اچھا لگ رہا تھا۔ پھر کائنات بھابھی کا یہ کہنا۔

"میرا بیٹا بڑا ذہین ہے سعد بھائی! یہ ہر بات کو فوراً" پک کر لیتا ہے۔" وہ متاثر ہوا تھا۔

اب وہ ان باتوں کو یاد کر کے سوچ رہا تھا کہ جب ہمارے بچے اتنے ذہین ہوتے ہیں کہ ہر بات کو فوراً" پک کر لیتے ہیں تو ہم انہیں اس راستے پر کیوں نہیں لے جا سکتے جو راستہ ہمیں ہمارے رب کی طرف لے جائے۔ جہاں فلاح ہی فلاح ہو۔ لیکن ہر کوئی اس جیسا خوش نصیب نہیں ہوتا کہ جسے صفیہ جیسی شریک حیات ملے۔

"کاش! ہر کوئی صفیہ جیسا سوچ سکے تو زندگی کا ڈھب ہی جدا ہو۔" وہ ریموٹ اٹھا کر چینل لاک کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

سعد اسٹڈی میں بیٹھا ایک بہت اہم کیس اسٹڈی کر رہا تھا۔ جب اس کا دس سالہ بیٹا عبداللہ دستک دے کر اندر داخل ہوا۔

"بابا جانی! اگر آپ ڈسٹرب نہ ہوں تو میں آجاؤں؟" وہ تھوڑے فاصلے پر کھڑا بہت تمیز سے اجازت مانگ رہا تھا۔ سعد کو اس کے انداز پر پیار آگیا۔ "بالکل بھی ڈسٹرب نہیں ہوں گا۔ آپ آجائیں۔" اس نے فائل بند کرتے ہوئے اسے اپنے پاس بلایا۔

"بابا جانی! میرے ساتھ مونا بھی تھی، لیکن ماما جانی نے ہمیں منع کیا تھا کہ آپ کام کر رہے ہیں، آپ کے پاس نہ جائیں تو وہ لاؤنج میں ہی بیٹھ گئی لیکن میں آگیا، اب میں مونا کو بھی بلا لاؤں؟" وہ تھوڑا جھجکتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔

"ایسا کرتے ہیں لاؤنج میں ہی مونا اور آپ کی ماما کے پاس چل کر بیٹھتے ہیں۔"

عبداللہ نے راضی ہو کر سر ہلایا۔ سعد اس کو ساتھ لیے لاؤنج میں آگیا، جہاں صفیہ کارپٹ پہ بیٹھی بچوں کی کاپیوں پر کور چڑھا رہی تھی اور مونا منہ بسورے اس کے پاس رکھے صوفے پر بیٹھی تھی۔

"عبداللہ! میں نے تمہیں منع بھی کیا تھا پھر بھی تم۔۔۔"

"ارے نہیں صفیہ! میں خود ہی باہر آیا ہوں، تم پلیز بچوں کو نہ ڈانٹو اور یہ میرا مون کیوں ناراض بیٹھا ہے۔" وہ صوفے پر بیٹھ گیا اور دونوں بچوں کو گود میں بٹھا لیا۔

"ہاں! اب بتاؤ کیا بات ہے؟"

"بابا جانی! آپ کو پتا ہے ناں! صبح عبداللہ کا قرأت کمپٹیشن ہے؟"

"بابا کی جان! بالکل پتا ہے۔" اس نے دونوں کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

دونوں جڑواں ہونے کی وجہ سے ایک کلاس میں تھے اور پڑھائی کے ساتھ ساتھ ہم نصابی سرگرمیوں میں بھی آگے آگے تھے۔ عبداللہ ہمیشہ قرأت اور نعت میں پرائز لیتا تھا اور مونا جو بچوں کی ٹیوٹر بھی خود تھی اور قاریہ بھی خود تھی۔ تقریری مقابلوں میں بچوں کی یہ ساری تیاری صفیہ کرواتی تھی اسی لیے بچے اس سے تھوڑا ڈرتے تھے اور سعد سے ہی فرمائش وغیرہ کرتے تھے۔

"تو بابا جانی! عبداللہ کو وائٹ ڈریس پہن کے جانا

ہے اور ماما جانی کہتی ہیں کہ میں بھی وائٹ ہی فراک پہنوں جبکہ مجھے پنک والا اچھا لگتا ہے۔" وہ منہ بسور کر بولتے ہوئے اسے اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی۔

"سونا! تم نے مجھے کہا تھا کہ میں نے وائٹ نہیں، پنک پہننا ہے، پھر بابا جانی سے کیوں شکایت کر رہی ہو؟" صفیہ حیرانی سے مونا سے پوچھنے لگی۔ مونا نے جلدی سے سعد کی گود میں اپنا منہ چھپالیا۔ وہ دونوں اسی طرح چھوٹی چھوٹی بات سعد سے شیئر کرنے کے لیے بے چین رہتے تھے۔

"اچھا مونا کی ماما! آپ ایسا کیجیے گا میرے اور عبداللہ کے وائٹ قمیص شلوار پریس کیجیے گا اور ہماری گڑیا کے لیے پنک فراک اور پاجاما۔ اب خوش؟" وہ مونا اور عبداللہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "چلو اب جلدی سے جاکر سو جاؤ۔"

وہ دونوں اچھلتے کودتے صفیہ کو اور اسے پیار کرتے ہوئے سونے چلے گئے جبکہ سعد صفیہ کو دیکھنے لگا، جو ان کے کپڑے پریس کرنے لگی تھی، بچوں کی پیدائش کے بعد وہ فربہی مائل ہوگئی تھی مگر اس کے بال ابھی بھی لمبے اور گھنے تھے جنہیں وہ ہمیشہ چٹیا کی شکل میں باندھے رکھتی۔ بھرے بھرے گالوں اور چھوٹے سے دہانے کے ساتھ وہ بہت پرکشش لگتی تھی اور سب سے بڑھ کر اپنی عادات کی وجہ سے دل کے بہت قریب محسوس ہوتی تھی۔

"صفیہ! میں ایک بات سوچ رہا ہوں۔" اس نے صفیہ کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ "کہیں تمہاری بے جا سختی سے بچے تم سے دور نہ ہوجائیں۔" وہ جان بوجھ کر اسے چھیڑ رہا تھا۔

"آپ خاطر جمع رکھیں سعد! وہ آپ کے بچے ہیں۔ آپ کو کبھی خود سے دور ہونے دیا، جو ان کو ہونے دوں گی۔" اس نے بھی برجستہ جواب دیا تو سعد قہقہہ لگا کر ہنس دیا۔

صفیہ نے صحیح کہا تھا۔ سعد، صفیہ اور بچوں کے بغیر ایک دن بھی نہیں گزار سکتا تھا۔ وہ گاؤں جاکر بہت خوش ہوتے تھے اور وہاں زیادہ دن گزارنا چاہتے تھے لیکن سعد زیادہ چھٹیاں نہیں کر سکتا تھا اور ان سے دور بھی نہیں رہ سکتا تھا۔ اس لیے وہ تین ماہ بعد گاؤں کا چکر لگاتے اور دو تین دن سعد کے ساتھ ہی گزار کر واپس آجاتے۔

"سعد! میرے خیال میں آپ سوچنے کی بجائے سونے کی تیاری کریں تو زیادہ اچھا ہے۔ صبح آپ کو عبداللہ کے ساتھ اسکول بھی جانا ہے۔" اس نے سعد کو چھیڑا تو وہ ہنس کر اٹھ کھڑا ہوا اور اسے لیتا ہوا کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

سعد بڑا مسرور سا ہال میں بیٹھا ہوا تھا۔ مونا بھی اس کے ساتھ والی کرسی پہ بیٹھی پروگرام شروع ہونے کا انتظار کر رہی تھی۔

"بابا جانی! دعا کریں۔ عبداللہ فرسٹ پرائز لے۔" اس نے خود بھی چھوٹے چھوٹے ہاتھ دعا کے انداز میں گود میں رکھے ہوئے تھے اور اسے بھی دعا کے لیے کہہ رہی تھی۔ سعد اس کو دیکھ کر پیار سے مسکرا دیا۔

"کر رہا ہوں دعا، ان شاء اللہ عبداللہ فرسٹ پرائز ہی لے گا۔"

سب بچے اپنی اپنی باری پہ تلاوت کرنے لگے۔ یہ مقابلہ دس سے پندرہ سال کی عمر کے بچوں کے درمیان ہو رہا تھا اور جب عبداللہ کی باری آئی تو سعد اس کی خوش الحانی میں جیسے کھو گیا۔ سورۃ الکافرون کی تلاوت کرکے وہ تو جاچکا تھا، لیکن سعد ابھی بھی اسی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ہو بہو سعد کی کاپی تھا۔ اب وہ بھی اپنے پھولے پھولے گالوں اور ذہانت سے چمکتی آنکھوں سے اپنے بابا جانی اور بہن کو دیکھ رہا تھا۔ سعد نے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں تسلی دی۔

اور پھر جب کچھ ہی دیر میں رزلٹ کا اعلان کیا گیا۔

"تین سال سے یہ پرائز ایک بچہ لے رہا ہے اور اس کا نام ہے عبداللہ بخاری۔"

کمپیئر کے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ خوشی سے سعد کی

آنکھوں میں آنسو آگئے۔

عبداللہ انعام لینے کے لیے جا رہا تھا۔ سفید شلوار قمیص پہنے، اوپر سر پر سفید نمازیوں والی ٹوپی پہنے وہ بہت پاکیزہ لگ رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے وہ اسے اپنی کاپی لگ رہا تھا، لیکن اب وہ اسے صفیہ کا پرتو دکھائی دے رہا تھا، جس کی تربیت قدم قدم پہ اسے اپنے ہونے کا احساس دلاتی تھی۔ اس نے جلدی سے فون کرکے صفیہ کو بتایا۔

"بس! پندرہ بیس منٹ میں ہم گھر پہنچ رہے ہیں، پھر مل کے سیلیبریٹ کرتے ہیں۔" اس نے صفیہ کی بات سنے بغیر فون رکھا کیونکہ وہ جلد از جلد اس کے پاس جانا چاہتا تھا۔

پھر دونوں بچوں کو لیے وہ گاڑی میں آکے بیٹھ گیا، جب وہ بچوں کے ساتھ ہوتا تو ڈرائیور کو ساتھ ضرور رکھتا، کیونکہ بچوں کی موجودگی میں ڈرائیونگ نہیں کرپاتا تھا۔ وہ پرجوش سے عبداللہ کی باتیں سن رہا تھا، جسے اب جلدی سے اپنی ماما جانی سے ملنے کی خواہش تھی۔ وہ ان سے باتیں کر رہا تھا جب گاڑی ایک جھٹکا کھاکے رک گئی۔

"خان! گاڑی کیوں روک دی؟"

"صاحب! کوئی مسئلہ ہوگیا ہے۔ میں دیکھتا ہوں۔" وہ باہر نکل کر گاڑی کا بونٹ کھول کر دیکھنے لگا۔

سعد باہر آگیا۔ اسے بہت کوفت ہو رہی تھی کہ اس کے پاس ایک گاڑی آکر رکی اور جو شخصیت اس کے سامنے آئی، آج اتنے عرصے بعد اس کو دیکھ کر وہ حیران ہوا۔ ارسہ خود اسے یوں سرراہ دیکھ کر خوش ہوئی۔

"ہیلو سعد! کیسے ہو تم۔" وہ بہت خوش دلی سے اس سے پوچھ رہی تھی۔

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم کیسی ہو اور دبئی سے کب واپس آئیں؟" سعد بھی اس سے مل کر خوش ہوا تھا۔

"میں دبئی سے تو ہر چھ ماہ بعد آتی ہی رہتی ہوں، لیکن اتنی مصروفیت ہوتی ہے کہ تم سے کبھی مل نہ سکی۔ سعد! تم ابھی بھی ویسے ہی ہو، ایسا لگتا ہے جیسے دس سال تمہیں چھوئے بغیر گزر گئے ہیں۔"

وہ اسے عجیب سی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی تو سعد خفیف سا مسکرا دیا، وہ اسے یہ نہ کہہ سکا کہ تم بھی تو ویسی ہی ہو۔ ویسی ہی ماڈرن، ویسی ہی بے باک۔

"ماما! جلدی کریں، مجھے گھر جاکر پریکٹس کرنی ہے۔" اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور بات کرتے، ایک بچی گاڑی سے نکل کر باہر آئی تھی۔ وہ مونا اور عبداللہ کی ہی ہم عمر تھی۔

"عیشا! ادھر آؤ، ان سے ملو، یہ سعد انکل ہیں۔ میرے کلاس فیلو اور سعد! یہ میری بیٹی عیشا ہے۔"

"ہیلو انکل!"

"ہیلو بیٹا! کیسی ہو آپ!" سعد نے بھی اس کے گالوں کو چھوتے ہوئے پیار سے کہا۔

"سعد! تمہارے بچے؟" ارسہ کے پوچھنے پر سعد نے گاڑی کا دروازہ کھول کر عبداللہ اور مونا کو باہر آنے کو کہا، جو گاڑی سے ہی اپنے بابا جانی کو کسی آنٹی سے باتیں کرتا دیکھ رہے تھے۔

"یہ میرا بیٹا عبداللہ اور بیٹی میمونہ ہے۔"

"السلام علیکم آنٹی!" وہ بڑی تمیز سے یک زبان بولے تو ارسہ مسکراتے ہوئے ان کو پیار کرنے لگی۔ وہ دونوں تھے ہی اتنے پیارے کہ ان پہ بے اختیار پیار آجاتا۔

"سعد! تمہارے بچے بہت پیارے ہیں۔"

"ماشاء اللہ۔" سعد نے بے اختیار یہ الفاظ کہے تھے۔

"آنٹی! میرے بھائی نے قرأت میں فرسٹ پرائز لیا ہے۔" میمونہ عبداللہ کے کندھے پہ ہاتھ رکھے بڑے فخر سے ارسہ کو بتا رہی تھی۔

"سعد کے بیٹے ہونا، فرسٹ پرائز تو لینا تھا۔ سعد! تمہارے بیٹے نے قرأت میں فرسٹ پرائز لیا ہے۔ اس کا مطلب ہے تمہارے بچوں کا قاری بہت قابل ہے۔" ارسہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"بالکل! میرے بچوں کی قاری ان کی ماما ہے اور وہ واقعی بہت قابل ہے۔ خود حافظ قرآن پاک ہے۔"

"اچھا سعد! میں چلتی ہوں مجھے دیر ہو رہی ہے' پھر ملیں گے۔" اس نے عجیب سی بے چینی کے ساتھ سعد کی بات کاٹی اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھنے لگی۔

"انکل! آپ میرا پروگرام دیکھنے آئیں گے۔" ارسہ کی بیٹی نے ایک دم جاتے جاتے سعد سے کہا تھا۔

"بیٹا! کون سا پروگرام؟"

"انکل میں دبئی سے ایک گروپ کے ساتھ انڈیا جا رہی ہوں۔ وہاں میری ڈانس پرفارمنس ہے۔ آپ ضرور آیئے گا۔" سیاہ جینز کے اوپر سرخ شرٹ پہنے باب کٹ بالوں والی وہ دس سالہ بچی بہت زیادہ کیوٹ اور معصوم تھی' لیکن اس کی معصومیت ارسہ جیسی ماں ختم کرنے کے درپے تھی۔

وہ جا چکی تھی۔ سعد کی گاڑی بھی ٹھیک ہو چکی تھی' لیکن سعد نے گاڑی کی اس خرابی سے اپنی زندگی کا سب سے بڑا سچ جانا تھا۔ وہ اپنے بچوں کو دیکھ رہا تھا' خاص کر میمونہ کو۔ اپنی پسند کے پھولے پھولے سے نیٹ کے گلابی فراک کے نیچے سلک کا چوڑی دار پاجامہ' گھنے سلکی بالوں کی پونی اور سر پر چھوٹا سا گلابی اسکارف لیے وہ اپنے بھائی سے نجانے کیا باتیں کر رہی تھی۔ سعد کو آج دس سال بعد اپنی دادی ماں کے کہے الفاظ یاد آ رہے تھے۔

"ہمارے خاندان اور بخاری ولا کو صفیہ جیسی ہی لڑکی کی ضرورت ہے۔"

آج ان الفاظ کی سچائی سعد کو اپنے بچوں کی صورت میں مجسم نظر آ رہی تھی۔ بے شک اس نے جذبات میں آ کر ہی سہی' لیکن ایک صحیح راستے کا انتخاب کیا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ اپنی زندگی کا فیصلہ کرتے ہوئے ہمیں واقعی سوچ سمجھ کر صحیح راستے کا انتخاب کرنا چاہیے' کیونکہ یہی راستہ ہماری آئندہ نسل تک جاتا ہے۔ اس کے ذہن میں ابھی بھی ارسہ کی بیٹی کے الفاظ گونج رہے تھے۔ کم از کم اس عمر میں کیے جانے والے کاموں کے ذمہ دار سراسر والدین ہوتے ہیں۔ اسی عمر میں صحیح خطوط پہ کی جانے والی پرورش ہماری آئندہ

بہت سی مشکلات کو حل کر دیتی ہے۔ وہ اپنے رب کا دل ہی دل میں شکر ادا کر رہا تھا' جس نے اسے صفیہ جیسی شریک سفر عطا کی۔ جو نہ صرف اپنے بچوں کے لیے بلکہ ان کے باپ کو بھی راہ راست پر لانے کا وسیلہ بنی۔

سعد نے دل میں اترتی بے پناہ طمانیت کے ساتھ اپنے دونوں بچوں کو ساتھ لگا لیا' جو اس کی متاع جاں تھے۔ اب اسے صفیہ سے ملنے کی جلدی تھی۔ جو ان کا انتظار کر رہی تھی۔

آج اس کے دل میں صفیہ کے لیے عجیب سے رنگ اتر رہے تھے' کچھ ان چھوئے سے جذبے تھے۔ جن کا اظہار بھی وہ خوب صورت طریقے سے کرنا چاہتا تھا۔

☼ ☼ ☼

جو بچھا سکوں تیرے واسطے' جو سجا سکوں تیرے راستے
میری دسترس میں ستارے رکھ' میری مٹھیوں کو گلاب دے

آج صفیہ بہت خوش تھی۔ آج اس کی ساری بے چینی دور ہو گئی۔ اس کے وجود پہ ایک سرشاری سی چھائی تھی۔ آج اس کے سارے معاملے مکمل ہو گئے۔ اس کے سارے خوابوں کو تعبیر مل گئی۔ اس کی زندگی خوب صورت اور سادگی سے عبارت تھی۔

وہ تین بہنیں تھیں' لیکن اسے چھوٹے ہونے کی وجہ سے سب سے زیادہ پیار ملا۔ اپنے امی ابو کا' بڑی بہنوں کا' بھائیوں جیسے بہنوئیوں کا' دوستوں جیسے بھانجے بھانجیوں کا' اور پھر اس کی زندگی میں سعد جیسا انسان شامل ہوا۔ جب اسے اپنی امی کے ذریعے سعد کے پرپوزل کا معلوم ہوا تو وہ دنگ رہ گئی۔ وہ ایک عام سی لڑکی تھی۔ ایسا تو شاید وہ خواب میں بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس نے صرف سعد کی باتیں اور نام سن رکھا تھا۔ اس کے ذہن میں اس کا جو شان دار سا تصور ابھرتا تھا' وہ خود کو اس کے قابل بھی نہ سمجھتی تھی' لیکن پھر اس کے گھر میں شادی کی تیاریاں شروع ہوئیں تو گویا اسے حقیقت کا یقین آ گیا اور سب کی دعاؤں کے ساتھ وہ "بخاری ولا" آ گئی۔ اس کے ذہن میں سعد کا جو تصور

تھا حقیقت میں وہ اس سے بڑھ کر تھا۔

چھ فٹ سے نکلتا ہوا قد، کسرتی بدن، گہری کالی اور شفاف آنکھیں، گھنے سیاہ بال اور صاف رنگت کی وجہ سے وہ بہت خوب صورت دکھتا تھا۔

وہ خود بھی خوب صورت تو تھی، لیکن سعد کے مقابلے میں وہ کچھ بھی نہ تھی اور پھر سعد کی پہلی بات نے اس کی ساری حیرانی دور کردی۔

"صفیہ! آپ میری دادی ماں کو تو جانتی ہیں، ہمیں ان سے بہت پیار کرتا ہوں اور آپ کو یہ بھی اچھی طرح اندازہ ہوگا کہ میں تو آپ کے نام سے بھی واقف نہ تھا، لیکن میری دادی ماں آپ کو بہت پسند کرتی تھیں۔ انہوں نے ہی مجھے آپ سے شادی کرنے کے لیے کہا تھا اور انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ سیف چاچو کی بیٹی صفیہ میری زندگی میں روشنی بکھیر دے گی۔۔۔ تو بس اس کے بعد مجھے اور کچھ سوچنا نہ پڑا اور میں نے آپ کو دیکھے بغیر اور جانے بغیر اپنی زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ تو مجھے یقین ہے کہ آپ میرے لیے اور اس گھر کے لیے مبارک ثابت ہوں گی لیکن میں آپ کو یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میری طرف سے آپ کو کبھی کوئی دکھ نہیں ملے گا۔"

وہ اور بھی بہت کچھ کہہ رہا تھا لیکن صفیہ تو "صفیہ میری زندگی میں روشنی بکھیر دے گی۔" اسی فقرے میں کھوئی رہ گئی۔

اور پھر صفیہ نے ساری زندگی اس فقرے کی لاج نبھائی۔

سعد خود بھی بہت نرم خو اور بہت خیال رکھنے والا شوہر ثابت ہوا۔ شادی کے چند دنوں بعد ہی صفیہ کو لگا کہ وہ صدیوں سے سعد کے ساتھ ہی رہتی آئی ہے اس کی چاہت میں دن بدن اضافہ ہوتا گیا۔

سعد کے کورٹ جانے کے بعد ہی سے اسے سعد کی واپسی کا انتظار رہتا۔ اس کے بغیر ایک دن کاٹنا بھی صفیہ کو سوہان روح لگتا۔ اس کا جی کرتا کہ سعد اس کے سامنے بیٹھا رہے اور وہ اسے تکتی رہے۔ اور یہ کام وہ کرتی تھی۔ سعد کی عادت تھی کہ اخبار ضرور پڑھتا تھا تو جب وہ اخبار پڑھتا، صفیہ اسے ازبر کیے جاتی۔ نجانے کیوں سعد کے پاس ہوتے ہوئے بھی دید کی پیاس بجھتی نہ تھی۔ اس کو دیکھ دیکھ کر صفیہ خود پہ نازاں ہوتی کہ سعد نے اس سے شادی کی۔ وہ اسے دیکھ کر خوش ہوتی کہ وہ اس کا ہے۔ اسی لیے صفیہ نے اس کی ہر بات کو حکم کا درجہ دیا۔ جہاں اس نے یہ رویہ اپنایا وہیں سعد نے بھی اس کی ہر بات اور ہر فرمائش کو، ہر نصیحت کو فرض سمجھ کر پورا کیا تھا لیکن اپنی اس پرسکون سی زندگی میں صفیہ نے ایک بات نوٹ کی تھی۔ کہ جو پیار کے رنگ سعد کی آنکھوں میں، سعد کے ہر فعل میں ہوتے، ان کے اظہار کے لیے سعد نے کبھی زبان سے کام نہ لیا، کبھی کبھی صفیہ کو لگتا تھا کہ ابھی سعد کہہ دے گا۔

"صفیہ! میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔"

لیکن اس کی یہ تشنگی شادی کے بارہ سال بعد بھی روز اول جیسی تھی۔ ایک کسک تھی۔ ایک کمی تھی، جو کبھی کبھی صفیہ کی پوری زندگی پر حاوی ہونے لگتی تھی۔ اسے ہرانے لگتی تھی۔ اسے تھکا دینے والی، اس کو بے چین کرنے والی کیفیت، اسے بے زار کردیتی۔ البتہ یہ کیفیت اس پہ زیادہ دیر نہ رہتی کیونکہ وہ خود سعد کو بہت چاہتی تھی اور یہ چاہت بھی اسے عین سعادت لگتی تھی۔ وہ اسی کے سہارے اپنی ساری زندگی سکون سے گزارنا چاہتی تھی۔ وہ اپنی اس کبھی کبھار کی حسرت سے درگزر کرنا چاہتی تھی۔

لیکن آج اسے زندگی کی سب سے بڑی خوشی مل گئی تھی۔ اپنے بچوں کی کامیابی پر آج وہ ویسے بھی بہت خوش تھی، حالانکہ عبداللہ یہ مقابلہ تین سال سے جیت رہا تھا، لیکن آج کی خوشی بہت نرالی سی تھی۔ آج کا دن بہت یادگار تھا۔ سعد شام سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے کہیں باہر گیا تھا، ورنہ اس نے سارا دن گھر میں گزارا تھا۔ صفیہ نے سب کی پسند کا کھانا بنالیا، بچوں نے بھی خوب انجوائے کیا، دن بھر کے تھکے بچے جلد ہی سو گئے۔

ان کو سلا کر صفیہ کمرے میں آئی تھی، جب ہی سعد

بھی واپس گھر آگیا اور اس کے پیچھے پیچھے ہی کمرے میں داخل ہوا تھا۔

"سعد! آپ کدھر چلے گئے تھے۔" اسے دیکھتے ہی اس نے پوچھا تھا۔

"چھوٹا سا کام تھا، وہی کرنے گیا تھا۔" سعد اس کو دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

"اچھا! یہ بتائیں کہ کھانا کچن میں کھائیں گے کہ یہیں لے آؤں؟"

"کھانے کو چھوڑو، تم ادھر بیٹھو۔" سعد نے ہاتھ میں پکڑا شاپر صوفے پر رکھا اور پھر اسے بھی کندھوں سے پکڑ کر صوفے پر بٹھایا تھا اور خود کارپٹ پہ اس کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھ گیا، پھر اس نے شاپر اٹھا کر اس میں سے گہرے نیلے رنگ کی مخملی تھیلی نکالی تھی۔

صفیہ حیرانی سے اس کو دیکھ رہی تھی۔ اس مخملی تھیلی میں چھوٹا سا ایک ڈبا تھا۔ سعد نے اس کو کھولا تو اندر جگمگ کرتے نفیس سے گولڈ کے کنگن تھے۔ سعد نے بہت پیار سے وہ کنگن صفیہ کے ہاتھ میں پہنائے۔

"یہ کس لیے؟" صفیہ جیسے سحر زدہ سی تھی۔ سعد نے اسے بارہ سالوں میں پہلا تحفہ دیا تھا۔ یہ نہیں تھا کہ سعد نے اس سے پہلے کبھی اسے کچھ نہیں دیا تھا وہ تو اسے ضرورت کی ہر چیز لاکر دیتا تھا، اس کی کہی ہر ضرورت پوری کرتا تھا، لیکن ضرورت تو ضرورت ہوتی ہے۔ ضرورت انسان دوسرے کی خوشی کے لیے پوری کرتا ہے اور تحفہ انسان اپنی خوشی کے لیے دیتا ہے۔

"اس لیے کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ اس لیے کہ تم میری شریک حیات ہو۔ اس لیے کہ تم میرے بچوں کی ماں ہو۔ اس لیے کہ تم اس گھر کی مالکن ہو اور اس لیے کہ۔۔۔ تم میری مقبول دعا ہو۔" سعد نے پیار سے اس کے ہاتھوں کو چوم لیا۔ اور وہ طمانیت سے اسے دیکھے گئی۔ اس کی آنکھوں میں واضح سرشاری نظر آرہی تھی۔

آہستہ آہستہ رات گزرنے لگی۔ سعد کب کا سو چکا تھا، لیکن صفیہ جاگ رہی تھی۔ وہ ابھی تک اسی فقرے کے حصار میں تھی۔

"مجھے تم سے محبت ہے۔"

یہ فقرہ اس کی زندگی کا حاصل تھا۔ اس کی ذات کی تکمیل تھا۔ اس فقرے کی خوبصورتی اور چمک سونے کے ان کنگنوں سے کہیں بڑھ کر تھی۔

آج صفیہ کی ذات مکمل ہوگئی۔ کوئی تشنگی نہ رہی کوئی ادھورا پن نہ رہا۔ اس کی ذات سے اس کی ذات تک تمام معاملے تکمیل پا چکے تھے اور یہی صفیہ بخاری کی دعاؤں کا ثمر تھا، جو اسے مل چکا تھا۔ محبت جیسی خوب صورت رہ گزر پر وہ اکیلی نہ تھی بلکہ سعد بھی اس کا ہم سفر تھا۔ اور اس سفر میں "آج کی رات"، ایک خوب صورت فقرہ اور یہ طلائی "کنگن" انمول زاد راہ تھے، جنہیں وہ کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔

☼

صدف آصف

اِرادوں کی شکست

"ارے بہو... ذرا تیل سر میں لگا دو۔ بڑا درد ہو رہا ہے۔" صبا نے ایک دم بستر سے اٹھ کر ساس کی طرف دیکھا۔ وہ سرسوں کے تیل کی شیشی تھامے اس کے کمرے کے دروازے پر کھڑی آواز لگا رہی تھیں۔ صبا صبح سے گھر کے کاموں میں لگی ہوئی تھی۔ ابھی فارغ ہو کر کمر ٹکانے ہی لگی تھی کہ ایک نیا کام اس کی جان کو حاضر ہو گیا۔

"کیا ہوا اماں... سب خیریت تو ہے، اگر زیادہ درد ہو رہا ہو تو میں ڈاکٹر کے یہاں لے چلوں؟" ماں کی آواز سنتے ہی انس بیوی کو نظرانداز کرتا ہوا فوراً" آگے بڑھا۔ ماں کا ہاتھ تھاما، بیڈ پر بٹھایا اور محبت سے کمر کے پیچھے تکیہ لگاتے ہوئے ملائمت سے پوچھنے لگا۔

دنیا بھر میں بھلے وہ اپنی سخت مزاجی کے لیے مشہور تھا، مگر ماں کی عزت اپنی جان سے بڑھ کر کرتا۔ یہ توقع وہ اپنی بیوی صبا سے بھی رکھتا تھا۔ اسی لیے صبا کی مجال نہیں تھی کہ ساس کے آگے دم مار سکے۔ وہ ویسے بھی سادہ مزاج لڑکی تھی۔ جی جان سے گھر والوں کی خدمت میں مشغول رہتی، مگر کبھی کبھی اس کا دل بھی دنیا کی رنگینیوں میں کھونے کو بے قرار ہو جاتا تھا۔ آج بڑے دنوں بعد انس نے چھٹی کی تھی۔ دونوں میاں بیوی کافی عرصے بعد یوں ساتھ بیٹھے تھے۔ دونوں بچے محسن، احسن سیپارہ پڑھنے مسجد گئے ہوئے تھے۔ خلاف توقع آج انس کا موڈ بھی بہت خوش گوار تھا۔ صبا دو کپ چائے بنا لائی۔ ابھی دونوں چائے پینے والے ہی تھے کہ اماں کے سر میں درد اٹھ گیا۔

"نہیں بیٹا! بس... بہو بہت اچھی مالش کرتی ہے۔ تیل لگا کر تھوڑی دیر سر دبا دے گی تو درد بھاگ جائے گا۔ آہا! چائے پی جا رہی ہے۔ سردی بھی بڑی ہے نا۔ لیکن چلو! میں شام میں ہی پی لوں گی۔ بڑی طلب محسوس ہو رہی تھی۔"

نسیم بانو نے مسکرا کر فرمانبردار بیٹے کی پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیر کر کہا۔ صبا بل کھا کر رہ گئی، مگر شوہر کی موجودگی میں کیا بولتی۔ خاموشی سے اٹھ کر ہونٹوں تک لے جاتا گرما گرم اپنی چائے کا کپ انہیں تھما دیا۔

انس نے مسکرا کر ماں کو دیکھا۔ صبا کلس کر رہ گئی۔

وہ میاں سے بچوں کو کہیں باہر گھمانے پھرانے کی فرمائش کرنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ اس کی ساس نے آ کر رنگ میں بھنگ ڈال دیا۔ وہ ایسے ہی کسی موقع کی تلاش میں رہتی تھیں۔ جب بھی وہ دونوں اکیلے ہوتے، جس کی نوبت بہت کم آ پاتی تھی، وہ بھولپن کے ساتھ ایک نیا کام لیے بیچ میں آ جاتیں اور صبا ہمیشہ سلگ کے رہ جاتی پر منہ سے کچھ بول نہیں پاتی۔ حالات نے اس کے منہ پر خاموشی کا قفل لگایا ہوا تھا۔

انس نے شادی کی پہلی رات ہی صبا کو اس کی حیثیت اور اپنی ماں سے اپنی شدید محبت کے بارے میں مکمل آگاہی فراہم کر دی تھی۔ صبا کا سسرال اور انس کی زندگی میں مستقل قیام اماں جی کی فرمانبرداری سے مشروط تھا۔

"ارے بیٹا! میں شام میں پی لیتی۔ اچھا لاؤ تم اتنا اصرار کر رہی ہو تو پی لیتی ہوں۔" انہوں نے چائے پیتے ہوئے مروت دکھائی۔ صبا بس سر ہلا کے رہ گئی۔

"اماں! چائے پی لیں۔ سردی دور ہو جائے گی... صبا! ابھی میری اماں کا سر اچھی طرح سے دبانا۔ میں ذرا فیاض بھائی سے مل کر آتا ہوں۔ خاصے دن گزر گئے، ملاقات ہی نہیں ہوئی۔"

اس نے اپنا خالی کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھا۔ چپل پہنتے ہوئے اسے ہدایات دینے لگا۔ وہ نیلی جینز اور براؤن ٹی شرٹ میں بہت جچ رہا تھا۔

"مگر وہ... سنیے تو..." ابھی وہ بولنے کے لیے مناسب الفاظ ڈھونڈ ہی رہی تھی کہ وہ نو دو گیارہ بھی ہو گیا۔ پیچھے رہ گئیں ساس اور ان کی پرانی سی تیل کی شیشی۔ وہ پیچ و تاب کھاتی ہوئی ساس کی پتلی سی چوٹی کھولنے لگی۔ آج کتنے دنوں بعد تو انس گھر پر تھا، ورنہ تو اس کے کام کے اوقات ایسے تھے کہ رات گئے واپسی ہوتی تھی۔

"ارے بہو! آرام سے .... میرے سارے بال اکھیڑ دو گی کیا؟" نسیم بانو نے غصے سے بہو کو جھڑکا تو وہ ہوش کی دنیا میں واپس آ گئی۔ اس نے ساری جھلاہٹ ساس کے بالوں پر نکال دی تھی۔

"معاف کیجئے گا اماں جی... غلطی سے زور کا ہاتھ پڑ گیا تھا۔" اس نے مالش ختم کر کے ہاتھ صاف کیے۔ نسیم بانو بھی چادر سنبھالتی ہوئی کمرے سے نکل گئیں۔ ویسے بھی ان کا مقصد تو پورا ہو گیا تھا۔ اب وہاں رک کر کرنا بھی کیا تھا۔

انس چار بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ نسیم بانو کو ہر وقت یہ ہی خوف رہتا تھا کہ کہیں بیٹا ان کے ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ مرحوم شوہر نے بڑے بازار میں چلتی ہوئی تین دکانیں ترکہ میں چھوڑی تھیں، سو کبھی کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی نوبت نہیں آئی۔ خوش قسمتی سے ان کے نوکر بھی نمک حلال تھے، پھر وہ خود سب کے سروں پر کھڑے ہو کر حساب کتاب کرتی تھیں، اس لیے ہیرا پھیری کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ انس تین بیٹیوں سے چھوٹا اور ایک بیٹی سے بڑا تھا۔ ساری بیٹیوں کی شادی کے بعد وہ ایک غریب گھرانے سے صبا کو بیاہ کر لائی تھیں۔ صبا گو بہت خوبصورت نہ تھی۔ مگر وہ ایک دبلی پتلی، پرکشش سی لڑکی ضرور تھی۔ لیکن اس کے

مقابلے میں انس کا شمار خوش شکلوں میں ہوتا تھا۔ اکلوتا، برسرروزگار لڑکا دیکھ کر پورے خاندان نے نسیم بانو سے رشتہ جوڑنے کی سعی کی، مگر وہ جانتی تھیں کہ ان کے اپنے خاندان کی لڑکیوں کا گزارہ ان کے ساتھ ہونے والا نہیں تھا۔ جنہیں نہ صرف اپنے حسن پر ناز تھا بلکہ گھر کے کاموں سے اللہ واسطے کا بیر بھی تھا۔ ایک رشتے والی کی مدد سے انہوں نے اپنا گوہر نایاب ڈھونڈ نکالا تھا۔

صبا کے والدین حیات نہیں تھے۔ ماموں مامی نے بڑی پیار و محبت سے پالا تھا۔ نسیم بانو نے بیٹیوں کے ناک بھوں چڑھانے کے باوجود اپنے تجربے کی بنیاد پر بیٹے کے لیے صبا کا انتخاب کیا۔ پہلی ملاقات میں ہی اس اعتماد سے خالی، دبو شخصیت والی یہ لڑکی انہیں اپنے گھر کے لیے موزوں لگی۔ جانتی تھیں، بیٹے کی حسن پرست طبیعت اس لڑکی کو بیوی سے اوپر کا درجہ نہیں دے گی۔ ان کا اندازہ ہمیشہ کی طرح درست ثابت ہوا۔ آج بیٹیاں بھی جب آرام کے لیے سسرالوں سے میکے آکر رکتیں تو بھابھی کو اپنے آگے پیچھے گھومتے دیکھ کر ماں کی دور اندیشی کو سلام پیش کرتیں۔

☼ ☼ ☼

”ارے بھیا۔۔۔ او سبزی والے بھائی۔۔۔ رکو تو۔“ صبا سبزی والے کو آواز دیتی، تیزی سے اس کے پیچھے پیچھے دوسری گلی کے کونے تک جا پہنچی۔ وہ ”آلو لے لو۔۔۔ بھنڈی لے لو“ کی تانیں لگاتا، بغیر اس کی آواز سنے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ مجبوراً صبا کو اس کے پیچھے جانا پڑا۔

”لے لو باجی! تازی سب جی ہے۔ پکاؤ گی تو بابو سب جی والے کو یاد کرو گی۔“ پیلے پیلے دانتوں کی نمائش کرتا بابو مسلسل سبزیوں پر پانی کا چھڑکاؤ کر کے ان کا وزن بڑھا رہا تھا۔

”آدھا کلو کریلے دینا۔“ صبا نے پھولی سانسوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ اس کی ساس کا آج قیمہ کریلا کھانے کو جی چاہ رہا تھا۔ ان کو ہمیشہ ایسے پکوان ہی بھاتے تھے، جس کے پکانے میں صبا کو خوب بھاگ دوڑ کرنا پڑتی تھی۔ اب گھر میں کریلے موجود نہیں تھے، مگر وہ صبح سے کئی بار ٹھنڈی آہیں بھر کر صبا کو سنا چکی تھیں کہ اگر آج ان کی بیٹیوں کی شادی نہیں ہوئی ہوتی تو ان کو یوں اپنا دل مارنا نہیں پڑتا۔ بیٹیوں کی مجال نہیں تھی کہ وہ ان کے کہے کو ٹالتیں۔

”ارے بھائی! کیا کرتے ہو۔ مجھے اتنی مہنگی سبزی نہیں چاہیے۔“ صبا نے چونک کر پاس کھڑی پیاری سی لڑکی کو دیکھا جو سبزی والے کو ڈانٹ پھٹکار رہی تھی۔

”باجی! یہ لو کریلے۔۔۔ ساتھ میں تھوڑے ٹماٹر بھی تول دوں؟ ایمان سے ابھی منڈی سے تازے لایا ہوں۔“ اس نے کریلے تھیلی میں ڈال کر صبا کو تھماتے ہوئے پوچھا۔

”ارے! رہنے دو۔ تم تو ہر چیز بہت مہنگی دے رہے ہو۔ آپ میرے ساتھ روڈ تک چلیں گی؟ آج بچت بازار لگا ہوا ہو گا۔ ہمیں اس ٹھیلے والے کے مقابلے میں وہاں سے تازہ سبزیاں تھوڑی کم قیمت میں مل جائیں گی۔“

اس نے مسکرا کر بے تکلفی سے کہا اور کریلے کی تھیلی ٹھیلے پر واپس رکھ دی۔ سبزی والے کا منہ بن گیا۔ وہ بڑبڑ کرنے لگا، مگر وہ صبا کا ہاتھ بے تکلفی سے تھامے آگے بڑھ گئی۔ صبا کو بھی وہ شوخ سی لڑکی اچھی لگی، اس لیے اس نے سحرش کی ہمراہی قبول کر لی۔ ویسے بھی آج ہفتہ تھا۔ بچوں کی چھٹی ہوتی تھی۔ اس نے ابھی تو اپنے دونوں بیٹوں کو ناشتا کرایا تھا۔ اس لیے کھانے کی بھی جلدی نہیں تھی۔

”آج اماں جی کو پسندیدہ پکوان کے لیے تھوڑے انتظار کی زحمت تو اٹھانی ہی پڑے گی۔“ اس نے مسکرا کر سوچا۔

ویسے بھی آج کل وہ معمولاتِ زندگی سے خاصا بے زار ہو رہی تھی۔ شادی کو آٹھ سال ہونے کو آئے تھے، مگر وہ دونوں میاں بیوی ابھی تک ایسی زندگی گزار رہے تھے، جیسے دریا کے دو کنارے ہوں، جو ساتھ ساتھ تو چل رہے تھے، مگر یکجا نہیں ہو پا رہے تھے۔

اسے بھی تھوڑی سی تبدیلی کی ضرورت تھی۔ اس لیے بے سوچے سمجھے ساتھ چل پڑی۔

راستے میں دونوں کی اچھی خاصی دوستی ہو گئی۔ ویسے بھی دونوں ہم عمر ہی تھیں۔ ان کے مشاغل، پسند ناپسند تقریباً ایک جیسی ہی نکلی۔ پھر سب سے بڑی بات دونوں کے دکھ بھی ایک جیسے تھے۔ وہ اپنی ساس سے پریشان تھی تو سحرش بھی اپنی ساس، نندوں کے ہاتھوں گھائل تھی۔ سحرش، صبا کے مقابلے میں خاصی پُراعتماد اور مضبوط شخصیت کی حامل تھی۔ شاید لاشعوری طور پر صبا کو ایسی ہی کسی ساتھی کی ضرورت تھی، کیونکہ انس نے کبھی اس کو اپنے ہونے کا احساس نہیں دلایا تھا۔ وہ اس کی طرف پُرامید نظروں سے دیکھتی، مگر وہ ظالم اس کی طرف نظر بھر کے نہ دیکھتا۔ اسے کبھی کبھی لگتا کہ یہاں رشتہ کر کے ماموں ممانی نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ شادی کے بعد اس کی حیثیت کنیز جیسی ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی اسے لگتا زیست ایک ایسی قید بن گئی ہے، جس سے چھٹکارا مشکل ہے۔ بچپن سے اس کی روح پیاسی تھی۔ پہلے وہ والدین کی محبت کو ترسی، اب میاں کی بے رخی نے اس کے دل پر گھاؤ ڈال دیے تھے۔ بس محسن، احسن کا ہی وجود تھا، جو وہ ہر دکھ سکھ کی طرح سہ لیتی تھی۔

سحرش کی آواز پر اس نے ٹھنڈی آہ بھری اور اپنی نئی دوست کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ وہ خوب بھاؤ تاؤ کر رہی تھی۔ اس نے اپنے اور صبا کے لیے گھنٹے بھر میں اچھی خاصی سبزی، ترکاری کی خریداری کم داموں میں کی اور دونوں نے اپنے اپنے گھر کی راہ لی۔ واپسی میں ہاتھ ملا کر طے کر لیا گیا تھا کہ وہ ہر ہفتے اسی بچت بازار میں ملیں گی۔ سبزی لینے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے سے حالِ دل بھی کہہ سن لیا جائے گا۔

☼ ☼ ☼

”ارے بہو۔۔۔ تم نے یہ کیا وتیرہ بنایا ہوا ہے؟ ہر ہفتے کو بڑا سا تھیلا لے کر گھنٹے دو گھنٹے کے لیے غائب ہو جاتی ہو۔“

نسیم بانو نے بیٹے کو کھانے کی میز پر موجود دیکھا تو معصومیت سے پوچھنے لگیں۔ صبا ٹیبل پر سالن کی ڈش رکھ رہی تھی، لرز کے رہ گئی۔ انس نے سلاد کی پلیٹ میں سے کھیرا اٹھا کر کترتے ہوئے بیوی کو منتظر نظروں سے دیکھا۔

”اماں جان! وہ سڑک کے پار بچت بازار لگا ہے نا۔۔۔ وہاں تازہ سبزیاں، تھوڑے سستے داموں مل جاتی ہیں، اس لیے اکٹھا سبزیاں وہاں سے لے آتی ہوں۔ ٹھیلے والوں کے پاس مہنگی اور اکثر باسی سبزی ہوتی ہے۔ پھر اس کی مرضی، آئے یا نہ آئے۔ ان کو فرصت نہیں ملتی۔ گھٹنوں کے درد کی وجہ سے آپ بھی بازار نہیں جا سکتیں۔ روزانہ سبزیاں خریدنے میں میرا بہت وقت ضائع ہو جاتا ہے، اسی لیے میں ایک دن بازار میں تھوڑا زیادہ وقت لگا لیتی ہوں تو اتنا سامان آجاتا ہے کہ کئی دن کی چھٹی ہو جاتی ہے۔“

سحرش کی سنگت کا اثر تھا کہ اس کی شخصیت میں بھی تھوڑا نکھار اور اعتماد پیدا ہو گیا تھا۔ انس نے پہلی بار غور سے صبا کو دیکھا۔ سر ہلا کر اس سے اتفاق کیا اور پھر سر جھکا کر پالک گوشت سے لطف اندوز ہونے لگا۔

صبا نے ساس کو دیکھا۔ وہ بے دلی سے کھانا ٹونگ رہی تھیں۔ وہ دل ہی دل میں مسکرا دی۔

☼ ☼ ☼

”اوہ۔۔۔ انس بھائی نے ایسا کیا۔ یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔“ سحرش نے اس سے ہفتے بھر کی روداد سننے کے بعد مسکرا کر کہا۔ دونوں آج پھر گلی کے کونے پر ملی تھیں۔ اتفاق سے خریداری سے بھی جلدی فارغ گئیں تو سحرش اسے زبردستی ان کے گھر کے نزدیک واقع پارک میں لے آئی۔ دونوں نے گپ شپ کے دوران بازار سے خریدے گئے کینوؤں پر ہاتھ صاف کرنے شروع کر دیے۔ صبا کے لیے سردیوں کی دھوپ سینکتے ہوئے کینو کھانے کا تجربہ بڑا خوش گوار تھا۔

”ارے! ہاں بھئی، ان کو بھلا کہاں یہ بات برداشت تھی کہ انس میرا ساتھ دیں۔ بس شام سے ہی

ٹانگ میں درد کا شور مچا کر پورا گھر سر پر اٹھائے رکھا۔ سب نے باری باری پاؤں دبایا، مگر ان کو قرار نہ آیا۔ آخر انس نے مجھے ان کے کمرے میں سونے کے لیے بھیج دیا کہ رات میں کہیں امی کا درد نہ بڑھ جائے۔ اس کے بعد وہ تو پرسکون نیند سو گئیں، میری ساری رات آنکھوں میں کٹی۔"

آنسو صبا کی آنکھوں سے ٹوٹ ٹوٹ کے موتی کی طرح بکھر رہے تھے۔ سحرش بھی اس کی حالت پر آبدیدہ ہو گئی۔

"چلو! چھوڑو یار۔۔۔ ہم یہاں انجوائے کرنے آئے ہیں۔ تم اپنا دل خراب نہ کرو۔ فکر نہ کرو۔ ان کا بڑھاپا ہے۔ چل چلاؤ کا ٹائم ہے۔ جس دن بڑی بی کی آنکھیں بند ہو گئیں انس بھائی خود بخود تمہاری مٹھی میں آجائیں گے۔" سحرش نے گدگدی کی تو صبا مسکرا دی، مگر اپنی ساس کی موت کے بارے میں سوچ کر ہی اس کا دل دہل گیا۔ وہ فطرتاً "نیک روح" تھی۔ دل دکھتا تو وہ شکوہ کر بیٹھتی تھی مگر وہ اتنی سفاک نہیں تھی کہ ان کے لیے ایسا سوچے۔ اس لیے اس کے صاف و شفاف دل سے بے ساختہ دعا نکلی۔ "اللہ ان کو لمبی عمر عطا کرے۔"

"ایسی باتیں نہیں کرتے۔" صبا نے دوسرا کینو چھیل کر سحرش کو تھماتے ہوئے ہلکی سی سرزنش کی۔

"یار۔۔۔ میں تو خود اس دن کے انتظار میں ہوں، جب میری ساس اس دنیا سے جائیں۔ پھر دیکھنا! میں اپنی ڈائن جیسی کنواری نندوں کو کیسا سیدھا کرتی ہوں۔ منحوس ماریاں ماں کی شہہ پر میرا جینا حرام کر کے رکھتی ہیں۔ ایک بار ساس جی کی آنکھیں بند ہو جانے دو۔ پھر دیکھنا! میں انہیں کیسے دیوار سے لگاتی ہوں۔" سحرش کے لہجے کی سفاکی سے صبا کا نازک سا دل ڈول گیا۔

"ایک بات کہوں سحرش۔۔۔ کسی کی موت کی آرزو کرنا جائز نہیں۔ یہ تو اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ تم بس اپنے حق میں دعا کرو، مگر اپنی ساس کو ایسی بددعائیں مت دو۔" صبا نے اس کا ہاتھ تھام کر نرمی سے اسے سمجھایا۔

"او پاک بی بی۔۔۔ یہ درس جا کر کہیں اور دینا۔ تم تو خود اس آگ میں دن رات جلتی ہو۔ پھر بھی میری کیفیت نہیں سمجھتیں۔ وہ کیسے اپنی بیٹیوں کے ساتھ مل کر میرے چلنے، اٹھنے بیٹھنے پر نظر رکھتی ہیں۔ دن رات کی تنقیدیں، مجھ سے برداشت نہیں ہوتیں۔ وہ تو شکر ہے کہ میرے میاں عرفان میرے ساتھ ہیں، ورنہ اب تک میں تو پاگل ہو چکی ہوتی۔ ویسے بھی وہ ہماری طرح جوان تھوڑی ہیں۔ اب عمر کے اس حصے میں پہنچ چکی ہیں کہ کسی بھی وقت ان کا بلاوا آسکتا ہے۔ میرے دعا مانگنے یا نہ مانگنے سے کیا ہوتا ہے۔"

سحرش غصے میں بولتے ہوئے گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ تو صبا بھی دل ہی دل میں توبہ تلا کرتی سر جھکائے اس کے ساتھ پارک سے باہر نکل گئی۔ اسے سحرش کا یہ روپ بالکل نہیں بھایا تھا۔ اس نے خود کو بھی سرزنش کی کیونکہ سحرش کے سامنے سسرال والوں کی غیبت کر کے وہ بھی تو گناہ کی مرتکب ہوئی تھی۔ اس نے اللہ سے دل سے معافی مانگی۔

☼ ☼ ☼

"ہی! انس بھائی ایسا کر کے تو دیکھیں۔۔۔ ہم ان کی زندگی حرام کر کے رکھ دیں گے۔"

صبا نے اپنے پاس موجود چابی سے دروازہ کھولا اور گھر میں داخل ہوئی تو اسے ساس کے کمرے سے اپنی چھوٹی نند سامعہ کی آواز آئی۔ اس کا دل دوبارہ ان لوگوں سے برا ہو گیا۔ آج اس کی ساری نندوں کو یہاں رہنے آنا تھا۔ ساس نے اسے رات کو یہ بات بتائی تھی آوازوں سے پتا چل رہا تھا، سب اس کی ساس کے کمرے میں جمع ہو چکی ہیں۔

"ارے۔۔۔ میں نے ہمیشہ بیٹے کو اسی لیے دبا کر رکھا۔۔۔ کہ بن باپ کے بچوں کو بگاڑنے کے لیے دنیا تیار کھڑی رہتی ہے۔ جانے مجھ سے کہاں چوک ہو گئی۔ لگتا ہے کہ اس کے بہت پر نکل آئے ہیں۔ خیر! مجھے کترنے ہی پڑیں گے۔" صبا کے کانوں میں ساس کی آواز آئی۔ اس کا دل ان سب سے بدگمان ہو گیا۔

"ہونہہ! بیٹیوں کے ساتھ مل کر میرے خلاف منصوبہ بندی ہو رہی ہے۔" صبا نے خاموشی سے سبزیوں کا تھیلا ٹیبل پر رکھا اور ان کی باتیں سننے لگی۔ "آج تو کامیاب چھاپہ مارا ہے۔ تھوڑی برائیاں اور ہو جائیں۔ پھر کمرے میں گھس کر رنگے ہاتھوں پکڑوں گی۔" وہ کان لگا کر ان کی باتیں سننے لگی۔

"اتنی معصوم، سلیقہ شعار بیوی کے ہوتے ہوئے انہوں نے دوسری شادی کا سوچا بھی کیسے؟ یہ تو فرقان نے آکر مجھے بھائی کے سارے کالے کارناموں سے آگاہ کر دیا کہ آفس میں ساتھ کام کرنے والی ایک لڑکی سے زوردار عشق لڑانے کے بعد خفیہ شادی کے چکروں میں ہیں۔ میری تو آنکھیں پھٹ گئیں۔ فوراً آپ سب کو فون کھڑکایا کہ چلو! اماں کے گھر جمع ہو اور بھائی کی خبر لو۔ ورنہ سمجھو! بھائی گیا ہاتھ سے۔ بھابھی کے دم سے تو ہمارا میکہ ہے۔ وہ نہ ہوں گی تو سمجھو! میکہ چھوٹ گیا۔" سامعہ نے رندھی ہوئی آواز میں غصے سے کہا۔

صبا کو لگا جیسے زمین آسمان گھومنے لگے ہوں۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

"اف! انس دوسری شادی کرنے کا سوچ رہے ہیں۔" وہ وہیں زمین پر سر تھام کر بیٹھ گئی۔

"سامی۔۔۔ انس تو بے وقوف ہے۔ صبا ہم لوگوں کی پسند ہے۔ کوئی راہ چلتی لڑکی نہیں۔ پورے خاندان کے سامنے بھائی نے اسے قبول کیا ہے۔ ہم انس کو ایسے ہی اس پر ظلم توڑنے نہیں دیں گے۔" بڑی نند ہما نے جوش سے کہا، پھر اپنے بچے کو ایک ہاتھ لگایا، جو مسلسل ٹھنک رہا تھا۔

"ہائے ہائے۔۔۔ بھائی کا غصہ بچے پر کیوں اتار رہی ہو؟ ادھر دو میرے لال کو اور ہاں! تم لوگ ایک بات غور سے سن لو۔ صبا کو اس مسئلے کے بارے میں کانوں کان خبر نہیں ہونی چاہیے۔ ویسے ہی میری بچی نازک دل کی ہے۔ یہ سب باتیں سن کر اس کا دل ٹوٹ جائے گا۔ فون کر کے انس میاں کو آج ذرا جلدی گھر بلاؤ۔ میں اس کے سر سے عشق کا بھوت اتاروں۔"

ساس کی پاٹ دار آواز آج صبا کو گھنٹیوں سے بھی زیادہ سُریلی لگ رہی تھی۔ منجھلی نند عائشہ نے فون کر کے بھائی کو اماں کی ہدایت کے مطابق ان کی بیماری کی خبر دی۔ ساتھ ہی جلد گھر پہنچنے کی ہدایت بھی کی۔ سامعہ بچے کے رونے پر اس کے لیے دودھ بنانے کے لیے اٹھی تو صبا جلدی سے کھڑی ہو کر اپنے کمرے کی جانب دوڑ گئی۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کے دل پر لگے بدگمانیوں کے سارے داغ آج دھل گئے تھے۔ مگر انس کی بے وفائی نے اس کے دل کو چُور چُور کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اماں۔۔۔ میری اماں کو کیا ہو گیا، کوئی بتاتا کیوں نہیں؟" انس پلنگ کی پٹی سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ آنکھیں بند کر کے یوں نقاہت طاری کیے پڑی تھیں جیسے ان کا آخری وقت آپہنچا ہو۔ ساری بہنیں اور صبا ان کے پلنگ کے گرد گھیرا بنائے کھڑی تھیں۔

"ارے۔۔۔ بھیا! تم کو اپنے مشاغل سے فرصت مل گئی ہو تو ماں بہنوں کا حال احوال بھی پوچھ لو۔ ہم پر کیسی مشکل گھڑی آپڑی ہے۔" عائشہ نے بھائی کو جھڑکا۔ باقی بہنوں نے اس کے جذباتی انداز بیاں پر اسے ستائشی نظروں سے دیکھا۔ صبا حیران و پریشان اماں کی ایکٹنگ دیکھ رہی تھی۔ ان کے منہ سے تھوڑی تھوڑی دیر میں درد بھری آہیں نکل رہی تھیں، جنہیں سن کر انس کی پریشانیوں کا گراف بلند ہوتا جا رہا تھا۔

"باجی! شکوے شکایات کا دفتر بعد میں کھول لیجیے گا۔ پہلے یہ بتائیے! کہ اماں ایسے کیوں لیٹی ہیں۔۔۔ انہیں کیا ہو گیا ہے؟"

ماں اس کی کمزوری تھی۔ اس لیے ان کو ایسے آنکھ بند کیے لیٹا دیکھ کر وہ تڑپ اٹھا۔ نسیم بانو اپنے بیٹے کی رگ رگ سے واقف تھیں، اسی لیے اسی حساب سے اس کا احتساب شروع کیا گیا۔

"کیا پوچھتے ہو بھیا۔۔۔ ہماری ماں کو زمانے کے

طعنوں کے خوف نے ادھ موا کر دیا ہے۔ ان کا بی پی شوٹ کر گیا تھا۔ چکرا کر گر پڑیں۔ وہ تو اللہ بھلا کرے صبا کا۔ اماں کا اتنا خیال رکھتی ہے کہ بس! اللہ ایسی بہو سب کو دے۔ فوراً "دوا کھلائی۔" ماما باجی کے جھوٹ پر صبا ان کو حیران نظروں سے دیکھتی رہ گئی۔

"اچانک ایسی کیا افتاد آپڑی۔۔۔ صبح تو میں سب کچھ صحیح وسلامت چھوڑ کر گیا تھا۔" اس نے ایک لمحہ رک کر شکر گزار نظروں سے بیوی کو دیکھا' پھر بہنوں سے فکر مندی سے پوچھا۔

"اے بھیا! مجھ سے پوچھو نا۔۔۔ سامعہ کو فرقان گھر بٹھا گیا ہے۔ اسے کسی لڑکی کے عشق کا بخار چڑھ گیا ہے۔ کہتا ہے کہ اس سے دوسری شادی کرنا چاہتا ہے۔ جب سے سامعہ نے یہ خبر سنائی ہے۔ اماں کی طبیعت قابو میں نہیں آرہی ہے۔" صبا کی سب سے بڑی نند رابعہ نے دکھ بھری آواز نکالی۔ پاس ہی سامعہ بیٹھی سر جھکائے جھوٹ موٹ کے آنسو پونچھنے لگی۔

"کیا۔۔۔ مگر کیوں؟ میری بہن میں کیا کمی ہے؟ اس کم ظرف انسان کو میں چھوڑوں گا نہیں۔ دیکھتا ہوں وہ کیسے میری بہن پر یہ ظلم توڑتا ہے۔" وہ غصے سے مٹھیاں بھینچتا اٹھ کھڑا ہوا۔ ساری بہنیں دل ہی دل میں مسکرائیں۔

"میرے بھائی! آرام سے بیٹھو۔ غصے سے بات بگڑ جائے گی۔ ویسے بھی مرد جب ایک بار فیصلہ کر لے تو کہاں سوچتا ہے۔" عائشہ نے اسے پکڑ کر کرسی پر بٹھایا۔

"ویسے بھی سب ہماری بھابھی کی طرح خوش قسمت نہیں ہوتے نا جنہیں آپ جیسا شوہر نصیب ہوا ہے۔ اب میرے بچوں کا کیا ہوگا۔۔۔؟" میں نے گھر ٹوٹنے اور سوتیلی ماں کے عذاب جھیلتے بچوں کو مجرم بنتے دیکھا ہے۔ ہائے میری ماں۔۔۔ میرا گھر ہی اجڑ جائے گا۔ ارے بھائی! میں کہاں جاؤں گی۔ ان کی دوسری شادی کے بعد کچھ کھا کر مر جاؤں گی۔ بس تم اور بھابھی مل کر میرے بچوں کو پال پوس لینا۔"

سامعہ نے بھائی کا ہاتھ تھام کر جو بین شروع کیا تو رابعہ نے اسے گلے لگا لیا۔ صبا کی بھی ہچکیاں نہیں رک رہی تھیں۔ سامعہ نے اس کے مستقبل کا ایسا نقشہ کھینچا تھا کہ وہ مرنے کے بارے میں ہی سوچنے لگی۔ بہن کے آئینہ دکھانے پر انس گم صم بیٹھا رہ گیا۔ اس نے آگے بڑھ کر سامعہ اور روتی ہوئی صبا کو اپنے مضبوط بانہوں کے گھیرے میں لے لیا۔ ساری بہنوں نے خوشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ وہ ایک بار پھر اپنی ماں کے تجربے کی قائل ہو گئیں۔ ان کا منصوبہ کامیاب رہا۔

انہوں نے انس کو احساس دلا دیا تھا کہ وہ صبا اور بچوں پر ظلم کرنے چلا تھا۔ وہ سب بہنیں تو پہلے بھائی پر چڑھائی کرنے کا ارادہ رکھتی تھیں' مگر اماں نے انہیں بیٹے سے ڈائریکٹ بات کرنے سے روک دیا کہ اس طرح تو وہ اور شیر ہو جائے گا۔ بیٹے کی ضدی طبیعت سے بھی واقف تھیں۔ جانتی تھیں کہ ضد میں وہ کل کی شادی کرتا' آج کر بیٹھے گا۔ ان کی منصوبہ بندی پر عمل کرتے ہوئے پہلے فرقان کو فون کر کے اپنے ساتھ ملا لیا گیا۔ پھر ڈراما شروع ہوا۔ ویسے بھی جب اپنے دل پر ہاتھ پڑتا ہے' تب ہی انسان کو دوسرے کے دکھ کا احساس ہوتا ہے۔ اماں اور بہنوں نے مل کر انس کو یہ احساس اچھی طرح سے کروا دیا تھا۔ انہیں امید تھی کہ اب وہ کبھی بھی اپنی راہ سے نہیں بھٹکے گا۔

☆ ☆ ☆

صبا شیفون کی نیلی ساڑھی میں تیار آج اپنی ساس نندوں کی جھرمٹ میں بیٹھی خوشیوں کے ہنڈولوں میں جھول رہی تھی۔ ساری بہنوں نے مل کر بھائی بھابھی کو ساتھ ڈنر کے لیے باہر بھیجنے کا پروگرام بنایا تھا۔ انس کی خوش گوار سنگت میں صبا کی پیاسی روح جیسے سیراب ہو گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

آج کئی ہفتوں بعد اماں جی کے اصرار پر ہفتے کے روز بچت بازار سے سبزی لینے نکلی تو سحرش کا خیال آیا۔ اپنے مسائل میں الجھ کروہ اسے تو بھول ہی چکی تھی۔

"وہ بھی میرے بارے میں کیا سوچتی ہوگی؟" صبا نے مسکرا کر سوچا۔

دونوں نے اپنی اپنی ساسوں کے ڈر سے کبھی ایک دوسرے کو گھروں پر نہیں بلایا تھا۔ کبھی فون نمبر لینے کی ضرورت بھی نہیں پڑی تھی۔ مگر کیونکہ سحرش کا گھر پہلے پڑتا تھا تو اس نے گلی سے مڑتے ہوئے اکثر صبا کو دور سے دکھایا تھا۔ گلی کے کونے پر خاصی دیر انتظار کرنے کے بعد آخر وہ ڈرتے ڈرتے اس کے دروازے تک پہنچ گئی۔ سبزی خریدنے سے زیادہ اسے سحرش کو یہ بتانے کی جلدی تھی کہ کیسے ساس نندوں کی کوششوں سے اسے انس کی محبت حاصل ہو گئی تھی۔

سفید دروازہ کھٹکھٹانے پر ایک بڑی عمر کی عورت نما لڑکی نے دروازہ کھولا۔ یہ یقیناً "سحرش کی بڑی نند فاطمہ ہے۔ صبا نے دل ہی دل میں قیاس کیا۔ اس نے سحرش کے منہ سے ان لوگوں کی اتنی برائیاں سنی تھیں کہ وہ اس کے حلیے سے اسے فوراً "پہچان گئی۔

"جی۔۔۔ میں نے آپ کو پہچانا نہیں۔" اس نے اپنی سوجی سوجی آنکھوں سے صبا کو دیکھا اور دھیرے سے پوچھا۔

"وہ۔۔۔ میں سحرش کی دوست ہوں۔" صبا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیسے اپنا تعارف کرائے۔

"اوہ۔۔۔ اچھا! آیئے "اندر اس کمرے میں آجایئے۔" اس نے دروازہ بند کر کے ایک طرف اشارہ کیا۔ صبا اس کے پیچھے چل دی' فضا میں اگر بتیوں کی مہک بسی ہوئی تھی۔ ماحول سوگوار تھا۔ صبا نے دیکھا کمرے میں عورتیں بیٹھی سیپارے پڑھ رہی تھیں۔ ایک جگہ گٹھلیوں کی ڈھیری کے پاس بچے اور لڑکیاں بیٹھی کلمہ پڑھ رہی تھیں۔

"او میرے اللہ۔۔۔ یعنی آخر سحرش کی خواہش پوری ہوئی۔ اس کی ساس گزر گئیں۔" اس نے سر تھام لیا اور وہیں سفید چاندنی پر بیٹھ گئی۔ اس کی حالت دیکھ کر فاطمہ گلاس میں پانی لے آئی۔

"بہت افسوس ہوا۔۔۔ آپ کی امی۔۔۔" صبا نے دو گھونٹ پانی پیا اور فاطمہ کے گلے لگ گئی۔ اس سے آگے کچھ بولا ہی نہیں گیا۔

"جی جی۔۔۔ امی! یہ بھابھی کی دوست ہیں۔" فاطمہ نے اسے ایک سفید لباس میں ملبوس بوڑھی عورت کے سامنے لا بٹھایا۔ وہ جو آنکھیں بند کیے تسبیح پڑھنے میں مشغول تھیں۔ صبا ایک شاک کے عالم میں تھی۔ یہ زندہ ہیں تو انتقال کس کا ہوا ہے۔

"بہت پیاری تھی میری بہو۔۔۔ پر اللہ کی مرضی کے آگے کس کا زور چلا ہے۔ جانے کے دن تو میرے تھے' پر وہ اس دنیا سے چلی گئی۔ ہائے! میرے بچے کا ہنستا بستا گھر اجڑ گیا۔"

انہوں نے بے قراری سے صبا کو گلے لگا لیا' جو بے ہوش ہو چکی تھی۔ ساری عورتیں اس کے گرد جمع ہو کر اسے ہوش میں لانے کی تدابیر کرنے لگیں' کوئی ناک بند کر رہی تھی تو کسی نے پانی کے چھینٹے مارے۔

"آپ بھابھی کی اتنی اچھی دوست تھیں' مگر کبھی آپ سے ملاقات نہیں ہوئی۔" اس کے حواس بحال ہوئے تو فاطمہ نے تجسس سے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ ہماری دوستی کو زیادہ دن نہیں ہوئے تھے' ویسے سحرش کو ہوا کیا تھا؟" اس کے آنسو پھر امڈ آئے۔

"بس! کچھ پتا نہیں۔ اماں سے کسی بات پر کہا سنی ہو گئی تھی۔ صبح سے غصے میں تھیں۔ شام کو چائے پیتے ہوئے ایک دم سے گر پڑیں۔ اسپتال لے کر بھاگے تو پتا چلا ہارٹ فیل ہو گیا تھا۔" فاطمہ نے دھیرے دھیرے اسے تفصیلات سے آگاہ کیا۔

ان کے گھر سے نکلتے ہوئے صبا کی دلی کیفیت عجیب ہو رہی تھی۔ وہ انسان کی متضاد ذہنی کیفیات کے بارے میں سوچ سوچ کر حیران ہو رہی تھی۔ کسی کے دکھ اسے اللہ سے قریب کر دیتے ہیں' مگر کسی کے دکھ اسے بغاوت پر اکسا دیتے ہیں۔ یہ تو اس رب کی شان ہے کبھی وہ اپنے بندے کو اس کی حیثیت سے زیادہ دے کر اس کا شکرانہ قبول کرتا ہے تو کبھی کمی بیشی کر کے اس کے صبر کو آزماتا ہے اور جو اس امتحان میں پورا اترتا ہے' وہ ہی دنیا اور آخرت میں کامیابی حاصل کرتا ہے۔

☆

رابعہ افتخار

سردیوں کی دھوپ صحن کی اینٹوں سے کھسک کر دیوار پر چڑھ چکی تھی۔ بڑی بہو رقیہ باورچی خانے میں ہنڈیا پکا رہی تھی اور چھوٹی بہو نورین کپڑے استری کرنے میں مصروف تھی۔ خالدہ بیگم نے گھڑی کی سمت دیکھا۔ ترنم کو گئے ابھی ایک گھنٹہ ہی ہوا تھا۔ لیکن ان کا دھیان اسی میں اٹکا تھا۔

"نہ جانے گھر کے حالات کیسے ہوں گے۔ فاروق کو کوئی کام ملا ہوگا یا نہیں۔" ان کا نواسا اسفندیار اور نواسی اقرا کچھ ہی دنوں میں مرجھا سے گئے تھے۔

"اماں! کھانا بنا دیا ہے۔ میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو آواز دے دیجیے گا۔"

بڑی بہو باورچی خانے سے نکلی تو وہ سوچوں سے باہر آئیں۔ گھر کا سارا انتظام دونوں بہوؤں نے بہت اچھی طرح سنبھال رکھا تھا۔ کوئی لڑائی جھگڑا نہیں تھا۔ ہاں ان دنوں ترنم کی وجہ سے کچھ تناؤ ضرور تھا۔

ترنم، خالدہ بیگم کی اکلوتی بیٹی تھی۔ پہلوٹھی کی اولاد تھی۔ ابھی وہ بیس برس کی ہی تھی کہ خالدہ بیگم نے اس کی شادی کر دی۔ فاروق ایک اچھی پرائیوٹ فرم میں ملازمت کرتا تھا۔ ترنم کے حالات بے حد اچھے تھے۔ اچھا لباس، اچھی خوراک اور پر سکون زندگی نے اسے بے حد خوب صورت بنا دیا تھا۔ خالدہ بیگم اسے دیکھ کر خوش ہو جاتی تھیں۔ ترنم کے ہاں پہلے اسفند کی پیدائش ہوئی اور پھر اسفند کے دو سال بعد اقرا نے اس گھرانے کو مکمل کر دیا۔ اسی دوران خالدہ بیگم نے ترنم سے چھوٹے کامران اور نعمان کی بھی شادیاں کر دیں۔ زندگی بہت پر سکون تھی۔ خدا نے ان پر خاص کرم کیا تھا اور انہیں بہوویں بھی بہت اچھی ملی تھیں۔

بڑی بہو کے ہاں بیٹی کی پیدائش ہوئی تو وہ کچھ عرصے کے لیے ترنم کی طرف نہ جا سکیں۔ وہ بھی آئی اور کچھ دیر بیٹھ کر چلی گئی۔ ننھی صالحہ دو ماہ کی ہوئی تو خالدہ بیگم کو جیسے فراغت ملی۔ انہیں ترنم اور اپنے نواسے، نواسی کا خیال آیا۔

"ترنم کہاں غائب ہو بیٹی؟" راستے سے وہ بچوں کے لیے پھل اور کیک لے گئیں۔ ترنم تو جیسے صدیوں کی بیمار دکھائی دے رہی تھی۔ بچے بھی کچھ نڈھال سے تھے۔

"اماں...." وہ ان سے لپٹ کر رو پڑی۔

"اماں! آپ نے تو میری خبر بھی نہ لی۔ فاروق کی ملازمت ختم ہو گئی۔ دو ماہ سے گھر میں خرچا نہیں دیا تو سسرال والوں نے بھی الگ کر دیا۔ اب ہم کرائے کا مکان ڈھونڈ رہے ہیں۔" وہ جیسے کب سے بھری بیٹھی تھی۔ خالدہ بیگم کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا ہو۔

"کرائے پر کیوں جائے گی میری بچی! میرے ساتھ چلو۔ اپنی چھت ہے۔ جب تک فاروق کی ملازمت نہیں ہو جاتی تم سب وہیں رہو گے۔" اماں نے اسے ساتھ لگا کر تسلی دی۔ بچوں کے چہروں پر بھی خوشی دوڑ گئی۔

"فاروق بہت عزت دار اور غیرت مند ہیں۔ وہ نہیں مانیں گے۔" آنسو صاف کرتے ہوئے ترنم نے خدشہ بیان کیا۔

"اسے منانا میرا کام ہے۔ تم پریشان مت ہو۔ فاروق میرا داماد ہی نہیں، بیٹا بھی ہے۔" خالدہ بیگم نے ترنم کو مزید تسلی دی۔ نعمان اور کامران کا کام بہت اچھا تھا۔ ترنم کے ابا کی پنشن بھی اچھی آ جاتی تھی۔ انہیں کوئی فکر نہیں تھی۔ پھر ترنم تو گھر کی بیٹی تھی۔

☼ ☼ ☼

"نہیں خالہ جان! میں اپنی بیوی اور بچوں کو پال سکتا ہوں۔ میں کرائے پر مکان لے لوں گا۔ دوست یاروں سے مدد مانگ لوں گا۔ لیکن سسرال میں رہنا.... نہیں خالہ جان۔" وہ کب سے فاروق کو سمجھا رہی تھیں۔ لیکن وہ کسی طور رضامند نہیں ہو رہا تھا۔

"اچھا بیٹا! میں تمہیں مجبور نہیں کرتی۔ لیکن ایک ہفتے کے لیے تو رہو چل کر.... جب مکان کا بندوبست ہو جائے گا تو میں تمہیں نہیں روکوں گی۔" وہ جیسے ہار سی گئیں۔ ترنم نے امید بھری نظروں سے فاروق کی سمت دیکھا۔

"ٹھیک ہے! یہ بات مان لیتے ہیں۔ لیکن صرف ایک ہفتہ.... ایک ہفتے تک میں کوئی نہ کوئی بندوبست تو کر ہی لوں گا۔" وہ ہمت نہیں ہار

"ترنم کا بھی حق ہے اس گھر پہ اور ترنم کے حوالے سے تمہارا بھی۔ تم کوئی غلط خیال دل میں نہ لاؤ اور چلو اب۔" خالدہ بیگم نے داماد سے، بہت محبت سے کہا۔

"مہربانی ہے آپ کی خالہ جان۔" وہ مشکور ہوا تھا۔ ترنم اٹھ کر ضروری سامان پیک کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

ترنم کو خالدہ بیگم کے ساتھ آئے دوسرا دن تھا۔ گھر کے حالات بہت اچھے تھے۔ رقیہ اور نورین کھلا خرچ

کرتی تھیں۔ کھانے پینے، پہننے اوڑھنے میں کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ خالدہ بیگم تو دونوں بچوں کے ساتھ بہت مصروف ہو گئی تھیں۔ انہیں بھی صالحہ کی صورت میں کھلونا مل گیا تھا۔

ترنم پانی پینے کی غرض سے باورچی خانے میں گئی۔ نورین اور رقیہ وہیں موجود تھیں۔ ایک آٹا گوندھ رہی تھی اور دوسری گوشت صاف کر رہی تھی۔ ترنم نے فریج کھولا تو ان دونوں نے ہی اس کی طرف دیکھا تھا۔ فریج میں انواع واقسام کے کھانے رکھے تھے۔ فروٹ جیم کی تین چار بوتلیں بھی تھیں۔ اسے اسفند کا خیال آگیا۔ اسفند جیم کے بغیر ناشتا نہیں کرتا تھا۔ لیکن اب کچھ عرصے سے وہ صرف پاپے کھا کر ناشتا کر رہا تھا۔

"کیا چاہیے آپا؟" نورین نے اسے فریج کھولے کھڑے دیکھا تو پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ شادی شدہ بیٹی کا ماں، باپ کے گھر پہ کوئی حق نہیں رہتا شاید۔

"پیاس لگ رہی تھی۔ پانی پینا تھا۔"

"اتنی ٹھنڈ میں فریج کا پانی؟" رقیہ نے حیرت سے اسے دیکھا۔ پھر وہ دونوں ایک دوسرے کی سمت دیکھ کر ہنسنے لگیں۔

"ہاں! دل چاہ رہا تھا ٹھنڈا پانی پینے کو۔" وہ دروازہ بند کر کے جگ سے پانی ڈالنے لگی۔

"دراصل میں اس موسم میں کبھی فریج میں پانی رکھا نہیں ہم نے۔ ہمارے ہاں تو گرمیوں میں بھی برف کا پانی کم ہی پیتے ہیں۔" رقیہ کام میں مصروف بتانے لگی۔

"ہاں! جانتی ہوں۔" وہ پانی پینے لگی۔

"آپ باہر اماں کے پاس بیٹھیں نا..... باتیں کریں۔" نورین نے گوشت کا پانی نچوڑتے ہوئے کہا۔ کم از کم ڈیڑھ کلو گوشت تھا۔ ترنم کو یاد آیا تقریباً مہینہ پہلے اس نے ایک پاؤ گوشت پکایا تھا۔ وہ بھی آلو ڈال کر۔ حالات کیسے بدلے تھے۔ لیکن وہ ناشکری نہیں ہوئی تھی۔ بس ذرا ہمت کم ہوئی تھی۔ لیکن وہ اپنے رب سے اب بھی یقین کے ساتھ مانگ رہی تھی۔

"کیا بنا رہی ہو؟" وہ یوں ہی بات کرنے کی غرض سے بولی۔

"گوشت صاف کیا ہے۔ کڑاہی گوشت پکانے کا ارادہ ہے۔ ہمارے ہاں ایک دن گوشت کی کوئی ڈش ہوتی ہے اور ایک دن دال سبزی۔ مجھے تو میکے سے عادت ہے۔ کباب وغیرہ بنا کر رکھنے کی اور بھابھی بھی ماشاء اللہ کھاتے پیتے گھر کی ہیں۔ سچ بات ہے دال سبزی ذرا مشکل سے ہی ہضم ہوتی ہے۔"

نورین بات کے آخر میں ہنس دی۔ ترنم مسکراتے ہوئے اٹھ گئی۔ دم سا گھٹ رہا تھا۔ یہ گھر اپنا نہیں لگ رہا تھا۔ باہر صحن میں بیٹھی ماں بھی ایک ایسی ملکہ کی طرح لگ رہی تھی جو تخت پر بیٹھی تو تھی۔ لیکن اس کے پاس کوئی اختیار نہیں تھا۔ وہ چند قدم کے فاصلے پر بیٹھ گئی۔ ذہن فاروق کی نوکری میں ہی اٹکا ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم نے دیکھا تھا نورین! اسفند کیسے ندیدوں کی طرح کھا رہا تھا..... مجھے تو لگتا ہے ان کے حالات شروع سے ہی ایسے ہیں۔ پہلے سسرال والوں نے سہارا دے رکھا تھا تو بھرم رہ جاتا تھا۔ اب علیحدہ ہوئے ہیں تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوا ہے۔" وہ وضو کے لیے اٹھی تھی۔ بچوں کو سلاتے ہوئے عشاء کی نماز کا وقت نکل رہا تھا۔ صحن میں وضو کرتے ہوئے باورچی خانے سے آتی آواز نے اس کو ساکت کر دیا۔

"اور نہیں تو کیا۔ کتنی مرتبہ آپا بہانے سے فریج کھولے کھڑی نظر آتی ہیں اور وہ اقرا۔ اس کی نظریں تو فروٹ کی ٹوکری کا ہی طواف کرتی رہتی ہیں..... حد ہوتی ہے بھئی! کم از کم اتنا تو لحاظ کریں کہ اپنا گھر نہیں ہے۔" نورین نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔

"چھ دن ہو گئے۔ ابھی تک تو فاروق بھائی کوئی بندوبست کر نہیں سکے۔ کھلا کھانا پینا دیکھ کر کس کا دل چاہتا ہے کہ یہاں سے جائے مفت کا مل رہا ہے۔" رقیہ نے تو حد کر دی۔

ترنم کسی صورت اپنے شوہر کی تذلیل برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ نماز ادا کر کے رو رو کر اپنے شوہر کے روزگار اور اپنی چھت کے لیے دعا کی۔ سسرال والوں نے دل دکھایا ہی تھا، میکے والوں نے بھی کچھ کم نہیں کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح ناشتے سے فراغت کے بعد فاروق نے انہیں سامان پیک کرنے کو کہا۔

"کہاں جا رہے ہو بیٹا! کوئی انتظام ہوا؟" خالدہ بیگم کو فکر ہوئی۔

"جی خالہ جان! میرا ایک دوست باہر ہوتا ہے۔ اس کا مکان بند پڑا تھا۔ اسے پتا چلا تو فون پر بہت ناراض ہوا۔ اگلے دن ہی اس کا کزن مجھے مکان کی چابی دے گیا۔" فاروق نے بتایا تو ترنم نے سکھ کا سانس لیا۔

"اور نوکری؟ کھاؤ گے کہاں سے؟"

"خالہ جان! جس اللہ نے میرے بیوی، بچوں کے لیے چھت کا انتظام کیا ہے، وہ ہی ان کی روٹی کا بھی بندوبست کرے گا۔ وہ ہی کرنے والا ہے اور پھر ہر انسان کو اس کے نصیب کا ملتا ہی ہے۔" فاروق کو بہت یقین تھا۔

کپڑے بیگ میں رکھتے ہوئے ترنم کی نظر ابا کی تصویر پر پڑی۔ وہ ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

"ابا! میرا اس گھر پہ کتنا حق ہے۔ یہ تو مجھے احساس ہو گیا۔ پر دکھ اس بات کا ہے کہ کوئی "حق نہ جتاتے" ہوئے بھی میں اور میرے بچے مجرم بن رہے ہیں۔ اسی گھر میں بیٹی بڑھی، جوان ہوئی اور پھر رخصت ہوئی اور آج بابل کے گھر میں اتنا بھی حق نہیں کہ میں یا میرے بچے کھل کر کچھ کھا سکیں۔ ابا! آپ کے آنگن سے صرف میرا ہی رشتہ نہیں ٹوٹا، بلکہ ہر اس لڑکی کا اپنے باپ کے آنگن سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے، جو میری طرح کے حالات کا شکار ہو جائے۔ اللہ کسی شادی شدہ بیٹی کو ماں، باپ کے در پر نہ لائے۔" اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے۔

"ایک حق جتا رہی ہوں، لیکن صرف آپ پر۔۔۔ ایک چوری کر رہی ہوں ابا! اپنے بچوں کے لیے۔" آنسو صاف کرتے ہوئے وہ کمرے سے باہر نکلی۔ اس کے قدموں کا رخ باورچی خانے کی طرف تھا۔

سامنے ہی آٹے کے ڈبے کے اوپر نورین کے سونے کے کنگن رکھے تھے۔ ترنم نے ادھر ادھر دیکھا اور کنگن اٹھا لیے۔

☼ ☼ ☼

اماں کے ہاں سے اس مکان میں آئے تین دن ہوئے تھے۔ فاروق کو ابھی کوئی کام تو نہیں ملا تھا۔ لیکن اسی دوست نے جن کے مکان میں وہ رہ رہے تھے، تھوڑی سی رقم بھیجی تھی۔ فاروق نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ جلد ہی چکا دے گا۔

"میں سوچ رہی تھی کہ اماں کی طرف ہو آؤں۔ میں ان سب کا شکریہ بھی ادا کر کے نہیں آئی اور پھر اماں فکرمند ہوں گی۔" ترنم نے فاروق کے سامنے چائے کا کپ رکھتے ہوئے کہا۔

"ہوں۔۔۔ ایک، دو دن تک چلیں گے۔ ایک جگہ نوکری کی بات چلی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ کام بن جائے گا۔ پھر ہم اسی مکان کا کرایہ بھی دینے لگیں گے۔" فاروق کچھ مطمئن سا ہوا۔ ایک طمانیت سی ترنم کے دل میں اتر گئی۔

"ہاتھ میں پیسے آئیں تو پہلے مجھے کچن میں سودا سلف ڈال کر دیجیے گا۔"

"ہاں، ہاں! معلوم ہے، بچے عادی نہیں تھے اتنا کم کھانے کے۔۔۔ انہیں دیکھتا ہوں تو کڑھتا ہوں۔ لیکن اللہ مسبب الاسباب ہے۔ ان شاء اللہ بہتر ہی ہو گا۔" فاروق اسے تسلی دینے لگے۔

"آپ ایسا کیجیے گا کہ پہلے مجھے سامان ڈال دیجیے گا، پھر اماں کے ہاں چلیں گے۔" کسی خیال کے تحت وہ بولی۔ فاروق نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر دو دن بعد ہی فاروق کو نوکری بھی مل گئی اور اسی دوست کے توسط سے ایک چھوٹا سا بزنس بھی شروع کر لیا۔ پہلی آمدنی اگرچہ دس ہزار روپیہ ملی۔ لیکن فاروق ترنم اور بچوں کا خیال کر کے اشیائے ضرورت گھر لے آیا۔

"میں شام میں اماں کی طرف جاؤں گی فاروق!" وہ کپڑے استری کرتے ہوئے بولی۔

"ٹھیک ہے۔ لیکن میں نہیں جا سکوں گا، دفتر سے چھٹی کے بعد مجھے جنرل اسٹور پر بھی ٹائم دینا ہے۔" فاروق نے مصروف سے انداز میں کہا۔ ترنم مسکرا دی۔ اللہ نے ان کے دن ایک بار پھر پھیر دیے تھے۔

☼ ☼ ☼

صحن میں قدم رکھتے ہی ترنم نے محسوس کیا جیسے اماں اس سے ناراض ہوں۔ ان کا ناراض ہونا بجا تھا، وہ ان سے اتنے دن کوئی رابطہ بھی نہیں کر سکی تھی۔

"کیسی ہیں اماں؟" وہ ان سے لپٹ گئی۔ اماں نے سرد مہری سے اسے خود سے الگ کر دیا۔

"کیا ہوا اماں! پوچھیں گی نہیں کہ میں کیسی ہوں؟ فاروق اور بچے کیسے ہیں؟ اماں آپ اتنی ناراض تو نہ ہوں نا۔ آج دیر تک آپ کے پاس بیٹھوں گی۔ بلکہ رات کا کھانا کھا کر ہی جاؤں گی۔" ترنم نے لاڈ سے اماں کے ہاتھ تھام لیے۔

"بس کر دے ترنم۔۔۔ تو کتنی بے شرم ہے۔ کتنی ڈھٹائی سے پھر آ گئی۔۔۔ تیرے چہرے کا سکون بتا رہا ہے کہ تو مطمئن ہے۔ پرسکون ہے۔ بتا کتنے میں بیچے نورین کے کنگن۔"

اماں نے گویا اسے مار ہی دیا ہو۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ گئی۔ شکر ہے کہ وہ بچوں کو ساتھ نہیں لائی تھی۔ بچے فاروق کی دور کی رشتے دار کے پاس گھر پہ ہی تھے۔ وہ اتفاق سے ان کی محلے دار بھی تھی۔

"نورین کے کنگن؟"

"ہاں! نورین کے کنگن۔۔۔ چوری کی ہے تو نے۔ تیرے حالات بتا رہے ہیں کہ اچھے خاصے مہنگے بکے ہیں وہ کنگن۔" اماں کی آنکھیں قہر برسا رہی تھیں۔ اسی وقت نورین، رقیہ، کامران اور نعمان بھی باہر آ گئے۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں اماں آپ؟" دکھ سے اس کی آواز گھٹ گئی۔ نعمان اور کامران کی آنکھوں میں بھی نفرت تھی۔

"کیا آپ کے حالات اتنے برے ہو گئے تھے کہ آپ نے ایمان بیچ دیا؟ اپنے ہی گھر، اپنی ہی بھابھی کے کنگن چرا لیے آپا۔" نعمان بھی خاموش نہ رہ سکا۔

"چوری، چوری ہی ہوتی ہے آپا! میں نے وہ کنگن آٹا گوندھنے کے لیے اتار کر آٹے کے ڈبے پر رکھے تھے۔ بعد میں مجھے یاد نہیں رہے۔ آپ نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور کنگن لیتے ہی چلتی بنیں۔ آپ کو رقم کی ضرورت تھی تو مانگ لیتیں آپا!" نورین کا غصہ عروج پر تھا۔

"مان لیں کہ آپ نے چوری کی ہے۔" کامران نے نفرت سے اس کی سمت دیکھا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں میں نے چوری کی ہے۔ لیکن۔۔۔ میں نے نورین کے کنگن نہیں چرائے۔ نورین کے کنگن تو میں نے حفاظت کے خیال سے کیبنٹ میں پیچھے کر کے رکھ دیے تھے۔" وہ رو دی۔ سب کے منہ حیرت سے کھلے رہ گئے۔

"تو پھر کیا چرایا ہے آپ نے؟" نورین تیزی سے کچن کی طرف بڑھی۔ کچھ ہی دیر کے بعد وہ اپنے کنگن ہاتھ میں لیے واپس آ گئی۔ اس کے چہرے پر شرمندگی کے آثار واضح تھے۔ خالدہ بیگم نے حیرت سے ترنم کی سمت دیکھا۔

"تو پھر کیا چرایا ہے تم نے ترنم؟" وہ سب ان کی طرف متوجہ تھے۔ وہ کسی مجرم کی طرح کٹہرے میں کھڑی تھی۔

"میں نے چوری کی ہے۔ اس گھر سے چوری کر کے بھاگی ہوں۔ یہ گھر جو میرے باپ کا ہے۔ میری ماں کا ہے، میرے بھائیوں کا ہے۔ جہاں میں نے آنکھ کھولی۔ چلنا سیکھا۔ اپنی زندگی کے اکیس برس گزارے۔ اس گھر پہ میرا بھی اتنا ہی حق ہے، جتنا باقی سب کا۔۔۔ ہاں! میں نے اس گھر سے چوری کی ہے۔"

وہ روتے روتے بولی اور پیچھے دیوار سے ٹیک لگا کر نڈھال سی کھڑی ہو گئی۔ پھر اپنا بیگ اٹھا کر کھولنے لگی۔ ایک پوٹلی سی نکالی۔ سب نے حیرت سے اس پوٹلی کی سمت دیکھا۔

"یہ چرایا تھا میں نے۔ اپنا حق جتانا چاہتی تھی یا نہ جانے کیا۔۔۔ چوروں کی طرح لے کر گئی۔ لیکن آج واپس رکھنے آئی تھی۔ کیونکہ میں جانتی ہوں بیٹی کا حق اس کی رخصتی کے ساتھ ہی رخصت ہو جاتا ہے۔ وہی بچی جو اس گھر کے آنگن میں کسی پھول کی طرح مہکتی ہے۔ آنگن کی رونق ہوتی ہے۔ ایک دن مجرم بن کر سب کی عدالت میں کھڑی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ حق نہیں رہتا۔۔۔ خیر! میں تو آج یہ بتانے آئی تھی کہ فاروق کی نوکری لگ گئی ہے۔ ہمارے گھر کا بندوبست بھی ہو گیا ہے۔ فاروق سودا سلف لے کر آئے تو سوچا پہلے یہ واپس رکھ کر آؤں۔" وہ پوٹلی اماں کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

"لیکن یہ ہے کیا؟" خالدہ بیگم کے ہاتھ کانپ سے گئے۔

"دو کلو آٹا۔۔۔ چوری کا آٹا۔۔۔ جو اس روز میں اپنے بچوں کی روٹی کی نیت سے چرا کر لے گئی تھی۔ فاروق کی جیب بالکل خالی تھی۔ اس نے ہمارے لیے چھت کا بندوبست تو کر دیا تھا۔ لیکن۔۔۔ خیر! اب ان سب باتوں سے کیا حاصل؟ میں نے فاروق کو یہ ہی بتایا تھا کہ اماں نے کچھ ضرورت کی چیزیں ساتھ دے کر بھیجا ہے مگر یہ مجھ پہ بوجھ تھا سو میں نے اتار دیا۔"

وہ اپنی بات مکمل کر کے پلٹی۔۔۔ سب اپنی جگہ ساکت کھڑے تھے۔

"ترنم۔۔۔" خالدہ بیگم اس کے پیچھے لپکیں۔ مگر وہ تیزی سے گلی کا موڑ مڑ گئی۔ دل آنسو بہا رہا تھا۔ مگر وہ پھر بھی مطمئن تھی کہ اس نے آٹا واپس کر دیا۔

میکے کا مان ختم ہو گیا تو کیا ہوا۔ اس نے خود پر لگا چوری کا داغ تو دھو دیا تھا نا۔

☼

مکمل ناول

مصباح نوشین

محبت گمشدہ میری

میری دیوانگی پہ اس قدر حیراں ہوتے ہو
میرا نقصان تو دیکھو، محبت گمشدہ میری

اوائل جنوری کی ٹھٹھرتی رات کا دھند میں لپٹا آخری پہر تھا جب دروازے پر ہونے والی زوردار دستک نے مجھے اپنے نیم تاریکی میں ڈوبے ہوئے بیڈ روم سے باہر نکلنے پر مجبور کیا تھا۔

چوکیدار آج ہی دو دن کی چھٹی لے کر اپنے گھر گیا تھا۔ میں نے اپنے پہلو میں لیٹی اپنی عزیز ترین بیوی کو دیکھا جس کی یہ خوبی تھی کہ ایک دفعہ اگر سو جائے تو صبح سے پہلے وہ کبھی غلطی سے بھی رات میں نہیں اٹھتی۔ سو مزید انتظار بے کار تھا۔ رات کے دو بجے آنے والا ظاہر ہے کہ اپنی مرضی خوشی سے تو اس وقت آنے سے رہا۔

میں نے جوں ہی دروازہ کھولا۔ سامنے کا منظر ناقابل

یقین تھا آنے والی شخصیت آج تین سال بعد میرے سامنے دوبارہ کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر صدیوں کی طویل مسافت کی داستان رقم تھی۔ نڈھال اور نیم مردہ وجود کو بمشکل اپنے قدموں پر اس نے سنبھال رکھا تھا۔ جسم کا بایاں حصہ یکدم درد سے ڈوبا تھا میں نے ایسا تو نہیں چاہا تھا اس نے ذرا کی ذرا نگاہیں اٹھا کر دیکھی تھیں۔ مٹے مٹے میک اپ زدہ چہرے پر آنسوؤں کی لکیر صاف نظر آ رہی تھی میری نظریں اس کے چہرے کا طواف کرتی ہوئی اس کے لباس پر اٹک کر رہ گئیں۔ سلگتے ہوئے سرخ انگاروں کی طرح دہکتا ہوا عروسی لباس۔

وہ اس وقت اس لباس میں رات کے دو بجے یہاں آئی تھی اور اگر آئی تھی تو کیوں؟

جس شخص کے ساتھ اس نے تین سال قبل اپنا رشتہ ہر ناتا توڑ لیا تھا جس شخص کو اس نے آسمان سے زمین کی طرف بے دردی سے پٹخا تھا اس کی ذات کے پرخچے ہواؤں میں اڑا دیے تھے۔ وہ آج پھر اس کے سامنے تھی تو کیوں تھی؟

میں یہ سب فقط سوچ کر رہ گیا میں تو اس وقت بھی اسے کچھ نہیں کہہ پایا تھا جب اس نے میرا چین سکون لوٹا تھا آج تو وہ خود بکھری بکھری نڈھال اور پژمردہ میرے دروازے پر کھڑی تھی۔

میں نے دروازے کے پاس سے ہٹ کر اسے اندر آنے کی اجازت دی تھی اس کے ہاتھ میں فقط ایک سفری بیگ تھا ایسا لگ رہا تھا جیسے جلدی میں دو چار جوڑے ٹھونسے گئے ہوں۔ بیگ کی زپ بھی آدھی کھلی تھی۔ وہ اب بھی کچھ نہیں بولی تھی خاموشی سے میرے آگے آگے چلنے لگی تھی۔

وہ خاموش تھی مگر اس کا وجود اور اس پر سجا وہ لباس چیخ چیخ کر اس کے ساتھ ہونے والی زیادتی اور ظلم کی داستان سنا رہے تھے۔ بعض دفعہ خاموشی بھی ان کہی داستانیں بلا تردد آسانی کے ساتھ عیاں کر دیتی ہے۔

"کیسی ہو؟" لاؤنج میں پڑے ایک صوفے پہ اسے بٹھاتے ہوئے محض بات چیت کے آغاز کے لیے میں نے اس سے وہ بے تکا سا سوال پوچھا تھا۔ حالانکہ اس کے حلیے کو دیکھتے ہوئے یہ سوال کرنا نہ صرف غیر ضروری تھا بلکہ کافی مضحکہ خیز بھی تھا۔

باہمت لوگ جب ٹوٹ کر بکھرا کرتے ہیں تو یقیناً ایسے ہی نظر آتے ہیں، جس طرح اس وقت میرے سامنے دل نشین راجہ تھی۔ وہ اسی طرح خاموش و لاتعلق تھی چند پل تکلیف دہ خاموشی کے گزارنے کے بعد میں نے پانی کا گلاس اسے پکڑایا تھا۔ لرزتے ہوئے ہاتھوں سے گلاس پکڑتے ہوئے اس کی آنکھوں سے چند موتی ٹوٹ کر گالوں پر بکھر گئے۔

میں نے ـــــ آج تک اسے روتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔

آج نہ صرف وہ رو رہی تھی بلکہ اس کی روح بھی اس کے ساتھ ماتم کناں تھی۔ چہرہ ذہنی اذیت کا غماز تھا۔

"میں تمہارے لیے کھانا گرم کرتا ہوں۔" طویل خاموشی سے گھبرا کر میں نے جونہی اٹھنا چاہا۔ اس نے سرعت سے میرا ہاتھ تھام کر مجھے بٹھا دیا۔

"ن ..... نہیں۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔ آپ سو جائیں جا کے، میں نے ناحق آپ کو ڈسٹرب کیا۔ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا؟" پچھلے پندرہ منٹ کے طویل اذیت ناک وقفے کے بعد اس نے کہا بھی تو کیا؟ اجنبی، غیریت سے بھرپور یہ چند جملے۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو دل! یہ تمہارا اپنا گھر ہے ہم سب تمہارے اپنے ہیں۔ تم نے یہاں آنے کا بہت درست فیصلہ کیا ہے؟" یہ کہتے ہوئے مجھے اپنی ہی آواز پرائی محسوس ہو رہی تھی جواباً" اس نے مجھے جن نظروں سے دیکھا تھا، وہ مجھے خود سے بھی نظریں چرانے پر مجبور کر گیا تھا۔

"آؤ! میں تمہیں تمہارا کمرا دکھا دوں؟"

اب کی بار وہ کچھ نہیں بولی تھی بس خاموشی سے اپنا بیگ اٹھا کر اپنی تمام ہمت کو مجتمع کر کے میرے ساتھ چلنے لگی تھی چند قدم چلنے کے بعد میں نے اسے بہت احتیاط سے اسے کسی قیمتی متاع کی طرح تھام لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اگر وہ اس وقت ہوش میں ہے تو اسے کچھ کھلا دو فرحین!" میری عزیز ترین پیاری دوست نما بیوی جس نے مجھے اس وقت سنبھالا تھا جس وقت میرے بہت اپنوں نے مجھے اکیلا ہی نہیں کیا تھا بلکہ ایک اذیت مسلسل سے بھی نوازا تھا۔

"نہیں! ابھی وہ سکون کی نیند سو رہی ہے ڈاکٹر نے انجکشن لگا دیا تھا۔"

آج چونکہ ویک اینڈ تھا اس لیے مجھے کورٹ بھی نہیں جانا تھا۔ چھٹی والے دن فرحین خوب دل لگا کر میرے لیے میری پسند کا ناشتا تیار کیا کرتی تھی۔ جتنا میں اسے عزیز تھا اسی طرح مجھ سے تعلق رکھنے والا ہر شخص اس کے لیے قابل احترام تھا۔

وہ کئی دفعہ جا کر اس کے کمرے کے دروازے پر دستک دے چکی تھی، چوتھی بار وہ تشویش لیے میرے پاس آئی تھی میں اسے حوصلہ دیتے ہوئے دلنشین کے کمرے تک آیا تھا دروازہ مقفل نہیں تھا۔ میرے ناب گھمانے پر فوراً" ہی کھل گیا۔

لیکن اندر کا منظر ہم دونوں کے لیے ہی ناقابل یقین تھا۔ برفیلے فرش پر اوندھے منہ گری ہوئی دلنشین ہم دونوں کے حواس مختل کرنے کو کافی تھی، فری بے اختیار لپک کر اس کے پاس پہنچی تھی۔

چاندنیوں کے نور میں ڈھلا اس کا وجود پرنور روشنی سے دہکتے سورج کی شفاف کرنوں سے مزین چہرے پر زردیاں کھلی ہوئی دور سے ہی صاف محسوس ہو رہی تھیں۔

"اسے تو بہت تیز بخار ہے۔" فری نے اس کے ماتھے کو ہلکے سے چھو کر محسوس کیا تھا وہ اس وقت بے سدھ ـــ ہوش و خرد سے بے گانہ چہرے پر بھولا پن سجائے محو استراحت تھی۔ شاید بلکہ یقیناً" اٹھنے کی کوشش میں وہ گری تھی۔ فری نے لپک کر اسے سیدھا کیا تھا گلاس ٹیبل کے شیشے سے اس کا سر بری طرح سے ٹکرا کر زخمی ہوا تھا۔

"او مائی گاڈ! اس کا تو کافی خون بھی بہہ گیا ہے۔" فری تشویش سے کہتے ہوئے قالین پر جمے اس کے خون کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

میں بے حس و حرکت کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ اپنی ٹانگوں کی واضح لرزش پہ قابو پانے کے لیے میں نے دیوار کا سہارا لیا تھا۔

جو لوگ آپ کو بہت عزیز ہوں ان کو ٹوٹ کر بکھرتے اور پھر بکھرا دیکھنے کا یارا نہیں ہوتا۔

کاش سامنے لیٹی پانچ فٹ پانچ انچ کی یہ لڑکی اگر ضد و انا کو درمیان لائے بغیر سوچتی تو آج حالات کتنے مختلف ہوتے، وقت نے کیسا پلٹا کھایا تھا، کل کو جو لڑکی سب کو ہارنے اور رونے پر مجبور کیا کرتی تھی، آج خود شکست و ریخت کا نمونہ بنی میرے سامنے تھی۔

"میں ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں تم خیراں کے ساتھ مل کر اسے بیڈ پر لٹاؤ؟" اپنے اندر کے شوریدہ سر جذبوں کو صبر و تحمل کی تھپکی دے کر سلاتے ہوئے میں نے بمشکل کہا تھا۔

ایک سو چار بخار اور شدید کمزوری کے باعث وہ اتنی بیمار پڑی تھی رب جانے اس نے کتنے دن سے بھوک ہڑتال کر رکھی تھی۔ مجھے یاد تھا وہ جب بھی کسی سے ناراض ہوتی یا اپنی کوئی ضد منوانا ہوتی یونہی سب کو ایموشنلی بلیک میل کیا کرتی تھی۔ وہ جانتی تھی اس کی بھوک ہڑتال سے اس سے زیادہ اس کے گھر والوں کو تکلیف ہو گی اسی لیے وہ یوں ہی کیا کرتی۔

ڈاکٹر اپنے پیشہ ورانہ انداز میں کچھ ہدایات دے کر چلا گیا میں حیران سا اس کے ماتھے پر لگے زخم کو تک رہا تھا۔

کل رات سے مسلسل میں انہی سوچوں کی یلغار میں پھنسا ہوا تھا جن سے دانستہ میں پچھلے تین سالوں سے چھپنے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن کل رات سے

میری ہر کوشش رائیگاں ثابت ہو رہی تھی۔
میں اندر ہی اندر خود اذیتی کرنا کی اور جان کنی کے عذاب سے گزر رہا تھا۔
کیوں گئی تھی وہ میری زندگی سے؟
اور اگر گئی تھی تو واپس کیوں آئی وہ بھی اس حال میں؟

وہ جو مجھے حال سے بے حال با اختیار سے بے اختیار کر گئی تھی۔ آج ایک دفعہ پھر کیوں میرا ضبط آزمانے آئی تھی۔ کیا اسے ایک لمحے کو بھی مجھ پہ ترس نہیں آتا اگر نہیں تو کیوں نہیں؟ میں جتنا سوچتا جاتا اتنا الجھتا جاتا۔
"آہ، دلنشین راجہ! میں تمہیں کیسے اور کیوں بھول پاؤں گا۔"

☼ ☼ ☼

تانگے والے کو پیسے دے کر میں نیچے اترا۔ سامنے کا منظر ہمیشہ کی طرح بہت پُرفریب و دلکش تھا میرے لیے ویسا ہی رعنائی و دلکشی کا منبع، لہلہاتے کھیتوں اور فصلوں سے مزین ارض وطن پر جلوہ افروز۔ میرا مان میرا اپنا میرا سکون۔ میری رگ و پے میں دوڑتا اس گاؤں کے میٹھے چشموں کا پانی جو میرے جوان و توانا جسم میں خون بن کر دوڑتا تھا۔ میرے پنڈ کی زمین میری ماں میری دھرتی کی سوندھی سوندھی خوشبو آج بھی میرے لیے ویسی ہی اپنائیت بھری تھی اور یہاں کی پُرلطف ٹھنڈی ٹھنڈی میٹھی لوری سناتی ہوئی باد صبا...
میں نے لمبا سانس کھینچ کر ان ہواؤں کو محسوس کرنا چاہا تھا جنہوں نے مجھے پردیس میں بھی بے چین رکھا تھا۔

سب کچھ ویسا ہونے کے باوجود بہت کچھ پھر بھی بدل گیا تھا۔ اب راجاؤں کی حویلی کی طرف جانے والی کچی پگڈنڈی ایک پکی سڑک میں تبدیل ہو گئی تھی۔
میں دس گیارہ سال بعد اس دھرتی کے وجود کو محسوس کر رہا تھا۔

سورج سوا نیزے پر تھا، فصلوں کی کٹائی شروع ہو چکی تھی میرے دائیں طرف بنے کھلیانوں میں دھان یعنی چاولوں کی فصل تھی اور میرے بائیں طرف سرسوں کے پھول پیلے پیلے پھول سبز ڈنڈیوں کے ساتھ آنکھوں کو اتنے بھلے لگ رہے تھے کہ میں چند لمحے اس بنی سنوری اپنی ماں دھرتی کو مبہوت سا دیکھے گیا تھا۔
سامنے لگے برگد کے درخت کے نیچے "پنڈ" کی بچیاں شٹاپو اور گولیاں کھیلنے میں مصروف تھیں۔ میں نے رک کر اس منظر کو قریب سے محسوس کرنا چاہا تھا۔ پہلے یہاں برگد کے درخت کے نیچے ایک تالاب ہوا کرتا تھا جہاں گاؤں کے لڑکے اکثر نہایا کرتے تھے اور سردیوں میں وہاں جانور پانی پیا کرتے تھے۔ مگر اب وہاں کوئی تالاب نہیں تھا شاید سوکھ جانے پر گہری زمین کی کھدائی کر کے زمین کو ایک جیسا کر دیا گیا تھا۔
گاؤں میں کچھ نہیں بلکہ بہت کچھ بدل گیا تھا۔ پہلے جو راستہ کچی پگڈنڈی کی صورت بل کھاتا ہوا حویلی تک طرف جاتا تھا، اب اس کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔ برگد کے درخت تک تو میں ٹھیک پہنچا تھا لیکن آگے دو راستے تھے اور میری سمجھ میں بالکل بھی نہیں آرہا تھا کہ ان میں سے کس راستے کا انتخاب کروں؟ ویسے بھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ سورج کی حدت میں مزید اضافہ ہو رہا تھا۔
میں نے بے اختیار پیچھے مڑ کر دیکھا تو اندازہ ہوا کہ میں کافی فاصلہ طے کر آیا ہوں تقریباً "دو میل کے پیدل سفر میں مجھے ایک لمحے کو بھی اپنی یادداشت کو کھنگالنا نہیں پڑا تھا۔ آنکھیں بند کیے اس راستے تک چلتا جا رہا تھا۔ مگر اب واقعی میں پریشان تھا۔
"اے سنو! راجاؤں کی حویلی کی طرف کون سا راستہ جاتا ہے۔" میں نے آگے بڑھ کر ایک لڑکے سے پوچھا تھا۔
"یہ دایاں والا راستہ اس پر سیدھے چلے جائیں۔ آخر میں یعنی سڑک کے اختتام پر ایک تالاب آئے گا

اس کے بائیں ہاتھ پر راجاؤں کی حویلی ہے۔" تاہم بتانے والے یعنی لڑکے نما لڑکی کی طرف سے مکمل جواب سن کر میں اس کا شکریہ ادا کر کے اپنی منزل کی جانب چل پڑا تھا۔
مگر میں آگے جا کر خوب پھنسا تھا۔ اس سڑک کا اول تو اختتام ہی نہیں ہونے میں آرہا تھا اور پھر خدا خدا کر کے ہوا بھی تو کسی قسم کا تالاب میری ناقص بصارت دیکھنے سے قاصر تھی۔
میری جھنجلاہٹ اور سفر کی تھکان اب غصے میں بدل رہی تھی۔
پچھلے پندرہ منٹ سے مجھے وہاں کسی ذی ہوش کا وجود نظر آیا تھا نہ ہی کوئی سایہ دار درخت جہاں میں چند لمحے گزار کر اپنی ہمت مجتمع کر سکتا۔
پندرہ منٹ کے طویل انتظار کے بعد ایک کسان دوست کی مدد سے میں اسی سڑک کو دوبارہ کراس کر کے برگد کے درخت کے پاس سے گزر کر بائیں جانب جانے والی سڑک پر مڑا تھا۔
فقط چند لمحے بعد میں اپنی منزل یعنی راجہ سکندر حیات کی حویلی کے سامنے کھڑا تھا۔ لکڑی کے پرانے گیٹ کی جگہ اب جدید اسٹائل کے گیٹ نے لے لی تھی میں نے ایک نظر حویلی کی پرشکوہ عمارت پر ڈالی۔ آج بھی وہ فخر و غرور سے گردن اکڑائے شان و شوکت سے کھڑی گویا اپنی اہمیت کا دوسروں کو بھرپور احساس دلا رہی تھی۔
حویلی میں مجھے میری سوچ سے بڑھ کر محبت اور پذیرائی ملی تھی۔ تایا جی آج بھی آم کے درخت کے نیچے تخت بچھائے حقے کے کش لگانے میں مصروف تھے۔ میں نے ایک طائرانہ نگاہ حویلی پر دوڑائی۔ بہت کچھ کھونے اور بدلنے کا احساس لمحہ بھر میں پوری آب و تاب کے ساتھ روشن ہوا تھا۔
حویلی میں داخل ہوتے ہی دائیں حصے پر بنا لان جہاں دنیا بھر کے رنگوں سے مزین پھول ہوا کے دوش پر ایک دوسرے سے سرگوشیاں کرتے نظر آتے۔ املی، امرود اور ٹاہلی کے لگے درخت جس پر میں کبھی چڑھ کر غلیل سے نشانہ بازی کرتا تھا۔ وہاں اب گھاس لگا کر ان درختوں کے نیچے چھوٹا سا لان بنا کر تین کرسیاں رکھ دی گئی تھیں۔ پہلی نظر میں آنکھوں کو خیرہ کر دینے والا یہ شہری طرز کا لان بہت بھلا اور اس گھر کے مکینوں کے بدلتے ذوق کا اعلا نمونہ تھا۔
حویلی کے پرانے کمرے ایک ہی لائن میں تھے اور ان کے آگے محراب دار برآمدے تھے کمروں کی چھت یعنی فرسٹ فلور پر تایا جی نے بڑے شوق سے بارہ دری بنوائی تھی۔ اور اس حویلی کی یہ سب سے نمایاں خصوصیت تھی اور اردگرد کے تمام علاقوں میں اسے ممتاز بناتی تھی یہ ــ بارہ دری جس پر خوب صورت لکڑی سے میناکاری کی گئی تھی منقش تھی۔ بھاری منقش دروازے، ٹھنڈے کمرے، پُرسکون ماحول سب کچھ پہلی نظر میں ویسا ہی لگ رہا تھا۔ حویلی کے بائیں جانب تین کمروں پر مشتمل ایک علیحدہ سے گھر بنا نظر آیا جو جدید کنسٹرکشن کے کام کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ جدید اور قدیم مشرقی و مغربی طرز کی یہ حویلی پہلے سے زیادہ تاباں نظر آتی تھی۔ حویلی میں مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا تھا۔
تایا جی آنکھوں میں آئی نمی کو پلکیں جھپک جھپک کے روکنے کی ناکام کوشش میں مصروف تھے۔
جی جی ہمیشہ کی طرح نرم و شفیق لہجے والی شہد آگیں نظر سے ممتا بھرے لمس سے چھو کر دیکھنے والی، بالکل بھی نہیں بدلی تھیں فاروق میرا یار میرا بیلی، میرا بھائی جو پچھلے سال ہی ڈھونڈتا ڈھانڈتا مجھے نیویارک میں ملا تھا اور اسی کے بھرپور اصرار پر میں آج یہاں تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ والہانہ انداز میں میری طرف بڑھا تھا۔
"یار شافع! تم یہاں؟ آنے سے پہلے کم سے کم اطلاع تو کر دیتے یار! میں تمہیں ایئرپورٹ لینے ہی آجاتا۔" پیار بھری خوشگوار شکایت۔
"بس یار! میرا دل تم سب کو سرپرائز دینے کے چکروں میں تھا۔ اسی لیے تم سب کو نہیں بتایا۔" میں

اب اس چھوٹے بچے کی طرف متوجہ تھا جو فاروق کے قدموں میں بیٹھا اس کی ٹانگوں سے لپٹ رہا تھا۔ چنامنا گول مٹول گل گوتھنا سا بچہ مجھے بہت پیارا لگا میں نے بے اختیار ہی آگے بڑھ کر اسے اٹھا کر چوما۔

"میرا بیٹا ہے یہ' حذیفہ نام ہے اس کا؟ اور یہ میری بیوی آسیہ ہے لیکن سب اسے آس کہتے ہیں۔" اس نے اپنی مختصر فیملی کا مختصر تعارف کرایا۔ گندمی رنگت کی حامل تیکھے نین نقش والی آس بھابھی مجھے پہلی ہی نظر میں کافی سوبر اور پرکشش لگیں۔

"باقی سب لوگ کہاں ہیں! رؤف' مسعود؟ مجھے سب سے ملنا ہے۔" ان سب کا نام لیتے ہوئے میں خود بخود جذباتی ہو گیا تھا۔

"وہ دونوں شہر گئے ہیں کسی کام سے! کل شام تک آجائیں گے پریشان مت ہو! سب برادری والے تم سے خود آکر ملیں گے۔" فاروق کہتے ہوئے ہنسا تھا۔

"ارے جاؤ پرے ان نالائقوں سے مل کر اسے کیا خوشی ہو گی خوشی تو اسے میرے شیر پتر سے ہو گی مل کے۔" تایا جی نے فاروق کو گھرکتے ہوئے مجھے کہا تھا۔

"اچھا پتر یہ بتا کہ تجھے آنے میں تو کوئی مسئلہ نہیں ہوا؟" جی جی جو کافی دیر سے خاموش تھیں فوراً ان دونوں کے چپ ہونے پر بول پڑیں۔

"ارے! اسے کیا مسئلہ ہو گا جی جی! گاؤں کی کچی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے ہی تو یہ بڑے بڑے قدم اٹھانا سیکھا ہے۔" اب کی بار پھر فاروق نے مداخلت کی تھی۔

"ہاں! اپنے باپ کی طرح یہ بھی بہت ذہین نظر آتا ہے۔" تایا جی کے کہتے ہی جی جی نے اپنی آنکھیں رگڑ دیں۔

"تایا جی پکی سڑک کی وجہ سے رستہ تھوڑا بدل گیا ہے پہلے تو اسٹیشن پر اترتے ہی لال حویلی نظر آجایا کرتی تھی اور آج تو ویسے بھی بچوں نے بھی نو وارد سمجھ کر ——"

ابھی میں بات مکمل کرنے والا ہی تھا کہ میری نظریں گیٹ سے سفید کاٹن کے سوٹ میں سندھی اجرک شانوں کے اطراف پھیلائے پیروں میں پشاوری چپل پہنے طوفانی انداز میں اندر داخل ہوتے اس لڑکے پر ٹھہر گئیں۔

"اوہ میرا شیر جوان پتر آیا؟" تایا جی پرجوش انداز میں اپنے تخت سے اچھلے تھے اور اچھل کر اٹھے تھے۔

"ہونہہ یہی باتیں اس کی عادتیں بگاڑتی ہیں۔" جی جی نے جل کر رخ موڑا تھا۔ فاروق کا بچہ ابھی بھی میری گود میں تھا۔ دونوں میاں بیوی مسکرا رہے تھے۔

"اوئے شافع پتر! اسے پہچان کون ہے یہ؟" تایا جی نے اپنا رخ روشن میری طرف موڑا تھا۔ میں جو فاروق کے بیٹے کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ چونک کر سیدھا ہوا اور حیرت سے میری آنکھوں کے بس پھٹنے کی کسر رہ گئی تھی۔

باب کٹ بال' کھڑکھڑاتے کلف دار کرتا شلوار میں پشاوری چپل پہنے کاندھوں پر سندھی اجرک ڈالے ایک خوب صورت لڑکی نما لڑکا وہی جس نے مجھے غلط راستہ بتا کر مجھے تیز دھوپ میں رج کے جھلسایا تھا۔ میرے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"اسے پہچانا نہیں میں... نے۔" میں بمشکل تمام بولا کیونکہ اس کی ہنسی مجھے چڑا رہی تھی۔

"یہ وہی ہے جسے آدھا آدھا دن کندھوں پر بٹھا کر گاؤں کی سیر کراتے تھے' اپنے ہاتھ سے روٹی کے لقمے بنا کر اس کے منہ میں ڈالتے تھے۔" تایا جی میری یادداشت کو کوستے ہوئے ناراض ناراض لہجے میں کہہ رہے تھے۔

"اوہ ہو اباجی! بندہ خطا کا پتلا ہے کیا ہوا جو میں انہیں یاد نہیں میں خود ہی بتا دیتا ہوں۔" وہ تایا جی کے سامنے سے اٹھ کر میرے پاس میرے سامنے آ بیٹھا۔

"ہائے مائی نیم از دل راجہ!" اس نے اپنا دودھیا ہاتھ مصافحہ کے لیے بڑھایا' میں نے اس کی جانب نگاہ اٹھا کے دیکھا تو ہٹانا بھول گیا۔ گہری کالی سیاہ انتہائی چمک دار پرشوق و ذہین آنکھیں' سورج کی حدت سے تپتا ہوا سرخ معصوم چہرہ میرے دل نے ایک بیٹ مس کی تھی۔

"دل ـــ دلنشیں! دلنشیں۔" میں خوشگوار حیرت میں گھرا تھا۔ "تم اتنی بڑی ہو گئیں' ارے تم تو چھوٹی سی ہوا کرتی تھیں۔" میں نے دونوں ہاتھوں کا پیالا بناتے ہوئے کہا تھا۔

"ارے بلی! کیا اب بھی بلیوں سے ڈرتی ہو؟" میں واقعی ـــ حیران ہوا تھا آس بھابھی شربت بنا کر لے آئی تھیں میں نے گلاس پکڑتے ہوئے پوچھا۔

"ارے شافع بھائی! آپ کو کیسے یاد ہو گا۔ تھی بھی تو تین سال کی جب آپ یہاں سے گئے تھے۔" اس نے مدد طلب نظروں سے تایا جی اور آس بھابھی کی طرف دیکھا تھا۔

"کس نے لا کر دیا تجھے یہ سوٹ! میں نے تو پہلے ہی بڑی مشکل سے تیرے سارے جوڑے نکال کر پھینکے تھے۔"

"ہائے سکینہ! تو تو میری دھی کے پیچھے ہی پڑ گئی ہے کیا ہوا جو اس نے یہ پہن لیا دیکھ تو کتنا سوہنا لگ رہا ہے میرا پتر؟" تایا جی نے بھرپور حمایت کی تھی۔

"ہاں! بگاڑیں اور بگاڑیں! میں تو اسے سمجھانے کا کوئی حق نہیں رکھتی ناں۔ دشمن جو ہوئی اس کی۔" وہ ناراضی سے گویا ہوئیں۔

"ارے جی جی! کیا ہوا ابھی بچی ہی تو ہے۔ پہننے دیں ناں اسے۔" آس بھابھی نے بھی اپنے حصے کی مداخلت کی۔

"اچھا! تو یہ تم نے ہی لا کر دیا ہے اسے ارے لڑکی ذات ہے لڑکی ہی رہنے دو خدا کے لیے! لیکن کوئی میری سنے بھی تو۔" وہ جلتی کڑھتی اٹھ کر چلی گئیں میں نے بڑی دلچسپی سے دلنشیں کے چہرے پر پھیلتے ہوئے سکون و اطمینان کے سائے دیکھے۔

"شافع پتر! تو حیران مت ہو! تیری جی جی تو ویسے بھی اس بے چاری کے اس انداز سے جینے سے خائف رہتی ہیں تو اپنی سنا۔ بلکہ ایسا کر' میرے دل راجہ سے باتیں کر۔ تجھے اندازہ ہو جائے گا میرا پتر کتنا ذہین اور سمجھ دار ہے ہمیشہ ملکوں کے بیٹوں کو کنچوں' گلی ڈنڈے اور کرکٹ میں ہرا کر آتا ہے۔" تایا جی بہت پیار بھرے مان سے مجھے اپنے بیٹے نما بیٹی دل راجہ کے متعلق انفارم کر رہے تھے اور میں مسکرا رہا تھا۔

"میں ذرا روٹی پانی کا انتظام دیکھ کر آتا ہوں۔" کہتے ساتھ ہی وہ وہاں سے اٹھ گئے تھے۔

"اچھا شافی بھائی! یہ بتائیے کہ آنی کیسی ہیں؟ وہ آپ کے ساتھ یہاں کیوں نہیں آئیں۔" میں جب سے یہاں آیا تھا۔ کسی نے اس تکلیف دہ موضوع کو نہیں چھیڑا تھا' ہاں صرف ڈیڈی کے پیار بھرے قصے وقفے وقفے سے تایا جی دہرا لیتے مگر اب اچانک اس چھٹانک بھر کی چھوکری نے ایسا سوال کر کے مجھے عجیب مشکل میں گرفتار کر دیا تھا۔ میں اسے اس سوال کا جواب دوں یا نہ دوں؟ لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ اگر اس نے ازراہ مروت میری ممی کا حال احوال پوچھا ہے تو اس کے پیچھے کسی تکلیف دہ یاد کا کوئی سرا نہیں بندھا وہ بارہ تیرہ سالہ لڑکی یقیناً ساری صورت حال سے ناواقف ہو گی ـــ میں جب سے یہاں آیا تھا ان لوگوں کی اتنی محبت و چاہت کو دیکھتے ہوئے برابر شرمندگی محسوس کر رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ اپنی ذات پر فخر و غرور بھی۔ مجھے اپنوں میں آکر ایک دم سے اپنی جڑیں بہت مضبوط محسوس ہوئی تھیں۔ حالانکہ ممانے مجھے پاکستان آنے سے بہت منع بھی کیا تھا۔

"آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا شافی بھائی!" مجھے خاموش دیکھ کر اس نے اپنا سوال دہرایا تھا۔

"شافع ـــ" شافع رضا نام ہے میرا... شافی نہیں۔" میں سمجھا اسے نام سننے میں کوئی غلط فہمی ہوئی ہے اسی لیے فوراً پیشتر تصحیح کو اپنا فرض سمجھا۔

"ہو گا! لیکن میں تو آپ کو شافی بھائی ہی کہوں گی چاہے آپ جو مرضی کہیں یا سمجھیں۔" اس نے لاپروائی سے اپنے کندھے اچکائے۔

"بدتمیز!"

"بدتمیز نہیں ہوں میں بس ذرا کانفیڈنٹ ہوں۔ اس لیے میرے بارے میں رائے قائم کرنے سے پہلے تھوڑا سوچے گا ضرور۔" جانے میرے چہرے پر ہی اتنا واضح لکھا تھا یا وہ دوسروں کے تاثرات محسوس کرنے میں اتنی ماہر تھی اس کی اس قدر درست قیاس آرائی پر میں چونکے بنا نہ رہ سکا تھا۔

☼ ☼ ☼

مجھے یہاں آئے آج چوتھا دن تھا۔ ہر روز کی طرح آج بھی میری آنکھ بی جی کے بڑبڑاہٹ بھرے کوفت زدہ جملوں سے کھلی تھی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تھا ہر روز کی طرح گھر میں پالی ہوئی مرغیوں، بکریوں اور کبوتروں وغیرہ کی شامت نہیں آئی تھی بلکہ تھوڑی سی مختلف اور پہلے سے ذرا زیادہ تیکھی تھی۔

میں جلدی سے اٹھا۔ منہ ہاتھ دھونے کے بعد کمرے سے نکلا تو ٹھنڈی ٹھنڈی باد صبا نے میرا استقبال پرزور انداز میں کیا میں نے لمبا سانس کھینچ کر فضا میں رچی بسی مٹی کی سوندھی خوشبو کو محسوس کرنا چاہا۔

"غضب خدا کا! یہ بال ہیں یا بیری کا درخت، دیکھو کس قدر روکھے اور کھردرے ہیں۔ کبھی جو انہیں تیل بھی لگانے کی زحمت کی ہو۔" صحن میں بچھے پلنگ پر دل راجہ کا سر گود میں رکھے وہ اس کے سر میں پوری تیل کی بوتل انڈیلنے کے بعد بھی مطمئن نہ تھیں اور مسلسل صلواتیں سنائے جا رہی تھیں کبھی جو اگر وہ کچھ بولنے کی زحمت کرتی تو زوردار دھمو کا اس کی کمر میں بھی جڑ دیتیں بے چاری دل راجہ بلبلا کر رہ جاتی۔

"ہک ہا ماڑی قسمت میری! اللہ نے تین بیٹے دیے تھے، سوچا ایک بیٹی ہوگی تو بڑھاپے میں میرا دکھ درد ونڈائے گی۔ مگر کیا خبر تھی کہ جسے منتوں مرادوں سے رب سوہنے سے مانگا تھا وہ یہ گل کھلائے گی۔ ارے تجھ سے تو اچھے میرے بیٹے ہیں، بڑھاپے کی اولاد وہ بھی سخت نانہجار۔"

میں ابھی تک برآمدے میں کھڑا ان کے مکالمے سن رہا تھا۔

"اب اگر تو مجھے ملکوں کے بیٹوں کے ساتھ کھیلتی ہوئی نظر آئی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔" دھمو کا پھر جڑتے ہوئے نصیحت کی گئی تھی۔

"غضب خدا کا بچے کا اتنا سا منہ نکل آیا تھا۔ پیلی آنکھیں نیلے ہونٹ اور پھٹے ہوئے سر کے ساتھ۔ ایک تو شکل ماشاء اللہ، اوپر سے تمہارا دیا گیا ماتھے پر گومڑ اور اس میں سے نکلتا خون، عجیب ہونق لگ رہا تھا بے چارا۔" بی جی کی اس بچے کے ساتھ ایسی ہمدردی پر میں فلک شگاف قہقہہ لگائے بغیر نہ رہ سکا۔

دفعتاً "دل راجہ نے... ایک تو میری سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ اسے دل راجہ کہوں یا دلنشین! اس نے میری طرف مڑ کر دیکھا۔ میں بڑے محرابی دروازے سے نکل کر ان کے قریب آیا اس نے مجھے دیکھا اور بائیں آنکھ ماری۔ میں جز بز ہو کر دل میں اسے ایک نیا خطاب دے چکا تھا۔

"بے حیا!" آٹھ ساڑھے آٹھ سال بڑا تھا میں اس سے۔

"ارے اٹھ گیا شافع پتر! آ یہاں میرے پاس آکر بیٹھ جا۔ میرے تیرے لیے میٹھی چاٹی کی لسی منگواتی ہوں۔" مجھے آتا دیکھ کر انہوں نے فوراً "میری طرف رخ موڑا تھا۔

"کیا ہوا بی جی! کیا کر دیا ہے اب دل راجہ نے کیوں ڈانٹ رہی ہیں اسے؟" میں نے جان بوجھ کر دل راجہ کی دکھتی رگ کو پکڑنا چاہا تھا مگر بے سود۔ وہ آنکھیں موندے سونے میں مصروف تھی۔ چہرے پر فرشتوں جیسا نور، در صدف جیسا چمکتا دمکتا رنگ و روپ۔ سلکی باب کٹ بال تیل لگنے کی وجہ سے پیچھے ہو کر چوڑے ماتھے کو اور واضح اور خوب صورتی بخش رہے تھے۔

"ہائے بیٹا! کیا بتاؤں تمہیں۔ میری تو کوئی سنتا ہی نہیں ہے۔ تمہارے تایا جی اور اس کے بھائیوں کے بے جا لاڈ پیار نے اسے لڑکی کے بجائے لڑکا بنا دیا ہے۔ ضدی، ہٹ دھرم، لڑاکا اور غصیلا میں تو تنگ ہوں اس سے۔ آج بھی بڑی مشکل سے پکڑ کر اپنے پاس بٹھایا ہے میرے پاس تو دو گھڑی ٹک کر بیٹھتی ہی نہیں بس آپ سے کبھی کبھار گپ شپ لگا لیتی ہے۔" لیکن اگلے ہی لمحے ان کی نگاہوں کی زد میں اس کا معصوم چہرہ تھا۔

"ہائے میری بچی! دیکھا کتنی معصوم ہے۔ آج بھی میری گود میں سر رکھتے ہی سو جاتی ہے میری دھی رانی میری زندگی۔ مجھے بہت عزیز ہے میری فرشتوں جیسی معصوم صورت دھی رانی!" وہ اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر نرمی سے تکیے پر سر رکھتے ہوئے بولیں۔ میں جتنا بھی حیران ہوتا کم تھا۔ ان کے بدلتے موڈ اور رویے پے۔

"تو بیٹھ میں تیرے لیے لسی لاتی ہوں۔ تیرا اباپ بھی بڑے شوق سے میرے ہاتھ سے بنی لسی پیتا تھا آج تو بھی پی کر دیکھ۔" یہ کہتے ساتھ اٹھ کر وہ وہاں سے کچن میں چلی گئیں۔

بی جی بھی کمال کی خاتون تھیں خود ہی اسے ڈانٹتیں اور خود ہی اس کی ہر غلطی کا جواز ڈھونڈ لیتیں میں نے رخ موڑ کر سوئی ہوئی دل راجہ کو ایک نظر دیکھا تھا۔

وہ جاگ رہی تھی اور میری طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

اب میری سمجھ میں اس کا بائیں آنکھ کا دبانا یاد آیا تھا وہ صرف مجھے دکھانا چاہتی تھی کہ بی جی کی گئی اتنی ساری عزت افزائی محض وقتی غبار کے طور پر ہے اور یہ حقیقت بھی تھی اب بھی اس کا مظاہرہ میں بخوبی دیکھ چکا تھا۔

میرے دل نے بے اختیار اسے ایک اور لقب سے نوازا تھا۔

"چالاک لومڑی!"

اب میری نظر میں وہ ایک ہٹ دھرم، ضدی، خود سر، چالاک اور بے حیائی کی حد تک بولڈ تھی۔ ان چار دنوں میں میری کی گئی آبزرویشن کے نتیجے میں اس کی یہ ساری خوبیاں سامنے آئی تھیں۔ ابھی نجانے آگے کیا ہونا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تمہارا اباپ میرا بہت اچھا دوست ہی نہیں بلکہ مجھے بالکل اپنے بھائیوں کی طرح سے عزیز تھا۔ تمہارے دادا دادی کا تو بچپن میں ہی انتقال ہو گیا تھا پھر میری بے جی اور اس کی سگی خالہ اسے یہاں لے آئیں۔ ابا جی چونکہ اس کے سگے چچا تھے اس لیے وہ انہیں بہت عزیز بھی تھا۔ تیرا اباپ تو لائق بھی بہت تھا شہر میں جا کر پڑھنے لگا میں تو شروع سے ہی پینڈو بندہ تھا یار میں نے تو زمین اراضی ہی سنبھالنی تھی تیرے باپ کی امانت آج بھی میرے پاس پڑی ہے پتر! بڑا بوجھ سینے پر دھرا محسوس کرتا ہوں۔

اپنی امانت واپس لے جا اور اپنی ماں کو دے دے اور اس سے کہنا کہ اپنا سارا غبار جو دل میں چھپا رکھا ہے نکال دے۔ آجائے واپس۔ اب ختم کر دے ضد جو اس نے ہم سے اور اس بے چارے سے لگائی تھی وہ تو اب اس دنیا میں بھی نہیں رہا۔"

میرے دل نے ہلکی سی سسکی لی تھی۔ دل میں آنسوؤں کی بارش کی نمی تھی تو آنکھیں دور کہیں وسعتوں میں کچھ تلاشتی تجزیے جان۔

"کاش تیری ماں ضد نہ کرتی اور آج میرا ویر یہاں زندہ و سلامت خوش و خرم رہتا اور نہیں تو میں اس مرے ہوئے کا چہرہ ہی دیکھ لیتا۔" وہ اپنے آنسو صاف کر رہے تھے۔ آج ہی تو تایا جی کے ساتھ اور کچھ روف و سعود کے بھرپور اصرار پر بھی میں رقبے پر آیا تھا۔

کھلی فضا، پرندوں کی چہکار، ندی میں بہتا پانی سب کچھ اتنا دلفریب تھا کہ میں کائنات کے اس حسین منظر کو دیکھتے ہوئے مبہوت ہوئے جا رہا تھا۔

"بس کریں ابا جی! گزری تکلیف دہ باتوں کو یاد کرنے کا بھلا کیا فائدہ؟" روف نے ناصحانہ انداز میں انہیں سمجھایا تھا۔

"تو ٹھیک کہتا ہے پتر! بس میں بھی ذرا جذباتی ہو گیا تھا۔ تو ایسا کر شافع کو پورا گاؤں دکھالا اور یہ مسعود کدھر گیا ہے؟"

"ٹھہر گیا ہے ابا جی کھاد لینے کے لیے' مکئی کی فصل بس کٹنے ہی والی ہے پھر زمین کو دوبارہ کھیتی کے قابل بھی تو بنانا ہے۔"

"شافی بھائی کو تو گاؤں کی سیر آپ کا یہ شیر دل جواں پتر کرائے گا۔ ابا جی! کیوں شافی بھائی۔"

وہ ہمیشہ مجھے ایسے موقع پر لاجواب کرتی تھی جب میں اسے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں دل ہی دل میں پچھلے سارے القابات حرف بہ حرف دہرا رہا تھا۔

"اوئے ہاں میرا پتر جائے گا وہاں! اور ہاں خبردار اپنی ماں کو نہ پتا لگنے دینا۔ ایویں خوامخواہ۔ ڈانٹے گی تمہیں بھی اور مجھے بھی۔" کہتے ہوئے انہوں نے خود ہی ہلکا سا قہقہہ لگا کر اپنی کمزوری کا اعتراف کیا تھا۔

ہم سب کے لبوں پر بھی مسکراہٹ کھیلنے لگی تھی۔

"تم اتنی ضدی کیوں ہو دل راجہ!"

"یہ آپ سے کس نے کہا؟" اس نے اچنبھے سے پوچھا۔

"میں نے خود محسوس کیا ہے۔"

ہم دونوں اس وقت ایک باغ میں داخل ہو رہے تھے۔ جو کینو' امرود' لیچی' کیلا اور املی اور آم کے درختوں سے بھرا نظر آ رہا تھا۔

"یہ ملکوں کا باغ ہے۔ یہاں کا مالی بابا بہت سخت ہے۔ ہم اکثر چوری کر کے پھل کھاتے ہیں اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ اس نے کبھی بھی ہمیں اپنے ہاتھ سے ان پھلوں کو توڑتے ہوئے نہیں دیکھا البتہ کھاتے ضرور دیکھا ہے۔" وہ ہنسی۔

"تم میری بات کو نظر انداز کیوں کر رہی ہو!" مجھے غصہ ہی تو آ گیا تھا وہ بجائے میری بات کا جواب دینے کے الٹا باغ کی خصوصیت اور اپنے چوری کیے ہوئے پھلوں کی وارداتیں سنانے میں مگن تھی۔

"دل راجہ بڑے سے بڑے امتحان میں کبھی نہیں ہاری' کبھی نگاہ نہیں چرائی کسی بات سے۔ کسی کے آگے جھکی نہیں تو پھر یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ میں آپ کی بات کو نظر انداز کر رہی ہوں؟"

"مجھے تمہارے انداز سے ایسا لگا جیسے تم جان بوجھ کر میری بات کا جواب نہیں دینا چاہتیں۔" اب کی بار میں ذرا نرم لہجے میں بولا تھا۔

"ہاں! میں واقعی۔ آپ کے سوال کا جواب نہیں دینا چاہتی تھی۔" وہ اب نہر کے کنارے بنے سیمنٹ کے تھڑے پر بیٹھ کر پانی میں ٹانگیں لٹکا چکی تھی۔

"کیوں؟"

"اب بھلا بندہ فضول سوالوں کے کیا جواب دے؟"

"تو تمہارے خیال میں میں فضول ہوں؟" اب کی بار میں بھی تنک کر بولا۔

"یہ میں نے کب کہا۔" وہ پاؤں پانی میں ہولے ہولے جھلا رہی تھی۔ دودھیا' صاف شفاف و بے داغ پنڈلیاں سورج کی روشنی پڑنے سے چاندی کی طرح چمک رہی تھیں۔ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی اس نے تو میری بات کو فضول کہا تھا نا کہ مجھے؟

"تم ہو کیا آخر؟" میں جھلا کر بولا۔

"جی جی کی نظر میں یا آپ کی نظر میں؟" اس کے اطمینان میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔

"دونوں کی۔" میں بے اختیار بولا تھا۔

"اگر بات جی جی کی کروں تو ان کی نظر میں نا ہنجار بڑھاپے کی اولاد' جھگڑالو' منہ پھٹ' بدلحاظ' ہٹ دھرم اور ضدی ہونے کے ساتھ ساتھ کام چور بھی ہوں اور ——

اگر آپ کی نظر کے آئینے میں اپنا عکس دیکھوں تو انتہائی بدتمیز' غیر مہذب' اوور اسمارٹ اور بدلحاظ اپنے آپ کو پاؤں گی۔"

میں اس کی اس قدر صحیح قیاس آرائی پر پہلے دن کی طرح حیران تھا۔ وہ ہر نئے دن کے ساتھ مجھے حیران کرنے پر تلی تھی۔ میں نے اسے ایک اور لقب سے نوازا تھا۔

"ذہین —— نہیں ذہین اور خوب صورت!" میں

ہولے سے دل میں ہنسا ہر گزرتا دن مجھے نہ صرف حیران کر رہا تھا بلکہ پریشان بھی کر رہا تھا۔ میری سمجھ سے بالاتر تھا کہ آخر یہ لڑکی تھی کیا؟ بہت ہی پیچیدہ ذات تھی اس کی۔

میرے اندر یکایک اس لڑکی کو جاننے کی خواہش پیدا ہوئی تھی۔

"ایک تو آپ باہر والوں کے ساتھ یہ بڑا پرابلم ہے کہ ہر قدم پھونک پھونک کر اٹھاتے ہیں ہر کام سوچ سمجھ کر کرتے ہیں اور بعض دفعہ تو اتنا سوچتے ہیں کہ گاڑی نکل جاتی ہے۔"

"اور تم پاکستانی! اپنے بارے میں کیا خیال ہے تم پاکستانیوں کا؟" میں جو اپنی ہی سوچوں میں غلطاں تھا اس کی بات سن کر میں چونک کر واپس حال میں پہنچا تھا۔

"ہم پاکستانیوں جیسا تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا' جو دل چاہتا ہے پہلے وہ کرتے ہیں بعد میں سوچ لیتے ہیں۔"

"یہ بات تو تم لوگوں کی ماننی ہی پڑے گی کیونکہ دل سے سوچنا اور اس پر عمل بھی کرنا اور بغیر پچھتائے اس پر ڈٹے رہنا واقعی —— تم سب کا کام ہے اور بے چارے' ہم باہر کے لوگ دماغ کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے دل کا نقصان کر جاتے ہیں۔" میں بھی اس کا مذاق سمجھ کر اس سے ہلکا پھلکا مذاق کرنے میں مگن تھا۔

تب ہی مسجد سے اذان کی آواز پر اس نے منہ پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اذان ختم ہوئی تو اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔ میں حیرت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

آنکھیں بند کیے ہاتھ اٹھائے نازک عنابی ہولے سے ہلتے ہونٹ' ہوا کے شریر جھونکوں کی چھیڑ خانی سے خائف چہرے پر جھولتی آوارہ لٹیں معصوم چہرہ پر چھایا بلا کا سکون' صاف و شفاف بے داغ چاندنی روپ اور چہرے پر چھائی الوہی چمک اس کو اس وقت بے پناہ حسین بنا رہا تھا میں کئی لمحے مبہوت سا اسے تکے گیا تھا۔

ایسی بے داغ مکمل اور بھرپور خوب صورتی میں نے کبھی بھی نہیں دیکھی تھی۔

"دل نشین؟" میرے دل نے ہولے سے اس کو پکارا' ہاں یہ وہی تھی دل نشین جسے میں آدھا آدھا دن کندھوں پر بٹھائے پورے گاؤں میں گھماتا تھا۔ جسے اپنے ہاتھ سے چوری بنا کر کھلاتا تھا۔ چاندنی رات میں اس کی خاطر اپنی نیند کی پروانہ کرتے ہوئے بھی اسے آدھی رات تک باہر گھماتا پھراتا تایا جان' ابا جی اور ممی کی ناراضی کے ڈر سے اسے چھپ چھپ کر گولے گنڈے کھلاتا تھا۔ وہ ضدی' پیار بھری معصوم مسکان اور توتلے لہجے میں کہنے والی تانی بھابھی' اکا بھائی کہنے والی اس لمحے وہی دلنشین تھی جس کی معصوم کلکاریوں نے مجھے ایک عرصے تک نیویارک ایک پردیس شہر میں بھی بے چین رکھا تھا۔

لاشعوری طور پر میں اس اکا بھائی کہنے والی دلنشین کو یہاں ڈھونڈنے آیا تھا۔ مگر گزرے وقت کی گرد اڑاتی دھول نے جیسے اس سارے منظر کو ان کرداروں کو گدلا کر دیا تھا۔ سب کچھ ویسا ہونے کے باوجود ویسا نہیں رہا تھا۔ جس دلنشین سے مجھے پیار تھا' وہ یہاں کہیں دکھائی نہ دی تھی اور جس دل راجہ سے میں متعارف ہوا تھا اس تک پہنچنا مشکل ہی نہیں بلکہ کسی حد تک نا ممکن بھی تھا۔

☼ ☼ ☼

مجھے یہاں پندرہ دن ہو چکے تھے۔ ہر دن ایسا پرمسرت اور خوشگوار اور مصروف گزرتا تھا کہ مجھے ان گزرتے دنوں کا احساس ہی نہیں ہو سکا تھا۔ ہر روز کوئی نہ کوئی یا تو ملنے کے لیے آجاتا یا فاروق مسعود یا روئف کے ساتھ میں ان کے دوستوں کے ہاں کسی نہ کسی دعوت میں چلا جاتا یہاں کے لوگ بہت مہمان نواز تھے۔ اسی لیے خاندان کے ہر بندے کی خواہش تھی کہ میں کم از کم ایک وقت تو ان کے ساتھ کھانا ضرور کھاؤں۔ میں یہاں گاؤں میں بہت سے بچوں لڑکوں اور لڑکیوں سے بھی ملا تھا۔ شرمیلی شرمیلی سی لڑکیاں جو مجھے اپنی جانب دیکھتے پا کر ہی دوپٹے سے منہ

چھپا کر بھاگ جاتی تھیں اور رہے لڑکے تو وہ مجھے جیسے کوئی آسمانی بلا سمجھ کر بات کرنے سے بھی پرہیز کرتے تھے۔ ان سب کو دیکھتے ہوئے میں ہمیشہ خود کو یہ بات سوچنے پر مجبور پاتا کہ آخر دل راجہ بھی تو یہیں پلی بڑھی تھی مگر وہ تو بلا کی پراعتماد لڑکی تھی۔ کیا اس کی کمپنی کا بھی ان لڑکیوں و لڑکوں پر اثر نہیں ہوتا تھا۔ اگر نہیں تو کیوں؟

اس کا بلا کا پراعتماد انداز' دو ٹوک لہجہ' بے لچک و بے ریا۔ ناں کر کے ہاں میں کسی صورت نہ بدلنے والا اگرچہ مجھے بعض دفعہ اس کا دو ٹوک لہجہ ناگوار گزرتا تھا مگر اس حقیقت سے انکار بھی ناممکن تھا۔ وہ ضدی' ہٹ دھرم بدتمیز و بدتہذیب ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی ذہین پراعتماد اور انتہائی پرکشش اور خوب صورت بھی تھی میرے دل نے چپکے سے اس کے حسن کو شرارتی و معصوم حسن کے لقب سے نوازا تھا۔

میں آس بھابھی کے پاس باہر محرابی برآمدے میں بچھے تخت پر براجمان تھا۔ حذیفہ حسب معمول ان کی گود میں تھا اور وہ اسے دلیہ کھلانے میں بری طرح سے ہلکان نظر آ رہی تھیں۔ تایا جی اور رؤف و مسعود حسب معمول زمینوں پر تھے اور فاروق شاید شہر کسی کام سے گیا تھا۔ البتہ جی جی ملکوں کی حویلی میں اسی لڑکے کی عیادت کے لیے گئی تھیں جسے کرکٹ کھیلتے ہوئے دل راجہ نے بے ایمانی کرتے دیکھ کر سزا دی تھی اور اس کا برا حال کر دیا تھا۔

"بھابھی! دل راجہ کو آپ کیوں نہیں سمجھاتیں ذہنی طور پر تو وہ آپ کے بہت قریب ہے۔" میں جو اپنی ہی سوچ میں مگن تھا' نجانے کس خیال کے تحت ان سے یہ سوال کر بیٹھا تھا۔ جواباً "انہوں نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے انہیں میری دماغی حالت پر شبہ ہو۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں شافع بھائی! وہ تو ہمارے گھر کی بلبل ہے اگر وہ ہی خاموش ہو جائے تو ہمارے گھر میں تو الو بولیں۔ نہ صرف ہمارے بلکہ پورے گاؤں کی رونق تو اسی کے دم سے ہے۔ کبھی جو اگر یہ بیمار پڑ جائے ناں تو پورا گاؤں عیادت کرنے کے لیے آتا ہے اس کی' جی جی کہ وہ لوگ بھی جنہیں عام حالات میں ان سے بہت سی شکایات ہوتی ہیں۔"

"نہیں اصل میں جی جی اس لڑکے کی وجہ سے اسے کافی ڈانٹ رہی تھیں اس لیے میں نے سوچا کہ آپ اسے سمجھائیں۔" الفاظ کہیں حلق میں ہی اٹکنے لگے تھے اس سے ہر دم خائف نظر آنے والے اس کی برائی نہیں سن سکتے تھے اور یہاں تو تھیں بھی آس بھابھی جن کی وہ چہیتی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں خود کو کوسا تھا۔ تب ہی وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔

"جس لڑکے کی آپ بات کر رہے ہیں ناں۔ ٹھیک دو دن بعد ٹھیک ہوتے ہی وہ ہی اس کے ساتھ کھیلنے کے لیے آئے گا بلکہ اس کی ناراضی ختم کرنے کے لیے کرکٹ کا ایک زبردست سا میچ بھی رکھے گا اور اس سے اپنی غلطی کی معافی بھی مانگے گا۔

دراصل شافع بھائی! دل راجہ ناحق کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتی! بہت ہی نرم دل اور حساس لڑکی ہے وہ۔ بس بے ایمانی' دھوکا اور جھوٹ برداشت نہیں کر سکتی۔ اسے ہمیشہ سبق ہی اخلاقیات' رواداری کا دیا گیا ہے تو پھر خود ہی سوچیں کہ وہ کیسے اپنے ساتھ فراڈ' جھوٹ بے ایمانی برداشت کرے۔ کچھ وہ جذباتی بھی بہت ہے۔ اپنے دلی جذبات کا اظہار فوری کر دیتی ہے چاہے اچھے ہوں یا برے؟" انہوں نے تفصیل سے بتایا۔

"نہیں تو نتیجہ حسب معمول' حسب توقع ویسا ہی ہوتا ہو گا جیسا ملکوں کے لڑکے کے ساتھ ہوا ہے۔ ہے ناں؟" جواباً "میں بھی کچھ دیر پہلے والی بات کا اثر ضائع کرنے کی غرض سے ہنستے ہوئے بولا۔

"ویسے اس وقت موصوف کدھر براجمان ہیں؟"

"اپنے کمرے میں ہے! شاید جی جی نے اسے گھر سے باہر نکلنے سے منع کیا ہے۔ اس لیے احتجاجاً" کمرے میں مقید ہوگی۔ تم دیکھ لو جا کر۔"

میں جو اٹھنے ہی والا تھا دفعتاً" آنے والی زوردار پکار نے وہیں میرے قدم جکڑ لیے تھے۔

"ارے بھئی! آسیہ' سکینہ کوئی گھر میں بھی ہے یا نہیں؟" شٹل کاک برقعے میں ایک ساٹھ پینسٹھ سالہ

عورت پان چباتے ہوئے کمر پر دونوں ہاتھ رکھے اپنی لومڑ جیسی چمکیلی آنکھوں سے تک رہی تھی ایسے جیسے نظروں ہی نظروں میں میرا ایکسرے کر رہی ہو۔

"ارے بھئی! میں نے سوچا کہ اتنے دنوں سے دل راجہ پتر نے چکر نہیں لگایا۔ چل کر خیر خیریت معلوم کر آؤں کدھر ہے وہ؟ طبیعت تو ٹھیک ہے ناں اس کی؟" تخت پر برقع رکھتے ہوئے وہ بلا تکان بولے جا رہی تھیں۔

"جی بوبو! سب خیریت ہی ہے! بس آج کل گرمی بہت ہے ناں اس لیے آپ کے گھر کا چکر نہیں لگا پائی ورنہ تو آپ کو پتا ہے کہ کتنا چاہتی ہے وہ آپ کو؟"

"ہاں واقعی پتر! میرا بڑا خیال رکھتی ہے وہ۔ ہے کدھر وہ' بلاؤ تو سہی! اللہ اس کے نصیب اچھے کرے پچھلے دنوں میرے پاؤں میں جب چوٹ آئی تھی ناں تو روز آ کر اپنے ہاتھوں سے ڈاکٹر کی دی ہوئی ٹوپ (ٹیوب) مل کر میری مالش کر کے پٹی باندھتی تھی اور روٹی پانی کا بھی انتظام کر کے آتی تھی۔" آس بھابھی خراج کے طور پر اس کی تعریفیں سمیٹ رہی تھیں اور میں حیرتوں کے سمندر میں غرق تھا۔

کیا دل راجہ جیسی خود پسند لڑکی اپنے علاوہ کسی کو قابل توجہ گردانتی تھی کہ دوسروں کی خدمت کرے۔ ان کا خیال رکھے۔ اس کی ذات کا یہ دوسرا رخ تھا۔ جس سے میں پہلے واقف نہیں تھا۔ اگر ایسا تھا تو یقیناً" بہت خوب صورت رخ تھا۔ مجھے یاد آیا دل راجہ نے کہا تھا۔

"کچھ لوگ یکدم اپنا آپ دوسروں پر واضح کرنا پسند نہیں کرتے دھیرے دھیرے وہ اپنی شخصیت کے پہلو سامنے لاتے ہیں۔ دھیرے دھیرے نظر آنے والے واضح اور روشن پہلو بہت گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں لیکن یک لخت نظر آنے والی حقیقت اپنا اثر اس شاک سے نکلنے کے ساتھ ہی ختم کر ڈالتی ہے۔"

"تم باتیں بہت بڑی بڑی کرتی ہو حالانکہ عمر تو تمہاری بہت چھوٹی ہے دل راجہ!" اس کی اتنی بڑی بڑی باتیں مجھے ہمیشہ حیران کیا کرتی تھیں۔ وہ ایک حیرت انگیز لڑکی تھی۔

"شعور آنے کا تعلق کبھی بھی طبعی عمر سے نہیں جڑ سکتا۔ یہ کبھی کبھی بہت بچپن میں آ جاتا ہے یا پھر عمر گزرنے کے باوجود بھی انسان اس کو حاصل نہیں کر پاتا۔"

اور اب ان خاتون کی باتیں سن کر میں واقعی دل راجہ سے متاثر ہوا تھا اور یہ پہلا موقع تھا جب میں نے دل راجہ کے متعلق مثبت رائے قائم کی تھی۔ لاشعوری طور پر ہی سہی لیکن اپنی کھوئی ہوئی دلنشین کا روپ دل راجہ میں دیکھ کر مجھے اچھا لگا تھا۔

"تو کیا یہ سب تم پڑھتی ہو؟"

"ہاں! لیکن آپ کو کیوں حیرت ہو رہی ہے؟" خاصے تیکھے انداز میں اس نے سوال کے جواب میں سوال کیا تھا۔ میرا منہ حلق تک کڑوا ہو گیا تھا تھوڑی دیر پہلے والی سوچ ہوا ہو چکی تھی۔

"مجھے اعتراض کیا ہونا ہے میں تو صرف اس لیے پوچھ رہا تھا کہ یہ لٹریچر اچھے بھلے بندے کی سمجھ میں مشکل سے آتا ہے اور تم تو پھر۔۔۔" میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا تھا اسے جلانے اور تپانے کے لیے۔

"کیا تم تو پھر؟ آپ باہر رہنے والے کیا سمجھتے ہیں ہم لوگ جو گاؤں میں رہتے ہیں۔ صرف کھانا اور سونا ہی جانتے ہیں ہم لوگ کیا لٹریچر' آرٹ' کلچر سے ناواقف ہیں۔ ہاں! جواب دیجیے! کبھی آپ نے کسی گاؤں کے لڑکے اور لڑکی سے اس موضوع پر بات بھی کر کے دیکھی ہے۔ کبھی آپ نے ان سب سے یہ بھی پوچھا ہے کہ وہ وارث شاہ' بابا فرید' بابا بلھے شاہ کے علاوہ کس کس کو پڑھ چکے ہیں۔ کبھی آپ نے پوچھا ہے کہ تم لوگوں نے کبھی —— ورڈزورتھ' غالب' میر تقی میر' اقبال' فیض' فراز' امجد اسلام امجد' احسان دانش اور جون ایلیاء کو پڑھا ہے۔ اگر پوچھ لیتے ناں تو مسٹر شافع رضا اس غلط فہمی سے تو ضرور چھٹکارا پا لیتے۔" بولتے بولتے وہ ہانپنے لگی تھی۔ میں نے اتنے دنوں میں

اسے پہلی دفعہ اتنے غصے میں بولتے دیکھا تھا۔

مجھے خاموش دیکھ کر وہ ۔۔۔ میرا ہاتھ پکڑ کر تقریباً کھینچتے ہوئے بیڈ کے ساتھ بنے ریک کے پاس لے آئی ریک میں ترتیب سے رکھی ہوئی کتابیں اب وہ ایک جھٹکے سے نکال نکال کر پھینک رہی تھی۔

"یہ ۔۔۔ یہ دیکھیں!" اس کے ہاتھ میں تزک جہانگیری تھی۔

"کیا آپ اسے پڑھ چکے ہیں؟ اور اسے" اب اس کے ہاتھ میں میں نے ہٹلر کی سوانح حیات دیکھی تھی۔

"یہ سب میں نے حفظ کر رکھی ہیں میں لکھے کے ہزارویں حصے میں بتا سکتی ہوں کہ ان کتابوں کے کون سے صفحے پر کیا بات لکھی ہے اور یہ ۔ ناول دیکھ رہے ہیں آپ؟ یہ ٹالسٹائی کا وہ پہلا ناول ہے جسے اس نے سات مرتبہ لکھا تھا اور اس کے بعد کہیں جا کر سے پذیرائی ملی تھی۔ کون کون سے واقعات اور جملے اس نے کتنی مشکل اور کتنی تکلیف دہ حالت میں لکھے ہیں وہ بھی آپ کو بتا سکتی ہوں اور یہ راجہ گدھ بانو قدسیہ کا سب سے مقبول ناول ہے۔ مراۃ العروس مولوی نذیر احمد کی تصنیف اردو کا پہلا ناول۔ جس سے جانے کتنی ہی ماؤں بہنوں نے سبق حاصل کر کے اپنی زندگیاں سنواریں۔"

میں نے تو اپنی طرف سے تیلی لگائی تھی کیا خبر تھی بغیر تیل کے آگ بھڑک اٹھے گی۔ مگر آج مجھے اس کی باتیں بری نہیں لگی تھیں ہمیں واقعی ۔۔۔ کسی بھی شخص کو ڈی گریڈ کرنے کا کوئی حق نہیں بنتا! ویسے یہ بھی سچ تھا کہ ان میں سے بیشتر کتابیں میں نے بھی نہیں پڑھی تھیں۔

"سوری! میں تو صرف مذاق کر رہا تھا یار! صرف تمہیں جلانے اور چڑانے کے لیے۔ کیا خبر تھی کہ تم واقعی میں برا مان جاؤ گی اچھا اب اپنا موڈ ٹھیک کر لو اور باہر چلو میرے ساتھ!" میں نے نرمی سے کہتے ہوئے اس کے ماتھے پر آئے بالوں کو ہٹایا تھا۔ جواباً اس نے کینہ توز نظروں سے مجھے گھورتے ہوئے میرا ہاتھ جھٹکا تھا۔

"ہم پینڈو لوگ آپ جیسے لوگوں کے ساتھ سوٹ نہیں کرتے مسٹر شافع رضا! بہتر یہی ہے کہ اپنے اسٹینڈرڈ کے لوگوں سے میل جول بڑھائیے۔"

"اسٹینڈرڈ تو واقعی میں میرا تم لوگ نہیں ہو دل! جانتی ہو کیوں؟ اس لیے کیونکہ تم لوگ مجھ سے ہزار درجے باظرف اور بڑے دل کے ہو، ذہین ہو اتنے پڑھے لکھے اور ذہین لوگوں میں میں خود کو بہت کمزور، کم تر اور بے بس پاتا ہوں۔" میں خود بھی نہیں جانتا کہ میرے منہ سے یہ الفاظ کیسے نکلے تھے۔

"فرینڈز!" میں نے اپنی چوڑی ہتھیلی والا ہاتھ اس کے سامنے کر دیا تھا۔

اس کی گہری چمک دار ذہین آنکھوں میں تحیر تھا۔ وہ اپنا مرمریں دودھیا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے چکی تھی۔ میں نے بھی جلدی سے اسے کسی قیمتی چیز کی طرح ۔۔ تھام لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ سامنے جو چارپائی پر بیٹھا حقہ پی رہا ہے ناں؟ یہ ملک عمران ہے ملک جی کے ڈر سے چھپ چھپ کر حقہ پیتا ہے اور سگریٹ بھی۔ کئی دفعہ میں اسے رنگے ہاتھوں شاہنواز انکل کے سامنے پکڑوا چکی ہوں مگر یہ ایک نمبر ڈھیٹ مان کے ہی نہیں دے رہا۔ حالانکہ یہ نہیں جانتا کہ ایک سگریٹ میں 30,000 سے زائد جراثیم ہوتے ہیں اور 99% چانسز ہوتے ہیں کہ جگر کی پھیپھڑوں کی یعنی ٹی بی کی بیماری ہونے کے، مگر فیشن کے نام پر زندگی خراب کرنے کا شوق جو چرایا ہے۔" وہ نخوت سے کہتے ہوئے باغ میں داخل ہونے لگی میں ایک روبوٹ کی طرح اس کے پیچھے تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس کی کھٹی میٹھی باتوں پر برابر مسکرا رہا تھا اور روبوٹ مسکرایا نہیں کرتے۔

"تم اپنا جی کیوں جلاتی ہو دل! اپنے کیے کا ذمہ دار ہر شخص خود ہوتا ہے۔" وہ چلتے چلتے یکدم پیچھے مڑی تھی حیران نظروں سے تکتی ہوئی مجھے کسی غلطی کا فوراً احساس دلا گئی تھی۔

"ہم پینڈو لوگ یوں کسی کو گہری کھائی یا اندھے کنویں میں گرتے دیکھ کر خاموش نہیں رہ سکتے۔ ہمارا فرض ہے کہ انہیں تباہ ہونے سے بچائیں انہیں غلط اور صحیح کا پتا بتائیں۔"

یا تو میں بہت بے وقوف تھا یا وہ حد سے زیادہ ذہین۔ جو بھی تھا وہ کم سے کم میرے لیے ہرگز اچھا نہیں تھا۔ میں چوبیس سالہ نوجوان جو ایک فارن یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کر چکا تھا اور اب امریکا کی ایک بہت بڑی یونیورسٹی میں بار ایٹ لاء کی ڈگری کے لیے اپلائی بھی کر چکا تھا۔ اس چھوٹی سی ۔۔ لڑکی سے نہیں جیت سکتا۔

"کیسے ہو عمر ملک! یہاں اس وقت باغ میں کیا کر رہے ہو جبکہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تمہیں تو غالباً درختوں کے نیچے بیٹھنے سے الرجی تھی ناں؟" عمر ملک حقہ پیتے ہوئے یوں اچھلا تھا جیسے کسی بچھو نے کاٹ لیا ہو، حقہ ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے کچی زمین پر لگی اکا دکا گھاس پر الٹ گیا تھا۔ اس کے چہرے پر اڑتی ہوائیاں ماتھے پہ پھوٹتا خوف اور سراسیمگی کا پسینہ، صورت حال کو سمجھنے کے لیے کافی تھا۔ میں نے بے اختیار اپنی مسکراہٹ چھپانے کے لیے رخ پھیرا تھا۔

"کچی تھانیدارنی لگ رہی ہو مگر پھر بھی یہی کہوں گا تم ہر روپ میں ہی ایسا جچتی ہو گویا بنی ہی اسی کے لیے ہو۔" عمر ملک اب اپنی پہلی کیفیت پر قابو پا چکا تھا تب ہی ہنا بنا "مسکہ لگاتے ہوئے بولا تھا۔

"مسکہ لگانے میں بھی اناڑی ہو دوست! بالکل ویسے ہی جس طرح کرکٹ اور والی بال میں بے ایمانی کرنے میں چہ چہ بہت افسوس ہو رہا ہے مجھے اب یہ کہتے ہوئے کہ اب کی بار شاہ نواز چاچا کے بجائے تمہاری پھینٹی میں لگاؤں گی۔"

"نن نہیں دل راجہ یار! ہم تو دوست ہیں اور پھر تمہیں یہ زیب تو نہیں دیتا ناں؟" وہ بے چارہ ہکلا رہا تھا اور میں اور دل راجہ برابر اس کی حالت سے حظ اٹھا رہے تھے۔

میں حیران تھا اچھا خاصا لڑکا اپنے سے عمر میں کہیں چھوٹی نظر آنے والی لڑکی سے یوں ڈر رہا تھا جیسے بچہ ماسٹر جی کے ہاتھ میں ڈنڈا دیکھ کر خوف زدہ ہوتا ہے۔

"میری عزت کا سوال ہے دل!" نہایت آہستگی سے دائیں جانب دونوں ہاتھ موڑ کر اس نے ہاتھ جوڑے تھے تاکہ دل راجہ کے علاوہ کوئی دیکھ نہ سکے مگر مجھ سے اس کی یہ حرکت مخفی نہ رہ سکی تھی۔

"تمہاری کوئی عزت بھی ہے عمر!" وہ اچنبھے سے پھر بولی۔

"میری نہیں تو کم سے کم اپنے امریکا پلٹ کزن کا ہی کچھ لحاظ کر لو۔ کیا سوچے گا وہ تمہارے بارے میں؟" وہ روہانسا ہو کر بولا۔

"میرے نہیں تمہارے بارے میں۔" میں جو کافی دیر سے ان دونوں کی گفتگو سن رہا تھا اب کی بار بولنے پر مجبور ہو گیا۔

"معاف کر دو دل! بے چارے کی عزت کا سوال ہے؟" وہ کھسیانا سا ہنس دیا۔

"چلو! معاف کیا تم بھی کیا یاد کرو گے کس سخی دل لڑکی سے پالا پڑا ہے۔" وہ گردن اکڑائے فخر سے فرضی کالر جھاڑتے ہوئے بولی اور آگے بڑھ کر مزارعوں کو چند ہدایات دینے لگی۔ میں اور عمر واپس چارپائی پر بیٹھ چکے تھے۔

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔" مسکراہٹ کا تبادلہ کرتے ہوئے عمر نے کہا۔

"مجھے بھی ۔ شکریہ!" میں نے بھی فرض نبھایا اور مسکرا دیا۔

"آپ امریکا میں کس جگہ رہتے ہیں۔"

"لاس اینجلس!"

جانے دل راجہ کب پیچھے آ کر کھڑی ہو گئی تھی میرے بولنے سے پہلے ہی بول پڑی میں دل ہی دل میں اس کی غلط بیانی پر حیران تھا مگر اگلے چند لمحوں میں میری

حیرانی ہوا ہو چکی تھی۔
"لاس اینجلس او مائی گاڈ۔ لاس اینجلس میں تو ہالی وڈ ہے اور ہالی وڈ میں انجلینا جولی ہاؤ لونگ اینڈ امیزنگ۔" عمر ایک دفعہ پھر چارپائی سے اچھل رہا تھا۔ قریب تھا کہ وہ نیچے گر پڑتا۔ اب میری سمجھ میں دل راجہ کی غلط بیانی کی وجہ آگئی تھی۔
"تم سے کس نے کہا کہ یہ لاس اینجلس میں رہتے ہیں۔" دل راجہ تنک کر بولی تھی۔
"ابھی تم نے خود ہی تو کہا ہے۔" وہ نا سمجھی سے بولا۔

"میں نے کب کہا؟ بھئی میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ لاس اینجلس عمر اور میری فیورٹ جگہ ہے کیونکہ اس شہر میں میری بھابھی اور عمر کی ہونے والی بیوی انجلینا جولی رہتی ہے۔" پھر وہ میرے طرف مڑتے ہوئے بولی۔
"پلیز شانی بھائی! آپ رشتہ ڈالیے نا! انجلینا سے کہئے بریڈ پٹ کو چھوڑ دے۔ قسم سے عمر لاکھوں نہیں تو ہزاروں زن مریدوں سے اچھا زن مرید ثابت ہو گا۔"
اب مجھ سے اپنی مسکراہٹ چھپانا دو بھر ہو گیا تھا۔ اور عمر بھی کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے ہمارے ساتھ شامل ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

"اب اگر اتنے سالوں بعد چکر لگایا ہی ہے تو کچھ عرصہ تو رک جاتے بیٹا! ابھی تو جی بھر کے دیکھا ہی نہیں آنکھوں کی پیاس ہی نہیں بجھی بیٹا! اور تم ابھی سے چل دیے! کچھ دیر تو رک جاتے۔" جی جی اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے مجھ سے کہہ رہی تھیں اور میرا دل ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھتے ہوئے کٹ رہا تھا۔
"میں جلد لوٹ کر آؤں گا جی جی! آپ سب کے پاس میں مما کو بھی لے کر آؤں گا۔" میں نے انہیں تسلی دی حالانکہ جانتا تھا کہ مما کسی صورت واپس پاکستان نہیں آئیں گی۔

"نہیں پتر! جھوٹی تسلیاں مت دے۔ وہ نہیں آئے گی' وہ سمجھتی ہے کہ اس کی زندگی تباہ ہم نے کی ہے ہم نے تیرے باپ کو تیری ماں کے خلاف بھڑکایا تھا۔ پر پتر تو ہی بتا کیا تیرا باپ خود بچہ تھا کیا' وہ خود صحیح غلط اچھے برے کی پہچان نہیں رکھتا تھا۔"
"بس کر سکینہ! بس کر۔ کیوں اس بچے کو پریشان کرتی ہے۔ بھلا اس میں بے چارے کا کیا قصور یہ اور دیکھ اب یہ اس کی محبت ہی تو ہے جو اتنے سالوں بعد بھی یہاں ہم سے ملنے کے لیے آیا ہے۔"
"کیوں نا بولوں آخر اسے اپنے دل کی باتیں نہیں بتاؤں گی تو کسے بتاؤں گی۔ میرا بھائی میں بد نصیب تو اس کا منہ بھی نہ دیکھ پائی۔" وہ ایک دفعہ پھر سسک اٹھی تھیں۔
"جی جی! پلیز سنبھالیں خود کو۔ آپ کا بیٹا آپ کے پاس بیٹھا ہے میں لوٹ آؤں گا آپ سب کے پاس ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔ یہ میرا وعدہ ہے آپ سے۔"
بعض فیصلے لمحوں میں ہو جایا کرتے ہیں۔ میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا
انسان کی جڑیں ہمیشہ اپنوں سے جڑ کر ہی مضبوط ہوتی ہیں۔

☼ ☼ ☼

"پھر کب آئیں گے آپ؟"
"جب تم بی اے کر لو گی۔" میں شرارت سے نچلا ہونٹ دبا کر بولا۔
"یعنی دو سال بعد آپ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جائیں گے؟" وہ خوش ہو کر بولی تھی۔
اس وقت مجھے اتنی پیاری لگی کہ بے اختیار دل چاہا سب کچھ چھوڑ چھاڑ یہاں بیٹھا رہوں۔
اس کی آنکھیں بہت خوب صورت تھیں گہری کالی سیاہ انتہائی چمکدار اور روشن ان آنکھوں میں رقصاں شرارت اور نمی جب بھی وہ بے اختیار ہنستی تو اس کی آنکھوں میں شوخ رنگ نمی آکر ٹھہر جاتی۔

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھنے سے گریز کیا کہیں مجھے اپنا پروگرام بدلنا نہ پڑے۔
"میں تعلیم مکمل ہوتے ہی ہمیشہ کے لیے پاکستان آجاؤں گا۔ بس تم میرے لیے دعا کرنا مجھے تمہاری دعاؤں کی اشد ضرورت ہے۔"
اور وہ کچھ نہیں بولی تھی بس سر جھکا کر اضطرابی انداز میں اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے قالین کو کھرچ رہی تھی۔ اس کی گود میں مراۃ العروس کھلی پڑی تھی میرے آنے سے پہلے غالباً" وہ اسی کا مطالعہ کرنے میں مصروف تھی۔
"مجھے مشرقی لڑکیاں بہت اچھی لگتی ہیں دل راجہ! خصوصاً" مراۃ العروس میں اصغری کا کردار میرا آئیڈیل ہے اس جیسی بن جاؤ دل راجہ! بدل ڈالو خود کو!" اس نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔
"میری خاطر۔" میں نے بہت آہستگی سے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ دبایا تھا اور اسے متحیر چھوڑ کر تیزی سے باہر نکل آیا تھا۔
وہ اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی۔ سب مجھے سی آف کرنے کے لیے آئے تھے تایا جی اور فاروق روف مجھے ایئرپورٹ چھوڑنے کے لیے لاہور بھی گئے۔ میں جانتا تھا اس کی عادت کو' وہ کمزور نہیں پڑنا چاہتی تھی اسی لیے وہ میرے سامنے نہیں آئی تھی۔ سارا راستہ میں افسردہ رہا تھا۔
مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ میں اس سے پہلے یہاں کیوں نہیں آیا تھا کیوں اتنے سال اپنوں سے دور پتی چھاؤں میں گزار دیے تھے۔ ماما کی بے جا ضد نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا تھا۔ لیکن اب میں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ واپس ضرور آؤں گا۔ میں نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ واپس جا کر مما اور فرحین کو ساری باتیں بتاؤں گا تو وہ بھی بے اختیار یہاں آنے پر مجبور ہو جائیں گی۔
فرحین میری سب سے اچھی اور پیاری دوست مما کی فرینڈ عالیہ کی بیٹی اور سرمد کی بہن وہ لوگ ہمارے اپارٹمنٹ کے نزدیک ہی رہتے تھے۔ سرمد اور میں نے ہمیشہ ایک ہی اسکول کالج میں پڑھا تھا اب ہم دونوں اکٹھے ہی لنکنز یونیورسٹی میں بار ایٹ لاء میں ایڈمیشن بھی لے چکے تھے۔ بار ایٹ لاء میرا خواب ڈیڈی کا خواب جس کی تکمیل کی خاطر میں بہت محنت کر رہا تھا اور اب تو اور بھی اہم تھا میرے لیے اس ڈگری کو حاصل کرنا کیونکہ یہ دل راجہ کی خواہش تھی۔ میں ان آنکھوں میں ابھرتی چمک اور خوشی کے دھنک رنگ شاید ہی کبھی بھول پاؤں جو اس کی آنکھوں میں میری بات سن کر اترے تھے۔

☼ ☼ ☼

گہرے میرون سوٹ میں اپنی گلابی رنگت' اپنی تمام تر سوگواری اور یاسیت سمیت وہ دل میں اترتی محسوس ہو رہی تھی۔ سبک سبک' نرم نرم ایڑیوں والے ننگے پیر مخملیں گھاس پر بہت جچ رہے تھے۔ اس کی میری طرف پشت تھی۔ شولڈر کٹ بال بڑھ کر کمر سے نیچے تک پہنچ رہے تھے۔ بالوں کی چوٹی سے نکلی چند آوارہ لٹیں ہوا کے دوش پر رقص کرتی اس کے حسن میں مزید اضافہ کیے دے رہی تھیں۔
آج بہت عرصے کے بعد میرے دل نے پھر اسے ایک لقب سے نوازا تھا۔ اس کے حسن کو میں نے آج ایک بالکل مختلف لقب دیا تھا "حسن جہاں سوز کا پیکر" میں ٹیرس پر کھڑا اسے اضطراری انداز میں ادھر سے ادھر چکر لگاتے دیکھ رہا تھا۔ آج کافی دنوں کے بعد اس کی طبیعت سنبھلی تھی۔ تب ہی آج صبح ہی صبح وہ مجھے لان میں واک کرتی نظر آئی تھی۔ میں بے اختیار اس کے پیچھے لان میں چلا آیا۔
"دل نشین!" آج عرصے کے بعد یہ نام میرے لبوں نے دوبارہ چھوا تھا۔ وہ آج بھی چنبیلی کی خوشبو سے مہکتے وجود والی ان چھوئی کلی تھی۔ اس نے بے اختیار مڑ کر دیکھا تھا۔

"گڈ مارننگ!" جواباً" مسکراتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا تھا۔ سفید آبدار موتی عنابی ہونٹوں میں ذرا دیر کو اپنی چھب دکھلا کر غائب ہو گئے تھے۔

"کیسی طبیعت ہے اب تمہاری؟" میں لان میں پڑی چیئرز میں سے ایک پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہوں!" آہستگی سے کہتے ہوئے وہ بھی ایک کرسی پر ٹک گئی تھی۔

میں نے دیکھا اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔

"پھر کیا سوچا ہے تم نے؟" کچھ تکلیف دہ پل خاموشی سے گزار کر میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس تکلیف دہ موضوع کا ایک سرا تھام لیا تھا۔ آخر کوئی نہ کوئی حل تو نکالنا ہی تھا ناں!

"میں اپنا فیصلہ آپ سب کو سنا چکی ہوں۔" وہ بے لچک لہجے میں کہتے ہوئے اس لمحے وہی پرانی دل راجہ محسوس ہوئی مجھے۔

"لیکن دل اس طرح یہ مسئلہ کیسے حل ہوگا، تمہیں سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہیے۔ آخر تمہاری پوری زندگی کا سوال ہے۔" میں نرمی سے سمجھاتے ہوئے بولا۔

"میں نے کہا ناں! میں فیصلہ کر چکی ہوں اور آپ کو پتا ہے کہ میں اپنے فیصلے بدلا نہیں کرتی۔" وہی ہٹ دھرمی اور تحکم بھرا دو ٹوک لہجہ جو کبھی اس کی شخصیت کا حصہ تھا۔ اس کے بارے میں بھلا مجھ سے بہتر کون جان سکتا تھا۔

"جوش سے نہیں ہوش سے کام لو دل راجہ! اپنے فیصلے پر ٹھنڈے دل و دماغ سے نظر ثانی کر لو پھر مجھے بتانا۔" میرا لہجہ ابھی بھی لچک دار تھا کیونکہ میں حقیقتاً" اس کی بھلائی چاہتا تھا۔

"شافع ٹھیک کہتے ہیں دل! ایسے کام باہمی مشاورت سے ہی کیے جا سکتے ہیں۔ تم پلیز ٹینشن مت لو اور آرام سے سوچ سمجھ کر فیصلہ کرو۔" فرحین جوس گلاسوں میں ڈالتے ہوئے بولی۔ ہم دونوں میاں بیوی سحر خیزی کے عادی تھے۔

"شام کو ایئرپورٹ ٹائم سے چلے جائیے گا شافع!" وہ جوس کا گلاس مجھے پکڑاتے ہوئے بولی۔

"کیوں خیریت فری۔" میں اچنبھے سے بولا تھا۔

"سرمد آ رہا ہے شافع! بھول گئے کیا؟" وہ نروٹھے پن سے بولی۔

"بھئی میں تو مذاق کر رہا تھا یار! ٹھیک ہے چلا جاؤں گا۔" میں نے کن انکھیوں سے دل نشین کی طرف دیکھا وہ امر بیل کی بیل پر بیٹھی چڑیا کو بغور تکتے ہوئے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ میں حیران تھا کہ بعض دفعہ دعائیں اس انداز میں بھی قبولیت کا درجہ پاتی ہیں کہ ہمیں اپنے مانگنے پر افسوس سا ہونے لگتا ہے میں نے بھی دل راجہ کو روتا دیکھنے کی خواہش کی تھی۔ مگر صرف اپنے لیے۔ اور قدرت کا کیسا سنگین مذاق ہوا تھا میرے ساتھ کہ آج وہ میرے سامنے بیٹھی رو رہی تھی مگر میرے لیے نہیں، کسی اور کے لیے...

☼ ☼ ☼

"تم سارا دن بور ہوتی ہو گی، ایسا کیوں نہیں کرتیں کہ میرے ساتھ چلو! تھوڑی آؤٹنگ ہو جائے گی تمہارا دل بھی بہل جائے گا اور تھوڑا مجھے بھی آسرا ہو جائے گا۔" فرحین بہت پیار سے کہہ رہی تھی وہ دل نشین سے بہت نرم لہجے میں بات کرتی تھی کیونکہ وہ اسے بہت پسند آئی تھی۔

"میرا دل نہیں چاہ رہا بھابھی پلیز! آپ چلی جائیں ناں۔ میں پھر کسی دن چلی جاؤں گی۔" وہ سستی سے کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"پھر کسی دن نہیں، ابھی چلو! دیکھو تو چند دنوں میں کیا حالت بنالی ہے تم نے دل! خود کو سنبھالو۔ تم کوئی کمزور لڑکی نہیں ہو نہ ہی اتنی ارزاں کہ خود کو اس طرح ختم کر لو۔" فرحین نے اسے رسان سے سمجھایا۔

"تو پھر میں اور کیا کروں بھابھی! میں تھک گئی ہوں کسی کا سامنا نہیں کرنا چاہتی میں۔ مجھے کسی سے کوئی تعلق نہیں رکھنا۔ پلیز! آپ سب مجھے تنہا چھوڑ دیں۔" وہ سسک اٹھی تھی۔

"نہیں دل... نہیں چندا! تمہیں ہمت نہیں ہارنی بلکہ ڈٹ کر حالات کا مقابلہ کرنا ہے۔ تم ایسا کر سکتی ہو کیونکہ تم کوئی عام لڑکی نہیں ہو۔ تم تو بہت اہم خاص لڑکی ہو یہ باتیں تو کمزور اور ان پڑھ عورتیں پر جو اپنے اچھے برے کی پہچان نہیں رکھتیں یا کچھ کر نہیں سکتیں ان پر جچتی ہیں۔ ڈٹ جاؤ دل! اپنا حق حاصل کرو..." وہ پیار سے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔

"نہیں بھابھی! میں ہار گئی۔ بہت کاری ضرب پڑی ہے اب کی بار تقدیر کی طرف سے۔ میں ٹوٹ کر بکھر گئی ہوں۔ اک عمر لگے گی اپنی ذات کی عمارت کو جوڑنے میں اور اک زمانہ لگے گا اپنے کرچی کرچی زخمی دل کو سمجھانے میں۔"

"اپنے آپ کو اکیلا کبھی مت سمجھنا دل! زندگی کے ہر موڑ پر، ہر آزمائش میں خود سے پہلے مجھے اپنے سامنے پاؤ گی۔ یہ میرا تم سے وعدہ ہے۔ چلو اٹھو شاباش مارکیٹ چلتے ہیں۔ سرمد بھی آنے والا ہو گا، اس کے آنے تک مجھے سارے انتظامات بھی کرنے ہیں۔"

"اپنی خوشیوں کی قاتل پر بھلا کوئی کیسے اعتبار کر سکتا ہے فرحین! یہ تم نہیں جانتیں مگر دل نشین راجہ اچھی طرح سے جانتی ہے۔" وہ سوچتے ہوئے پھیکی سی ہنسی ہنستے ہوئے چل دی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ کافی دیر سے اسے مشکوک نظروں سے دیکھ رہا تھا اور وہ حیران تھا کہ اتنی صبح جبکہ ابھی سورج بھی نہیں نکلا تھا۔ بغیر کسی ڈر اور خوف کے اتنے مالکانہ انداز میں کون لڑکی گھوم پھر سکتی ہے یہاں؟

وہ رات بھر صحیح طرح سے سو نہیں پایا تھا کیونکہ کسی بھی انجان جگہ پر اسے پہلی رات نیند بالکل بھی نہیں آتی تھی۔ اسی لیے رات بھر کروٹیں بدلنے کے بعد وہ صبح کافی جلدی بیدار ہو گیا تھا اور اب وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے ایک لڑکی کو اضطراری انداز میں ادھر سے ادھر چکر لگاتے دیکھ رہا تھا۔

"اس سے پہلے کہ دیر ہو جائے مجھے صورت حال جاننا چاہیے۔" خود کلامی کرتے ہوئے اس نے نیچے جانے والی سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھا دیے۔

"کون ہو تم؟ اور یہ بتاؤ یہاں کیا کرنے آئی ہو؟" وہ اسے کندھوں سے پکڑ کر اس کا منہ اپنی طرف کرتے ہوئے بولا۔

دل نشین کا غصے سے برا حال تھا اس کا دل چاہا اس کے کس کے ایک تھپڑ لگائے مگر وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی اس کے دونوں ہاتھ اس بدتمیز شخص کے ہاتھوں میں تھے۔

"دل! کیا بات ہے۔ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" سرمد نے مڑ کر دیکھا تھا۔ پیچھے شافع کھڑا اسے گھور رہا تھا۔

"پتا نہیں یہ شخص اچانک آ کر پوچھنے لگا میں یہاں کیا کرنے آئی ہوں میں اسے بالکل بھی نہیں جانتی۔" دل کے چہرے پر خوف کے سائے ابھی بھی لرزاں تھے مجھے بے اختیار سرمد پر غصہ آیا۔

"اٹس اوکے! کام ڈاؤن اینڈ پلیز بی ریلیکس۔ یہ سرمد ہے فرحین کا بھائی رات ہی کو آیا ہے۔ تم سے ڈنر پر اس کی ملاقات نہیں ہو سکی اسی لیے تم دونوں ہی ایک دوسرے کو پہچان نہیں پائے۔"

"کیا؟ یہ... یہ سرمد ہے لیکن یہ تو مجھے چور کہہ رہا تھا۔" وہ روہانسی ہو کر بولی، اس وقت اس کے چہرے پر بالکل ویسی ہی معصومیت تھی جسے دیکھ کر میں مبہوت ہو کر اپنے ہوش کھونے لگتا تھا۔

"آہ دل راجہ! زندگی مانا کہ مسلسل آزمائش کا نام ہے۔ تم اسے مزید تو مشکل مت بناؤ؟" مگر میں صرف یہ سب سوچ سکتا تھا کہنے کی جرات اور تمام اختیار میں اپنے ہاتھوں کھو چکا تھا۔

"مجھے کیا پتا تھا کہ آپ چور نہیں، بلکہ میں تو خود حیران تھا کہ اتنی خوبصورت لڑکی کو چوری کرنے کیا ضرورت ہے۔" سرمد اپنا دفاع کر رہا تھا جواباً" وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے دوبدو بولی۔

"چور ہوں گے آپ خود۔ میں تو دل نشین ہوں۔ میں چوری نہیں کرتی، بلکہ ڈائریکٹ قتل کرتی ہوں۔" بااعتماد اور باوقار انداز میں وہ بالکل وہی دل راجہ نظر

آرہی تھی جو باہمت 'باعزم اور مضبوط قوت ارادی کی مالک تھی۔ آہستہ آہستہ وہ خود کو سنبھال رہی تھی جو بھی تھا وہ زندگی کی طرف لوٹ رہی تھی جو کم سے کم میرے لیے ایک بہت بڑی کامیابی تھی۔

"نہیں جی دل نشین صاحب! بلکہ نازنین مہ جبین صاحبہ! یہ تو آپ کی زیادتی ہے۔ دل چرانے کا آپ کو پورا حق ہے۔" سرمد ابھی نجانے اور کیا کہتا کہ میری تنبیہہ پر اس کی زبان کو بریک لگانے پڑے۔

"میں نے ہی اسے بلوایا ہے دل! یہ تمہارا کیس لڑے گا اسی لیے اس کو جلدی سے بلوایا ہے تاکہ تمہارا کیس اسٹڈی کر کے ہم کوئی اسٹیپ لے سکیں۔"

وہ حیران نظروں سے اسے تک رہی تھی میں نے چور نظروں سے اس کی آنکھوں میں دیکھا جہاں اب بھی وہ ہی چمک تھی بلکہ شرارت کی جگہ ہلکی ہلکی سوگوار سی نمی نے لے لی تھی جو اس کی آنکھوں کو مزید خوب صورتی بخشتی تھی۔

"تو گویا آپ میرا کیس نہیں لڑیں گے؟" جب وہ بولی تو لہجہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ وہ بغور مجھے ہی دیکھ رہی تھی۔ ان آنکھوں میں نجانے کیا کیا سوال مجھے نظر آئے تھے میں نے ہمیشہ کی طرح نظر چرانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔

"کیوں بندہ خاکسار آپ کو اس قابل نہیں نظر آتا کہ آپ کا کیس لڑ سکے؟" نہایت عاجزی سے کہتے ہوئے سرمد کورنش بجالایا تھا۔

"نہیں!" پتھر مار لہجہ سرمد کی آنکھیں پھاڑنے کو کافی تھا۔ کیونکہ اس کے لیے یہ سب کچھ بالکل اچانک اور نیا تھا۔

"وجہ جان سکتا ہوں میں؟" وہ خود کو سنبھالتے ہوئے بولا۔

"رہنے دیجئے! آپ کے بس کا کام نہیں ہے حقیقت کو ہضم کرنا؟"

ہلکا طنز کرتے ہوئے اداس سی مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا تھا۔

"ایسی بات نہیں ہے مس دلنشین صاحبہ! ہم پیشہ ورانہ انداز میں مکمل سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ مظلوم کو انصاف دلانے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ ہم محنت کی حلال کمائی پر یقین رکھتے ہیں۔" سرمد کا لہجہ فوراً "نارمل اور خشک ہو گیا تھا۔

"اچھا! ایسا ہے تو چلو آزما کر دیکھتے ہیں۔" خلاف توقع وہ جلدی مان گئی تھی اور یہ زندگی میں پہلا موقع تھا جب میں نے دل نشین کو اپنا فیصلہ بدلتے دیکھا تھا۔

"کیا چاہتی ہیں آپ؟" پیشہ ورانہ انداز میں پوچھا گیا۔

"طلاق!" پتھر مار ٹھوس لہجے میں جواب دیا تھا۔ ایک تو وہ اس قدر دو ٹوک اور بارعب لہجے میں بات کرتی تھی کہ اگلا بندہ چاہ کر بھی مزید کوئی سوال نہیں پوچھ سکتا تھا۔

"الزام کیا لگانا چاہیں گی آپ؟"

"اغوا کا۔ حبس بے جا میں رکھنے کا اور زبردستی نکاح کا کیس کیجئے۔" تڑپ کر کہا تھا "کیونکہ یہی سب سچ ہے۔" نگاہیں اب کی بار جھکا لی تھیں۔

"کوئی بھی بندہ آپ کو دیکھ کر اپنا ایمان سلامت نہیں رکھ سکتا کیونکہ آپ واقعی میں بہت خوب صورت ہیں اس لیے بندے کو کچھ رعایت تو ملنی چاہیے۔" سرمد ایک بار پھر پٹڑی سے اتر چکا تھا۔ اب یقیناً "اس کی خیر نہیں تھی۔

"آپ کو میرا کیس لڑنا ہے یا نہیں؟" تنک کر پوچھا گیا۔

"اگر نہیں تو بے جا فضول سوالات کرنے کی کوشش مت کریں اور اگر ہاں میں جواب ہے آپ کا تو پھر شافی بھائی سے ساری تفصیل پوچھ لیجئے۔" "کیونکہ باہمی مشاورت سے فیصلہ کرنے کے لیے مدد انہوں نے مانگی ہے آپ سے تاکہ میں نے۔ از دیٹ کلیئر؟" بے لچک انداز میں کہتی ہوئی وہ جھٹکے سے اٹھی اور اندر کی جانب بڑھ گئی تھی۔ پیچھے حیران پریشان سرمد کو مجھے ابھی تفصیل بتانا تھی۔

☼ ☼ ☼

"مجھے دل نشین کو اس حالت میں دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے شافع!" رات بستر پر لیٹنے سے قبل فرحین پھر وہی تکلیف دہ موضوع چھیڑ چکی تھی۔ انجانے میں وہ میرے زخموں پر لگے کھرنڈوں کو بڑی بے دردی سے نوچ رہی تھی اور میں باوجود کوشش کے چیخ کر اپنی تکلیف کا اظہار بھی نہیں کر سکتا تھا۔

"آپ کچھ کرتے کیوں نہیں شافع! کتنا مان لے کر وہ آئی ہے یہاں۔ پلیز شافع! اسے روتا تڑپتا دیکھ کر میرا دل کٹتا ہے؟" میرے سینے پر سر رکھ کر لیٹی وہ اس وقت میرے اتنے نزدیک ہونے کے باوجود بھی مجھ سے صدیوں کے فاصلے پر کھڑی تھی۔

میں نے بے اختیار اپنا دایاں ہاتھ اپنے دل پر رکھا تھا۔ تکلیف حد سے سوا ہو کر آنکھوں میں مرچیں بھرنے لگی تھی۔ میں نے بے اختیار اپنے سینے پر سے فری کا سر بے دردی سے جھٹکا تھا۔

وہ حیران نظروں سے مجھے تک رہی تھی۔ لیکن اس وقت میں مزید کچھ بھی سننے کے موڈ میں نہیں تھا اسی لیے جھٹکے سے اٹھا اور باہر ٹیرس پر آکر کھڑا ہو گیا۔ آج کی رات پھر میں نے سگریٹ پھونکتے اور جلتے گزارنا تھی۔

☼ ☼ ☼

ہمیں لاحق جو اک بے نام سا غم ہے ' عجب غم ہے
تبسم زیر لب ہے آنکھ پرنم ہے ' عجب غم ہے
بظاہر روشنی ہے ' زندگی ہے ' دلنوازی ہے
درون خانہ دل شور ماتم ہے عجب غم ہے

دوسری مرتبہ میں نے ساڑھے تین سال بعد پاکستان کا چکر لگایا۔ تایا جی 'رؤف اور مسعود فاروق کے بے حد اصرار کے ساتھ ساتھ دل راجہ کے بار بار بلانے پر مجھے لازمی جانا پڑا تھا۔

میرا بار کمپلیٹ ہو چکا تھا۔ اب میں پریکٹس شروع کرنے والا تھا۔ مما نے ایک بار پھر اپنی تمام تر کوششیں کرلی تھیں مجھے پاکستان جانے سے روکنے میں وہ ناکام رہی تھیں۔ غصے ' پیار دھمکی ہر طرح سے انہوں نے مجھ پر دباؤ ڈالا تھا لیکن وہ ایک وعدہ جو میں ان سب سے کر چکا تھا واپس لوٹنے کا وہ بہرحال مجھے ہر صورت پورا کرنا تھا۔ میں مما کو قطعی دکھ نہیں دینا چاہتا تھا لیکن میں ان کے بے وجہ وسوسوں اور بلاوجہ کی نفرتوں کی وجہ سے اپنوں سے دور بھی نہیں رہ سکتا تھا۔

انہیں پاکستان نہیں بلکہ میرا پاکستان جانا برا لگتا تھا۔ انہیں آج بھی اس حویلی میں رہنے والے مکینوں سے اتنی ہی چڑ 'اتنی ہی نفرت تھی جتنی اس حویلی میں ان سب کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ کر آتے ہوئے محسوس ہوتی تھی۔

اور زندگی میں پہلی مرتبہ میں مما کی ناراضی کی پروا کیے بغیر اکیلا اس سرزمین پر اترا تھا۔ جس کی اپنائیت بھری فضاؤں اور خوشبوؤں کو میں ایک عرصہ تک پردیسی اور اجنبی ملک میں ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا تھا۔

میں نے واپس آکر تایا جی کی امانت کے ساتھ ساتھ وہاں کے لوگوں کی چاہتوں اور محبتوں کے قصے سنا سنا کر مما منا لیا تھا۔ وہ قائل ہوئی تھیں یا نہیں میں یہ نہیں جانتا تھا مگر اتنا ہوا تھا کہ مما ساری باتیں سن کر اور وہ فائل لے کر خاموش ضرور ہو گئی تھیں اور یہ ان کی نیم رضامندی کا گرین سگنل تھا۔

اس دفعہ پاکستان جاتے وقت میں پہلی بار سے زیادہ پرجوش اور خوش تھا۔ گزرتے ماہ و سال میں آنے والی گاؤں کے لوگوں اور حویلی میں تبدیلیاں "دل راج" کے توسط سے مجھ تک پہنچتی رہی تھیں۔ اس میں دل راج کے ذاتی مسائل سے لے کر ملکی و قومی امور تک تبصرہ تفصیلی ہوتا۔ عمر ملک اب بھی چھپ کر سگریٹ پیتا ہے؟ حذیفہ اسکول جانے لگا ہے رؤف اور مسعود جڑواں تھے اس لیے ہر کام میں ایک جیسی شکل رکھنے کے باوجود پسند ناپسند میں اختلاف رکھتے تھے۔ "دل راج" جی جی سے اب مار نہیں کھاتی ' وہ ملکوں کے بیٹوں کے ساتھ کرکٹ میچ میں اب بھی انہیں بے ایمانی نہیں کرنے دیتی میں یہ بھی جانتا تھا۔ غرض ان گزرے تین ساڑھے تین سالوں میں میں نے حویلی اور گاؤں والوں کے ساتھ پل پل گزارا تھا۔

آج پھر میں ایک دفعہ اسٹیشن پر اترا تھا۔ آج مجھے تانگے سے حویلی نہیں پہنچنا تھا بلکہ آج فاروق گاڑی لے کر پہنچنے والا تھا۔ میرے آنے کی خبر صرف اور صرف فاروق کو تھی، وہ بھی پچھلے کچھ عرصے سے اپنی مختصر سی فیملی کے ساتھ دبئی سیٹل ہو چکا تھا۔ شاید اب بھی وہ چھٹیوں میں پاکستان آیا تھا۔

گاؤں میں اس دفعہ بھی چند تبدیلیاں دیکھنے میں آئی تھیں۔ سب سے پہلے مجھے وہ برگد کا درخت نظر آیا۔ اس کے ساتھ ایک زیر تعمیر عمارت تھی جسے ہسپتال بنایا گیا تھا۔ یہ نیک کام بھی یقیناً" تایا جی کر رہے ہوں گے کپاس کی فصل اپنے جوبن پر تھی۔ لہلہاتے کھیت اپنی خوش بختی پر جھومتے گاتے مجھے خوش آمدید کہہ رہے تھے۔

تایا جی کا آم اور نیم کے درختوں کے نیچے بچھا پلنگ آج بھی ویسے ہی آباد تھا۔ جی جی اپنی مرغیوں کو دانہ دنکا ڈالنے میں مصروف تھیں۔ حذیفہ روف کے کندھے پر بیٹھا شاید کوئی کہانی سنانے میں مگن تھا۔ سب سے پہلے مجھ پہ تایا جی کی نظر پڑی تھی وہی والہانہ محبت وہی بارعب لہجہ۔ میں بھاگ کر ان کے گلے جا لگا تھا۔ مجھے ان میں سے ڈیڈی کی خوشبو آتی تھی۔

"شافع پتر! تو یہاں اتنا اچانک آج پھر؟ میں تو سمجھا تھا کہ تو ہمیں بھول گیا ہے پھر کبھی واپس نہیں آئے گا۔" پچھلی بار کے جیسا مان بھرا شکوہ تایا جی ایک دفعہ پھر ساڑھے تین سالوں بعد لہرا رہے تھے۔

"میں کیوں نہ آتا تایا جی! میرا مان تو آپ لوگ ہیں میری جڑیں تو آپ لوگوں سے جڑی ہیں اور میں آپ لوگوں کا ہی تو خون ہوں اور بھلا کوئی اپنے خون سے جدا ہوتا ہے، کبھی اپنی جڑیں کاٹ کر پھینک سکتا ہے؟"

میں نے بھی مان بھرے لہجے میں ان کے دونوں ہاتھ چومتے ہوئے اپنی آنکھوں سے لگائے۔

"کیا بات ہے گھر میں بڑی خاموشی ہے۔ باقی لوگ کدھر ہیں بھئی؟" پندرہ منٹ کے مسلسل انتظار کے بعد بھی میں دل راج کو دیکھنے میں ناکام ہو کر بالآخر ان سب کا پوچھ بیٹھا تھا۔

"سب ادھر ہی ہیں۔ آس اپنے میکے گئی ہے۔ مسعود شہر گیا ہوا ہے اور دل راج اندر اپنے کمرے میں ہے۔ رہا روف تو وہ ابھی تمہارے سامنے حذیفہ کو لے کر باہر گیا ہے۔" جی جی تفصیل بتاتے ہوئے بولیں۔

دل راج گھر میں موجود تھی اور پھر بھی گھر مکمل سکون کا نقشہ پیش کر رہا تھا میں جتنا حیران ہوتا کم تھا۔

"اس کے باوجود گھر میں خاموشی ہے تایا جی!" میں ہولے سے ہنسا۔ تایا جی بھی میری بات سمجھ کر مسکرائے۔

"میرا پتر بڑا سدھر گیا ہے اب! ویسے واویلا نہیں مچاتی اب بلکہ بڑی ماٹھی (دھیمی) ہو گئی ہے۔"

"آپ کہتے ہیں تو مان لیتا ہوں، ویسے دل نہیں مانتا۔" میرے لہجے میں ابھی بھی شرارت تھی۔

"کیوں جی جی! کیا واقعی میں دل راجہ سدھر گئی ہے یا ہمیشہ کی طرح تایا جی اس کی حمایت کر رہے ہیں؟"

"نہیں پتر! بڑی سیانی ہے دھی رانی میری تو خود مل کر دیکھ لے لیکن پہلے ایسا کر، یہ دودھ سوڈا پی لے۔ گرمی سے آیا ہے ناں!" مجھے اٹھنے کے لیے پر تولتے دیکھ کر وہ فوراً" بولیں۔

جلدی جلدی دودھ کا گلاس ختم کر کے میں اگلے چند لمحوں میں ہی حویلی کے اندر دروازے کو کراس کر کے بائیں ہاتھ پر بنے دل راج کے دروازے پر دستک دے چکا تھا۔

"جی فرمائیے! کس سے ملنا ہے آپ کو؟" بے حد تیکھے انداز میں پوچھا گیا۔

میں بے حد حیران نظروں سے اسے تک رہا تھا۔ تقریباً" پورے ساڑھے تین سالوں بعد آج پھر وہ میرے سامنے ایک مختلف روپ میں ملی تھی سفید چوڑی دار پاجامہ، سیاہ آٹھ کلی کرتے کے ساتھ بڑا سا کرن لگا سفید ہی دوپٹا سفید سبک پاؤں نازک کھسے میں مقید تھے۔ ریشمی بال کھلے پشت پر لہرا رہے تھے۔ یہ سامنے کھڑی لڑکی ہمیشہ کی طرح ایک دفعہ پھر مجھے حیرتوں کے سمندر میں غرق کر چکی تھی اگر حیران میں تھا تو وہ بھی نہیں تھی۔

"فرمائیے! میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں۔" روکھے پن سے پھر ایک سوال کیا گیا۔

"جی! مجھے یہاں کسی سے ملنا ہے۔" میں نے حد درجہ فرمانبرداری کا مظاہرہ کیا تھا۔

"کس سے؟" اب کی بار انداز خاصا تیکھا تھا۔

"جی! یہاں دل راج نامی ایک خوب صورت سی لڑکی رہتی تھی میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔" میری سعادت مندی میں ابھی بھی کوئی فرق نہیں آیا تھا۔

"وہ اب یہاں نہیں رہتی؟" یہ کہہ کر اس نے دروازہ بند کرنا چاہا تھا کہ میں نے فوراً" دروازہ پکڑ لیا۔

"تو پھر کہاں رہتی ہیں۔" میرا لہجہ اور آنکھوں دونوں میں شرارت تھی۔

"معلوم نہیں۔" بے رخی سے کہتے ہوئے رخ موڑا تھا۔

"اچھا! چلیں، یہ بتا دیں کہ اب ان کی جگہ یہاں کون رہتا ہے۔" میں انجان بن کر بولا۔

"یہاں اب صرف میں رہتی ہوں!" خاصے تیز لہجے میں جواب آیا تھا۔ میں بمشکل اپنی ہنسی ضبط کر پایا تھا۔

"اور آپ کون ہیں؟" قریب تھا کہ وہ کوئی چیز اٹھا کر میرے سر پر مار دے لیکن میرا اندازہ غلط نکلا تھا۔

"میں دل نشین ہوں۔ دل نشین راجہ!" ایک ایک لفظ چبا کر کہا گیا۔

"مجھے آپ ہی سے ملنا تھا؟" اس کے غصے کی پروانہ کرتے ہوئے میں دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گیا تھا اور دل راج مجھ پر غصہ نکالنے کے لیے الفاظ ترتیب دینے لگی تھی۔

☆ ☆ ☆

"ارے! تم تو بہت اچھے موقع پر آئے ہو.... "اسی مہینے کے آخر میں ہم لوگ روف اور مسعود کی شادیاں کر رہے ہیں چلو! اچھا ہے تم بھی شرکت کر لینا بلکہ بھرپور شرکت کرنا آخر کو تمہارے بھائیوں کی شادی ہے۔ سب تیاریاں تقریباً" مکمل ہیں بس دو چار روز میں ڈھولکی بھی رکھوا دوں گی اور مٹھائی کے لیے حلوائی بھی حویلی میں بٹھا دوں گی۔ تم دیکھنا! حویلی کی شادیاں بہت پر رونق ہوتی ہیں، تمہیں بہت مزا آئے گا۔" جی جی برابر مجھے تفصیلات سے آگاہ کر رہی تھیں۔

"جی جی! میں واقعی میں بہت خوش ہو رہا ہوں یہ سب سن کر۔ مجھے حقیقتاً" بہت شوق تھا یہاں کی شادی دیکھنے کا۔ میں ضرور یہاں بھرپور شرکت کروں گا ویسے جی جی! کیا بابا اور ممی کی بھی ایسی ہی پر رونق شادی ہوئی تھی؟" میں اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھ کر شاید بہت بڑی غلطی کر بیٹھا تھا۔ تب ہی جی جی ٹھنڈا سانس بھرتی ہوئی بولیں۔

"ہک ہا پتر! تیرے باپ کے ویاہ پر تو ہم سب نے اپنے دل کے سارے ارمان نکالے تھے۔ پورا ایک ماہ ڈھولکی رکھی تھی اور حلوائی بھی بٹھایا تھا۔ تین چار تو مہندیاں لگائی تھیں گاؤں کے لوگوں نے تمہارے باپ کو اور سب سے زیادہ لمبی گاڑیوں والی برات اس زمانے میں صرف تمہارے باپ ہی کی گئی تھی۔ اتنی محبتوں چاہتوں سے بیاہ کر لائے تھے تمہاری ماں کو مگر وہ ناشکری، خود غرض شہری عورت شک میں اپنا سب کچھ گنوا بیٹھی۔"

"توبہ ہے جی جی! شافی بھائی کی والدہ ہیں وہ۔ آپ کم سے کم آنٹی کے بارے میں ان کے سامنے تو ایسا نہ کہیں۔" دلنشین جو ابھی کچھ دیر پہلے وہاں آئی تھی، ٹوکے بغیر نہ رہ سکی۔

"شافع کوئی بچہ نہیں جو درست غلط کی پہچان نہیں رکھتا میں ساری حقیقت ضرور بتاؤں گی اسے؟"

"جی جی پلیز! ابا جی نے منع کیا تھا۔" اس نے کمزور سی مزاحمت کی تھی۔

گزرے وقت نے دل راجہ پر بہت گہرا اثر ڈالا تھا اس کا تیز سب پر سبقت لے جانے والا لہجہ نہایت دھیما ہو گیا تھا۔

"نہیں! جی جی کو مت روکو! میں ان سے خود ساری

معلومات لینا چاہوں گا۔" میں تنگ آگیا تھا اس بھول بھلیاں والے کھیل سے نہ مما کچھ بتاتی تھیں میں تایا جی سے پوچھتا تو بھی وہ ٹال جاتے۔

☼ ☼ ☼

"کبھی کبھار مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے میں نے آنے میں بہت دیر کردی ہے دلنشین!"

"اور آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے' وہ ایک چھوٹا سا پتھر اٹھا کر ندی کے بہتے پانی میں پھینک کر پانی میں بننے والے گرداب دیکھنے لگی۔

"اس لیے کہ میں دل راج سے نہیں مل سکا۔" پانی میں پھینکنے کے لیے دوسرے پتھر والا ہاتھ اس کا ہوا میں ہی معلق رہ گیا تھا وہ حیران سی میری طرف مڑی تھی۔

"آپ کو اس سے ملنا تھا؟" لہجہ اچنبھا لیے ہوئے تھا۔

"ہاں! مگر یہاں آکر معلوم ہوا کہ وہ تو یہ جگہ چھوڑ چکی ہے۔" میں نے بے چارگی سے کہا۔

"اوہ! پھر تو آپ نے واقعی دیر کردی۔" افسوس سے سر ہلاتے ہوئے وہ سادگی سے بولی۔ "ویسے آپ اس سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟"

"یہ تو خیر میں آپ کو نہیں بتا سکتا کیونکہ بہرحال یہ تھوڑا سا پرسنل ہے۔" ڈھیر سارے کنکر اٹھا کر ایک دم اس نے پانی میں پھینکے تھے' اک شناسا سا مدھر شور میری سماعتوں سے ٹکرایا تھا۔ پانی میں بنتے بھنور اور ٹوٹتی لہریں منظر کو ڈوبتے سورج کے ساتھ مزید حسین بنا رہی تھیں۔

"ایک بات بتائیے مسٹر شافع رضا!" کچھ دیر کے توقف کے بعد وہ پھر بولی تھی۔ اب وہ ندی کنارے سے اٹھ کر باغ کے اندر داخل ہو رہی تھی۔

"اب دل راج بدل چکی ہے تو آپ اس سے کیوں ملنا چاہتے ہیں؟" وہ دکھ سے چور لہجے میں بولی۔ مجھے یکدم کسی گڑبڑ کا اندازہ ہوا تھا۔

"اس نے خود کو کیوں بدلا تھا دل؟"

"شافع رضا کو مراۃ العروس کی اصغری بہت پسند تھی ناں اس لیے؟ جاتے وقت اس نے ایک چھوٹی سی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ دل راج نے اسی لمحے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ دل نشین کو ضرور ڈھونڈے گی اور دیکھیں! بالآخر اس نے اسے پالیا؟" دوپٹے کے پلو کو کبھی اپنی انگلی پر لپیٹتی اور کبھی چہرے پر در آنے والی لٹیں اپنے ہاتھ سے کان کے پیچھے اڑستی وہ دیومالائی حسن کا پیکر لگ رہی تھی۔ اس کا جواب سن کر میرا دل خوشی سے بھر گیا تھا۔

"تھینک یو دل! تھینک یو سو مچ!" بے خودی کے عالم میں کہتے ہوئے میں نے بے اختیار اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔

☼ ☼ ☼

حویلی میں جی جی کے حسب وعدہ اگلے تین چار دنوں میں ہی شہنائیاں گونجنے لگی تھیں۔ پوری حویلی کو کسی دلہن کی طرح سے سجایا گیا تھا۔ حویلی کے بڑے سے صحن میں چارپائیاں اور کرسیاں چاروں اطراف بچھا کر درمیان کی خالی جگہ پر زمین پر کارپٹ بچھا کر ان پر چاندنیاں بچھائی گئی تھیں اور ساتھ میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر گاؤ تکیے لگا دیے گئے تھے۔ حویلی میں مختلف قسم کی مٹھائیاں تیار ہو رہی تھیں اور ان کی اشتہا انگیز خوشبو ہر سو پھیل کر ماحول کو اور نکھار بخش رہی تھی۔

حویلی کی بارہ دری میں مردوں کے بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا جہاں روزانہ رات کو گاؤں کے تمام لوگ اور رؤف مسعود کے دوست اور عزیز و اقارب آکر شغل میلہ لگاتے اور مٹھائیاں' فروٹ اور چائے سے لطف اندوز ہوتے یہاں کے لوگوں کی ایک خاص بات جو میں نے دیکھی' وہ یہ تھی کہ خوشی ہو یا غمی' سب ایک دوسرے کے ساتھ اس میں برابر کے شریک ہوتے تھے۔

گزرتے ہر پل میں مجھے ادراک ہوا تھا کہ دل نشین واقعی دل نشین ہے' میں خوش نہیں تھا بلکہ میں بہت زیادہ خوش تھا۔ ایک لمبے عرصے تک بھٹکنے کے بعد مجھے میری زندگی کی ناؤ کو کنارا ملا تھا۔ دل نشین کی صورت میں؟ امریکا میں کو ایجوکیشن میں پڑھنے کے باوجود دنیا بھر کی مختلف کمیونٹیز کی لڑکیوں سے مل کر مجھے کبھی اپنائیت کا رتی بھر احساس نہ ہوا تھا۔ میں نے اپنی ستائیس سالہ زندگی میں کوئی ایسی لڑکی نہ دیکھی تھی نہ اس سے ملا تھا کہ اس سے متاثر ہوتا۔

دل راج نے دلنشین تک کا سفر صرف شافع رضا کی خاطر کیا تھا۔

اگر کوئی اسے اس روپ میں دیکھ لیتا تو ہرگز سوچ ہی نہ پاتا کہ کبھی وہ ضدی' ہٹ دھرم' بولڈ' شدت پسند اور کسی حد تک خود پسند دل راج کے وجود میں جیتی تھی۔ مگر یہ کایا پلٹ ہوئی تھی آج بھی سب اس تبدیلی پر حیران تھے سوائے شافع رضا کے۔

"پندرہ دن ہو چکے ہیں لیکن میں ابھی تک عمر سے نہیں ملا ہوں! کیا بات ہے خیریت تو ہے' کہیں تمہاری اس سے لڑائی تو نہیں ہو گئی؟"

آج پھر ہم لوگ گھر سے باہر کھیتوں میں گھومنے پھرنے نکلے تھے۔ دل نشین کا اب زیادہ وقت گھر میں ہی گزرتا تھا اس نے نہ صرف باہر نکلنا چھوڑ دیا تھا بلکہ وہ تمام کھیل کود شرارتیں اور لڑائیاں بھی ختم کردی تھیں جس کی وجہ سے اسے "جی جی" سے اکثر طعنے اور مار پڑتی تھی۔ اس کے انداز و اطوار بدلنے پر کوئی خوش نہیں تھا۔ نہ تایا جی' نہ آپی بھابھی' نہ گاؤں' نہ محلے والے صرف جی جی خوش تھیں۔

"وہ اب یہاں نہیں ہوتا۔ لاہور میں کنگ ایڈورڈ میڈیکل کے غالباً" آخری سال میں ہے پھر اس کے بعد ہاؤس جاب کے لیے بھی وہیں رکے گا اور شاید ایف آر سی ایس کرنے کے لیے انگلینڈ چلا جائے۔"

"اس! تو کیا اتنے عرصے میں اس کا گاؤں کا چکر لگانے کا کوئی ارادہ نہیں؟" میں حیران ہی تو ہوا تھا۔

"یہ میں نے کب کہا؟ میں نے تو بس اس کی فیوچر پلاننگ کے متعلق انفارم کیا ہے آپ کو۔ جیسا اس نے مجھے بتایا' ویسا میں نے آپ کو بتا دیا۔" وہ سرسوں کا پھول توڑتے ہوئے لاپروائی سے بولی تھی۔ اس کی یہی بے نیازی اسے مزید دلکش و دلنشین بناتی تھی۔

"تم بالکل نہیں بدل سکتیں دل!" میں نے گہرے گمبھیر لہجے میں اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ جواباً اس کے عارض پر گرتی پلکوں کی چلمن اور شرم و حیا نے اس کے عارض دہکا دیے تھے۔

"میں نے بدلنا کب چاہا ہے شافی بھائی!" کڑوی گولی مجھے بغیر پانی کے نگلنی پڑتی تھی' جب وہ مجھے شافی بھائی کہہ کر مخاطب کرتی تھی' مگر میں مجبور تھا کہ عمروں کا فرق تو بہرحال ہم میں اٹل حقیقت کی طرح سے موجود تھا۔

"کیا اب بھی باغ سے پھل چوری کرکے کھاتی ہو؟" میں ہنسا۔

"نہیں! اب تو نہ وہ دن رہے نہ وہ لوگ' نہ ہی وقت اب کچھ بھی تو ایسا نہیں رہا میں ان سب کو اب بہت مس کرتی ہوں وقت ایک سا کیوں نہیں رہتا شافی بھائی؟"

وہ آسمان کی وسعتوں میں کچھ تلاشتے ہوئے دکھ سے چور لہجے میں بولی تھی۔

"وقت کو بدلنا ہی چاہیے دل! کیونکہ فطری طور پر انسان بہت جلد یکسانیت سے اکتا جاتا ہے۔ اگر ہماری زندگیوں میں ایک ہی موسم آکر ٹھہر جائے تو بالکل ویسا ہی منظر ہماری زندگی پیش کرے گی' جیسے کھڑے پانی میں جمی کائی؟" میں ناصحانہ انداز میں اسے سمجھا رہا تھا۔

"لیکن گزرا وقت ہمیں ہمیشہ یاد تو آتا ہے ناں' کیا آپ کو بھی یاد آتا ہے؟" اس نے جیسے میری تائید چاہی تھی۔

مجھے نئی چیزیں فیسی نیٹ کرتی ہیں' مجھے حال میں جینا اور مستقبل پر نظر رکھنا اچھا لگتا ہے اور.... اور مجھے بچپن کی دل راج کو حال کی دلنشین میں دیکھنا اچھا لگتا ہے۔" آخر میں کہتے ہوئے میں ذرا شوخ ہوا تو وہ جھینپ گئی۔

دل راج اور دلنشین میں آج بھی ایک قدر مشترک

تھی۔ دونوں ہی شدت پسند تھیں۔

☼ ☼ ☼

آج حویلی میں ضرورت سے زیادہ چہل پہل تھی کیونکہ آج دونوں بھائیوں کی مہندی تھی۔ تمام لوگ مہندی لے جانے کی تیاریوں میں تھے۔ عام سی شکل و صورت والی لڑکیاں جو روزانہ ڈھولکی بجانے اور ہلا گلا کرنے آتی تھیں، آج بڑے سلیقے سے کیے گئے میک اپ اور جدید فیشن کے لباس پہنے بڑی بڑی مہ جبینوں اور اپسراؤں کو بھی مات دے رہی تھیں۔

دل نشین شاکنگ پنک کلر کے غرارہ سوٹ میں لائٹ میک اپ اور کھلے بالوں میں لگائے گجروں کے ساتھ مغلیہ شہزادی لگ رہی تھی۔ اس کی صراحی دار گردن میں سجا سچے موتیوں کا ہار اس کے گلے میں سج کر اپنی سج دھج میں اضافہ کر رہا تھا۔ سڈول دودھیا بازوؤں میں کلائی سے کہنیوں تک سجی چوڑیاں اور گجرے یقیناً اپنی قسمت پر ناز کر رہے ہوں گے۔ اپنی تمام تر سادگی کے باوجود وہ اتنی دلنشین، اتنی دلنواز لگتی تھی تو آج معمولی سج دھج سے تو وہ قیامت ڈھا رہی تھی۔ اس کا قیامت خیز سراپا شوخ رنگ غرارے میں قدرے اور نمایاں لگ رہا تھا۔

میں مبہوت سا کئی لمحے دیکھے گیا تھا۔

"آپ کیوں اس وقت مراقبے میں چلے گئے بھئی! کیا کوئی خاص چلہ کاٹ رہے ہیں کہ ناغہ کرنا گناہ ہے۔" وہ جانے کب میرے پاس آکر کھڑی ہوئی تھی میں نے بے دھیانی سے نہ سمجھتے ہوئے سر کو جھٹکا تھا۔

"آپ سے کہہ رہی ہوں میں، اگر چلہ ختم ہو گیا ہے تو چلیے! دیر ہو رہی ہے اور یہ لیں گاڑی کی چابی مجھے اور آس بھابھی کو آپ کے ساتھ ہی جانا ہے۔" وہ میری آنکھوں کے آگے ہاتھ ہلاتے ہوئے ایک ہی سانس میں ــــ بڑے مصروف سے انداز میں بولے گئی۔

"واپس آجایئے؟" مجھے اپنی طرف تکتے پا کر وہ جلدی سے بولی شاید میری پرشوق نظروں سے گھبرا کر۔

"بہت خوب صورت لگ رہی ہو دل! بالکل اپنے نام کی طرح؟" میری تعریف پر وہ شرما گئی تھی۔

"سچ بتاؤ دل! کیا میرے لیے بھی ایسے سجا کرو گی؟" میں بے خودی کے عالم میں خود بھی نہیں جانتا تھا کہ کیا کہہ رہا ہوں ــ وہ میری بات سن کر چپ سی ہو گئی تھی۔

وہ اور آس بھابھی میرے ساتھ گاڑی میں تھیں وہیں میری ملاقات گاڑی سے اترتے ہوئے عمر ملک سے بھی ہوئی تھی۔

خاصا سوبر اور ڈیسینٹ سا آنکھوں پر نظر کا چشمہ لگائے وہ بہت پرشوق نظروں سے دیکھتے ہوئے دل سے مخاطب تھا۔ وہ مجھ سے بھی بڑے جوش سے ملا تھا۔ دلنشین اس کی بچپن کی دوست تھی۔ دونوں میں بے تکلفی تھی لیکن پھر بھی نجانے کیوں اس کا اتنے استحقاق سے دل نشین کو تکنا اور والہانہ انداز میں باتیں کرنا مجھے سخت برا لگا تھا۔

"کیا بات ہے تمہاری دل! قسم سے غضب ڈھا رہی ہو یار! لگتا ہے آج قیامت ضرور آئے گی۔" وہ شرارت سے آنکھ دبا کر بولتا مجھے زہر لگ رہا تھا۔ میں نے تعریف کر دی تو وہ کچھ نہیں بولی۔ اور عمر کی تعریف سن کر قہقہے لگا رہی تھی ہمیں جل کر رہ گیا تھا۔

"بکو مت! جب بھی بولنا، فضول ہی بولنا۔ کوئی سن لے گا تو کیا کہے گا کہ ایک مستقبل کا مسیحا کیسے ایک خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر دیوانہ ہوئے جا رہا ہے۔" جواباً وہ اترا کر بولی "اسے اترانا بھی چاہیے تھا۔

وہ یقیناً اس کی بات کو مذاق میں اڑا رہی تھی گویا اس کی نظر میں عمر کی تعریف کی کوئی اہمیت نہیں تھی مجھے یکدم خوشی بھی ہوئی اور اپنے آپ پر حیرت بھی یہ کیا میں شکی مزاج مردوں کی طرح سوچ رہا تھا۔ لیکن اگر دیکھا جائے تو میں اتنا بھی غلط نہیں تھا محبت میں محبوب کے لیے پوزیسو بھی ہونا ہی پڑتا ہے۔

مہندی، مایوں، بارات اور پھر ولیمہ ان تمام فنکشنز میں وہ آل ان آل نمایاں رہی تھی۔

دونوں جوڑے "ہنی مون ٹرپ" پر چلے گئے۔ پیچھے حویلی میں یکدم سناٹا اتر آیا تھا۔ خاموشی سے گھبرا کر میں اور دل نشین باہر کا رخ کرتے۔ لہلہاتے کھیتوں باغوں اور ندی کا پرشور پانی میں بجتا جلترنگ ہمیں خوابوں امیدوں امنگوں کی نئی نئی وادیوں کی سیر کرواتا۔ یہ پندرہ دن ہم نے ایک دوسرے کے ساتھ گزارے تھے۔ پل پل کی رفاقت کے اس مزے کو ہمیشہ کے لیے اپنے ذہنوں میں محفوظ کر لیا تھا۔

دل نشین میرے لیے ہر روز میری پسند کی ڈشز بناتی ــ ــ ــ اور سہ پہر میں ہم دونوں تایا جی کے ساتھ شطرنج کی لمبی لمبی بازیاں لگاتے تو کبھی جی جی سے ان کے بچپن، جوانی کے دلچسپ واقعات سنتے، میوزک سے لطف اندوز ہوتے۔

دل نشین کی حس مزاح غضب کی تھی۔

وہ لوگ پندرہ دن بعد لوٹے تھے اور ان پندرہ دنوں میں ہم نے بہت سی باتیں کیں۔ کبھی کبھار میں بے خود سا ہو کر اگر کوئی معنی خیز جملہ یا بات کر دیتا تو دل کا بلش کرنا مجھے اتنا اچھا لگتا کہ اس کے چہرے پر پھیلی شرم و حیا کی سرخی کو تکنے کی خواہش میں بارہا سرگوشیاں اور جسارتیں کر بیٹھتا اور پھر دل سے خوب ڈانٹ بھی کھاتا۔

اب ہماری گفتگو میں کھیلوں کتابوں، کھانوں اور ملکی و قومی مسائل کے علاوہ اپنے مستقبل کی بھی باتیں تھیں۔ دل کو بیرسٹر بہت اچھے لگتے تھے۔ اسی لیے لاشعوری طور پر میں نے اس ڈگری کے حصول کے لیے بہت محنت کی تھی کہ لنکنز یونیورسٹی میں میں گولڈ میڈلسٹ رہا تھا۔

مجھے تقریباً دو ماہ ہو چکے تھے یہاں آئے ہوئے اور مما کے بار بار فون کر کے واپس بلانے پر بھی میں واپس لوٹنے کا نہیں سوچ رہا تھا۔ میرا یہاں آکر اتنا دل لگ گیا تھا کہ ہمیشہ کے لیے واپس آنے کا عہد دن میں کئی بار میں خود سے ضرور دہراتا، نیویارک میں گزرا اپنا آدھا بچپن، لڑکپن اور پھر جوانی مجھے اتنا مانوس نہیں کر سکا تھا میں آج بھی لاشعوری طور پر ہی سہی اسی گاؤں میں جیتا تھا جہاں میں نے اپنی زندگی کے گیارہ سال گزارے تھے۔

مما کے بے حد اصرار کے باوجود میرا وہاں نہ جانا مما کو بیمار کر گیا تھا۔ فرحین ان کا خوب خیال تو رکھ رہی تھی لیکن اب وہ بھی مجھے لوٹنے پر مجبور کر رہی تھی۔

آج بھی فرحین کا فون آیا تھا۔ مما بہت بیمار تھیں اور پہلے سے کافی ویک بھی اسی لیے مجھے فوراً واپس جانا پڑ رہا تھا۔ ابھی بھی میں شہر سے اپنے جانے کے لیے ٹکٹ کنفرم کروانے اور سیٹ بک کروانے کے بعد لوٹا تھا کہ افشین بھابھی نے مجھے گہری نظروں سے تکتے ہوئے مجھے اپنے کمرے میں آنے کو کہا تھا۔ میں اس وقت خاصا تھکا ہوا تھا اور صرف آرام کرنا چاہ رہا تھا لیکن ان کا بے وقت اپنے کمرے میں بلانا میں الجھ کر رہ گیا تھا سو سر جھٹک کر میں اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا تھا۔

کمرے میں افشین بھابھی اکیلی تھیں۔ رؤف ہوتا تو الگ بات تھی اس لیے میں پرسکون ہو کر اپنے بستر پر لیٹ چکا تھا یہ سوچے بغیر ایسی کون سی بات ہے جو مجھ سے اکیلے میں کرنی ہے کہ اپنے کمرے میں بلا رہی ہیں۔

☼ ☼ ☼

"تو تمہیں کیا لگتا ہے، وہ مان جائے گی؟"

"ہونا تو ایسے ہی چاہیے کیونکہ اس میں اس کا ہی بھلا ہے۔" وہ بضد تھا۔

"لیکن اس سے بات کون کرے گا؟" سب سے اہم نکتہ میں نے اٹھایا۔

"اس سے بات بھی تم کرو گے اور ساری صورت حال بھی تم سمجھاؤ گے۔" سارا ملبہ مجھ پر گرا کر وہ خود

ایک طرف سکون سے ہو کر بیٹھ گیا۔

"مم۔۔۔ میں؟ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے۔ بھلا میں کیسے اس سے بات کروں گا؟" میں کرسی سے یوں اچھلا گویا بچھو نے کاٹ لیا ہو۔

"لیکن کورٹ سے مدد لینے میں کیا حرج ہے بھلا؟" فرحین کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"دیکھو! اگر ہم کورٹ سے مدد لیں گے تو بہت سے مسائل سامنے آئیں گے۔ ہمارا کیس مضبوط سہی لیکن پھر بھی بہت سی پیچیدگیاں ہو سکتی ہیں ظاہر ہے ہمارا نوٹس بھجوانے پر وہ بھی تو ہاتھ پیر ہلائیں گے اور اگر خدانخواستہ انہوں نے دل کی کردار کشی کی یا جواباً ہم پر دل کو حبس بے جا میں رکھنے کا دعوا دائر کر دیا تو پھر ہم کیا کریں گے کیونکہ بہر حال نکاح نامہ تو ان ہی کے پاس ہے۔"

"لیکن یار! ہم خلع کا کیس بھی تو کر سکتے ہیں۔"

"ہاں کر سکتے ہیں۔ بالکل کر سکتے ہیں لیکن اس کے لیے بھی ہمیں دل کے گھر والوں کا ساتھ چاہیے ہو گا اور ادھر تم لوگ اصرار کر رہے ہو کہ کسی کو پتا نہ چلے اور معاملہ بالا ہی بالا طے ہو جائے۔

اور تم لوگ خود ہی کہہ رہے ہو کہ اس سے ان دونوں گھرانوں میں دشمنی کی بنیاد پڑ جائے گی کورٹ کچہری میں ایک دوسرے کے ساتھ گزرے اچھے وقت کی دھول کو ایک دوسرے پر لگائے گئے گندے الزامات کی صورت دھوئیں گے راجاؤں کی عزت کورٹ کچہری میں دھکے کھائے گی اگر ملکوں کی فیملی بھی اس میں برابر کی شریک ہو گی اور دونوں فیوڈل گھرانے خون خرابے کو اولیت دیں گے۔"

"اگر دل سمجھوتا کر لے تو۔۔۔؟" فرحین کا انداز سوالیہ تھا۔

"ہاں! پھر تو صورت حال ساری مختلف ہو گی اگر دل سمجھوتا کر لیتی ہے تو پھر تو آسانی کے ساتھ ہم لوگ کام کر سکتے ہیں لیکن دل مانے تو؟"

"نہیں وہ کبھی نہیں مانے گی! وہ بہت ضدی ہے۔

میں جانتا ہوں جو فیصلہ وہ ایک بار کر لیتی ہے اسے بدلا نہیں کرتی کوئی اور حل نکالو اس کا" اب کی بار میں نے اپنی ہمت کو مجتمع کرتے ہوئے کہا تھا۔

"لیکن کوشش تو کی جا سکتی ہے ناں! نہیں تو ناچار ہمیں کورٹ سے مدد لینی ہو گی۔ لیکن اگر ایسا نہ ہی ہو تو اچھا ہے؟" سرمد نے اپنی رائے دی۔

"ایک حل ہے میرے پاس۔ اگر دل یہ معاملہ اپنے گھر والوں کی مدد سے حل کرے تو یقیناً" فائدہ میں رہے گی۔" فرحین نے چٹکی بجاتے ہوئے مسئلے کا حل بتایا۔

"واہ جی واہ! واقعی میں اللہ عورت کو ایک چیز ایک ہی وقت میں عطا کرتا ہے تو بہت اچھا کرتا ہے اللہ نے تمہاری شکل صرف اچھی بنائی ہے لیکن عقل توبہ الامان؟" سرمد نے فرحین کی بات سن کر کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے توبہ کے سے انداز میں اسے چڑایا۔

"کیا مطلب! ایک تو اتنا اچھا مشورہ دیا ہے تم لوگوں کو اوپر سے تم لوگ۔ آپ کچھ کیوں نہیں کہتے شافع" ناراض لہجے میں توپوں کا رخ میری طرف ہوا۔

"یار سالے! کیوں میری بیوی کو تنگ کر رہے ہو! اب ہر بندہ اپنی عقل کے مطابق ہی تو مشورہ دیتا ہے۔ اس میں اس بے چاری کا کیا قصور ہے۔" حسب عادت فرحین میری اس طرح کی طرفداری پر ہزار بار لعنت بھیجتی وہاں سے واک آؤٹ کر گئی۔

راستے میں لان میں آتی دل سے ٹکراتے ٹکراتے بچی تھی۔ لاؤنج کا دروازہ زور سے بند ہوا تھا' مطلب کافی غصے میں تھی۔

"ام نہیں کیا ہوا ہے؟" دل متعجب تھی۔

"کچھ نہیں! ادھر آؤ۔ تم یہاں بیٹھو۔" میں نے اسے بیٹھنے کی آفر کی تھی۔

"ہم دونوں نے مل کر بہت سوچ بچار کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ۔۔۔" سرمد نے بات ادھوری چھوڑ کر میری طرف دیکھا تھا۔

"کیا فیصلہ کیا ہے آپ لوگوں نے؟" کرسی پر بیٹھے وہ متعجب لہجے میں بولی تھی۔

"کچھ نہیں! تم یہ بتاؤ کہ جی جی سے رابطہ ہوا تمہارا؟" ہوا چاہتے ہوئے بھی میں نے بات بدل دی تھی۔

"نہیں! باوجود کوشش کے میرا ان سے رابطہ نہیں ہو سکا۔ شام کو پھر کروں گی۔"

"تو کیا انہیں یہ بالکل بھی نہیں پتا کہ آپ کہاں ہیں؟" سرمد حیران تھا۔

"نہیں جانتے ہیں۔ رؤف بھائی کو پتا ہے کہ میں یہاں ہوں۔"

"کن حالات میں ہو' یہ بھی؟" سرمد کا انداز سوالیہ تھا۔ کھوجتی ہوئی نظریں جیسے ایکسرے کر رہا ہو۔

"نہیں! اسے فون کر کے میں نے بتایا تھا کہ دلنشین میرے پاس ہے۔ میں کسی کام سے لاہور گیا تھا تو وہیں ایک تقریب میں میری ملاقات دل سے ہو گئی اور میں بے حد اصرار کر کے اپنے ساتھ یہاں لے آیا۔" دل کے چہرے پر پھیلے تذبذب کے آثار کو دیکھ کر اب کی بار جواب میری طرف سے آیا تھا۔

"آپ لوگوں نے بتایا نہیں کیا سوچا ہے پھر آپ نے بیرسٹر سرمد شفیع صاحب؟" اب کے وہ قدرے چبا چبا کر بولی تھی۔ وہ سمجھ گئی تھی کوئی بات ہے ضرور جو جان بوجھ کر اس سے چھپائی جا رہی ہے۔

"اللہ میری توبہ! کبھی بھی حسن اور ذہانت اکٹھی نہیں ہونی چاہیے' ورنہ بڑی تباہی مچتی ہے۔" سرمد زیر لب بڑبڑایا تھا لیکن اس کی یہ بڑبڑاہٹ میں نے بخوبی سن لی تھی اسی لیے دل کی متوقع بحث سے بچنے کے لیے میں نے جلدی جلدی بات کا آغاز کیا تھا۔

"کیا؟ آپ لوگوں کا دماغ تو صحیح ہے؟ آپ کو پتا ہے آپ لوگ کیا کہہ رہے ہیں؟" نتیجہ حسب توقع تھا' وہ تو بپھر پڑی تھی ہماری بات سن کر۔

"پلیز دل ریلیکس! دیکھیں اس کے علاوہ ہمارے پاس کوئی چارہ نہیں ہے۔"

"ارے واہ! یہ دنیا سے علیحدہ کام ہو گیا ہے یا یہ اتنا پیچیدہ ہے کہ قانون کی کسی کتاب میں اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔" وہ تنک کر بولی۔

"یہ بات نہیں ہے دل! بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ دیکھیں! اگر مل بیٹھ کر مسئلہ حل ہو جاتا ہے تو کیا ضرورت ہے اپنی عزت کو کورٹ کچہری میں اچھالنے کی؟" سرمد نے اس کے غصے کو ٹھنڈا کرنا چاہا تھا۔

"تو کیا اب آپ میری عزت بچا رہے ہیں۔ مجھے جھکا کر میری انا کا خون کر کے آپ اس شخص کو فاتح بنا کر ایک دفعہ پھر مجھے اس کے قدموں میں جھکنے پر مجبور کر رہے ہیں اور پھر بھی کہہ رہے ہیں کہ یہ اتنی سی بات ہے۔" اس کا غصہ ہنوز قائم تھا۔ میں خاموش تماشائی بنا دونوں کو باری باری دیکھ رہا تھا۔

"آپ کو کیا لگتا ہے کہ کوٹ کچہری میں جا کر آپ کو انصاف بغیر کوئی قیمت چکائے مل جائے گا۔ ذرا احتساب کی عینک لگا کر اپنا اور اس ملک کے قوانین کا محاسبہ کر کے دیکھئے تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔ کتنا کیچڑ اچھالا جا سکتا ہے آپ پر اور آپ کی فیملی کتنے کرائسس کا شکار ہو سکتی ہے۔ آپ خاندان میں کتنی بدنام ہو سکتی ہیں یہ سوچا ہے آپ نے؟" سرمد بھی اب کی بار غصے سے بولا تھا اور وہ تمام باتیں سنا رہا تھا جو میں باوجود کوشش کے کہہ نہیں پا رہا تھا دل کے چہرے کا رنگ یکلخت بدلا تھا۔

"دیکھیں دل! اگر آپ اسے یہاں بلائیں سمجھائیں کہ میں تمہارے ساتھ اس صورت میں زندگی نہیں گزار سکتی۔ اعتماد کا خون ہونے کے بعد میرا گزارا مشکل ہے تم مجھے طلاق دے دو اسی میں تمہاری اور ہم سب کی بہتری ہے اگر آپ یہ کہہ دیں گی تو نہ تو قیامت ٹوٹے گی نہ ہی آپ جھکیں گی بلکہ جیت آپ کی ہو گی بصورت دیگر۔۔۔"

"بصورت دیگر کیا؟" تیکھے چتوں سے دیکھا تھا۔

"بصورت دیگر وہی ہو گا جیسا آپ چاہیں گی۔ ہم کورٹ سے رابطہ کر کے ان سے مدد مانگیں گے لیکن ایسی صورت میں دونوں فیملیز بھی برابر کی شریک

ہوں گی کیونکہ آپ اپنی فیملی کی سپورٹ کے بغیر یہ کیس نہیں لڑ سکیں گی۔"
"اور اگر وہ نہ مانا تو۔۔۔۔؟" بات شاید اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔
"وہ ہرگز ہرگز انکار نہیں کرے گا۔ وہ ضرور آئے گا بلکہ اسے لازمی آنا ہوگا۔" سرمد اسے نیم رضامند دیکھ کر جوش سے بولا تھا۔
اور مجھے حیرت کا دوسرا جھٹکا لگا تھا۔ اور شدید دکھ بھی ہوا تھا کچھ لوگ، ہمیشہ فیصلہ اور حکم سناتے ہی اچھے لگتے ہیں فخر و غرور سے اٹھے ہوئے سر کو جھکا اور مضمحل دیکھنا بہت مشکل ہوتا ہے اسی لیے اس کا یہ تھکا تھکا سا مضمحل روپ مجھے مجھ سے دیکھا نہیں جا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس شام جو میں بے خبر سویا تو دوسرے دن صبح بمشکل آٹھ بجے اٹھا۔ میں نے کل دوپہر اور پھر رات کو بھی کھانا نہیں کھایا تھا۔ سو اسی لیے شاور لینے کے بعد میں سیدھا اپنے کمرے سے نکل کر کچن کی جانب چلا آیا۔ نرمین بھابھی ناشتا بنانے میں مصروف تھیں جی جی حسب عادت باہر تخت پر تایا جی کو اپنی نگرانی میں ناشتا کروا رہی تھیں۔ تایا جی ناشتا کر رہے تھے اور جی جی ہمیشہ کی طرح اپنے دوپٹے کے پلو سے "نادیدہ" مکھیاں اڑانے میں محو تھیں۔
"شافع پتر! ادھر یہاں آجا اپنے تایا کے پاس۔" مجھے دیکھتے ہی وہ تخت پر میرے لیے جگہ بناتے ہوئے پیار سے بولیں۔ میں ان دونوں کو سلام کر کے وہیں بیٹھ گیا۔
"ارے بھئی برخوردار! کل سارا دن کہاں کی خاک چھانتے پھرتے رہے اور شام کو بھی آکر کمرے میں بند ہوگئے۔" تایا جی کا شکوہ بجا تھا۔ میں واقعی میں کل صبح سے گھر سے غائب تھا۔
"وہ اصل ... تایا میں ذرا شہر گیا ہوا تھا اپنی ٹکٹ کنفرم کروانے کے لیے۔"
"لیکن اتنی جلدی بیٹا؟ ابھی تو تجھے آئے صرف ماہ ہوئے ہیں اور تو تو کہہ رہا تھا ادھر تین چار مہینے رہے گا۔" جی جی نے کہا۔
"ارادہ تو یہی تھا جی جی! لیکن مما کی طبیعت بہت خراب ہے۔ اسپتال میں ایڈمٹ ہیں اس لیے جلدی جانا پڑ رہا ہے لیکن جلدی آؤں گا دوبارہ۔" میں نے انہیں تسلی دی۔
"رہنے دے، جلدی آؤں گا۔ پچھلی مرتبہ بھی یہی کہا تھا تو نے ساڑھے تین سال بعد آیا۔ تو جلدی آئے گا۔" جی جی خفگی بھرے لہجے میں گویا ہوئیں میں ان کی اتنی محبتوں پر قدرے شرمندہ سا ہوگیا اسی لیے سر جھکا گیا۔
"اچھا! اب بس کر دے سکینہ! ایک تو بچوں کے پیچھے پڑ جاتی ہے تو، پتر تو یہ بتا کہ جانا کب ہے۔" تایا جی نے پوچھا۔
"کل شام کی فلائٹ ہے تایا جی!
"کون کہاں جانے کی بعد بات کر رہا ہے؟" افشین بھابھی میرا ناشتا لاتے ہوئے خوش دلی سے بولی تھیں میں سمجھا تھا شاید وہ کل بات نہ سننے پہ ناراض ہوں لیکن ان کے چہرے پر ناراضی کا شائبہ تک نہیں تھا۔
"اپنا شافع کل جا رہا ہے واپس؟" جی جی نے افشین کو بتایا تھا۔
محرابی دروازہ پار کر کے اپنا آنچل تھامتی دل نشین لحہ بھر کو چونکی تھی اور پھر اجنبی رویہ اپناتے بغیر میری طرف دیکھے کچن کی طرف مڑ گئی میرے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی، جانتا تھا کہ وہ مجھ سے ناراض ہوگئی ہے۔

☼ ☼ ☼

کمرے میں اس وقت چاروں نفوس براجمان تھے ہمارے بے حد اصرار پر ہی دلنشین عمر کو میرے گھر یہاں اسلام آباد بلانے پر راضی ہوئی تھی۔
سرمد کا یقین صحیح نکلا تھا۔ دل کی کال ریسیو کرتے ہی

دارالحکومت سے چل پڑا تھا اور اب یہاں دن بارہ بجے ہمارے گھر میں موجود تھا۔ کمرے میں میرے، سرمد، عمر اور فرحین کے علاوہ اسی وقت کوئی نہیں تھا۔ دلنشین اپنے کمرے میں تھی۔ اسے ابھی ہم نے نہیں بلایا تھا۔
عمر کی متلاشی نگاہیں ارد گرد بھٹک رہی تھیں۔ میں بغور اس کی یہ اضطراری کیفیات نوٹ کر رہا تھا اس کی سوچ کا محور صرف اور صرف وہی تھی اور یہ تو میں بخوبی جانتا تھا کہ دل نشین جس کی سوچوں میں آجائے وہ جانے کے باوجود اپنا پیچھا نہیں چھڑا سکتا۔
میں ان ہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھول کر وہ اندر آئی تھی۔ ملگجا سا لباس، سوجی ہوئی آنکھیں اس بات کی غماز تھیں کہ وہ روئی ہے بکھرے بالوں کے ساتھ وہ خود بھی بہت بکھری بکھری لگ رہی تھی۔ عمر نے بے اختیار نظریں چرائی تھیں۔ میں اور سرمد بغور اس کی حالت کا جائزہ لے رہے تھے۔ فرحین نے اپنے پاس صوفے پر اس کی جگہ بنائی تھی۔
"کیسی ہو دل نشین!" بمشکل تمام عمر کے لبوں سے ادا ہوا تھا۔
"تم نے جس حال کو پہنچایا ہے... اسی حال میں ہوں اب تک۔" اس کا لہجہ ابھی بھی بھیگا ہوا تھا۔
فرحین بے اختیار اٹھ کر ڈرائنگ روم کے دروازے کے پاس جا کر کھڑی ہوئی تھی۔ اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا۔
"میں شرمندہ ہوں دلنشین! بہت شرمندہ۔" عمر نے سر جھکا لیا۔
کمرے میں کربناک دبیز تہوں میں چھپی سسکیاں گونج رہی تھیں۔ باہر بادل کن من کن من برس رہے تھے۔
دلنشین کے آنسوؤں میں باہر برستی بارش سے زیادہ روانی تھی۔ دکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبے سسکیوں میں لپٹے درد کے سمندر میں بھیگے شکوے عمر کا سر لحہ بہ لحہ مزید جھکا رہے تھے۔ میں نے اس تکلیف دہ منظر سے گھبرا کر اٹھنا چاہا لیکن دل نے ایک بار پھر ہمیشہ کی طرح سرعت سے میرا ہاتھ تھام کر مجھے روک دیا۔
"کاش! اس وقت بھی یوں ہی ہاتھ تھام کر مجھے روک لیتیں دل! تو آج اتنی اکیلی، اتنی تنہا اور بکھری ہوئی نہ ہوتیں۔" میرے دکھی دل نے سسکی لی۔
"تم نے ایسا کیوں کیا عمر! میرے ساتھ۔ تم تو میرے بچپن کے دوست تھے ناں! تم نے ہی مجھے توڑ دیا۔ دیکھو آج دلنشین دلنشین نہیں رہی، وہ ٹوٹ گئی ہے۔ دل کے اندر وہ چاہتوں بھرا دل ہی نہیں رہا۔ وہ اپنوں کا مان اپنوں کا پیار جو اسے سمیٹے رکھتا تھا، وہ نہیں رہا۔ دل ایک زندہ لاش ہے عمر! اور لاشوں کے ساتھ نہ تو شادی کی جاتی ہے نہ ہی وہ گھر بسایا کرتی ہیں۔ محبت تو دور کی بات۔ میں نے ہمیشہ تمہیں دوست سے بڑھ کر جانا۔ تمہاری ہر غلطی کو میں نے اگنور کیا۔ ہمیشہ تمہارے دکھوں کو اپنے آنچل میں سمیٹا۔ تمہاری آنکھ کے آنسو اپنے دامن کے بجائے اپنے دل پر گرائے اور عمر! تم نے میرے ساتھ کیا کیا؟ تم نے میری محبتوں کا، میری ریاضتوں کا یہ صلہ دیا کہ آج کے بعد دل کسی پر اعتبار ہی نہ کر سکے گی۔ تم نے دل کو بے مول کر دیا اپنے ہاتھوں سے اسے زندہ لاش کے طور پر قبر میں دھکا دے دیا۔ عمر۔۔ عمر تم نے۔۔۔" وہ صوفے پر ایک طرف لڑھک گئی تھی۔ میں اور سرمد یک دم اس کی جانب بڑھے تھے جبکہ عمر حیران پریشان جہاں تھا، وہیں بیٹھا رہ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

بہت دکھی دل کے ساتھ اور سب کو اداس کر کے میں وہاں سے لوٹ آیا تھا۔ یہاں آکر مجھے پتا چلا کہ مما واقعی بیمار تھیں لیکن اسپتال میں ایڈمٹ ہرگز نہیں تھیں، وہ ویک تو تھیں لیکن اتنی زیادہ نہیں کہ وہیل چیئر پر بٹھا کر انہیں واش روم تک لے جایا جائے۔
میں اس غلط بیانی پر غصے کے گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔

تو کیا مما اتنی بے اعتبار تھیں جو مجھے واپس بلانے کے لیے انہوں نے اتنا بڑا ڈراما رچایا۔

”مما! اگر آپ بالکل ٹھیک تھیں تو مجھے وہاں پریشان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“ میں مما سے پوچھے بنا نہ رہ سکا۔

”تمہاری خاطر مائی سن! میں تمہیں بہت یاد کر رہی تھی۔ اس لیے بیٹا! اور دیکھو طبیعت تو میری اب بھی خراب ہے۔“ وہ مجھے چھوٹے بچوں کی طرح پچکارتے ہوئے بولیں۔

”لیکن مما! فرحین نے مجھے بتایا تھا کہ خدانخواستہ آپ اسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔“

”ارے نہیں میری جان! وہ تو بس تمہیں پریشان کر رہی تھی۔“

”لیکن مما! واپس تو مجھے آنا ہی تھا ناں! پھر آپ لوگوں نے ایسا کیوں کرنے دیا فرحین کو؟“ میری جھنجلاہٹ اب غصے میں بدل رہی تھی۔

”چلو! موڈ ٹھیک کرو اور یہ اسپیگیٹی کھا کر بتاؤ کیسی بنی ہے صرف تمہارے لیے تھکن کے باوجود بنائی تمہیں پسند جو ہے۔“

مگر مما کی حد درجہ محبت بھی میرا موڈ ٹھیک نہ کر سکی ہے۔ رہ رہ کر مجھے دل نشین کی آنسوؤں سے بھری ساحرانہ آنکھیں یاد آ کر تڑپا رہی تھیں۔ میرا غصہ کسی صورت ختم ہونے میں نہیں آ رہا تھا جب ہی اگلے پندرہ منٹ بعد میں سامنے پارک میں فرحین کے بالمقابل موجود تھا۔

”تم نے مجھ سے غلط بیانی کیوں کی؟“

”کون سی غلط بیانی؟“ سوالیہ انداز، آنکھوں میں حیرت۔ مجھے سخت زہر لگی تھی۔

”اتنی بچی تم ہرگز نہیں ہو کہ میرے سوال کا جواب نہیں جانتیں تم۔ بولو مجھ سے جھوٹ کیوں بولا مما کے متعلق؟“ میں تقریباً ”دھاڑا تھا۔ غصہ میری نس نس میں بھرا ہوا تھا۔

”یہ تم کس لہجے میں مجھ سے بات کر رہے ہو [illegible] آج سے پہلے تو تم نے میری بڑی سے بڑی غلطی [illegible] کیا ہے اور آج اتنی چھوٹی سی بات پر۔۔۔“ آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو بے دردی سے رگڑتے ہوئے [illegible]

”چھوٹی سی بات؟“ مجھے کرنٹ لگا تھا۔

”یہ چھوٹی سی بات ہے؟ تم جانتی ہو کہ تم نے [illegible] مما کے حوالے سے کتنا ٹارچر کیا ہے۔“ میرا انداز [illegible] برہم تھا۔

”تو پھر میں کیا کرتی شافع! یہاں سب تمہارے [illegible] بے حد اداس تھے یونیورسٹی فیلوز تمہارے اعزاز میں تمہاری شاندار کامیابی کو مل کر سیلیبریٹ کرنا چاہ رہے تھے، وہ بار بار اصرار کر رہے تھے تمہیں بلانے کے [illegible] اور تم آ کر نہیں دے رہے تھے۔ بالآخر میں نے تھک ہار کر یہ ڈراما رچایا۔“

”اوہ فری! تم نہیں جانتیں کہ تم نے میرا کتنا [illegible] نقصان کیا ہے۔“ میں نے تھک ہار کر بینچ پر بیٹھ [illegible] آنکھیں موند لیں۔ ایک خوب صورت معصوم ناراض چہرہ میری آنکھوں میں پوری آب و تاب کے ساتھ روشن ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

”میں نے فیصلہ کیا ہے شافع! کہ اب فرحین کے ایگزامز کے بعد تمہاری شادی کر دوں۔“ پلیٹ میں اپنے لیے سالن ڈالتا میرا ہاتھ ڈونگے کے پاس ہی رک گیا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ بیٹا جی! کہ ہر ماں کی طرح میری بھی خواہش ہے کہ میں جلد از جلد اپنے بیٹے کے سر پر سہرا سجا دیکھوں۔“ مما نے مسکراتی نظروں سے مجھے دیکھا۔

”یہ آپ کو میری شادی کی کیا جلدی پڑ گئی جبکہ ابھی تو مجھے پریکٹس شروع کرنا [illegible]

[illegible] خود کو اسٹیبلش کرتا ہے۔“

”[illegible] جانتی ہوں، لیکن بیٹا! میں اب مزید انتظار نہیں کر [illegible] اکیلے میں میرا جی گھبراتا ہے۔ بہو آ جائے گی تو گھر [illegible] رونق ہو گی۔ وہ گھر سنبھالے گی اور میں تمہارے [illegible] اور میں نے زندگی میں اتنا تو کما لیا ہے کہ تم شادی کے کچھ عرصے بعد تک بھی بیٹھ کر کھا سکو۔“

”لیکن مما؟“

”نو آرگیومنٹ؟ اگر تمہاری کوئی پسند ہے تو بتاؤ ورنہ میں تمہارے لیے لڑکی پسند کر چکی ہوں۔“ دو [illegible] انداز میں انہوں نے کہا۔

”اوکے مما! پھر جیسے آپ کی مرضی۔ لیکن میری ایک شرط ہے۔“

”وہ کیا؟“

”میں شادی پاکستان جا کر کروں گا؟“

”کیا مطلب؟ کس لیے؟ یہاں کیا تکلیف ہے تمہیں شادی کرنے میں؟“ تیکھی چتون سے کہتی وہ [illegible] لگ رہی تھیں۔

لیکن مجھے اپنا مقدمہ تو خود ہی لڑنا تھا ناں۔ بغیر پریکٹس شروع کیے اپنی زندگی کا سب سے بڑا اور اہم فیصلہ۔

”مما پلیز! کیا آپ کا دل نہیں چاہتا اپنوں میں واپس لوٹنے کا؟ آپ کو کبھی بھی پاکستان یاد نہیں آیا؟ وہ مٹی وہ خوشبو وہ چاہتیں، وہ محبتیں مما! ایک دفعہ بھی آپ کا [illegible] نہیں چاہا واپس پلٹنے کو؟ کیوں مما اتنی سرد مہری اتنی ضد کیوں، کیوں، کیوں خود پر ظلم کر رہی ہیں۔ نہ خود پاکستان گئیں نہ ہی اپنے والدین سے رابطہ رکھا۔“

شافع! انہوں نے مجھے روکنا چاہا۔

”آج مجھے مت روکیں مما! مجھے کہنے دیں، کیوں آپ نے ایسا کیا؟“

”میں تمہیں قطعی اجازت نہیں دوں گی اپنی [illegible] ڈسکس کرنے کی؟“ وہ دھاڑیں۔

”ٹھیک ہے مما! پھر میں بھی فیصلہ کر چکا ہوں کہ پاکستان ضرور سیٹل ہوں گا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔“ میں بضد تھا۔

”دیکھو شافع! تم میرا آخری سہارا ہو خدا کے لیے مجھے اور تنگ مت کرو پلیز! میری زندگی پہلے ہی بڑی مشکل گزری ہے اب اسے مزید مشکل مت بناؤ میرے لیے۔ ضد مت کرو۔“ وہ تھکے تھکے انداز میں کہہ رہی تھیں۔ مجھے اپنے لہجے کا احساس ہوا۔

”اچھا چھوڑیں اس وقت اس بات کو۔ چلیں سوری! آئندہ آپ کو نہیں ناراض کروں گا، چلیں مجھے بتائیں کہ کس لڑکی کے ساتھ میری شادی کرنا چاہ رہی ہیں؟“

”بیٹا! فرحین کے علاوہ کوئی لڑکی تمہارے ساتھ سج ہی نہیں سکتی، وہ تمہیں سمجھتی ہے۔ بچپن سے تمہاری اور اس کی دوستی رہی ہے۔ انڈرسٹینڈنگ ہے تم دونوں کے درمیان اس لیے۔۔۔“

”واٹ مما! آئی کانٹ بلیو اٹ مما! یہ آپ کہہ رہی ہیں۔۔۔ نہیں مما! میں فرحین سے شادی نہیں کروں گا۔“

”لیکن کیوں بیٹا! وہ تو تمہیں بہت پسند کرتی ہے۔“ مما حیران ہوئیں۔

”لیکن مما! میں تو نہیں ناں اور اگر وہ مجھے پسند کرتی

ہے تو اس میں میرا کیا قصور؟ میں نے اپنے لیے لڑکی پسند کرلی ہے۔" جھنجلائے انداز میں بالآخر میں نے اپنے دل کی بات کہہ ہی دی۔

"اوہ! تو یوں کہو ناں کہ پہلے ہی کسی کے ساتھ کمٹ منٹ کرچکے ہو کسی اور سے کیے گئے وعدے زیادہ امپورٹنٹ ہیں تمہارے لیے اپنی ماں کی محبت سے۔" ان کا لہجہ خاصا طنزیہ ہوگیا تھا مگر میں صبر کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔

"مما پلیز۔ آپ سے مجھے بے حد محبت ہے۔ لیکن مما! میری اس سے صرف کمٹ منٹ ہی نہیں، مجھے اس سے محبت بھی ہے، بے حد اور بے حساب اور مما اگر وہ مجھے نہ ملی تو میں کبھی شادی نہیں کروں گا۔"

"کون ہے وہ لڑکی؟"

"مما! میں تایا سکندر حیات کی بیٹی دلنشین سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" میں نے بم بلاسٹ کیا تھا۔

"کیا؟ تم ہوش میں تو ہو تمہیں پتا ہے تم کیا کہہ رہے ہو کیا میں نے اس لیے تمہیں پڑھا لکھا کر اتنا بڑا کیا کہ کل کو میرے ہی دشمنوں کی بیٹی کو لا کر میرے سر پر بٹھا دو؟" وہ ہذیانی انداز میں چیخنے لگیں۔

"میں نے کچھ غلط نہیں کیا مما! صرف اپنوں سے جڑنا چاہا ہے اور محبت کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔"

"لیکن اس لڑکی سے محبت کرنا جرم ہے۔ تم نے میرے دشمنوں کو ایک مرتبہ پھر مجھے ہرانے کا موقع دے دیا ہے۔ پہلے باپ کیا کم تھا کہ اب بیٹا بھی۔۔۔"

"مما، مما! وہ ہمارے اپنے ہیں۔ آپ نے خود ساختہ بیر باندھ رکھا ہے ان کے ساتھ۔"

"خود ساختہ بیر؟ تم اسے خود ساختہ بیر کہتے ہو شافع! کیسے بیٹے ہو کہ جن لوگوں نے تمہاری ماں کی ساری زندگی تباہ و برباد کردی، ان لوگوں کی حمایت کر رہے ہو اور ماں کو جھٹلا رہے ہو۔ اسی دن کے ڈر سے میں تمہیں وہاں جانے سے روکتی تھی۔ کر دیا ناں تمہاری اس "جی جی" نے تم پر بھی کالا جادو جیسے اس کی بہن نے تمہارے باپ پر کیا تھا۔" وہ جاہلانہ انداز میں لڑتی ہوئی کہیں سے بھی اعلا تعلیم یافتہ مما نہیں لگ رہی تھیں جن کی گفتگو کی شائستگی کی ایک دنیا مداح تھی۔ مجھے ان کی باتیں سن کر حقیقتاً دکھ ہوا تھا۔ میں تڑپ کر بول اٹھا تھا۔

"میں کوئی بچہ نہیں ہوں کہ اپنا اچھا برا نہ سمجھ سکوں۔ سب کچھ جانتا اور سمجھتا ہوں کون صحیح ہے اور کون غلط سب اندازہ ہے مجھے۔۔۔ آپ نے صرف اپنی جھوٹی انا اور ضد کی خاطر مجھے میرے اپنوں سے دور رکھا مما! میں ایک عرصے تک اپنی شناخت کو تلاش کرتا رہا۔ آپ نے مجھے میری جڑوں سے اکھاڑ کر یہاں لا پٹخا۔ جہاں مجھے نہ اپنی شناخت ملی نہ محبت نہ مان۔ مما! کیا دیا مجھے آج تک یہاں کی ہواؤں نے، یہاں کے موسموں نے، یہاں کے لوگوں نے؟ بلکہ مجھ سے میرا باپ، میری ماں تک چھین لی۔ میرا باپ اپنوں سے دور ہو کر ان اجنبی فضاؤں میں محبت، اپنوں کا مان نہ ملنے پر مجھ سے روٹھ گیا اور میری ماں دو وقت کی روٹی کمانے کے چکروں میں ایسا پڑی کہ اپنے گیارہ سالہ بچے کو بھول گئی کہ اسے کیا چاہیے؟ وقت پر کھانا، اسکول فیس اور اچھے کپڑے کے علاوہ بھی بچوں کو بہت کچھ چاہیے ہوتا ہے مما! ذرا سوچیں کیا آپ نے کبھی مجھ سے سکون سے دو گھڑی بیٹھ کر بات کی۔ کبھی میرے دل تک پہنچنے کی کوشش کی۔ نہیں ناں مما! تو کیوں اب جبکہ مجھے میرے اپنوں سے شناخت ملی ہے، مان ملا ہے پیار ملا ہے تو آپ مجھے ان سے دور کرنا چاہ رہی ہیں کیوں؟"

مما یک ٹک جذبات سے سرخ پڑ جانے والا میرا چہرہ دیکھتی رہیں۔ میں شاید کچھ زیادہ ہی بول گیا تھا۔ چند لمحے بعد مما نے اس خاموشی کو توڑا تھا۔

"تو کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟" آواز کے ساتھ ساتھ لہجہ بھی سرد تھا۔

"جی مما! میں شادی کروں گا تو صرف دلنشین سے اور کسی سے نہیں؟" میں ڈٹ کر بولا تھا۔

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ فرحین تم سے محبت کرتی ہے؟"

"فار گاڈ سیک مما! فرحین اگر مجھ سے محبت کرتی ہے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ میں نے تو کبھی اس کی حوصلہ افزائی بھی نہیں کی۔ بہرحال جو بھی ہے آپ اسے سمجھائیں کہ مجھے بھول جائے۔ میں فرحین سے کسی صورت شادی نہیں کروں گا۔" میں مما کے تاثرات جانے بغیر باہر نکل آیا تھا۔ اب میرا رخ لیہسی کی جانب تھا۔ مجھے جلد از جلد پاکستان پہنچنا تھا۔

☼ ☼ ☼

پچھلے تین گھنٹے سے آئی سی یو کے باہر اضطراری انداز میں ادھر سے ادھر چلنے کی وجہ سے میری ٹانگیں شل ہوچکی تھیں سترہ گھنٹے کی طویل مسافت کے بعد جیسے ہی میں لاہور ایئرپورٹ پر پہنچا رؤف کو کال کرتے ہی مجھے یہ روح فرسا خبر ملی کہ تایا جی کو شدید نوعیت کا ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور وہ اس وقت آئی سی یو زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ میرے قدموں تلے نہ زمین رہی نہ سر پر آسمان۔

میرے تایا جی ہسپتال میں تھے زندگی اور موت کی کشمکش میں اور مجھے کسی نے اطلاع بھی نہ دی۔

میں سیدھا اسپتال پہنچا تھا تایا جی کے پاس۔

مجھے تایا جی سے بہت محبت تھی مجھے ان سے ڈیڈی کی مہک آتی تھی۔ میرے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ میں تو اپنا دکھ شیئر کرنے آیا تھا۔ ان کی ضعیف لیکن مضبوط بانہوں میں پناہ ڈھونڈنے آیا تھا ان کے سینے سے لگ کر اپنے تمام آنسو بہانے آیا تھا لیکن یہاں آکر مجھے اپنے تمام غموں دکھوں سے زیادہ ان کا دکھ بڑا لگ رہا تھا۔

سب وہاں موجود تھے۔ جی جی، رؤف، مسعود اور فرحین بھابھی مجھے دیکھ کر سب ایک لمحے کو حیران ہوئے تھے جی جی ایک طرف کونے میں جائے نماز بچھا کر غالباً کوئی وظیفہ پڑھنے میں مگن تھیں۔۔۔ ان کا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔

مسعود ڈاکٹر کے پاس کھڑا شاید کوئی بات کر رہا تھا۔ رؤف مجھے دیکھتے ہی آگے بڑھ کر میرے گلے لگ کر بچوں کی طرح سسکنے لگا تھا۔ میں اسے کیا تسلی دیتا، میرا دل تو خود موم کی طرح پگھل رہا تھا۔

"ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں رؤف!" میں نے اسے خود سے علیحدہ کرتے ہوئے پوچھا۔

"زیادہ پرامید نہیں ہیں کہہ رہے ہیں بہت شدید قسم کا اٹیک ہوا ہے کومے میں ہیں کسی شدید ذہنی دباؤ کی وجہ سے ان کی یہ حالت ہوئی ہے۔" رؤف آنسو صاف کرتے ہوئے بولا میرا دل کٹ کر رہ گیا۔

"تم فکر نہ کرو یار! سب ٹھیک ہو جائے گا انہیں اس وقت ہماری دعاؤں کی ضرورت ہے۔" میں نے تسلی آمیز لہجے میں اس کا شانہ تھپکا۔

پھر میں نے دلنشین کو دیکھا وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ سب سے لاتعلق نظر آئی میں اس وقت اس کی حالت سمجھ سکتا تھا۔ رؤف جب ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق کچھ میڈیسن لینے کے لیے گیا تو میں نرمین بھابھی اور اس کے پاس گیا۔ نرمین بھابھی مجھے تایا جی کی بیماری کی تفصیلات سنا رہی تھیں لیکن دل نے میری طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔

مسلسل تین گھنٹے سے میں ادھر سے ادھر چکر لگا رہا تھا۔ بھوک اور تھکن سے میرا برا حال تھا۔ میں کل صبح سے بھوکا تھا۔ پرسوں شام ڈنر کے وقت مما سے لڑائی کرنے کے بعد میں کھانا وہاں ادھورا چھوڑ کر آگیا تھا اور پھر پیکنگ اور ٹکٹ کنفرم کرنے میں مجھے کھانے کا یاد ہی نہ رہا۔ جہاز میں بھی میں نے کچھ نہ کھایا تھا مجھے بار بار مما یاد آرہی تھیں۔ جذبات میں آکر میں ان سے لڑ جھگڑ کر آتو گیا تھا مگر اب مسلسل ان کی طرف سے پریشان تھا۔ آتے وقت میں مما کے کمرے میں ایک لیٹر چھوڑ آیا تھا اور اس میں لکھ دیا تھا کہ میں پاکستان جا رہا ہوں شاید کبھی نہ واپس آنے کے لیے میں نہیں جانتا کہ اتنا غصہ مجھے کیوں آرہا تھا شاید اپنی محبت کی ناقدری پر یا فرحین کو دی گئی مما کی اہمیت پر؟ حالانکہ میں فطری طور پر جذباتی نہیں ہوں بلکہ میں بڑا ٹھنڈا دماغ رکھنے والا شخص ہوں۔

والدین بچوں کو دنیا بھر کی خوشیوں اور آسائشوں کا

عادی بنا لیتے ہیں لیکن ان کی زندگی کا اہم ترین فیصلہ خود کر کے انہیں مشکل میں ڈال دیتے ہیں۔ حالانکہ مما اور ڈیڈی کی اپنی پسند کی شادی تھی۔

ڈیڈی اور مما کی یونیورسٹی میں ملاقات ہوئی تھی جو رفتہ رفتہ دوستی میں اور پھر دوستی محبت میں بدل گئی۔ ڈیڈی کا تعلق ایک جاگیردارانہ دیہاتی فیملی سے تھا ممی کا تعلق شہر سے تھا لیکن ڈیڈی کی محبت کا بھوت اتنا سر چڑھ کر بول رہا تھا کہ انہوں نے والدین کی مخالفت مول لے کر ڈیڈی سے شادی کر لی تھی۔ مما ڈیڈی کے لیے بہت زیادہ پوزیسو تھیں۔ اپنے علاوہ وہ کسی کو بھی ڈیڈی سے زیادہ دیر باتیں نہیں کرنے دیتی تھیں۔

پہلے پانچ سال بہت پرسکون خوشیوں کے ہنڈولے میں جھولتے گزرے۔ میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھا۔ رفتہ رفتہ مما گاؤں کے ماحول سے اکتانے لگی تھیں حالانکہ یہاں پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی مما آزادانہ ہر طرف گھومتی پھرتیں۔ مما نے اپنی جذباتی اور ضدی طبیعت کے باعث والدین سے بھی قطع تعلق کر لیا تھا۔ مما اور ڈیڈی کے درمیان جھگڑے ہونے لگے تھے۔ تین سال مزید گزر گئے تھے۔

جب دلنشین پیدا ہوئی تھی زندگی ایک دفعہ پھر خوب صورت ہو گئی تھی۔ اتنی پیاری گلابی گلابی ہاتھ پیروں والی وہ باربی ڈول سی بچی مما کی توجہ بھی اپنی طرف مبذول کروا چکی تھی۔ دلنشین کا نام بھی مما نے ہی رکھا تھا۔ مما اور میں ہر وقت دلنشین کے اردگرد گھومتے پھرتے تھے۔ دلنشین مما سے اتنی مانوس ہو گئی تھی کہ ہر وقت ان کے پاس رہتی تھی۔ جی جی اور تایا کے پاس تو وہ جاتی ہی نہ تھی۔

بات اتنی بڑی نہیں تھی جتنا بتنگڑ بنا دیا گیا تھا۔

جی جی کی چھوٹی بہن ان دنوں بہاول پور سے یہاں آئی ہوئی تھی۔ بے پناہ خوب صورت اور اونچی لمبی مٹیار سی امینہ خالہ سب کو ہی بہت پسند تھیں۔ سننے میں آیا تھا کہ وہ ڈیڈی کی منگیتر تھیں لیکن ڈیڈی نے مما کو پسند کر لیا اس لیے ان کی شادی بہاول پور میں ہی ان کے کسی رشتہ دار سے کر دی گئی۔ ایک دن شاید باتوں باتوں میں ڈیڈی نے مما کو بتا دیا تھا۔ تو جب وہ اپنی بہن کے پاس رہنے کے لیے آتیں تو مما کو یہ بات ذرا بھی پسند نہ آئی۔ وہ مشکوک نظروں سے ڈیڈی اور امینہ خالہ کو دیکھتیں۔ ایک دن ساون کے موسم میں بارش کے بعد جی جی اور مما نے مل کر پکوڑے بنائے۔ یوں ہی مذاق ہی مذاق میں امینہ خالہ نے ڈیڈی کی پلیٹ میں سے ایک پکوڑا اٹھا لیا۔ مما کو برا تو بہت لگا مگر صبر کے گھونٹ بھر کر رہ گئیں لیکن اسی دن شام کو باہر کھیتوں میں جانے کے لیے سب ہی تیار تھے۔ اس وقت وہ پگڈنڈی تھی، وہاں پر سڑک نہیں تھی۔ اچانک جانے کیسے خالہ کا پاؤں پھسلا اور لڑکھڑا کر نیچے پانی والے کھیتوں میں گرنے ہی لگی تھیں کہ ڈیڈی جو ان کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے انہیں اپنی بانہوں میں تھام کر گرنے سے بچا لیا تھا۔ امینہ خالہ کا سر ڈیڈی کے کندھے پر تھا اور ایک ہاتھ سے انہوں نے ڈیڈی کی شرٹ کو سینے پر پکڑ رکھا تھا۔ مما نے وہ سب دیکھا تو ان کی برداشت کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ انہوں نے ڈیڈی اور امینہ خالہ پر جی بھر کر گندے الزامات کی بوچھاڑ کر دی۔

بقول ان کے جی جی اور ان کی بہن سازش کر کے ڈیڈی کو ورغلا کر مما کو ان کی زندگی سے نکالنا چاہ رہی ہیں۔ امینہ خالہ، جی جی اور ڈیڈی نے خاص طور پر ان کے ہر الزام، ہر بدگمانی کی تردید کی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں اور فوراً "طلاق" کا مطالبہ کرنے لگیں۔ سب کے سمجھانے پر بڑی مشکل سے وہ راضی ہوئیں تو اس بات پر کہ یا تو میرے ساتھ ابھی اسی وقت یہ حویلی چھوڑیں یا پھر مجھے طلاق دے دیں۔ مما نے تو جذبات میں آ کر کسی کا نہیں سوچا لیکن ڈیڈی اور تایا جی نے میرا ضرور بھلا سوچا کیونکہ گھر ٹوٹنے کی صورت میں سب سے زیادہ نقصان میرا ہوتا۔

مما اور ڈیڈی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے وہ گاؤں، وہ ملک ہی چھوڑ آئے اور امریکہ آ بسے۔ مما پر عجیب بے حسی سے طاری ہو گئی تھی وہ کسی کو بھی یاد نہ کرتیں ڈیڈی سے بھی ان کے تعلقات خراب تھے۔

مما نے مجھے بھی نظر انداز کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان دنوں میں ڈیڈی کے اور بھی قریب ہو گیا، اپنوں سے دوری اور مما کی بے اعتنائی نے ڈیڈی کو اندر سے توڑ پھوڑ دیا اور ایک دن وہ چپکے سے مجھے ہمیشہ کے لیے اس اجنبی شہر کی اجنبی فضاؤں میں تنہا چھوڑ گئے۔ صرف مما کی ضد و انا نے مجھے اور ڈیڈی کو ہمیشہ کے لیے اپنوں سے دور کر دیا۔

اتنے سال گزر جانے کے باوجود مما کے دل کا میل نہیں ختم ہوا تھا ان کے دل کی کدورت نہیں ختم ہوئی تھی۔ نہ جانے یہ کیسی بے حسی، کیسی نفرت اور کیسی کدورت تھی جو ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔

لیکن میں ہمیشہ تو مما کی جھوٹی انا کی بھینٹ نہیں چڑھ سکتا تھا۔ سو اسی لیے پاکستان آ گیا اور اپنوں کی محبت پا کر اپنی شناخت کو پا لیا لیکن مما جو کہا کرتی تھیں کہ دلنشین کو اپنی بہو بناؤں گی، یہ اللہ تعالیٰ نے میرے شافع کے لیے پیاری سی گڑیا تحفے میں بھیجی ہے۔ اسی کی مخالف بن گئیں۔ کیا نفرت کا جذبہ اتنا طاقت ور ہوتا ہے کہ محبتوں، چاہتوں کے موسم کا اثر بھی نہیں ہوتا۔ اسی لیے میں یہ سب سوچتا تو اپنا آپ اپنا فیصلہ بالکل صحیح لگتا۔

میں ان ہی سوچوں میں غلطاں تھا کہ ڈاکٹر آئی سی یو سے باہر آتے دکھائی دیے تھے۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی دلنشین اور نرمین بھابھی ان کے پاس پہنچ چکی تھیں۔ جی جی نے بھی سجدے سے سر اٹھایا تھا۔

"مبارک ہو، مریض کو ہوش آ گیا ہے۔ آپ سب اگر ملنا چاہیں تو باری باری اندر چلے جائیں لیکن انہیں زیادہ بات نہ کرنے دیجیے گا پلیز؟" ڈاکٹر اپنے پیشہ ورانہ انداز میں چند ہدایات دیتا ہوا ہمارے اندر خوشی و مسرت کے پھول کھلاتا آگے بڑھ گیا۔

اتنے عرصے میں پہلی مرتبہ میں نے دلنشین کے چہرے پر سکون و اطمینان ہلکورے لیتا دیکھا تھا۔ میرا [illegible] نظر انداز کرنے والا گلہ جاتا رہا۔

اس شام ہم سب بہت، بہت خوش تھے۔ فاروق اور [illegible] بھابھی بھی دبئی سے آ چکے تھے، رؤف مسعود اور ان کی بیویاں بھی آ چکی تھیں سب باری باری ملنے گئے تھے۔ آکسیجن ماسک ان کے چہرے سے ہٹا دیا گیا تھا۔ اب وہ قدرتی آکسیجن سے سانس لے رہے تھے لیکن تھوڑی ہی دیر بعد پھر ان کا تنفس بگڑنے لگا تو ڈاکٹرز نے انہیں سکون کا انجکشن دے دیا۔

تایا جی کو تین دن بعد ہوش آیا تھا اور یہ تین دن اس گھر کے مکینوں پر کس قدر بھاری تھے میں سمجھ سکتا تھا۔

"شافع پتر! تو جب سے آیا ہے تجھے نہ آرام کا موقع ملا ہے نہ تو نے کچھ کھایا ہے۔ ایسا کر پتر تو گھر چلا جا اور ساتھ میں دل کو بھی لے جا۔"

یوں جی جی کے بے حد اصرار پہ میں اور دل واپس حویلی آ گئے تھے۔ راستے میں بھی وہ خاموش بیٹھی تھی میں نے ایک دوبار اس سے بات کرنا چاہی لیکن اس نے مجھے بری طرح سے ڈانٹ دیا میں بار بار الجھ رہا تھا کہ آخر ایسی کیا بات ہے جو وہ مجھ سے اتنی بے رخی سے بات کرتی ہے بالآخر میرے ضبط کا پیمانہ لبریز ہو گیا تب ہی اس کے گاڑی سے اترتے ہوئے پوچھ بیٹھا۔

"دلنشین! کیا بات ہے جو تمہیں پریشان کر رہی ہے۔ آخر تم مجھے اتنا اگنور کیوں کر رہی ہو؟ تمہیں پتا ہے کہ تمہاری یہ بے رخی مجھے کتنی تکلیف دیتی ہے۔"

"اچھا مسٹر شافع رضا آپ میں بے رخی اور تکلیف کو محسوس کرنے کی خوبی بھی ہے۔ ویسے کیا کمال خوبیاں موجود ہیں آپ میں؟" انتہائی طنزیہ اور چبھتا ہوا لہجہ میں سمجھ نہ سکا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔

"آخر ایسا کیا کر دیا ہے میں نے دل! جو تم ایسی باتیں کر رہی ہو؟"

"ایسی باتیں میں کیوں کر رہی ہوں مسٹر شافع! یہ اپنے آپ سے پوچھتے یا اپنی ماں سے جنہوں نے میرے شریف و معصوم باپ کو اس حال تک پہنچایا ہے۔ یاد رکھیے مسٹر شافع! اگر میرے ابا جی کو کچھ ہو گیا ناں تو میں آپ کو کبھی بھی معاف نہیں کروں گی۔"

"ہوا کیا ہے دل! مجھے سچ سچ بتاؤ۔" اب کی بار میں

غصے سے دھاڑا تھا۔ اسے بازو سے پکڑ میں اپنے کمرے میں کھینچ لایا تھا۔ مبادا گھر میں کوئی دوسرا نہ سن لے۔

"مجھ سے کیا پوچھتے ہیں؟ آپ اپنی ماں سے پوچھئے جا کر، جنہیں اپنی جھوٹی انا، نفرت اور کدورت عزیز ہے۔ گھٹ گھٹ کر مرجائیں گی وہ اپنے اسی غرور و گھمنڈ میں۔ میں آپ کو ورغلا رہی ہوں ناں؟ آپ کو بہکا کر ایک دفعہ پھر اپنی خالہ کی طرح آپ کی مما سے دور کر رہی ہوں ناں تو پھر بچ جائیں ناں مجھ سے۔ کیوں آئے تھے یہاں اگر اتنے سال رہ لیے تھے ہمارے بغیر تو اب بھی نہ آتے ہم نے —— آپ کو بلایا کبھی؟ کوئی رابطہ رکھا؟ خدا کے لیے چلے جائیے یہاں سے ہماری زندگیوں سے؟" وہ چیختے روتے چلاتے کہہ رہی تھی اور میں یک ٹک غائب دماغی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"اور آپ مسٹر شافع! آپ کیوں میری خاطر ایک عام دیہاتی جاہل لڑکی کی خاطر ایک ویل اسٹیبلشڈ ویل آف لڑکی کو چھوڑ رہے ہیں۔ اس کی محبت کو ٹھکرا رہے ہیں۔ آخر ایک جاہل اور دیہاتی لڑکی آپ کو دے ہی کیا سکتی ہے ویسے بھی آپ کو تو اس سے عشق ہے ناں، بہت محبت کرتے ہیں اس سے۔"

"یہ —— یہ سب تم سے مما نے کہا ہے؟" میں بمشکل تمام بولا تھا۔

"ہاں! لیکن مجھ سے نہیں میرے باپ سے کہ اپنی بیوی اور سالی کو تو نہ سنبھال سکے۔ اب کم از کم اپنی بیٹی کو تو نکیل ڈال کر رکھو تاکہ ایک اور آبگینے جنم نہ لے سکے۔ ایک اور رضا زندگی سے دور نہ جاسکے۔ تو جائیے مسٹر شافع رضا! آج آپ دل نشین کی زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکل گئے اور جا کر بتائیے اپنی ماں کو کہ ایک اور رضا ایک اور رامینہ کے چنگل میں پھنسنے سے بچ گیا اور اب ایک اور آبگینے جنم نہیں لے گی۔

اور مسٹر شافع! مجھے آپ کی محبت میں دیا گیا فریب اور دھوکا ہمیشہ یاد رہے گا محبت کے تحفے کے طور پر۔ تھینک یو تھینک یو سو مچ۔

اور ہاں! ایک بات یاد رکھیے۔ اگر میرے باپ کو کچھ ہوا ناں تو میں آپ کو زندگی بھر معاف نہیں کروں گی۔" وہ جاتے جاتے دروازے سے پلٹی تھی۔

"دل —— دلنشین! میری بات سنو۔"

لیکن وہ مجھے سنے بغیر آگے اور آگے بڑھتی گئی تھی یہ چند قدموں کے فاصلے ہمارے درمیان کئی صدیوں پر محیط ہو کر سینے پر ایک بھاری بوجھ گرا گئے تھے۔

دوسرے دن ہم تایا جی کے پاس پہنچے تھے لیکن تھوڑی دیر بعد ہی وہ ہم سے روٹھ کر چلے گئے اور میری دنیا ہمیشہ کے لیے ویران کر گئے۔ حالانکہ کل رات سے اب تک میں نے کتنی ہی دعائیں مانگی تھیں ان کی صحت کے لیے، ان کی زندگی کے لیے لیکن قدرت نے ان کی زندگی اتنی ہی لکھی تھی۔

ایک ہفتے بعد بھاری بوجھ سینے پر لادے وہاں سے لوٹ آیا تھا۔ واپس آتے وقت میں نے ایک دفعہ پھر کاسہ دل دلنشین کے سامنے پھیلایا تھا۔

بھلا اب اپنے باپ کی قاتل کے بیٹے سے وہ کیونکر شادی کرتی۔

باقی کی کہانی بڑی سادہ سی ہے، میرے لیے پھانسی کا پھندا شادی کے نام پر مما پہلے ہی تیار کر چکی تھیں۔ میں نے ان سے کچھ نہیں کہا تھا۔ کوئی گلہ کوئی شکوہ نہیں کیا تھا۔ میری قسمت میں ہارنا تھا سو میں ہار گیا۔ پھر کوئی شکوہ شکایت کیسی؟ کبھی کبھار میں سوچتا کہ فرحین کی محبت میری محبت سے زیادہ طاقت ور تھی یا میں کمزور تھا۔

بہت ہی خاموشی سے فرحین میری زندگی میں شامل ہوئی تھی —— میں روبوٹ کی طرح سارے کام کیے جاتا۔ فرحین کے حقوق اور ایک فرماں بردار بیٹے کے تمام حقوق پورے کیا جاتا لیکن میں مما سے ذہنی طور پر اور بھی دور ہو گیا تھا۔ میرا لاتعلق سا رویہ وہ بھی محسوس کرتی تھیں لیکن کہتی کچھ نہیں تھیں۔ کبھی کبھار مجھے احساس ہوتا، شاید وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہیں۔ لیکن انہوں نے زبانی کبھی کچھ نہیں کہا تھا اندر ہی اندر انہیں یہ دکھ دیمک کی طرح چاٹ گیا تھا۔

ان کا اکلوتا بیٹا ان سے اس قدر دور ہو گیا تھا۔ اسی لیے وہ زیادہ دیر جی نہ پائیں اور ایک سال بعد مجھے پھر ایک دفعہ اس بھری دنیا میں تنہا کر گئیں۔ جاتے ہوئے مجھ سے معافی مانگی تو میں غائب دماغی سے سوچے گیا کہ کس بات کی معافی، یہ سب تو میری قسمت میں لکھا تھا اور کیا میرے معاف کرنے سے تایا جی واپس آسکتے تھے؟ کیا دل نشین مجھے مل سکتی تھی؟ میں اس دن دھاڑیں مار مار کر رویا تھا اپنی محبت کی گمشدگی پر۔ میری محبت دیوانگی بھری محبت، میرا زندگی بھر کا ناقابل بیان، ناقابل تلافی نقصان۔

تنکا تنکا اپنا وجود کرچیاں کرچیاں دل کو سنبھالتے میں پاکستان پہنچا تھا اور اب پچھلے تین سالوں سے اپنے زخمی زخمی وجود کو اپنے ناتواں کندھوں پر سنبھالے پھر رہا تھا۔ اب تو شاید ساری عمر یہی کرنا تھا جھوٹی مسکان لبوں پر سجائے روتے دل کے ساتھ دنیا داری نبھانی تھی اور خوشگوار ازدواجی زندگی کا ٹیگ بھی لگوانا تھا۔

آہ! میرا نقصان تو دیکھو محبت گمشدہ میری!

☼ ☼ ☼

"دلنشین! ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔ میں نے تمہارے اعتبار کا خون کر کے ہمیشہ کے لیے تمہیں بے اعتبار کر دیا۔ میں نے اپنی نفسانی خواہش کے حصول کے لیے تمہیں بے مول کر دیا لیکن دل! میرا یقین مانو میں نے تم سے محبت کی تھی۔ آج بھی کرتا ہوں کرتا رہوں گا۔

میں نے طلاق کے پیپرز پر دستخط کر دیے ہیں، پلیز دل! کچھ تو بولو! جھگڑا ہی کر لو لیکن خدارا خاموش مت رہو تمہاری خاموشی مجھے مارنے کے لیے کافی ہے۔ دل! مار دو مجھے، لڑائی کرو مجھ سے دل پلیز۔" ٹوٹا بکھرا عمر اس وقت دلنشین کے قدموں میں بیٹھا تھا۔ کم سے کم عمر اتنا تو خوش قسمت تھا کہ اسے دلنشین کے قدموں میں بیٹھ کر انہیں چھو کر معافی مانگنے کا موقع مل رہا تھا۔

"دل! خدا کے لیے دل کچھ تو بولو۔" اب وہ اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔

"جاؤ عمر... چلے جاؤ اور کوشش کرنا کہ کبھی کسی دلنشین کا دل مت دکھاؤ کیونکہ جب اعتبار ٹوٹتا ہے ناں تو بہت تباہی مچتی ہے جاؤ اور اگر ہو سکے تو کبھی میرے سامنے مت آنا؟" وہ غائب دماغی سے کہتی کہیں سے بھی نارمل نہیں لگ رہی تھی۔

لٹا لٹا، شکستہ قدموں کے ساتھ جھکے سر کے ساتھ عمر ملک چل دیا تھا۔ اپنے بار بار ٹھکرائے جانے پر محض نفس کے مجبور کرنے پر دل نشین کو جھکانا چاہا تھا یہ سوچے بغیر کہ وہ اپنی محبت کو کھو رہا ہے۔

☼ ☼ ☼

محبت کے اتنے جارحانہ انداز پر میں ششدر سا کھڑا تھا۔

پچھلے کئی گھنٹوں سے وہ ایک ٹک آسمان پر اڑتے اکا دکا پرندوں پر نظر جمائے بیٹھی تھی۔

"آہ، محبت کو تلاشتے تلاشتے میری انگلیاں فگار اور پاؤں آبلہ ہو گئے۔" ویران آنکھوں کے رستے دل میں ایک گہری تکلیف وہ یاد نے جھانکا تھا۔

محبت آخر اتنا بے بس اور قابل رحم کیوں بنا دیتی ہے، کیا ضروری ہے کہ محبت ہمیشہ درد ہی دے؟ ہمیشہ اعتبار کھوئے؟ ہمیشہ دکھ سے دوچار کرے؟

اس کا وجود ہلکی ہلکی سسکیوں کی زد میں تھا، اپنی انا و ضد کا پرچم بلند رکھنے والی لڑکی آج ٹوٹی بکھری شکست خوردہ سی بیٹھی تھی۔ تقدیر نے کیسا کاری وار کیا تھا۔

آہ عمر ملک

کاش میں ہمیشہ کی طرح اس دن تم پر اعتبار نہ کرتی میں تو شافع رضا کی محبت سے بھاگتے بھاگتے ذرا دیر کو سکون پانے کی خاطر تمہارے پاس آئی تھی۔ تم نے میری مجبوری سے فائدہ کیوں اٹھایا عمر کیوں؟ بچپن کے دوست ہو کر ایسا گھناؤنا گہرا زخم؟ دھیرے سے سر کو کرسی کی ٹیک سے لگا کر آنکھیں موندی تھیں۔

٭ ٭ ٭

"یہ تم مجھے کہاں لے آئے ہو عمر! کس کا گھر ہے یہ؟"

"ابھی پتا چل جائے گا۔ تم نیچے تو اترو؟" لاپروائی سے کہتے ہوئے گاڑی لاک کی تھی۔

وہ تذبذب کے عالم میں کھڑی تھی، اندر کہیں خطرے کی گھنٹی بجی تھی۔ ڈیفنس کے علاقے میں کافی سنسان جگہ پر بنا یہ گھر رات کے اس پہر خاصا خوفناک منظر پیش کر رہا تھا۔ لائٹس بھی کم تھیں۔

"آؤ! اندر چلو ناں دل!"

"لیکن عمر! تم تو کہہ رہے تھے کہ ڈنر کے بعد فوراً واپس چھوڑ دو گے مجھے ہاسٹل گیارہ بجے بند ہو جائے گا اور تم....."

"ابھی صرف آٹھ بجے ہیں دل! میں تمہیں دس بجے سے پہلے ہی پہنچا دوں گا۔ تم اندر تو آؤ۔ مجھے تم کو کسی سے ملوانا ہے۔"

اس کے تسلی کرانے پر وہ بے فکرے انداز میں آگے بڑھی تھی۔

عمر اسے اپنے کسی دوست سے ملوانے لایا تھا نیا جوڑا خاصا خوش شکل اور ہنس مکھ سا تھا گھر میں ان تینوں کے علاوہ کوئی نہ تھا۔ عمر نے اسے کولڈ ڈرنک کا گلاس تھمایا تھا تھوڑا سا پی کر ہی اسے اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا تھا۔ ذائقہ بھی کچھ عجیب سا تھا۔ کمرے میں دھیرے دھیرے نفوس بڑھ رہے تھے اس کا دماغ سو رہا تھا۔ دھیرے دھیرے ماؤف ہوتے ذہن کے ساتھ خود کو سنبھالنے کی کوشش میں وہ ہلکان ہو رہی تھی۔

کسی لڑکی نے زبردستی اس کے کپڑے بدلوانے کی کوشش کی تھی۔

لمحے کے ہزارویں حصے میں اسے صورت حال کا ادراک ہوا تھا۔

"کک..... کون ہو تم اور یہ کیا کر رہی ہو؟" لڑکھڑاتی آواز میں اس نے حلق کے بل چیخنے کی کوشش کی تھی آواز اندر ہی کہیں معدوم ہو گئی تھی۔

"بے بی کو جلدی سے کپڑے بدلواؤ۔ نکاح ذرا جلدی ہے نا؟" دروازے سے اندر جھانک کر کسی نے اطلاع دی تھی۔

"کس کا نکاح؟ کون ہو تم؟" وہ چیخی۔

"تمہارا نکاح بے بی! عمر کے ساتھ۔ جلدی سے کپڑے بدلو ورنہ بہت دیر ہو جائے گی۔" اس لڑکی نے ہنس کر اسے چمکارتے ہوئے کہا تھا۔

"نہیں! عمر کو بلاؤ۔ میں نکاح نہیں کروں گی۔ چھوڑو مجھے۔" ہذیانی انداز میں چیختے ہوئے اپنا آپ چھڑانے کی کوشش کی تھی۔

وہ اپنا پورا زور لگا کر چیخنے کی کوشش میں پورا گھر اسر پر اٹھا چکی تھی۔ شور کی آواز پر عمر اور اس کا دوست اندر کی طرف بڑھے تھے۔

"کیا ہو رہا ہے یہ؟" عمر۔ تقریباً" دھاڑا تھا۔

کمرے میں یکدم خاموشی چھائی تھی۔

"دیکھو عمر! یہ..... یہ لوگ مجھے زبردستی یہ جوڑا پہنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔" اس نے ایک عروسی لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"مم..... میں نکاح نہیں کروں گی۔ تم جانتے ہو کہ میں صرف شافع سے محبت کرتی ہوں۔ وہ مجھے چھوڑ گیا تو کیا ہوا۔ میں اسے منا لوں گی میں اس سے کہوں گی۔ میں تنگ آگئی ہوں تنہائی سے۔ تمہاری جدائی مجھے ڈستی ہے مم..... مجھے کہیں چھپا لو میں تمہاری ہوں صرف تمہاری۔" اس کی شرٹ کو گریبان سے پکڑے وہ رو رہی تھی۔ اس کا دماغ ٹھکانے پر نہیں تھا۔

"دل..... دلنشین پلیز! دیکھو بھول جاؤ اسے۔ دیکھو میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔ آج سے نہیں تب سے جب ہمارے درمیان شافع رضا نہیں آیا تھا۔"

"نن..... نہیں! میں شادی نہیں کروں گی..... نہیں کروں گی۔ سن لیا تم نے۔" وہ اس کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑتے ہوئے بولی۔

"کیوں..... کیوں نہیں کرو گی تم شادی؟ دیکھو اگر تم نے نکاح نہ کیا تو میں ویسے ہی تمہارے ساتھ....." بات ادھوری چھوڑ کر وہ مکروہ ہنسی ہنسا تھا۔ اسے عمر کا چہرہ انتہائی بھیانک لگ رہا تھا۔ یہ عمر تو نہیں تھا۔

"اور ذرا سوچو کہ کل صبح کا سورج تمہارے لیے کیسا تاریک ثابت ہو سکتا ہے۔ تم کیا منہ دکھاؤ گی خاندان والوں کو اور کون تمہاری پارسائی کا یقین کرے گا؟ ہاں!"

"تت..... تم اس قدر گھٹیا....." الفاظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔

"ہا..... بس بس زیادہ نہیں میں جیسا بھی جو بھی ہوں اس کو چھوڑو۔ بس یہ دیکھو کہ تم اس وقت میرے رحم و کرم پر ہو۔ ذرا سوچو اگر میں تمہیں رات یہاں رکھ کر کل واپس یونیورسٹی چھوڑ دوں تو بھلے بے قصور ہو گی تم کیا جواب دو گی تم یونیورسٹی والوں کو؟ اور پھر خاندان والوں کو بھی.....؟ جلدی سے کپڑے بدلو۔"

پھر وہ دوسری اسمارٹ سی پرکشش لڑکی کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"بھابھی! ذرا میک اپ کروانے میں اس کی مدد کریں۔ اسے میرے لیے سجا دیں۔ آج کی رات کو میں امر کر دینا چاہتا ہوں؟" مسرور کن مسکراہٹ اچھالتے ہوئے باہر کی طرف بڑھا۔

لحہ بہ لحہ اس کا دماغ گہری تاریکی میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ عمر کا اتنا مکروہ اور بھیانک چہرہ ہو گا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

پھر معلوم نہیں کس نے اس کے کپڑے بدلوائے۔ کس نے زیورات۔ نکاح نامے پر سائن کیے ہوش تو اس وقت آیا جب عمر اس کے قریب آکر بیٹھا تھا۔ کرنٹ کھا کر وہ پیچھے ہٹی تھی۔

عمر ملک کا ہاتھ پکڑتا اس کو حال میں لے آیا تھا۔ جانے اس کے اندر اتنی طاقت کہاں سے آئی تھی۔ ایک جھٹکے سے ہاتھ چھڑا کر وہ اٹھی تھی۔

"مت چھوؤ مجھے اپنے ان مکروہ ہاتھوں سے..... عمر ملک! نفرت ہے مجھے تم سے۔ تم اتنے گھٹیا اتنے کمینے ہو گے میں نے سوچا تک نہ تھا۔

کاش! مجھے علم ہوتا کہ میں ایک سانپ کو اپنی آستین میں پال رہی ہوں۔ تمہارا اصل چہرہ اتنا بھیانک اتنا مکروہ ہے میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔"

"دل! میری بات سنو میں مجبور تھا۔"

"شٹ اپ! مجبور اور تم؟ عمر ملک! تمہارے جیسے بندے کے منہ سے یہ الفاظ بہت پرائے معلوم ہو رہے ہیں مجھے..... تم کیسے مجبور ہو سکتے ہو۔ تم تو ایک مرد ہو ناں؟ فاتح مرد جو کچھ بھی کر سکتا ہے۔ لیکن یاد رکھنا! مجھے تم کبھی بھی نہیں پا سکو گے۔ سنا تم نے۔"

"دل! پلیز....." عمر ملک نے کچھ کہنا چاہا تھا لیکن وہ کہاں اس کی سن رہی تھی۔

"تمہیں مجھ سے محبت کا دعوا ہے ناں؟" اس نے نظر بھر کر اسے دیکھا عمر ملک کا سر جھک گیا تھا اس لمحے۔

"تو پھر محبت میں زبردستی اعتماد کا خون کہاں سے آ

گیا؟ عمر! محبت روح کو چھلنی تو نہیں کرتی، یہ کیسی محبت ہے تمہاری عمر جو لمحہ بہ لمحہ میرے دل میں درد کا اضافہ کر رہی ہے عمر یہ.... یہ محبت کی کون سی قسم ہے بولو۔ جواب دو - تمہیں چپ کیوں لگ گئی ہے، جواب دو ناں۔"

اور عمر کے پاس ان میں سے کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔

لمحے کے ہزارویں حصے میں اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ دل نشین کو کبھی نہیں پا سکے گا۔ کبھی نہیں۔ ڈھے جانے والے انداز میں وہ نیچے بیٹھتا چلا گیا تھا۔

"جاؤ۔ دل! چلی جاؤ..... میری طرف سے تم آزاد ہو۔ جاؤ کبھی نہ واپس آنے کے لیے۔"

اور ششدر کھڑی دل نشین اپنی پوری قوت سے وہاں سے بھاگی تھی پیچھے مڑ کر عمر ملک کی دھاڑیں وہ قطعی نہیں سن پائی تھی۔

اور پھر وہ یہاں چلی آئی تھی شافع رضا کے پاس۔ کٹی پھٹی انا، شکست و خوردگی اپنی عزت نفس کی بچی کچھی لاش لیے۔

"شافع رضا، شافی!

آہ!

کیا ضروری تھا کہ ہارنے اور بکھرنے کے بعد میں تمہارے در پر ہی انصاف مانگنے اور سائبان کی بھیک مانگنے کے لیے آتی؟

میری انا، میری محبت کے قاتل کیا ضروری تھا کہ میں تمہیں اپنا زخمی زخمی وجود دکھاتی؟ میں نے تو سارے رشتے ناتے تم سے توڑ لیے تھے تو پھر میں کس حیثیت، کس رشتے سے یہاں آئی؟ تم نے سوچا تو ہو گا لیکن آفرین ہے تم پر اور تمہاری ہمت پر شافع رضا!

جانتے تھے ناں کہ میرے پاس تمہارے ان سوالوں کا جواب نہیں ہے۔ تب ہی سوال نہ کر کے مجھے بے مول ہونے سے بھی بچایا اور میری زخمی انا کا بھرم بھی رکھ لیا۔

لیکن شافع رضا! ذرا سوچو کہ دل نشین آج بھی صرف تمہیں چاہتی ہے صرف تمہیں۔ وہ آج بھی تمہیں اپنا سب کچھ مانتی ہے، جب ہی تو یہاں آئی۔ میں نہ رو سکتی ہوں نہ اپنا زخمی وجود کسی کو دکھا سکتی ہوں۔ میں بہت اکیلی ہوں، صرف ایک ماں کا سہارا ہے اسے نہیں کھونا چاہتی، وہ مر جائے گی۔

پہلے محبت کی قیمت باپ کی موت کی صورت چکائی ہے ناں۔ اب اعتبار و اعتماد کی سزا میں ماں کو کھونے کا حوصلہ نہیں ہے، مجھ میں۔

تم اپنی زندگی میں خوش ہو، مطمئن ہو۔ تمہیں اور فرحین کو اکٹھے ایک ساتھ ایک دوسرے کے اتنے قریب دیکھ کر مجھے جانے کیوں بڑا دکھ ہوتا ہے۔ مجھے بڑی جیلسی ہوتی ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ درد بھی آہستہ آہستہ ختم ہو جائے گا۔ میری دعا ہے کہ زندگی میں ہمیشہ خوشیاں اور کامیابیاں تمہارا مقدر بنیں۔

تمہیں مجھ سے محبت تھی ناں اسی لیے مجھے بددعا نہ دی لیکن قسمت کا کاری وار دیکھو! کیسے کیسے حساب چکا رہی ہوں میں۔"

اس نے دھیرے سے آنسو پونچھے تھے۔

"لیکن اگر کبھی فرصت ملے تو یہ ضرور سوچنا کہ دلنشین نے زندگی میں کیا پایا؟

محبت اور اعتبار کے نام پر کس کس چیز کو قربان کیا؟"

درد کے سمندر میں آنسوؤں کی روانی کے بیچ دبی دبی سسکیوں اور گھٹی گھٹی چیخوں میں بمشکل اپنے وجود کو گھسیٹ کر باہر نکالتی وہ دھیرے سے اٹھی تھی اور اندر کی جانب بڑھی تھی۔

گلاس ڈور کے پار کھڑی دو آنکھوں میں سے چند موتی ٹوٹ کر گرے تھے اور شافع رضا کی شرٹ میں جذب ہوئے تھے۔

یہ آنسو محبت کی گمشدگی کے تھے، محبت میں اپنے بے مول ہونے کے یا محبوب کو ٹوٹا بکھرا دیکھ کر اس کے دکھ میں بہہ نکلے تھے۔

صائمہ اکرم چوہدری

وہ بہت خوب صورت، سرسبز، خوش نما اور سُرخ گلابوں سے ڈھکی ایک وادی تھی۔ تاحد نگاہ ہریالی اور پس منظر میں سرسبز و شاداب پہاڑوں پر خوردو پھول ایسے لگ رہے تھے جیسے کسی نے آسمان سے ستارے توڑ کر وہاں ٹانک دیے ہوں۔

اس خوب صورت اور دل آویز وادی میں وہ چاندی کے جسم والی لڑکی سفید رنگ کے پریوں کے لباس میں آسمان سے اتری کوئی حور لگ رہی تھی۔ وہ اس قدر دلکش اور حسین دکھائی دے رہی تھی کہ اس پر نظر ٹھہرانا دشوار ہو رہا تھا۔ وہ اپنے دونوں بازو پھیلائے آسمان سے گرنے والی پھوار کو اپنی ہتھیلیوں پر محسوس کر رہی تھی۔

اچانک اسے کچھ ہوا اور اس نے وادی میں موجود تتلیوں کے ساتھ رقص کرنا شروع کر دیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کے رقص میں کسی پہاڑی چشمے کی سی دیوانگی اور تیزی آگئی تھی۔ اس کا جسم اس کے اختیار میں نہیں رہا تھا۔ وہ خود کو روئی کے گالوں سے بھی ہلکا محسوس کر رہی تھی۔ فخر و غرور کی لہریں اس کے پورے وجود کا احاطہ کر چکی تھیں۔

ایک دم ہی منظر بدلا تھا۔

اس چاندی کے جسم والی لڑکی کا پاؤں پھسلا اور وہ خود کو بہت بلندیوں سے نیچے گرتا ہوا دیکھ رہی تھی۔ اس نے سخت خوف زدہ نظروں سے زمین کی پستیوں کو دیکھا جو اس کا مقدر بننے والی تھیں۔

وہ بڑی قوت اور رفتار سے بے تحاشا کیچڑ اور غلاظت سے بھری زمین پر گری تھی۔ اس کا سارا وجود زلزلوں کی زد میں آگیا تھا۔ اس نے گہرا سانس لے کر اپنے چٹختے ہوئے اعصاب کو سنبھالنے کی ناکام کوشش

ناولٹ

کی تھی۔ وہ اب آنکھ کی پتلیوں کو گھما کر اپنے اردگرد پھیلی تیرگی اور فضا میں رچی بدبو کو محسوس کر رہی تھی۔ اسے اپنے کیچڑ زدہ جسم سے گھن آرہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اپنے جسم کو ٹٹولا تو خوف کی ایک سرد لہر نے اس کے وجود کو لپیٹ میں لیا تھا۔

اسے محسوس ہوا کہ بہت سے حشرات الارض اس

کے وجود سے چمٹے ہوئے ہیں۔ اس خیال نے خوف سے اس کا سانس بند کر دیا تھا۔ اس نے دیوانہ وار ایک حشرات الارض نما چیز کو کھینچا تو اسے یہ دیکھ کر دھچکا لگا کہ وہ ایک مردہ پتنگا تھا۔ اس کی آنکھیں تیرگی سے مانوس ہوئیں تو اسے احساس ہوا کہ اس کا پورا جسم ان مردہ پتنگوں کے لباس سے ڈھکا ہوا تھا۔ خوف، وحشت اور سراسیمگی کے عالم میں اس نے اپنے چہرے کو ٹٹولا تو اسے خوف سے منجمد کر دینے والی کسی انہونی کا احساس ہوا۔

اسی وقت اسے ادراک ہوا کہ وہ کسی گہرے اندھے کنویں میں گری ہے۔ اوپر سے آنے والی ہلکی سی روشنی کی لکیر میں اس نے سیلن زدہ دیوار کے پاس گرا شیشے کا ٹکڑا دیکھا تو لپک کر اٹھالیا۔ آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے ہی اس کے منہ سے نکلنے والی چیخ بہت دلخراش اور بے ساختہ تھی۔

اس کے خوب صورت جسم کے اوپر ایک بوڑھی ماہ گدھ کا بدصورت چہرہ سجا ہوا تھا۔

بہت ہی خوف ناک، عجیب اور دل دہلا دینے والے خواب کے زیر اثر اس کی آنکھ کھلی تھی۔ اس نے مضطرب و متوحش آنکھوں سے اپنے کمرے میں کسی نادیدہ شے کو تلاش کرنا چاہا تھا۔ کمرا بالکل خالی تھا اور زیرو واٹ کے بلب کی روشنی میں اس نے تیزی سے اٹھ کر سنگھار میز کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا چہرہ دیکھا۔ ایک پرسکون سی سانس اس نے فضا میں خارج کی تھی۔

اس نے شیشے میں دیکھا، اس کے وجود کے اوپر اس کا اپنا ہی چہرہ تھا جو اس وقت پسینے سے تر، وحشت زدہ، پریشان حال اور خوف میں ڈوبا ہوا تھا۔ اپنے منہ پر ہاتھ پھیر کر اس نے ایک دفعہ پھر خود کو یقین دلایا تھا۔

وہ ایک عجیب سی سراسیمگی اور بے چینی کے عالم میں اپنے کپڑوں کو جھٹک رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے آدھ مرا ہوا پتنگا اس کے لباس میں چمٹا ہوا نہ رہ گیا ہو۔

اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ باہر سیاہ رات کے ہولناک سناٹے میں جھینگروں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لیکن اسے نہ جانے کیوں یہ وہم لاحق ہو گیا تھا کہ وہ بوڑھی گدھ کہیں آس پاس ہی ہے۔

اس خیال نے اسے ایک دفعہ پھر بے چین کر دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے کہیں پڑھا تھا کہ محبت بالکل کسی خودکش بمبار کی طرح انسان پر حملہ کرتی ہے اور سکینہ اللہ دتا کے ساتھ بھی بالکل ایسا ہی ہوا تھا۔ محبت نے ایسے ہی کسی خودکش بمبار کی طرح اس پر حملہ کر کے اس کے سارے وجود کے پرخچے اڑا دیے تھے۔ سکینہ اللہ دتا نے خود اپنی ذات کو ذروں کی صورت فضا میں بکھرتے دیکھا تھا۔ کئی لمحوں تک تو اسے اپنی بصارت پر یقین نہیں آیا تھا۔ اسے لگا کہ وہ اب کبھی بھی اپنے وجود کو یکجا نہیں کر پائے گی۔ اسی احساس نے بے بسی کا دھواں سا اس کے اردگرد پھیلا دیا تھا۔ بے چارگی کے احساس کے ساتھ ہی اس کی آنکھیں پانیوں سے بھر گئی تھیں۔

وہ اماوس کی ایک رات تھی۔ جب اس نے اسپتال کے کمرے کی کھڑکی سے ایک آکاس بیل کو برگد کے بوڑھے درخت پر چڑھتے دیکھا۔ خوف کی ایک فطری سی لہر نے بڑی سرعت سے اس کے ذہن و دل میں بسیرا کیا تھا۔

سکینہ اللہ دتا کی زندگی میں اداسی کا اپنا ایک مضبوط کردار تھا۔ وہ تنہائیوں کے قبیلے کا ایک ایسا فرد تھی جس کی زندگی میں بس کرب و اندوہ اور ہجر کے موسموں کا بسیرا تھا۔ اس کی زندگی میں بے شمار حبس بھری شامیں تھیں جو زندگی میں کبھی کبھی اس قدر وحشت کے رنگ بھر دیتی تھیں کہ سانس تک لینا محال ہو جاتا تھا۔

"اماں! آج میری سہیلی چڑیاں اتنی خاموش کیوں ہیں؟" اس کے دل کی اداسی لفظوں میں ڈھل کر جمیلہ مائی کی سماعتوں تک پہنچی تھی۔

"چنگا اے پتر! روز رولا بھی تو اتنا ڈالتی ہیں۔ کن کھا جاتی ہیں۔" جمیلہ مائی نے پیشانی پر ہاتھ مار کر بیٹی کا زرد چہرہ تشویش سے دیکھا۔ وہ نہ جانے کیوں صبح سے اتنی بے زار تھی۔ شاید موسم ہی گھٹا گھٹا اور حبس میں لپٹا ہوا تھا۔ اس لیے انار کے درخت پر بیٹھی ساری چڑیاں بھی مغموم تھیں۔ تب ہی لان میں خاموشی کا راج تھا۔ ورنہ عام دنوں میں وہ اتنا شور مچاتیں کہ کمرے کے مکینوں کا بات کرنا دشوار ہو جاتا۔ تنگ آ کر جمیلہ مائی ایک لمبا چکر کاٹ کر کمرے کے پچھلے لان میں ان کو بھگانے کے لیے جاتیں اور یہ کام ان کو دن میں کئی دفعہ کرنا پڑتا۔ پھر اسپتال میں کام کرنے والے ایک مہربان سے وارڈ بوائے نے ان کو ایک لمبا سا مولا بخش لا کر دیا۔ جسے وہ کھڑکی کی سلاخوں سے نکال کر ان شرارتی چڑیوں کو دن میں کئی دفعہ بھگایا کرتی تھیں۔

"کی ہویا میری دھی رانی کو، کیا بہت درد ہے؟" جمیلہ مائی نے بے چینی سے اٹھ کر اس کا نڈھال چہرہ دیکھا۔ وہ کھڑکی کے باہر املتاس کے درخت پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔ اس کی فزیو تھراپسٹ ابھی ابھی اسے ایکسر سائز کروا کے گئی تھی۔ اس لیے تھکن اس کے سارے وجود سے عیاں تھی۔

"ہاں اماں! ٹانگوں میں تو آج جان ہی نہیں رہی۔ یہ درد بھی لگتا ہے کہ اب عمر بھر کا ساتھی بن گیا ہے۔" اس کے چہرے پر ایک بے بس کر دینے والی مسکراہٹ تھی۔ اس کی اس بات کا جمیلہ مائی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

"چل چھڈ ساری گلاں۔ لے ہم ماں دھی بیٹھ کر دیسی گھی کی پنجیری کھاتے ہیں۔" وہ اس کے بستر کے نیچے رکھے لوہے کے ٹرنک سے اسٹیل کا ڈبا نکال کے لے آئیں۔ اور سکینہ کو اندازہ تھا کہ اس کی بھولی ماں صرف اور صرف اس کا دھیان بٹانے کی خاطر دن میں ایسی کئی معصومانہ حرکتیں کرتی ہے۔

"پتا ہے پتر! اے نال والی مائی مینوں پوچھ رہی سی کہ تساں نوں کیویں بیت المال والوں نے اس سرکاری اسپتال دا پرائیویٹ کمرا دے دتا۔ آکھدی سی اسی تے بہت وڈے افسراں کولوں منتیں ترلے کروائے۔ فیر کسی نے ساڈی گل تے کن دھرے۔"

سکینہ نے جمیلہ مائی کا سادہ اور بے ضرر سا چہرہ غور سے دیکھا۔ وہ پچھلے آٹھ سالوں سے اس کے ساتھ مختلف اسپتالوں کے دھکے کھاتی آ رہی تھیں۔ لیکن اس نے ان کے منہ سے کبھی مایوسی یا شکوے کا ایک لفظ نہیں سنا تھا۔

"پھر تو نے کیا کہا؟" اماں کتنی کمزور ہو گئی ہے۔ اس کے ذہن میں ابھی ابھی خیال ابھرا۔

"میں آکھیا، میری سکینہ ماشاءاللہ پوری نو جماعتاں پڑھی اے۔" جمیلہ مائی کے چہرے پر ہلکی سی فخر کی جھلک سکینہ کے چہرے پر مسکراہٹ لانے کا سبب بن ہی گئی تھی۔ جبکہ وہ اس کو مسکراتے دیکھ کر مزید جوش سے بولیں۔

"میں اونہوں دسیا میری نمانی دھی نے دسویں دا امتحان دینا سی کہ بیماری دے گیڑے وچ آ گئی۔ پورے آٹھ وریاں توں اسی اسپتالاں دیاں روٹیاں کھا رے آں، فیر وی سوہنے رب دا شکر اے کہ دے رہیا اے۔"

"تو نے اسے کہا کیا، اصل بات بتا۔" سکینہ نے پنجیری زبردستی حلق میں پانی کے ساتھ انڈیلتے ہوئے جھنجلاہٹ سے پوچھا۔ اسے اندازہ تھا کہ اس کی ماں نے اسے کیا کہانی سنائی ہو گی۔ اس بات نے اس کے حلق تک کڑواہٹ بھر دی تھی۔

"لو دسو! میں نے اسے کیا بتانا تھا۔ جو سچی گل تھی دس دتی۔" وہ گال پر انگلی رکھ کر تھوڑا سا ہکلائیں۔

"اماں! ہزار دفعہ سمجھایا ہے کہ سب کو داستان نہ سنانے بیٹھ جایا کرو کہ ہمیں لاہور والوں نے جواب دے دیا تو سکینہ نے بیت المال کے آفیسر کو ایک درد بھرا خط لکھا۔ انہوں نے اس خط کے جواب میں خود گڈی بھیج کر لاہور سے اسلام آباد بلوایا اور یہاں داخل کروا کے سارا خرچہ اٹھانے کا اعلان کر دیا۔"

ناراضی اس کے لفظوں سے ہی نہیں انداز سے

بھی چھلک رہی تھی۔ ایک بے نام سا اضطراب اس کے انگ انگ میں چٹکیاں بھر رہا تھا۔

"لے! تو اس وچ کھوڑی گل غلط اے۔" جمیلہ مائی نے ناک پر انگلی رکھ کر سخت تعجب بھرے انداز میں لاڈلی دھی کا بے زار چہرہ دیکھا۔

"اماں! بات غلط یا درست ہونے کی نہیں ہے۔ یاد نہیں اس آفیسر نے سختی سے منع کیا تھا کہ یہ بات کسی کو نہیں بتانی کیونکہ پھر چنگے بھلے دوسروں کا حق مارنے کے لیے ان کے پاس آنے لگتے ہیں۔ پر تجھے یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔ جو پوچھتا ہے ساری داستاں الف سے ی تک ڈھکن کھول کے سنانے بیٹھ جاتی ہے۔" وہ بے زاری سے بولی تھی۔

"لے پتر! میں ٹھہری عام سے پنڈ کی سادہ لوکی، مجھ سے یہ ہیر پھیر والی گلاں نہیں ہوندیاں۔ رب سوہنے نے سچ بولنے کا حکم دیا ہے۔ مینوں بس اناں پتا اے۔" ان کی بے نیازی عروج پر تھی۔ سکینہ نے ناراضی سے منہ پر دوپٹا ڈال لیا۔

"آئے ہائے! اب یہ منہ پھلا کے کیوں لمی پے گئی اے۔ چل چھڈ، اٹھ میری دھی وضو کر، نماز دا ویلا ہو گیا اے۔" جمیلہ مائی کی جان اپنی اکلوتی دھی میں اٹکی رہتی تھی۔ جسے اس نے شادی کے سترہ سال تک دعائیں مانگ مانگ کر رب سے لیا تھا۔

"اماں! کبھی کبھی میں سوچتی ہوں۔" اس نے دوپٹا منہ سے ہٹایا۔ رکی سانسیں بحال ہو گئیں۔

"جس عمر میں الڑ بالی لڑکیاں چوری چوری خواب بُنتا شروع کرتی ہیں، میری قسمت میں اللہ نے اس عمر میں اسپتال کے پھیرے کیوں لکھ دیے؟" سکینہ کی بات پر جمیلہ مائی کے چہرے پر پھوٹتی مسرت گویا فضا میں تحلیل ہو گئی۔

"پتر! ہزار واری سمجھایا اے کہ اللہ سوہنے نال شکوہ نہیں کردے۔" وہ ناراض ہوئیں۔

"اماں! یہ شکوہ نہیں ہے، میں تو بس یوں ہی تجھ سے بات کر رہی ہوں۔" اس کی بات پر انہوں نے بے یقینی سے اس کا چہرہ دیکھا لیکن چپ رہیں۔

"دیکھ ناں اماں! میں ہنستی کھیلتی اسکول جاتی تھی۔ اپنی گڑیا کی شادی ریشماں کے بے سوادے گڈے کے ساتھ کرتی تھی۔ مس صغراں کہتی تھیں کہ سکینہ کے اندر پارہ دوڑتا ہے۔ مجھے کیا پتا تھا کہ ایک رات چڑھنے والا بخار میرے سارے خواب جلا دے گا۔ دیکھ اماں! میرے ہاتھ میں تو اب کوئی بھی محبت کی تتلی اور چاہت کا جگنو نہیں رہا۔" اس نے اپنی خالی مٹھی کھول کر دکھائی۔ سکینہ کی آواز اور الفاظ کے ساتھ جمیلہ مائی کا دل کٹ رہا تھا۔

"پھر میری کمر پر نکلنے والے اس کب (کوہان) نے تو میری حیاتی کو بھی ٹیڑھا کر دیا۔ یاد ہے ناں پنڈ میں سارے بچوں نے کتنا شور مچایا تھا کہ سکینہ کبڑی مائی بن گئی ہے۔ اب اسے بھی دانے بھوننے والی بھٹی پر بٹھا دو، جیسے شیداں کبڑی دانے بھونتی ہے۔ یہ بھی یہ ہی کام شروع کر دے۔"

سکینہ پر آج کافی دنوں کے بعد قنوطیت کا دورہ پڑا تھا۔ اس کی سانولی رنگت متغیر ہو کر سیاہ لگنے لگی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کے پاس گری تتلی کو اٹھایا جو نہ جانے کیسے پرواز کی طاقت کھو بیٹھی تھی اور اب نڈھال ہو کر زمین پر گر پڑی تھی۔ اس کے ساتھ بھی تو ایسا ہی ہوا تھا۔

"کیوں ایسی گلاں کردی اے سکینہ! نہ میری جند مایوس نئیں ہوندے سوہنا رب ناراض ہو جاندا اے۔ چل اٹھ میں تسلے وچ پانی لیاندی آں، میری دھی نماز پڑھ کر کے مینوں سورۂ رحمٰن سنائے گی۔ ہے ناں۔" ان کو خوش کرنے کے لیے اس نے مسکرانا چاہا لیکن آنکھوں سے بہنے والے پانی نے سارا بھرم توڑ دیا۔

"اماں! یاد ہے آج کون سی تاریخ ہے۔" سکینہ کے گلے میں بے شمار آنسو اٹکے تھے۔

"جمیلہ مائی نے نظریں چرائیں۔

"آج بارہ مارچ ہے اماں!" جمیلہ مائی نے کیلنڈر دیکھا۔

وہ کالی سیاہ رات کیسے بھول سکتی تھیں۔ جس کے اندھیروں نے اس کی اور اللہ دتا کمہار کی بیٹی کے سارے اجالے نگل لیے تھے۔ وہ رات جب وہ دونوں سکینہ کو لے کر دو بجے سرکاری اسپتال کی ایمرجنسی میں بھاگے تھے اور وہاں کوئی ڈاکٹر نہ پا کر جیسے ان کے دلوں پر کوئی بلڈوزر چلا تھا۔ اس رات سے شروع ہونے والا سفر آٹھ سال سے جوں کا توں جاری تھا۔ رحیم یار خان، بہاول پور، ملتان، حیدر آباد، لاہور اور اب اسلام آباد میں۔ اس سفر میں پہلے گھر بکا اور اس کے بعد اللہ دتا کی آبائی زمین میں سے اس کے حصے میں آنے والے "دو گھمے" بھی ہاتھ سے نکل گئے۔

اب سکینہ کی کہانی بیت المال کے توسط سے چل رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

کمرے کی کھڑکی پر بھاری سا پردہ پڑا ہوا تھا۔ البتہ ایک انتہائی باریک درز سے روشنی کی ایک پتلی سی لکیر کمرے میں بسی تیرگی میں اپنی جگہ بنانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ سکینہ نے نماز اور قرآن پڑھنے کے بعد جمیلہ مائی سے کہہ کر زرد بلب بند کروا دیا تھا۔ ویسے بھی اسے ساٹھ واٹ کے اس بلب سے شدید چڑ ہوتی تھی۔ جو نہ تو کمرے میں روشنی کرتا تھا اور نہ ہی اس کی زندگی میں۔ اس لیے اسے ملگجے سے اجالے کبھی بھی اچھے نہیں لگتے تھے۔

اگلی صبح نو بجے جیسے ہی ڈاکٹر خاور نے اس کمرے میں قدم رکھا، مریضہ کے دل دھڑکنوں میں ایک ارتعاش سا برپا ہو گیا۔ اسے سارے دن میں صرف نو بجے زندگی خوب صورت لگتی تھی، جب ڈاکٹر خاور اس کے کمرے کا راؤنڈ لگایا کرتے تھے۔

سکینہ اللہ دتا نے کنکھیوں سے ڈاکٹر خاور کے چمکتے ہوئے سیاہ جوتوں کو دیکھا۔ نظر اٹھا کر ان کی طرف دیکھنے کا اسے یارا نہ تھا۔ وہ کچھ دنوں سے سب ہی لوگوں سے نظریں چرانے لگی تھی۔ ڈاکٹر خاور اس کی فائل دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے ساتھ موجود جونیئرز سے انگلش میں کچھ کہا۔ سکینہ کا سارا جسم ہی

سماعت بنا ہوا تھا۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھے دل کی دھڑکنوں کو لاشعوری طور پر دبانے کی کوششوں میں مگن تھی۔ جیسے ہی ڈاکٹر خاور نے کمرے سے قدم باہر نکالا' ہر چیز پر ایک پھیکا پن سا غالب آگیا۔ سکینہ نے بے زاری سے تکیے پر سر رکھ کر بازو اپنی آنکھوں پر تان لیا۔ اسے اب روشنی سخت بری لگ رہی تھی۔

"سکینہ! تم اپنی عمر سے بہت بڑی باتیں کرتی ہو۔" اس دن اس کی فائل دیکھتے ہوئے ڈاکٹر خاور نے کہا تو وہ شکست خوردہ انداز میں مسکرا دی۔

"بس ڈاکٹر صاحب! آگہی کے عذاب نے عجب گورکھ دھندے میں پھنسا دیا ہے۔ مجھے اس تلخ حقیقت کا ادراک ہوگیا ہے کہ زندگی میرے لیے پھولوں کی سیج کبھی نہیں بنے گی۔"

"اچھے اچھے خواب دیکھا کرو سکینہ! خواب زندگی کو خوبصورت بناتے ہیں۔" انہوں نے اس دن ایسے ہی مسکراتے ہوئے اسے مفت مشورہ دیا تھا۔ ان کی بات پر ایک تلخ سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر سج گئی تھی۔

"چھوڑیں ڈاکٹر صاحب! اس بیماری کی بدنما حقیقت کی تپش سے میرے سارے ہی خواب جھلس گئے ہیں۔"

بائیس سالہ سکینہ اللہ دتا کی آواز بوجھل اور مرطوب تھی۔ ڈاکٹر خاور کی باتیں اور جملے اسے کبھی کبھی اتنی روشنی ضرور دے دیتے تھے کہ وہ کم از کم کھل کر سانس لے لیتی تھی لیکن آج کل ٹانگوں کا بڑھتا ہوا درد اسے بے زار کر رہا تھا تو دل میں اٹھتی انوکھی خواہش نے اس کے ہاتھ پیر پھلا رکھے تھے۔ وہ دل کے اندر مچلتے جذبات کی آوازوں سے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیتی تھی۔ اسے خوف تھا کہ کوئی اس کے اندر کی آوازوں کو سن نہ لے۔

"اماں! اس کھڑکی کا پردہ ہٹا دو ورنہ میرا دم نکل جائے گا۔" اس کے حلق سے عجیب سی پھنسی پھنسی سی آواز نکلی تھی۔ دل ہی دل میں درود شریف پڑھتی جمیلہ مائی نے لپک کر پردہ ہٹایا تو روشنی کا ایک بدتمیز سا طوفان کمرے میں داخل ہوگیا۔

"میری دھی رانی کی طبیعت ٹھیک اے؟" جمیلہ مائی نے سخت فکرمندی سے اس کا ماتھا چھو کر حدت کو محسوس کیا تو اچھی خاصی پریشان ہوگئیں۔

"پتر! تینوں تے لگدا اے کہ اچھا خاصا تاپ ہے' میں نرس نوں بلا کر لیاندی آں۔" انہوں نے ہاتھ میں پکڑی تسبیح الماری کے اوپر رکھی اور باہر کی طرف قدم بڑھائے۔ اسے باہر جاتے دیکھ کر وہ استہزائیہ انداز میں مسکرائی۔

"اماں! اس عشق کے تاپ کا کوئی علاج نہیں۔ دنیا کا کوئی پانی' کوئی دوائی' کوئی محلول اس آتش کو نہیں بجھا سکتی۔" وہ چاہتے ہوئے بھی ماں سے یہ نہیں کہہ سکی۔

جمیلہ مائی کے باہر نکلتے ہی اس نے بمشکل کہنیوں کے بل اٹھ کر سامنے دیوار پر لگے شیشے میں جھانکا۔ اس شیشے کو لگانے کے لیے اسے اماں کے ساتھ اچھی خاصی جنگ اور پورا ایک دن بھوک ہڑتال کرنا پڑی تھی۔ تب جا کر جمیلہ مائی نے کسی نرس سے پورے دو سو روپے کا آئینہ منگوا کر دیا تھا۔

اس نے سامنے لگے آئینے میں اپنا بستر پر پڑا وجود دیکھا اور ہمیشہ کی طرح مایوسی کا شکار ہوئی۔ ویسے تو شاید اس کا قد پانچ فٹ تک ہوتا لیکن کچھ سال پہلے اس کی کمر پر ابھرنے والے کوہان کی وجہ سے وزن خاصا بڑھ گیا تھا اور کمر میں تھوڑا خم بھی آگیا تھا جس کی وجہ سے وہ چار فٹ کے قریب لگتی تھی۔

سانولی رنگت' چھوٹی چھوٹی آنکھیں' موٹی سی ناک' دونوں ہونٹوں کی بناوٹ بھی تھوڑی سی مختلف تھی۔ اس وجہ سے اس کا مجموعی تاثر بڑا عجیب سا پڑتا تھا۔

لوگوں کی استہزائیہ نظریں اس کا ایسا پوسٹ مارٹم کرتیں کہ سکینہ کا دل زمین میں سما جانے کو کرتا۔ لوگوں کے بے رحم' تلخ جملے اس قدر دل دکھاتے تھے کہ وہ کئی راتیں ان کی تکلیف کی وجہ سے سو نہیں پاتی تھی۔

"اماں اس کو تو ایک سو دو بخار ہے۔" نرس نے تھرمامیٹر اس کے منہ سے نکال کر اطلاع دی تھی۔ اس

کے چہرے پر قابل رحم تاثرات دیکھ کر سکینہ نے دانستہ آنکھیں بند کرلی تھیں۔ وہ شاید نئی نئی اس وارڈ میں آئی تھی اس لیے سکینہ کی ہسٹری سے ناواقف تھی۔

"اماں! تیری بیٹی کی کمر میں یہ کب کیا پیدائشی ہے؟" نرس کے لہجے سے جھلکتا تجسس سکینہ کے لیے سخت کوفت کا باعث بنا تھا۔

"ناں پتر ناں' میری سکینہ تو ماشاء اللہ چنگی بھلی' صحت مند اور اللہ نظر بد سے بچائے اپنے اسکول کی ساری کھیڈوں (کھیلوں) میں حصہ لیتی تھی۔" سکینہ کو جمیلہ مائی کی سادہ دلی بڑی جھنجلاہٹ میں مبتلا کرتی تھی لیکن اب کافی عرصے سے اس نے اس کا اظہار کرنا چھوڑ دیا تھا۔

"لے مائی! نظر تو لگ گئی' اور کیسے لگتی ہے۔" نرس بڑے منہ پھٹ انداز سے بولی تھی۔ اس کی بات پر جمیلہ مائی کے چہرے پر رنجیدگی کی دبیز چادر بچھ گئی تھی۔

"ہاں میری دھی نوں لگدا اے نظر ای لگ گئی اے۔" انہوں نے ہوکا بھرا۔ "اچھی خاصی تھی دھی رانی۔ ایک رات ایسا تاپ چڑھا کہ کاکی کو کانبا (کپکپی) چڑھ گیا۔ بڑے اسپتال میں لے کر گئے' پر تاپ تھا کہ اترنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ پھر آہستہ آہستہ کمزوری بڑھتی گئی اور کمر پر یہ پہاڑ سا بنتا گیا۔ ڈاکٹر پتا نہیں کون سی اوکھی سی بیماری کا نام بتاتے ہیں جو میری دھی کو گھن کی طرح چاٹ گئی' پھر بھی میرے مولا کا شکر ہے کہ چل نہیں سکدی۔ پر لیٹ تے سکدی اے۔ بیٹھ تے سکدی اے۔" جمیلہ مائی کے لہجے میں چھپی عاجزی اور شکر گزاری اس نرس کے لیے بڑی حیران کن تھی۔

"ہیں خالہ! واقعی تیری دھی پہلے بالکل ٹھیک تھی؟" نرس کو سخت تعجب ہوا تھا۔

"لے میں کوئی جھوٹ بول رہی آں۔" جمیلہ مائی نے تھوڑا سا برا مان کر کہا۔ "میری سکینہ نے سوہنے رب کی نوازش سے پورے چودہ ورے ٹھیک ٹھاک گزارے۔ اسکول جاتی تھی۔ کھیلتی تھی۔ سارے کام کاج کرتی تھی میری دھی۔" ان کے لہجے میں ہلکا سا فخر جھلکا تھا۔

"بس جی اللہ کی آزمائش ہے۔ اللہ ایسی آزمائش سے سب کو بچائے اور اس بچی کو بھی تندرستی دے۔" اس نرس کی دلچسپی اچانک ہی اس سے ختم ہوگئی تھی۔ "میرے ساتھ آجاؤ۔ میں ڈاکٹر صاحب سے بخار کی دوائی لکھوا دوں۔" ان دونوں کے کمرے سے نکلتے ہی اس نے اپنی آنکھوں سے بازو ہٹایا اور کھل کر سانس لیا۔

سکینہ اپنی زندگی کے گزشتہ چودہ سالوں کو کبھی نہیں بھلا سکتی تھی' جب زمین اس کے قدموں کے نیچے تھی اور زندگی کے سب رنگ اس کی دسترس میں تھے۔ پھر اچانک ہی اس کی زندگی کا کینوس بدل گیا اور اس میں کچھ بھدے رنگ نمودار ہوگئے اور وہ وقت کے ظالم شکنجے میں آگئی۔ گزشتہ پانچ سالوں سے وہ علاج کی غرض سے لاہور کے کئی اسپتالوں میں رہی' جہاں اس کا پیلوس (Pelvis) کا آپریشن کرنے کے بعد ڈاکٹرز نے مزید علاج کرنے سے انکار کردیا۔ اس وقت سکینہ کو لگا کہ جیسے اسے کسی نے ایفل ٹاور سے دھکا دے دیا ہو۔ ساری جمع پونجی ختم ہوچکی تھی۔ ان ہی دنوں اس نے بیت المال کو اپنی بیماری کی ساری تفصیل لکھ کر بھیجی اور پھر وہیں کے ایک مہربان آفیسر کی مدد سے وہ لاہور سے اسلام آباد علاج کی غرض سے آگئی۔ یہاں اس کا سارا علاج مفت تھا۔

"ہاں بھئی سکینہ! یہ بخار کیوں نہیں اتر رہا تمہارا؟" اگلی صبح ڈاکٹر خاور نے اس کی رپورٹس دیکھتے ہوئے اپنی مریضہ سے خوش گوار لہجے میں پوچھا۔

"پتا نہیں ڈاکٹر صاحب! اندر کی تپش کم ہونے کا نام کیوں نہیں لے رہی۔"

"اونہوں! مایوسی والی کوئی بات نہیں چلے گی۔" ان کے تنبیہی لہجے اور مسکراتی آنکھوں نے سکینہ کو بے بس کردیا تھا۔

"مجھے تو ویسی ہی سکینہ اچھی لگتی ہے جو پہلے دن پورے اعتماد کے ساتھ مجھ سے لڑ پڑی تھی کہ جب

قرآن پاک میں ہے کہ سوائے موت کے ہر بیماری کا علاج موجود ہے تو آپ لوگ میرا علاج کیوں نہیں کرتے۔یاد ہے ناں!" انہوں نے ہاتھ میں پکڑا بال پوائنٹ ہلکے سے اس کے سر پر مار کر شرارت سے یاد دلایا تھا۔ان کے اس انداز پر وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

"جی یاد ہے۔اس پینل میں موجود سب ڈاکٹرز میں واحد آپ تھے جنہوں نے کہا تھا کہ میں سکینہ اللہ دتا کا کیس ہینڈل کروں گا۔"

وہ کیسے اس دن کا منظر بھول سکتی تھی، جب سب لوگ مایوسی بھری باتیں کررہے تھے۔ایسے میں چھ فٹ دو انچ کے مردانہ وجاہت سے مالا مال اسپائنل سرجن ڈاکٹر خاور نے کچھ امید کے جگنو اس کی مٹھی میں پکڑائے تھے۔وہ اپنی مقناطیسی کشش کی حامل بادامی آنکھیں جب کسی پر ٹکا دیتے تو مدمقابل بات کرنا بھول جاتا تھا۔گھنی سیاہ مونچھیں، کھڑی مغرور ناک، کشادہ پیشانی اور بے نیازی نے ان کی شخصیت کو ناقابل تسخیر سا بنا رکھا تھا۔

"جی جناب! آپ کے اسی یقین اور اعتماد کے بل بوتے پر میں نے آپ کے علاج کا فیصلہ کیا تھا۔آپ کا اللہ پر پختہ یقین اس سفر میں میرا زادِ رہ ہے۔مجھے مکمل بھروسا ہے کہ اللہ اتنی اچھی لڑکی کو کبھی مایوس نہیں کرے گا۔"

وہ واحد شخص تھے جو پورے اسپتال میں اسے سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ان کی اسی اہمیت اور توجہ کے باعث وہ آسمانوں پر اڑتی پھرتی تھی۔وہ دل ہی دل میں ان کے کہے جملوں کو ہزاروں دفعہ دہراتی کہ اسے ازبر ہوجاتے۔

"کل جب میں آؤں تو یہ سب بخار وغیرہ غائب ہونا چاہیے۔"

وہ رکے اور ہلکا سا مسکرائے۔سکینہ کی دھڑکنیں بے ربط ہوگئیں۔وہ ایک ہوا کے جھونکے کی طرح کمرے سے نکلے تھے۔ان کے لباس سے اٹھنے والی نفیس بھینی بھینی خوشبو پورے کمرے میں رقص کرتی پھر رہی تھی۔اس پر چھائی مایوسی ایسے اڑی تھی، جیسے ہوا کے ہلکے سے جھونکے سے زرِ گل اڑ جاتا ہے۔اس کے اندر موجود محبت کی تتلی نے عجب سرخوشی کے عالم میں گول گول چکر لگانے شروع کردیے تھے۔

اللہ دتا کمہار کی اکلوتی بائیس سالہ کبڑی بیٹی کو مردانہ وجاہت سے مالا مال اسپائنل سرجن ڈاکٹر خاور سے محبت ہوگئی تھی۔

☆ ☆ ☆

وہ سائیکولوجسٹ ماہم منصور کی زندگی کا ایک انتہائی منفرد، مشکل مگر دلچسپ کیس تھا۔

وہ جب پہلی دفعہ اپنی والدہ کے ساتھ اس کے پرائیویٹ کلینک میں آیا تو اس کی آنکھوں میں عجیب سی وحشت اور بے چارگی تھی۔اس کے پورے وجود پر قنوطیت کی دبیز تہہ چڑھی ہوئی تھی۔ٹانگ پر ٹانگ رکھے وہ انتہائی اضطراری انداز میں اپنا دایاں پاؤں مسلسل ہلا رہا تھا جو اس کے اندرونی خلفشار کی بھرپور عکاسی کررہا تھا۔وہ عجیب سی خود فراموشی کی کیفیت میں مبتلا تھا۔اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں سختی سے پھنسائی ہوئی تھیں۔

"ایسے آرٹسٹک ہاتھ تو مصوروں کے ہوتے ہیں۔" ماہم کو اس کے ہاتھ دیکھ کر پہلا خیال یہ ہی آیا تھا۔

بلیو جینز پر سفید شرٹ پہنے، بڑھی ہوئی شیو اور رف سے حلیے میں بھی اس کی شخصیت خاصی متاثر کن تھی۔چکن کے ہلکے سرمئی رنگ کے سوٹ میں ملبوس اس کی ماں کشمیری حسن سے مالا مال تھی لیکن ان کے حسن میں ایک عجیب سا سوز تھا۔وہ عمر کے اس حصے میں بھی خوب غضب ڈھا رہی تھیں۔

"میرا بیٹا الیکٹریکل انجینئر ہے اور اس کی ساری ایجوکیشن انگلینڈ کے ٹاپ کلاس تعلیمی اداروں کی ہے۔"

اس کی ماں نے علیحدگی میں اسے بڑی رنجیدگی کے ساتھ معلومات فراہم کیں۔وہ اپنے بیٹے کی ہسٹری بتانے کے لیے ساتھ آئی تھیں۔ماہم نے پہلے ان ہی کو اندر بلوایا تھا۔

"میں بہت امید کے ساتھ آپ کے پاس آئی ہوں مجھے ڈاکٹر فیصل نے ڈاکٹر جواد سہیل کا بتایا تو پتا چلا کہ وہ تو امریکہ شفٹ ہوگئے ہیں لیکن ان کی بھانجی ان کا کلینک چلا رہی ہیں۔اس لیے میں آپ کے پاس آئی ہوں۔" ان کے انداز میں متانت اور سنجیدگی کا عنصر غالب تھا۔

ڈاکٹر جواد بہت زبردست سائیکاٹرسٹ تھے اور ماہم کے ماموں بھی تھے۔اس نے بھی ان سے بہت کچھ سیکھا تھا۔وہ ایک سائیکولوجسٹ کی حیثیت سے ان کے ہمراہ کام کرتی رہی تھی۔

"میں تو سوچ رہی تھی کہ آپ کوئی عمر رسیدہ خاتون ہوں گی لیکن آپ تو خاصی ینگ ہیں اور شاید میرے رامس سے بھی چھوٹی ہوں گی۔" وہ خاتون خاصی صاف گو تھیں۔اس کا اندازہ ماہم کو ابھی ابھی ہوا تھا۔وہ ان کے چہرے پر پھیلے تذبذب پر کھل کر مسکرائی۔

"میں بے شک ینگ سہی مگر میری قابلیت میں کوئی شک نہیں ہے۔میں نے کلینیکل سائیکولوجی میں امریکہ سے ڈپلومہ کیا ہے اور اس کے علاوہ جواد انکل کی اسسٹنٹ کے فرائض بھی سرانجام دیے۔آپ ان شاءاللہ مایوس نہیں ہوں گی۔"

ماہم کی زندگی میں یہ پہلا موقع نہیں تھا۔اس کے پاس آنے والے اکثر مریض اپنے سامنے اتنی کم عمری سائیکولوجسٹ کو دیکھ کر چونک جاتے تھے۔اس کی وضاحت پر وہ ہلکا سا مسکرائیں۔

"میرے ہزبینڈ کا انتقال ہوچکا ہے اور میرے صرف دو بیٹے ہی ہیں۔آج سے دو سال پہلے تک میں خود کو دنیا کی خوش قسمت خاتون سمجھتی تھی لیکن حالات اس طرح بھی پلٹا کھا سکتے ہیں، میرے گمان کی آخری سرحدوں پر بھی ایسا کچھ نہیں تھا۔" ان کی آنکھوں کے کنارے سرخ ہونے لگے۔ماہم نے ان کو بولنے دیا۔

"رامس میرا چھوٹا بیٹا ہے اور چھبیس سال کی عمر میں اس نے وہ کامیابیاں حاصل کیں جو لوگ عمر کے آخری حصے میں حاصل کرتے ہیں، لیکن اب اس کی حالت دیکھ کر دل پھٹتا ہے۔میں صرف اس کی وجہ سے انگلینڈ سے یہاں شفٹ ہوئی ہوں کیونکہ مجھے ڈاکٹرز نے اسی چیز کا مشورہ دیا تھا۔" ان کی آنکھوں میں رنجیدگی ہلکورے کھا رہی تھی۔

"شوہر کے انتقال کا صدمہ اپنی جگہ لیکن اپنے اتنے خوبرو، جوان اور ایجوکیٹڈ بیٹے کی حالت دیکھ کر میری راتوں کی نیندیں اڑ گئی ہیں۔یہ تو اتنی نفیس طبیعت کا حامل تھا کہ ہلکی سی بو بھی اس کے لیے ناقابل برداشت ہوتی تھی لیکن اب ایک گھنٹے میں اتنی سموکنگ کرتا ہے کہ سارا کمرا دھوں دھواں ہوجاتا ہے۔ساری ساری رات جاگتا ہے۔اپنے ڈیڈی کی اذیت ناک موت نے اس کی پوری زندگی کو ہی ڈسٹرب کردیا ہے۔" رامس کی والدہ کی آنکھ سے بہتی ہوئی نمی کی لکیر اب گالوں پر پھیلی رہی تھی۔ماہم نے انہیں گفتگو کے درمیان بالکل نہیں ٹوکا تھا۔اسے معلوم تھا کہ مریض کے رشتے دار روانی میں بے ربط باتیں کرتے ہوئے بھی بہت سی کام کی باتیں بتا جاتے ہیں۔

"ساری رات لائٹیں جلا کر اسموکنگ کرتا رہتا ہے۔کہتا ہے کہ تاریکی سے اسے ڈر لگتا ہے۔بعض دفعہ ایسی باتیں کرتا ہے کہ میں حیران رہ جاتی ہوں کہ یہ تو کبھی بھی ایسا نہیں تھا۔" وہ خاموشی سے اس خاتون کو دیکھ رہی تھی جو پچھلے ایک گھنٹے سے مسلسل بول رہی تھیں۔ان کے ساتھ سیشن کرکے اس نے انہیں گھر بھیج دیا تھا۔

ماہم کا رامس علی کے ساتھ پہلا سیشن بالکل کامیاب نہیں رہا تھا۔وہ اس کے ساتھ کوئی تعاون کرنے کو تیار نہیں تھا۔اس نے اپنے دو گھنٹے کے سیشن میں ماہم اور اس کی اسسٹنٹ کو زچ کردیا تھا۔وہ سپاٹ سے چہرے کے ساتھ بڑے نپے تلے انداز سے جواب دے رہا تھا لیکن ایسا ماہم کی پروفیشنل زندگی میں پہلی دفعہ نہیں ہوا تھا۔اگلے سیشن میں وہ اکیلا ہی اس کے پاس آیا تھا۔آزردگی اور تھکن اس کے ہر انداز سے مترشح تھی۔اس کی سرخ آنکھیں رت جگے کی غمازی کررہی تھیں۔اپنی ڈریسنگ کے

معاملے میں وہ خاصا لاپروا تھا لیکن اس کے باوجود وہ ماہم کے شان دار انٹیریر والے کلینک میں سب سے زیادہ شان دار لگ رہا تھا۔ اس نے پچھلے آدھے گھنٹے میں کوئی تیسری دفعہ سگریٹ سلگائی تو ماہم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"رامس! تم موویز دیکھتے ہو؟" وہ تھوڑا سا جھک کر انتہائی شوق، دلچسپی اور تجسس سے اس کا بے زار چہرہ دیکھ رہی تھی۔

"نہیں۔" وہ اس سوال پر اس قدر حیران ہوا تھا کہ کش لگانا ہی بھول گیا۔

"چلو پھر چھوڑو سب چیزوں کو۔ یہ سیشن ویشن بعد میں ہوتے رہیں گے۔ آج ہم دونوں مل کے مووی دیکھتے ہیں۔ اس کے بعد تم مجھے زبردست سی کافی پلاؤ گے۔"

اس نے فیصلہ کن انداز سے گاڑی کی چابیاں اٹھائیں جب کہ وہ ہکا بکا سا منہ کھولے اپنی سائیکولوجسٹ کو دیکھ رہا تھا جو اسے لمحہ لمحہ حیران کر رہی تھی۔

"بھئی جلدی کرو ناں، کن سوچوں میں گم ہو گئے ہو۔ شو کا ٹائم نکل جائے گا۔" وہ اس کے بالکل سامنے کھڑے ہو کر دو ٹوک انداز میں کہہ رہی تھی جب کہ اس کی اس ہٹ دھرمی پر وہ جھنجلا سا گیا۔

"مجھے موویز اچھی نہیں لگتیں۔" اس نے ناگواری سے ہاتھ میں پکڑی سگریٹ کو میز پر رکھے ایش ٹرے میں مسلا۔

"کوئی بات نہیں، مجھے تو اچھی لگتی ہیں ناں۔" اگلے ہی لمحے وہ اس کا بازو پکڑ کر بڑے پُر اعتماد انداز سے اسے اٹھا رہی تھی۔

رامس کو دھچکا سا لگا۔ اس نے سخت بے یقینی سے اپنے سامنے کھڑی نازک سراپے کی حامل دلکش ڈاکٹر کو دیکھا، جو آج اسے کسی بھی قسم کی رعایت دینے کو تیار نہیں تھی۔ وہ اس عجیب و غریب رویے کی حامل سائیکولوجسٹ سے بری طرح مرعوب ہو گیا تھا جو اپنے مریض کے ساتھ دوسرے ہی سیشن میں مووی دیکھنے جا رہی تھی۔ اس نے ٹھنڈی آہ بھر کر ہتھیار پھینک دیے اور کچھ ہی لمحوں کے بعد وہ اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ اسے لگا تھا جیسے اس لڑکی نے اسے ہپناٹائز کر دیا ہو۔

☼ ☼ ☼

آسمان پر بادل تہہ در تہہ جھکتے ہی چلے آ رہے تھے۔ گہرے سرمئی اندھیرے میں ڈوبتی شام خاصی خاموش تھی لیکن آسمان پر چھائے بادلوں نے خوب اودھم مچا رکھا تھا۔ ڈاکٹر خاور نے فضا میں مہکتی کچی مٹی کی خوشبو کو محسوس کرتے ہوئے گاڑی پارکنگ میں کھڑی کی۔ آج اتوار کی چھٹی ہونے کی وجہ سے اسپتال میں رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ جیسے ہی گاڑی پارک کرکے باہر نکلے، ایک تیز بوچھاڑ نے ان کا سارا چہرہ بھگو دیا۔ موسلا دھار بارش سے بچتے ہوئے انہوں نے شارٹ کٹ رستہ اختیار کیا تھا۔ وہ پرائیویٹ وارڈ کے کمروں کی پشت پر بنے شیڈز کے نیچے سے گزر رہے تھے۔ بھیگی ہوئی ہوا میں برسات کی ایک مخصوص مہک تھی۔ یہ بے وقت کی برسات دل کو کافی اداس کر رہی تھی۔

ایک شیڈ کے پاس سے گزرتے ہوئے ایک آواز نے ان کے پاؤں جکڑ لیے۔ آواز میں سوز کی کیفیت سننے والے کے دل پر کتنا اثر کرتی ہے، اس کا اندازہ انہیں پہلی دفعہ ہوا تھا۔ آواز نہ صرف خوبصورت تھی بلکہ لہجے کے اتار چڑھاؤ نے انہیں مبہوت سا کر دیا تھا۔ اس کی آواز میں سبک ندی کا سا بہاؤ تھا۔ وہ ایک جذب کے عالم میں نعت پڑھ رہی تھی۔

ڈاکٹر خاور نے اس آواز کے سوز کے حصار سے بمشکل نکلتے ہوئے اندازہ لگایا کہ وہ کمرا نمبر آٹھ کی کھڑکی کے آگے کھڑے تھے اور یہ مسحور کن آواز شاید نہیں یقیناً سکینہ کی تھی۔ انہوں نے غیر ارادی طور پر تھوڑا سا جھک کر کمرے کی کھڑکی سے جھانکا تو سامنے ہی وہ آنکھیں بند کیے بڑے جذب کے عالم میں کسی اور ہی دنیا میں پہنچی ہوئی تھی۔ وہ انتہائی بے یقینی سے سکینہ کو دیکھ رہے تھے۔ انہیں کبھی گمان تک نہیں ہوا تھا کہ اس کی آواز اتنی خوبصورت ہو سکتی ہے۔ کمرے کی لائٹ بند تھی لیکن باہر لگے بلب کی روشنی کی ایک لکیر اندر جا رہی تھی۔ وہ کھڑکی سے تھوڑا سا ہٹ کر کھڑے ہو گئے۔

اس کی آواز رات کے سناٹے اور خاموشی میں دُور تک ایک سحر سا طاری کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر خاور نے بمشکل اپنے قدموں کو چلنے پر راضی کیا۔ اس کی شفاف ندی کی مانند آواز کسی جھرنے کی صورت اپنا راستہ خود بناتی جا رہی تھی۔ وہ جو ایمرجنسی میں کوئی کیس بھگتانے آئے تھے، اس آواز نے ان کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی تھیں۔ ایک دم وہ چُپ ہوئی اور ایسا لگا جیسے فضا کا طلسم ٹوٹ گیا ہو۔

"کیا ہو گیا سکینہ! آگے پڑھ ناں۔" جمیلہ مائی جو تسبیح ہاتھ میں پکڑے کسی اور دنیا میں پہنچی ہوئی تھیں اس کے ایک دم چُپ کر جانے پر جھنجلا کر بلند آواز میں بولیں۔

"اماں! مجھے لگتا ہے کہ باہر کھڑکی کے پاس کوئی ہے۔"

سکینہ کا دل عجیب انداز میں دھڑکا تھا۔ ڈاکٹر خاور پر شرمندگی کا بڑا بھرپور حملہ ہوا۔ وہ فوراً کھڑکی سے ہٹ گئے۔ انہوں نے زندگی میں کبھی ایسی حرکت نہیں کی تھی لیکن اس آواز کا جادو ایسا تھا جو ان پر سر چڑھ کر بولا تھا۔ ان کا خود بھی دل چاہا تھا کہ وہ آگے مزید پڑھے۔

"لے دس بھلا کسی کی مت ماری گئی ہے جو اتنی بارش میں باہر کھڑا ہو گا، کملی تو نہیں ہو گئی میری دھی! چل شاباش آگے پڑھ۔" جمیلہ مائی کو اپنی بیٹی کی آواز میں نعتیں، حمد اور منقبت سننا بہت پسند تھا اور ان کا فرمائشی پروگرام اکثر ہی جاری رہتا۔

"پڑھ دے ناں سکینہ! دل کو اتنا سکون مل رہا تھا۔" ان کے لہجے میں اتنی التجا تھی کہ اس نے فوراً ہی آنکھیں بند کرکے پڑھنا شروع کیا۔ اس کی آواز نے ڈاکٹر خاور کو ایک دفعہ پھر جکڑ لیا تھا۔ وہ وہیں کے وہیں جم کر رہ گئے تھے۔ وہ اب سحر انگیز آواز میں پڑھ رہی تھی۔

وہ ایک دفعہ پھر اپنی دنیا میں مگن ہو چکی تھی۔ اس سے زیادہ وہاں کھڑے ہونا انہیں زیب نہیں دے رہا تھا۔ وہ پاؤں گھسیٹتے ہوئے بمشکل چل پڑے تھے۔ سکینہ کی آواز نے کافی دور تک ان کا تعاقب کیا تھا۔ وارڈ میں داخل ہوتے ہی انہوں نے سر جھٹک کر خود کو اس سحر سے آزاد کیا۔ رات کو ایمرجنسی سے فراغت ملی تو دس بج رہے تھے۔ سکینہ کے کمرے کے آگے سے گزرتے ہوئے اندر لائٹ جلتی دیکھ کر وہ رک گئے۔ بے اختیار ہی ہلکا سا دروازہ بجا کر اندر داخل ہو کر انہیں سخت شرمندگی کا احساس ہوا کیونکہ سامنے سنگل بیڈ پر تکیے کے ساتھ ٹیک لگا کر "عشق کا عین" پڑھتی سکینہ بوکھلا سی گئی تھی جب کہ اس کے بالمقابل صوفہ کم بیڈ پر بڑی عقیدت کے ساتھ قرآن پاک پڑھتی جمیلہ مائی بھی چونک گئی تھیں۔

"آئی ایم سوری! میں یہاں سے گزر رہا تو سوچا سکینہ کا حال پوچھ لوں۔" وہ نہ جانے کیوں خفت کا شکار ہوئے تھے۔

"اللہ تساں نوں اس دا اجر دے بیٹا! ورنہ غریباں نوں اس اسپتال وچ اللہ دے سوا بس تواڈا آسرا ہے۔"

جمیلہ مائی نے قرآن پاک بند کرکے انتہائی ممنونیت سے ڈاکٹر خاور کو دیکھا تھا جن سے بڑی امید تھی۔ اس سے پہلے والے تقریباً سب ہی ڈاکٹرز نے سکینہ کی بیماری کو لاعلاج قرار دے کر انہیں مایوسی کی بھٹی میں دھکیل دیا تھا لیکن ان کے حوصلے پھر بھی جوان رہے تھے۔

"ہاں بھئی سکینہ! ٹانگوں میں آج تو کوئی درد نہیں ہوا ناں۔" انہیں اپنے پروفیشن سے بے پناہ عشق تھا اور سکینہ کا کیس تو انہوں نے ایک چیلنج سمجھ کر قبول کیا تھا۔ ان کے اس قدر توجہ سے پوچھنے پر سکینہ کے چہرے پر تیزی سے فینسی لائٹس چمکی تھیں۔

"نہیں ڈاکٹر صاحب! اب درد نہیں ہو رہا۔" اس کے معنی خیز لہجے پر جمیلہ مائی نے الجھ کر اپنی اکلوتی بیٹی کو

دیکھا۔ جو آج کل اسے قدم قدم پر حیران کر رہی تھی۔

"ہوں، "عشق کا عین" اس کا مطلب ہے کہ ہماری سکینہ کو مطالعے سے بھی خاصا شغف ہے۔" ڈاکٹر خاور کے جملے میں "ہماری" لفظ نے سکینہ کے اندر توانائی کا ایک سمندر بھر دیا تھا اور وہ بغیر پروں کے ہی فضاؤں میں تھی۔

"بس ڈاکٹر صاحب! یہ سب تو زندگی گزارنے کے ہتھیار ہیں۔ اگر یہ ساتھ نہ ہوں تو سکینہ وقت سے پہلے ہی نہ مرجائے۔" اس کا انداز اگرچہ شگفتہ تھا پھر بھی جمیلہ مائی نے دہل کر اپنی اکلوتی بیٹی کا چہرہ دیکھا تھا۔

"اللہ نہ کرے سکینہ! ایسی باتیں کرتی ہیں آپ۔" ڈاکٹر خاور کے لہجے سے بھی ہلکی سے خفگی جھلکی تھی۔

انہوں نے پہلی دفعہ اس کے کمرے کا جائزہ لیا۔ سامنے لوہے کی الماری پر بہت سی کتابیں سلیقے کے ساتھ رکھی ہوئی تھیں۔ کمرے میں موجود واحد میز پر چائے کے برتن دھلے ہوئے، ساتھ ایک فائل اور کچھ ادویات رکھی ہوئی تھیں۔ الماری کے اوپر والے خانے میں چھوٹا سا قرآن پاک، ایک تسبیح، جائے نماز، روم اسپرے اور کافی ساری چھوٹی چھوٹی چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر خاور کو اندازہ تھا کہ یہ کمرا انہیں بیت المال والوں کی بھرپور کوششوں سے ملا ہے اور وہ پچھلے بیس دن سے یہاں مقیم تھیں۔

"ڈاکٹر صاحب! کیا میں اپنے پیروں پر چلنے لگوں گی ناں۔" اس کے لہجے بچوں کا سا اشتیاق جھلک رہا تھا۔ وہ اس کی بات پر ہلکا سا مسکرائے۔

"ان شاء اللہ۔" ان کے انداز میں بھرپور اعتماد تھا۔

"پتا ہے ڈاکٹر صاحب! میں ٹھیک ہونے کے بعد پھر سے اپنا پڑھائی کا سلسلہ شروع کروں گی۔ مجھے بھی آپ کی طرح ایک اچھا ڈاکٹر بننا ہے۔" سکینہ کا پرعزم انداز ڈاکٹر خاور کے ساتھ ساتھ جمیلہ مائی کو بھی اچھا لگا تھا۔

"ان شاء اللہ، میرا سوہنا رب او ویلا ضرور لائے گا جی۔" جمیلہ مائی نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔

"آپ کی بس ایک ہی فلاسفر بیٹی ہے؟" ڈاکٹر خاور کی بات میں لفظ فلاسفر تو جمیلہ مائی کو سمجھ میں نہیں آیا تھا لیکن ان کے اس قدر اہمیت دینے پر وہ خاصی مسرور تھیں۔

"جی اکوں اک دھی اے۔ تے اسی اپنی دھی نوں شادی دے پورے ستارا وریاں (سترہ سال) دعاواں نال حاصل کیتا اے۔ اس نمانی دا پیو تے اپنی دھی دا دیوانہ اے۔ ادہنے اپنی کاکی دی پیدا ہون دی خوشی وچ پورے پنڈ نوں موتی چور دے لڈو کھلائے سن۔" جمیلہ مائی کی بات پر ڈاکٹر خاور کھل کر مسکرائے۔

"واقعی؟" انہیں بڑی خوش گوار حیرت ہوئی۔

"پھر تو وہ بہت پریشان ہوں گے سکینہ کی بیماری کی وجہ سے۔" ڈاکٹر خاور نے اس کی تازہ رپورٹس اور ریڈنگ کو دیکھتے ہوئے سنجیدگی سے پوچھا۔

"پریشان تے ہے، پر سانوں سوہنے رب دے نال کوئی گلہ نئیں۔ اس دھی رانی نے پورے چودہ ورے ساڈی پھیکی زندگی وچ پھل وی تے کھلائے سن۔ ایدھا پیو آکھدا اے کہ جمیلہ! اللہ توں کدی شکوہ نہ کریں تے میں اے گل اپنے پلو نال بانده لئی۔"

ڈاکٹر خاور نے سخت حیرت سے اپنے سامنے مؤدب انداز میں کھڑی خاتون کو دیکھا جو مجسم صبر و شکر کا نمونہ تھی۔ انہیں بے ساختہ ان پر رشک آیا تھا۔ وہ آج بڑی فرصت سے ان کے سامنے کھڑے تھے اور سکینہ کا دل بری طرح بغاوت پر اترا ہوا تھا۔

"بس اماں! اللہ انہیں استقامت دے اور سکینہ کو اس استقامت کے بدلے صحت دے۔" انہوں نے خلوص دل سے دعا کی تھی۔

"ویسے سکینہ! آپ کی آواز بہت خوبصورت ہے۔ آج شام نعت کے کچھ اشعار میرے کانوں میں پڑے تو مجھے اندازہ ہوا۔"

اپنی تعریف پر اس کے چہرے کی رنگت میں سرخی سی پھیلی تھی، جس نے اس کے چہرے کا رنگ اور سانولا کر دیا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ شام میں کھڑکی کے پاس ڈاکٹر خاور ہی تھے۔ اس کے دل نے جھوٹی گواہی نہیں دی تھی۔ اس کے دل کی دھڑکنیں ایسے ہی بے

ربط نہیں ہوئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

"محبت اور مجھے۔ وہ بھی رامس علی سے؟؟ اوہ نٹ اپ یار!"

اس نے چونک کر دہرایا اور پھر اپنے سامنے بیٹھی عائشہ رحیم کو بے یقینی سے دیکھا جو یہ پھلجھڑی چھوڑ کر بڑی بے تکلفی سے سیب کھانے میں مگن تھی۔ گلاس وال سے باہر بارش گارڈینیا اور زینیا کی کیاریوں پر مسلسل برس رہی تھی۔

"کسی کے متعلق بات کرنے کا مطلب یہ تھوڑی ہوتا ہے کہ آپ کو اس سے محبت ہو گئی ہے۔ تم بعض دفعہ کمال کر جاتی ہو عائش!" ماہم اپنے لمبے ناخنوں پر بڑی نفاست سے نیل پالش لگا رہی تھی۔ سیاہ رنگ کے سوٹ میں اس کی شہابی رنگت دمک رہی تھی۔

"کبھی کبھار کسی کے متعلق بات کرنا علیحدہ بات ہے لیکن جب آپ صبح و شام ایک ہی شخص کی شان میں قصیدے پڑھیں گے تو میرے جیسا عقلمند بندہ بھی مشکوک ہو جائے گا ناں۔"

عائشہ نے سر جھٹک کر بے زاری سے اپنی اکلوتی بہترین دوست کو دیکھا جو نیل پالش لگا کر اب پھونکیں مار مار کر اسے خشک کر رہی تھی۔

"وہ میرا پیشنٹ ہے اور میں اس کا علاج کر رہی ہوں بس۔" ماہم نے جیسے اسے یاد دلایا۔

"پہلی دفعہ علاج تھوڑی کر رہی ہو اور جیسے میں نے تو تمہیں علاج کرتے ہوئے دیکھا نہیں ہے۔ تمہاری ایک ایک رگ سے واقف ہوں میں۔ اس مریض کو ضرورت سے زیادہ تم نے سر پر سوار کر لیا ہے۔" اس کی نظریں شیشے کی دیوار کے اس پار برستی بارش پر تھیں۔ بریگیڈیر منصور نے یہ گھر بڑے آرٹسٹک انداز میں بنوایا تھا۔ ہر کمرے سے خوبصورت لان کا نظارہ کیا جا سکتا تھا۔

"یار! وہ جواد انکل کے ریفرنس سے میرے پاس آیا ہے اور ان کا تو تمہیں پتا ہے، ہر سیشن پر اپ ڈیٹس لینے کے لیے امریکہ سے اتنی لمبی کال کرتے ہیں۔" ماہم نے ہنوز اپنے کام میں مصروف ہوتے ہوئے بھی اسے وضاحت دی۔

"خطاوار سمجھے گی دنیا تجھے۔ اب اتنی زیادہ صفائی نہ دے۔"

عائشہ شرارت سے گنگنائی۔ ماہم نے اسے گھور کر دیکھا۔

"اف! اتنا فضول کام تم کتنی توجہ سے کر رہی ہو۔" عائشہ نے اسے محویت سے نیل پالش لگاتے دیکھ کر طنزیہ کہا تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ عائشہ نے توصیفی نگاہ سے اس کی انگلیوں کو دیکھا جنہیں دیکھ کر گمان ہوتا تھا کہ کسی سنگ تراش نے اسے بڑی محنت سے تراشا ہو گا۔

"ویسے یار! تمہیں بھلا ان مصنوعی ہتھیاروں کی کیا ضرورت ہے۔ خوامخواہ خود کو ہلکان کرتی ہو۔" عائشہ نے رشک بھری نظروں سے اسے دیکھا پانچ فٹ پانچ انچ قد، سرخ و سفید رنگت جیسے کسی نے دودھ میں روح افزا ملا دیا ہو۔ شہد رنگ آنکھیں، ستواں ناک اور گلاب کی پنکھڑی جیسے ہونٹ، اسے اپنی دلکشی کا بھرپور احساس تھا۔

"یار! کیا کروں، دل چاہتا کہ بس ہر لحاظ سے پرفیکٹ نظر آؤں۔ آنکھوں کو ذرا سی کمی یا بھدا پن بھی بری طرح کھٹکتا ہے۔" اس کی ذات میں عجیب سی تمکنت اور بے نیازی تھی۔ کوئی عام سی چیز تو اس کی نگاہ کے سامنے ٹھہرتی ہی نہیں تھی۔

"تمہارے اندر کہاں سے کمی ہے یار!" عائشہ نے جھنجلا کر اپنی بے تحاشا حسن پرست دوست کو دیکھا جس کی آنکھوں میں روشنیوں کے سوتے سے پھوٹتے ہوئے دکھائی دیتے تھے اور فخر و انبساط کی لہریں اس کے وجود کا احاطہ کیے رکھتی تھیں۔

"مجھے معلوم ہے کوئی کمی نہیں لیکن عجیب بے چین طبیعت پائی ہے ماہ دولت نے۔" اسے خود بھی اپنی اس بے تحاشا خوبصورتی کی دلدادہ فطرت کا پتا تھا اور ایک سائیکولوجسٹ ہونے کی حیثیت سے وہ اپنی اس

خامی پر قابو پانے سے قاصر تھی۔

"رامس علی بھی اچھا خاصا ہینڈسم بندہ ہے اور میرے خیال میں اسی وجہ سے تم اسے دن رات لفٹ کروا رہی ہو۔" عائشہ کو اچانک یاد آیا کہ گفتگو کا آغاز کہاں سے ہوا تھا۔ دونوں اس وقت ماہم کے بیڈ روم کے کارپٹ پر بے تکلفی سے بیٹھی ہوئی تھیں۔

"کچھ خدا کا خوف کرو یار! کیوں مجھے بدنام کر رہی ہو۔ مجھے خوبصورتی اٹریکٹ ضرور کرتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ میں اپنے پروفیشن میں بھی اس چیز کو حاوی کرلوں۔" ماہم نے ٹانگیں پھیلاتے ہوئے اپنی دوست کو گھورا تھا' جو اس کے بارے میں آج خاصے غلط اندازے لگا رہی تھی۔ اس کے اس طرح چپ کر بولنے پر وہ مسکرائی۔

"تمہاری حرکتیں ہی ایسی ہیں۔ میں کیا کروں۔" اس نے کندھے اچکا کر شرارت سے اسے دیکھا جو اس الزام تراشی پر اب اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔

"تو میں نے کیا کیا ہے؟"

"پہلے محترمہ اپنے مریض کے ساتھ پارکوں میں گھومتی دکھائی دیتی تھیں' اب یہ مووویز دیکھنے کا ڈراما شروع کر رکھا ہے۔" عائشہ کو ابھی تک یہ بات ہضم نہیں ہوئی تھی جب ماہم نے بتایا کہ وہ رامس کے ساتھ فلم دیکھ کر آئی ہے۔

"تمہیں اچھی طرح علم ہے کہ میرا کام کرنے کا اپنا ایک اسٹائل ہے اور میں اسی اسٹائل میں زیادہ ایزی محسوس کرتی ہوں۔ میرے پاس ایسے لوگ آتے ہیں جو کلینک کے ماحول میں گھبرا جاتے ہیں۔ ان کو لگتا ہے جیسے یہاں خفیہ کیمرے لگے ہوں گے اور ان کی ریکارڈنگ ہو رہی ہوگی اس لیے وہ خاصے محتاط انداز سے گفت و شنید کرتے ہیں۔ اس لیے ان کو باہر لے جاتی ہوں۔ کھلی فضا میں وہ اچھا رسپانس دیتے ہیں۔" ماہم نے خلاف توقع خاصی تفصیل سے جواب دیا تھا۔

"اور سینما کے رومانٹک ماحول میں تو اور بھی۔" عائشہ نے شوخی سے کہا تو ماہم کا چہرہ سرخ پڑ گیا۔

عائشہ اور ماہم کا بائیس سال کا ساتھ تھا۔ دونوں کے والد آرمی میں تھے لیکن اپنی پوسٹنگ کے دوران انہوں نے بچوں کو ہمیشہ ایک ہی جگہ پر رکھا تھا۔ دونوں پڑوسی بھی تھیں اور ماہم کی بڑی بہن کی شادی عائشہ کے خالہ زاد بھائی انصر جمیل کے ساتھ ہونے کی وجہ سے بھی دونوں خاندان ایک دوسرے کے قریب آگئے تھے۔ دونوں کی اسکولنگ سے لے کر یونیورسٹی لائف ایک ساتھ ہی گزری تھی۔ فرق بس اتنا تھا کہ عائشہ نے فائن آرٹس میں جبکہ ماہم نے سائیکولوجی میں ایم ایس سی کیا تھا۔ عائشہ کے والد لیفٹیننٹ جنرل تھے لیکن اس کے مزاج میں ضرورت سے زیادہ سادگی تھی۔

"تمہیں معلوم تو ہے کہ جب تک میں پورے دن کی رُوداد تمہیں نہ سنالوں' مجھے چین نہیں آتا۔ میرا دل بے قرار ہو جاتا ہے اور طبیعت میں عجیب سی بے زاری بھر جاتی ہے۔ تمہیں کیا پتا کہ تم میری آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کا سکون ہو۔" ماہم کی اداکاری عروج پر تھی۔ عائشہ نے کڑے تیوروں کے ساتھ کمر پر ہاتھ رکھ کر اسے گھورا۔

"بند ہو گئی تمہاری بکواس؟"

"ہاں اب تم شروع کرو۔" ماہم نے جان بوجھ کر اسے چڑایا تھا جو اپنے گھر جانے کے لیے پر تول رہی تھی۔ جب کہ ماہم نے ابھی بہت سی باتیں اسے سنانی تھیں۔ اپنی بڑی بہن کی شادی کے بعد اس کا اب کلینک سے آنے کے بعد زیادہ وقت عائشہ کے ساتھ ہی گزرتا تھا۔ بریگیڈیر منصور کی صرف دو ہی بیٹیاں تھیں جن میں ماہم چھوٹی تھی۔

"میں تمہارے لیول کی فضول گفتگو نہیں کرسکتی اور نہ ہی میرے پاس اتنا فالتو وقت ہے کہ میں تمہارا "رامس نامہ" سنوں۔ مجھے اپنی سولو ایگزیبیشن کی تیاری بھی کرنی ہے۔" ماہم نے بغور اس کے تاثرات جانچے۔ وہ اب بالکل بھی رکنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

"تم کسی دن میرے ہاتھوں قتل ہو جاؤ گی۔ یہ بات آج کہیں لکھ لو۔" عائشہ نے انگلی اٹھا کر اسے وارننگ دی تو ماہم ایک دفعہ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"اگلی دفعہ جب مووی دیکھنے جاؤں گی تو تم بھی میرے ساتھ چلنا۔"

"سوری! میرے پاس ایسی فضولیات کے لیے کوئی ٹائم نہیں۔ یہ پھیرے تمہیں ہی مبارک ہوں۔ تمہیں خود ایک اچھے سائیکاٹرسٹ کی ضرورت ہے۔ پہلی فرصت میں کسی سے اپائنٹمنٹ لو' سمجھیں!" عائشہ نے انگلی اٹھا کر وارننگ دی تو وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"اور اگر وہ سائیکاٹرسٹ بھی پہلے سیشن میں ہی مجھے مووی دکھانے لے گیا تو؟" ماہم اچھل کر اس کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

"تو ایسے واہیات بندے سے "فوراً" سے پہلے شادی کرلینا کیونکہ تمہیں ایسا ہی پاگل بندہ سوٹ کرتا ہے۔" عائشہ نے جل کر کہا اور "فوراً" کمرے سے نکل گئی۔ جاتے ہوئے اس نے اتنی قوت سے دروازہ بند کیا کہ ایک لمحے کو تو ماہم کو لگا جیسے کوئی بھونچال آگیا ہو۔ اگلے ہی لمحے وہ اسے منانے کے لیے اس کے پیچھے لپکی تھی۔

☼ ☼ ☼

صبح کا اجالا آہستہ آہستہ انگڑائی لے کر نمودار ہو رہا تھا۔

سکینہ نے ہاتھ بڑھا کر کھڑکی کا پردہ ہٹایا تو سامنے آم کے گھنے اونچے درختوں کے ساتھ ساتھ چمپا کے خوشبو اڑاتے ہوئے پیڑوں پر صبح کی دل فریبی چھائی ہوئی تھی۔ اس کا بیڈ بالکل کھڑکی کے پاس تھا۔ وہ کھڑی نہیں ہو سکتی تھی لیکن بیٹھے بیٹھے پردہ ہٹا کر باہر کے مناظر سے لطف اندوز ہوتی رہتی تھی۔ صبح کے وقت سکون کا احساس قدر تقویت بخش تھا کہ ایک لمحے کو سکینہ کا دل چاہا کہ وہ باہر نکل جائے لیکن جمیلہ مائی فجر کی نماز پڑھ کر دوبارہ سو چکی تھیں۔

سامنے لان میں لگے درختوں سے تھوڑا آگے پارکنگ تھی۔ جہاں اِکّا دُکّا گاڑیاں کھڑی تھیں۔ شیشم کے درخت کے نیچے ماربل کے بینچ پر ایک بوڑھا شخص اپنی بوسیدہ سی چادر اوڑھے سو رہا تھا۔ سکینہ کو بے اختیار ابا یاد آگیا۔ جو ہر پندرہ دن کے بعد پنڈ سے اتنا لمبا سفر کر کے ماں بیٹی سے ملنے آتا تھا۔ اس کی یہ روٹین گزشتہ چار سال سے تھی۔ وہ کئی کئی ماہ اسپتال میں رہ کر گھر آتی تو اللہ دتا کی خوشی دیدنی ہوتی۔ وہ بار بار اس کے ماتھے کا بوسہ لیتا' چونکہ اس کے یہاں رہنے کی وجہ سے سلسلۂ معاش رک جاتا تھا اس لیے پنڈ میں رہنا اللہ دتا کی بہت بڑی مجبوری تھی۔ وہ مٹی کے برتن بنا کر شہر میں فروخت کرتا اور اپنی ساری آمدن ماں بیٹی کو دے دیتا۔ وہ لوگ کئی کئی ماہ اسپتال میں رہتیں اور پھر ڈاکٹروں کے جواب دینے پر کچھ عرصے کے لیے گھر آجاتیں اور پھر کسی اور نئے ڈاکٹر کی تلاش میں نکل جاتیں۔

"ابا! تیرے ہاتھوں میں کتنی نفاست ہے۔ کتنے خوبصورت برتن بناتا ہے۔ تو ایسا کر ابا! کہ مجھے بھی ڈھا کے دوبارہ بنا دے۔" ایک دن اس کی عجیب و غریب فرمائش پر اللہ دتا نے دہل کر اسے دیکھا۔ یہ بیٹی اس کے جگر کا ٹکڑا تھی اور آنکھوں کی ٹھنڈک۔

"ناں پتری! ناں۔ ایسی باتیں نہیں کرتے' ہمارے ہاتھوں میں ایسی طاقت کہاں' یہ تو سوہنے رب کے کام ہیں۔ وہ جس کو چاہے' جیسا بنا دے۔" ابا اور اماں دونوں ہی صبر و شکر کی مٹی سے گوندھ کر بنائے گئے تھے۔ سکینہ کو انہیں دیکھ کر اکثر یہ خیال آتا تھا۔

"ابا! کیا ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ پہلے کسی بندے کو اچھا اچھا بنا دے اور پھر کچھ سالوں بعد اس کے مٹی سے بنے وجود کو عیب دار کردے۔" سکینہ کو اس دن پتا نہیں کیا ہوا تھا جو باپ سے ایسی باتیں کر رہی تھی۔

"سکینہ میری دھی! جھلی تو نہیں ہو گئی۔ اللہ ایسا کیوں کرنے لگا۔ وہ تو اپنے جن بندوں سے پیار کرتا ہے ان کو چھوٹی موٹی بیماری کی آزمائش میں ڈال دیتا ہے۔ جو اللہ کے صابر بندے ہوتے ہیں وہ اس امتحان میں پاس ہو جاتے ہیں اور جو ہم جیسے بے صبرے اور

جلد باز ہوتے ہیں فوراً" گلے شکوے کرنے لگتے ہیں۔ تو سچ سچ بتا جب تو ٹھیک تھی اور پورے چودہ سال تجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی تو تو نے کبھی ایک دفعہ بھی اللہ پاک کا شکر ادا کیا؟" اللہ دتا کی بات پر اس نے شرمندگی سے سر جھکا دیا۔ دل ندامت کے بوجھ سے بھر گیا تھا۔

"بس پتری! گھبراتے نہیں"۔ جب اللہ دتا کو اس پر زیادہ پیار آتا تو اسے پتری کہہ کر پکارتا تھا۔ "اللہ پاک اپنے کمزور بندوں پر ان کی ہمت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈھوتا۔" انہوں نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے نصیحت کی تھی۔ سکینہ کو آج نہ جانے کیوں ابا بہت یاد آرہا تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اس نے سوچ لیا کہ آج ہر حال میں انہیں فون کرنا ہے۔ باہر کے مناظر سے تنگ آکر اس نے تکیے سے ٹیک لگائی اور نعت پڑھنے لگی۔

صبح آٹھ سے نو بجے کا درمیانی وقت سکینہ کے لیے بہت اذیت ناک ہوتا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے گھڑی کی سوئیوں کو زنگ لگ گیا ہو۔ وہ آگے بڑھنے سے انکاری ہو گئی ہوں۔ انتظار کے لمحات اس قدر اعصاب شکن ہو سکتے ہیں۔ سکینہ کو اس چیز کا اندازہ زندگی میں پہلی دفعہ ہوا تھا۔ وہ اپنے کمرے کے باہر آنے والی قدموں کی چاپ پر کان لگائے بس گھڑی کی ٹک ٹک کو سنتی جاتی۔

ڈاکٹر خاور وقت کے خاصے پابند تھے اور ان کے جونیئرز ان کی عادت سے خاصے گھبراتے تھے۔ جس ڈاکٹر کا صبح ان کے ساتھ راؤنڈ ہوتا تھا وہ وقت پر پہنچنے کی بھرپور کوشش کرتا تھا۔ جیسے ہی گھڑیال نو بجاتا تھا، سکینہ کے چہرے پر پھیلنے والی روشنی جمیلہ مائی کو الجھن میں مبتلا کر دیتی تھی۔ انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ ان کی انوکھی لاڈلی بیٹی کھیلنے کے لیے چاند کی تمنائی بن رہی ہے۔ یہ بات ان کے لیے کسی بڑی پریشانی سے کم نہیں تھی۔

"کائفوسکولیسس (Kyphoscoliosis) یعنی ریڑھ کی ہڈی کا ٹیڑھا پن چالیس کے زاویے سے بڑھتا ہے تو مسلسل جھکاؤ کی وجہ سے کبڑا پن نمودار ہونے لگتا ہے۔"

ڈاکٹر خاور تین چار پوسٹ گریجویٹ ٹرینی ... سکینہ کا ایکسرے دکھا کر بتا رہے تھے۔ آج ان کے ... راؤنڈ پر کافی جونیئر ڈاکٹرز تھے جن کی وجہ سے کمرہ بھر سا گیا تھا۔ سکینہ بڑی محویت اور توجہ سے ڈاکٹرز کی گفتگو سن رہی تھی۔ وہ اپنی بیماری سے متعلق ... سے چھوٹی بات بھی دلچسپی سے سنتی تھی۔ اس کی ... توجہ کئی دفعہ ڈاکٹر خاور کے چہرے پر مسکراہٹ لے ... تھی۔ اس وقت بھی وہ کالے پھولوں والا لان کا ... اوڑھے بڑے اعتماد کے ساتھ تمام ڈاکٹرز کی گفتگو ... رہی تھی۔

"یہ بیماری مسلسل تکلیف، بے آرامی، ٹانگوں ... کمزوری کے علاوہ کسی معذوری کا بھی باعث بن ... ہے۔ اس کی وجہ سے کمر کے نچلے حصے میں درد، ... کندھوں یا کولہوں کا توازن بگڑ جانا اور مستقل درد کے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔" وہ بہت تفصیل سے ... جونیئرز کو بتا رہے تھے۔ سکینہ نے بڑی عقیدت بھرے انداز سے اپنے مسیحا کو دیکھا تھا۔ جمیلہ مائی بھی دونوں بازو سینے پر لپیٹے بڑی دقت کے ساتھ ان کی گفتگو کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

"سکینہ کے مسلز کچھ مضبوط ہو جائیں پھر ہم مزید کسی سرجری کا سوچیں گے کیونکہ وہ پہلے ہی تین چار دفعہ سرجری کے دشوار کن مرحلے سے گزر چکی ہے۔" انہوں نے کسی ڈاکٹر کے سوال کا بڑی سنجیدگی سے جواب دیا تھا۔ آگے کی گفتگو ان لوگوں نے انگلش میں شروع کر دی تھی جسے سکینہ کے ساتھ ساتھ جمیلہ مائی بھی سمجھنے سے قاصر تھیں۔

"ڈاکٹر صاحب! آپ لوگ بہت چالاک ہوتے ہیں جب کوئی بات مریض سے چھپانا ہوتی ہے تو انگلش ... میڈیکل کی اوکھی اوکھی زبان میں باتیں کرنے لگتے ہیں۔" اگلی صبح سکینہ کے شکوے پر وہ کھل کر مسکرائے۔

"ایسی بات نہیں ہے سکینہ! ہم میڈیکل کی زبان میں اپنے ساتھیوں کو زیادہ بہتر طریقے سے بات سمجھا سکتے ہیں اور میں تو آپ کی خاطر آپ کی بیماری کے سلسلے میں بہت آسان اور عام فہم زبان میں بات کرتا ہوں کیونکہ مجھے علم ہے کہ آپ اپنے کیس میں خاصی دلچسپی لیتی ہیں اور پھر آپ میری بہت خاص مریضہ بھی تو ہیں۔"

ڈاکٹر خاور کا عام سا لہجہ اس کا دل دھڑکا گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے اختیار ہی ستارے چمکے تھے۔ جمیلہ مائی نے بے ساختہ اپنی نادان بیٹی کے چہرے سے نظریں چرائی تھیں۔ اب معاملہ ان کے اختیار سے باہر ہو چکا تھا۔

"مجھے کل ڈاکٹر شمسہ بتا رہی تھیں کہ آپ کو دو دن سے کمر میں زیادہ تکلیف کا سامنا ہے۔ جس کی وجہ سے نماز پڑھنے میں دشواری ہوتی ہے۔" انہیں اچانک یاد آیا تھا۔

"جی ڈاکٹر صاحب! سجدہ کرتے ہوئے بہت مشکل ہوتی ہے۔" اس نے افسردگی سے اپنی پریشانی بتائی۔

"میں آپ کی فزیو تھراپسٹ سے بھی ڈسکس کروں گا اور مجھے ایسا کہنا تو نہیں چاہیے لیکن جب زیادہ تکلیف ہو تو آپ دو چار دن چھوڑ کر نماز پڑھ لیا کریں۔" انہوں نے بہت محتاط انداز سے مشورہ دیا تھا لیکن ان کی بات پر سکینہ کے ساتھ جمیلہ مائی کو بھی کرنٹ لگا تھا۔

"نہیں ڈاکٹر صاحب! ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ میں نے تو اپنے آپریشن کے دنوں میں بھی اشاروں سے نماز پڑھی ہے اور اللہ کا شکر ہے کہ میرے اماں اور ابا کے نزدیک کوئی نماز قضا نہیں ہے۔" جمیلہ مائی نے سخت ناگواری سے اپنی بیٹی کا چہرہ دیکھا۔ اس کے چہرے پر جھلکتا فخر انہیں کوفت میں مبتلا کر رہا تھا۔

"آئی ایم سوری! میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا۔ اصل میں آپ کی بیماری کی وجہ سے میں ایسا کہہ رہا ہوں ورنہ اسلام میں بھی بیماری کی چھوٹ تو ہے ناں، جب آپ ٹھیک ہو جائیں تو ادا کر دیجیے گا۔" انہوں نے شرمندہ شرمندہ انداز سے اپنے سامنے لیٹی عام سی لڑکی کو دیکھا جو بہت زیادہ عام ہونے کے باوجود بہت خاص تھی اور اس چیز کا ادراک انہیں ابھی ابھی ہوا تھا۔

"ارے بیٹا! ہم اللہ کے نمانے بندے ہیں۔ اس دی دتی ہوئی ہمت دے نال چلدے آں۔ مولا کریم نوں ساڈیاں نمازاں نال کی فرق پیندا اے۔ بس مولا کریم ہر لحہ شکر کرن والا بنائے اور اپنی عبادت کرن دی توفیق دے۔ ہمت اور طاقت دے۔ اساں بندے تے بے بس آں۔" جمیلہ مائی کے ہر لفظ سے عاجزی جھلک رہی تھی۔ ڈاکٹر خاور کے کمرے سے نکلتے ہی اماں نے سخت خفگی سے اپنی بیٹی کا چہرہ دیکھا۔

"سکینہ! اے بڑھ چڑھ کر گلاں کرنے دی کی لوڑ سی۔ سوچ سمجھ کر بولا کر کڑیے! اللہ دے ہاں لفظاں دی پکڑ وی ہوئے گی اور اپنی عباداتاں تے فخر نہ کر، عبادت کر کے احسان نہ جتایا کر۔ اللہ نوں کوئی فرق نئیں پیندا، بندے نوں فرق پیندا اے۔"

"لو اماں! میں نے کون سی غلط بات کر دی، جو شیرنی کی طرح مجھے دیکھ رہی ہو۔ لوگ اپنے الٹے سیدھے کام اتنے فخر سے جتاتے ہیں اور تجھے میری اتنی سی بات بری لگ گئی۔" سکینہ کو بھی ٹھیک ٹھاک غصہ آگیا تھا۔ آج کل تو ویسے بھی اماں کی ایکسرے کرتی نگاہوں سے اسے خاصی الجھن ہوتی تھی۔

"پتر! اس ویلے سے ڈر جب اللہ پاک کو تیرا بڑھ بڑھ کر بولنا برا لگ جائے۔ ایسی ٹھوکر لگائے گا کہ منہ کے بل گر جائے گی۔" جمیلہ مائی مذہب اور اللہ کے معاملے میں اپنی اکلوتی اولاد کا بھی لحاظ نہیں کرتی تھیں۔

"خدا کا خوف کر اماں! کیوں بددعائیں دے رہی ہے۔" سکینہ نے دہل کر اماں کا ناراض چہرہ دیکھا۔ ان کے ہر نقش سے خفگی جھلک رہی تھی۔

"سمجھا رہی ہوں تجھے۔ بددعائیں نہیں دے رہی۔ پگلی! دنیا وچ ایک ماں دا رشتہ ہی اے۔ جتھے نال کسی غرض دا پھندا نہیں لٹکیا ہوندا۔"

سکینہ اماں کی منطق سمجھنے سے قاصر تھی لیکن اگلی صبح اسے یقین آگیا تھا کہ ان کی بات میں کوئی نہ کوئی

سچائی تو تھی۔

دونوں ماں بیٹی اگلے دن بیدار ہوئیں تو چمکتا سورج سر پر تھا۔ اللہ جانے اس مدہوش نیند نے انہیں کتنا بے خبر کر دیا تھا کہ اسپتال کی مسجد سے "نیند سے بہتر ہے نماز" کے الفاظ بھی دونوں ماں بیٹی کو اٹھانے میں ناکام ہوگئے تھے۔ جمیلہ مائی نے تو کبھی صبح اٹھنے کے لیے الارم بھی نہیں لگایا تھا۔

دونوں ماں بیٹی کی نماز قضا ہو چکی تھی۔

ندامت، شرمندگی اور افسوس کے گہرے غبار نے ان کے وجود کا احاطہ کر لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"فار گاڈ سیک ماما! یہ میری نمائشی پریڈ بند کریں۔ مجھے انسلٹ محسوس ہوتی ہے۔"

ٹی وی لاؤنج میں داخل ہوتے ہی ماہم کو جھٹکا لگا۔ اندر کا ماحول خاصا گرم تھا۔ مسز رحیم دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھامے خاموش اور ان سے کچھ فاصلے پر متورم آنکھوں کے ساتھ سخت جھنجلائی ہوئی عائشہ بول نہیں، بلکہ چیخ رہی تھی۔ ماہم کو اس کا یہ انداز دیکھ کر دھچکا لگا تھا کیونکہ وہ خاصی نرم خو اور دھیمے مزاج کی حامل لڑکی تھی۔

اسے کمرے میں آتے ہوئے سب سے پہلے وہیل چیئر پر بیٹھے موحد نے دیکھا تھا۔ اس کے تھکن گزیدہ چہرے پر روشنی کسی برقی رو کی طرح پھیلی تھی۔ وہ ہاتھ میں شاید صبح کا اخبار گول مول کیے دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر اضطرابی انداز میں مار رہا تھا۔

"آپ نے تو شادی کو ہوا بنا کر اپنے سر پر سوار کر لیا ہے۔ ماما پلیز! اس چیز کو تسلیم کرلیں کہ شادی زندگی کا ایک حصہ ضرور ہے۔ پوری زندگی نہیں۔"

اس کے چہرے پر اتنی تلخ مسکراہٹ ماہم نے پہلی دفعہ دیکھی تھی۔ موحد کی نظروں کے تعاقب میں ماما اور عائشہ دونوں نے ہی دروازے میں تذبذب کا شکار کھڑی ماہم کو دیکھا جو مسز رحیم کے خصوصی بلاوے پر وہاں آئی تھی۔

"ماہم کو آپ نے بلایا ہے؟" عائشہ نے [illegible] تیوروں کے ساتھ اپنی ماما کو دیکھا جو اس قدر [illegible] انداز پر گڑبڑا گئی تھیں۔

"کیوں۔۔۔ اس سے پہلے کیا میں آنٹی کے بلاوے پر ہی آتی ہوں؟" ماہم نے مسز رحیم کو کسی مشکل میں ڈالنے کے بجائے خود ہی جواب دے دیا۔ اس کے جواب پر ان کی متغیر رنگت بحال ہوگئی۔

"اور یہ تم کس خوشی میں بن بادل برسات کی طرح برس رہی ہو۔ ذرا سکون سے انسانوں کی طرح بات کرو۔" ماہم کو اسے ٹریٹ کرنے کے سارے طریقے آتے تھے۔ تب ہی مسز رحیم ہر ایسے موقع پر اسے بلوا لیتی تھیں۔ اس نے ہاتھ پکڑ کر عائشہ کو صوفے پر بٹھایا۔

"آنٹی! زبردست سی بلیک کافی کے ساتھ چکن میونیز والے سینڈوچ بنوائیں۔ ہمارے نئے کک نے آج سارا ناشتا ہی برباد کر دیا۔" وہ کنکھیوں سے عائشہ کے چہرے کے تاثرات کو جانچتے ہوئے بالکل عام سے انداز میں بولی تھی۔

"اور موحد صاحب! کچھ خیال کیا کریں۔ کیسے کپتان رہے ہیں آپ فوج میں؟ آپ کے سامنے محاذ کھلا ہوا ہے اور آپ چپ چاپ ہتھیار ڈالے بیٹھے ہیں۔" اس نے موحد کی آنکھوں میں اپنے لیے مچلتے جذبوں سے دانستہ نظریں چراتے ہوئے اس کی بھی کلاس لے لی۔

"ہم تو بہت سال پہلے ہی ہتھیار ڈال چکے ہیں ماہم منصور! اور محاذوں سے معذور ہو کر لوٹنے والے فوجیوں کو لوگ کہاں تک پوچھیں، تھک ہار کر ان کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں۔" موحد کا لہجہ پسپا اور جبر، دکھ کی گہری تہہ پر مسز رحیم اور عائشہ نے یکبارگی نظر اٹھا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں کے مزاج کی برہمی کا پارہ بڑی تیزی سے نیچے آیا تھا۔ وہ بازوؤں کو سینے پر لپیٹے خاصا تھکا تھکا سا تھا۔

وہشت گردی کی جنگ اللہ جانے کس نے جیتی اور کس نے ہاری، لیکن موحد رحیم سوات آپریشن میں

ہوئے بم دھماکے میں اپنی دونوں ٹانگیں ضرور گنوا آیا تھا۔ مسز رحیم کی دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ سب سے بڑی آمنہ شادی کے بعد میاں کے ساتھ کینیڈا میں مقیم تھی۔ جبکہ ان سے چھوٹا موحد معذوری کی زندگی گزار رہا تھا۔ جبکہ سب سے چھوٹی عائشہ تھی جو بہت زبردست مصورہ تھی۔

"بھلا فوجی دیکھا ہے۔ جس کی ہر بات سے مایوسی کسی تیل کی دھار کی طرح بہتی ہے۔ کچھ خیال کرو موحد! ایک سو ایک دفعہ سمجھا چکی ہوں کہ کوئی ایکٹویٹی ڈھونڈو۔" وہ عائشہ کو چھوڑ کر موحد کے پیچھے پڑ گئی۔

"بھائی نے تو قسم کھا رکھی ہے کہ بس مجھے اور ماما کو تنگ کرنا ہے۔ اوپر سے بابا کا بھی سارا غصہ ہم پر نکلتا ہے۔ انہوں نے کتنی دفعہ کہا ہے کہ ان کے ساتھ ہیڈ کوارٹرز چلیں اور آفس کے کاموں میں حصہ لیں۔ لیکن یہ ہر چیز سے انکار کر دیتے ہیں۔" عائشہ بھی اپنا معاملہ بھول کر موحد کو شکایتی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

"جو تم ماما کو تنگ کرتی ہو اس کا کچھ نہیں۔ صبح سے جو سوپ میرے سامنے چل رہا ہے۔ بتاؤں ماہم کو؟" موحد کے لہجے کی کھنک اسے دیکھتے ہی لوٹ آئی تھی۔ ماہم نے سوالیہ نظروں سے عائشہ اور مسز رحیم کو دیکھا۔

"بیٹا! تم ہی اسے سمجھاؤ، سر جھاڑ منہ پھاڑ حلیے میں گھومتی رہتی ہے۔ اپنا کوئی خیال ہی نہیں۔ کل مسز جلیل اپنے بیٹے کے لیے اسے دیکھنے آئیں تو جس حلیے میں اسٹوڈیو میں کام کر رہی تھی۔ نیلے پیلے رنگوں سے لتھڑے ہاتھوں کے ساتھ ہی ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔ مت پوچھو مجھے کتنی شرمندگی ہوئی۔"

مسز رحیم نے اپنا دکھڑا سنا ہی دیا تھا۔ عائشہ کے عام سے نقوش اور شکل و صورت انہیں ویسے ہی پریشان کرنے کو کافی تھی۔ اوپر سے اس کی لاپروائی ان کو ہولائے رکھتی۔ انہوں نے عائشہ کے بالکل ساتھ بیٹھی نک سک سے تیار میرون سوٹ میں دمکتی ماہم کو توصیفی نظروں سے دیکھا۔ عائشہ اس کے ساتھ بیٹھی اب اور زیادہ پس منظر میں چلی گئی تھی۔ ان کا دل رنجیدگی کے گہرے سمندر میں ڈوب گیا تھا۔

"ماما۔۔۔" عائشہ نے احتجاجی نظروں سے انہیں دیکھا۔ جن کے چہرے کی تشویش اور پریشانی اسے اور زیادہ جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی۔ ماہم نے تنبیہی نظروں سے اسے گھورا تو وہ کچھ سنبھل گئی۔

"ماما! آپ کو پتا ہے کہ میں پیدائشی ایسی ہوں۔ مجھے مصنوعی چیزوں، جیولری، میک اپ وغیرہ سے سخت الجھن ہوتی ہے۔ مصنوعی پن چاہے چیزوں میں ہو یا رویوں میں مجھے بہت برا لگتا ہے اور مسز جلیل جیسے بن بن کر بولتی ہیں مجھے بالکل پسند نہیں اور اوپر سے ان کا دائمی نزلے کا مریض لڑکیوں جیسا بیٹا تو مجھے سخت زہر لگتا ہے۔ جس کی ڈریسنگ ٹیبل طرح طرح کے لوشنز، کریموں اور میک اپ کی چیزوں سے بھری رہتی ہے۔" اس کی آخری بات پر ماہم اور موحد دونوں نے اپنی ہنسی کا گلا بڑی صفائی سے گھونٹا تھا۔ ورنہ مسز رحیم کی توپوں کا رخ ان کی جانب ہو جاتا۔

"میں ان کے بیٹے کی نہیں، تمہارے حلیے کی بات کر رہی ہوں۔ تم جان بوجھ کر ایسے موقعوں پر رف حلیے میں باہر آتی ہو۔" مسز رحیم کی بدگمانی پر عائشہ نے شکایتی نظروں سے بالکل خاموش موحد اور ماہم کو دیکھا۔

"ماما! آپ ایسے ہی پچھی ہو رہی ہیں۔ یہ شروع سے ہی ایسی ہے۔ اب بھی آپ ان دونوں دوستوں کو دیکھ لیں، کتنا تضاد ہے۔ ماہم کو دیکھ کر لگتا ہے کہ کسی فنکشن میں جا رہی ہے اور عائشہ کو دیکھ کر لگتا ہے کہ صبح منہ دھونا بھی بھول گئی ہے۔"

موحد نے ہلکے پھلکے لہجے میں ماحول پر چھائی سنگینی کو کم کرنا چاہا۔ اس کی بات پر کافی انڈر ٹلتی ماہم نے کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھا۔ ان تینوں کی کسی زمانے میں خوب دوستی تھی، پھر موحد کاکول اکیڈمی چلا گیا اور اس کے بعد اس کی پوسٹنگ کے سلسلے شروع ہوگئے۔ لیکن جب بھی وہ تینوں اکٹھے ہوتے تو خوب ہنگامہ کرتے تھے۔

"آنٹی! چھوڑیں آپ ٹینشن نہ لیں۔" ماہم نے بھی انہیں تسلی دی۔

"لیکن بیٹا! ایسا کب تک چلے گا۔ لڑکیوں کو اپنے معاملے میں ایسا لاپروا نہیں ہونا چاہیے۔" ان کی تشویش کسی صورت کم نہیں ہو رہی تھی۔ ماہم نے لاپروائی سے سینڈوچ کھاتی عائشہ کو غصے سے گھورا۔ جسے ماں کی ٹینشن کی قطعاً" پروا نہیں تھی۔

"میں کل ہی نکھار سے اپائنٹمنٹ لیتی ہوں۔ دیکھیے گا کہ کیسی اس کی ڈینٹنگ پینٹنگ کروا کر لاتی ہوں۔" اس کے پُرعزم انداز پر عائشہ منہ میں ڈالا سینڈوچ کا نوالہ نگلنا بھول گئی تھی۔ جبکہ اس کی بات پر مسز رحیم نے سکون کا سانس لیا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح کھینچ کھانچ کر واقعی اسے لے جائے گی۔

"ہرگز نہیں۔۔۔" عائشہ نے کڑے تیوروں سے اسے گھورا۔

"یہ تو کل آنے والا وقت ہی بتائے گا۔" ماہم نے تلخ کافی کا ایک اور گھونٹ لیا تھا۔ موحد ان سب کو گفتگو کرتا دیکھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ اسے معلوم تھا کہ ہمیشہ کی طرح ماہم ان سے فارغ ہو کر اس کے کمرے میں ضرور آئے گی۔

"ویسے ماما! آپ سوچتی تو ہوں گی کہ کاش میں بھی پاپا کے بجائے شکل و صورت میں آپ پر چلی جاتی، جیسے آمنہ آپی اور موحد بھائی ہیں۔" عائشہ کا مزاج خوش گوار ہو چکا تھا۔ وہ ویسے بھی زیادہ دیر تک کسی بات کو اپنے ذہن پر سوار نہیں کرتی تھی۔

"کیوں تمہیں کیا ہوا۔" مسز رحیم نے دانستہ اس پر سے نظریں ہٹاتے ہوئے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

"بھئی میں آپ لوگوں کی طرح خوبصورت جو نہیں۔" اس کا لہجہ سادہ اور کسی بھی قسم کے احساس کمتری سے پاک تھا۔ وہ اچھی خاصی پُراعتماد لڑکی تھی۔

"تمہیں کس نے کہا کہ تم خوبصورت نہیں ہو۔" مسز رحیم نے انتہائی محبت سے اسے دیکھا۔

"آئینے نے۔" اس کے جواب نے دونوں کو ہی ایک لمحے کے لیے چپ کروا دیا تھا۔

"تم بہت فضول باتیں کرنے لگی ہو عائشہ! یہ بھی تمہاری پیدائشی عادت ہے۔ چلو اٹھو اور مجھے تازہ تخلیق دکھاؤ۔" ماہم کافی کا مگ پکڑے کھڑی ہو گئی تھی۔ مسز رحیم نے بھی بوکھلا کر ... کر لیا تھا۔

دونوں نے اس کے اسٹوڈیو میں پورے دو گھنٹے گزارے تھے۔ ان کی باتیں ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھیں۔ جبکہ وہ ہی دو گھنٹے موحد نے ایک ہی پوزیشن میں گھڑی کو دیکھتے ہوئے اذیت کی بھٹی میں جل جل کر گزارے تھے۔ وقت کا پہیہ بڑی سست روی سے چل رہا تھا۔ موحد کا دل بار بار بغاوت پر اتر رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر اپنے کمرے کی کھڑکی کے باہر گیٹ پر پڑی۔ مگ کو گھماتی ہوئی اس کی انگلیاں ساکت ہو گئیں۔ جبکہ اس کا دل دھڑکنا بھول گیا تھا۔ اسے لگا جیسے کسی تیز رفتار ٹرین نے اس کے پرخچے اڑا دیے ہوں۔

وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے ارغوانی پھولوں کی روش پر واپس اپنے گھر جاتی ماہم منصور کو دیکھتا رہا۔

وہ آج اس سے ملنا بھول گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"پتر! مینوں لگدا اے سوہنے رب نوں تیری کوئی گل بری لگ گئی اے۔ سکینہ! توبہ کر توبہ۔ اللہ ناراض ہو گیا تے اسی رُل جائیں گے۔ اس ویلے توں ڈر، جب سوہنا رب تیرے دل تے کوئی مہر ہی نہ لگا دے۔" جمیلہ مائی نے اسے اللہ کے غضب سے ڈرایا اور وہ ڈر بھی گئی۔ آنسوؤں کے گرم قطرے اس کے رخساروں پر پھیل رہے تھے۔

"یا اللہ! میری کملی دھی تے رحم کر۔ اس نمانی کے کسی لفظ کی پکڑ نہ کرنا، یہ ناداں اے، پاگل اے، کملی اے، شوہدی نوں گل کرن دا سلیقہ نئیں۔" جمیلہ مائی کی اونچی آواز میں مانگی گئی دعا اسے اور بھی شرمندہ کر رہی تھی۔ بہت دیر تک رونے اور اللہ سے معافیاں مانگنے کے بعد اس کے اعصاب کچھ پُرسکون ہوئے اور اس نے ظہر کی نماز اذان کے ساتھ ہی پڑھ لی تھی۔

"اماں! چل اب ناراضی چھوڑ دے ناں۔ بس کر دے۔" سکینہ نے خفا خفا سی جمیلہ مائی سے بھی معذرت کی۔ وہ بھلا اس سے ناراض بھی کب ہوتی تھیں۔ ہمیشہ وہ ہی ان کو ادائیں دکھاتی تھی۔ لیکن آج تو وہ بھی جلالی موڈ میں تھیں۔ اس وقت بھی وہ بچ جانے والی روٹیوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر رہی تھیں، تاکہ صبح چڑیوں کو ڈال سکیں۔

"سوہنے رب سے سیدھے رستے پر چلنے کی دعا بھی کر لیتی تھی۔" اماں کے جل کر بولنے پر اسے ہنسی آ گئی۔

"اماں! تم سے بالکل کسی کپتی ساس کی طرح طعنے دیتی ہے تو۔" سکینہ کے شکوے پر جمیلہ مائی مبہم سے انداز میں مسکرائیں تو سکینہ کے حوصلے بھی جوان ہو گئے۔

"اماں! میرے سر میں تیل ڈال کے مالش کر دے۔ بال رُوکھے ہوتے جا رہے ہیں۔" اس کا فرمائشی پروگرام شروع ہو گیا تھا اور بھلا کب اس سے اتنی دیر خفا رہ سکتی تھیں۔ فوراً" سرسوں کے تیل کی بوتل اٹھا کر اس کے سر کا مساج کرنے لگیں۔ سکینہ کو سُرور سا آنے لگا اور آنکھوں میں نیند نے ایک دفعہ پھر ڈیرے ڈال لیے۔

☼ ☼ ☼

ڈاکٹر خاور کسی میڈیکل کانفرنس میں شرکت کرنے لاہور گئے ہوئے تھے۔ دو دن کے بعد وہ راؤنڈ پر آئے تو سکینہ کے ساتھ ساتھ اماں کی متورم آنکھیں اور خاموشی انہیں کسی انہونی کا احساس دلا گئیں۔ ورنہ دونوں ماں، بیٹی ان سے چھوٹے چھوٹے کئی سوال ضرور کرتی تھیں۔

"سکینہ! آپ کی طبیعت ٹھیک ہے۔" انہوں نے تشویش زدہ انداز سے اس کے چہرے پر پھیلی افسردگی کو دیکھا۔

"مجھے پتا چل گیا ہے ڈاکٹر صاحب! کہ میں نے ٹھیک نہیں ہونا۔ آپ لوگ بس مجھ پر تجربے کر کر دیکھ رہے ہیں۔" ڈاکٹر خاور کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ اس قدر تلخ جملہ بھی سکینہ کے منہ سے نکل سکتا ہے۔ اس لیے وہ کچھ لمحوں کے لیے ساکت رہ گئے۔ انہوں نے اپنے ساتھ موجود ڈاکٹرز اور ایک نرس کو کمرے سے نکلنے کا اشارہ کیا۔ وہ بہت گہری نظروں سے سکینہ کے چہرے کے تاثرات جانچ رہے تھے۔

"آپ سے کس نے کہا کہ ہم لوگ آپ کے کیس پر بس تجربات کر رہے ہیں۔" انہوں نے بہت تحمل سے سکینہ سے پوچھا۔ جس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ وہ کچھ دیر اپنے لب کچلتی رہی، پھر بے آواز آنسو اس کے گالوں پر ایک لڑی کی صورت میں بہنے لگے۔ انہوں نے مڑ کر سخت حیرت کے ساتھ اپنے پیچھے کھڑی جمیلہ مائی کو دیکھا، جو خود بھی دوپٹے سے اپنی نم آنکھوں کو خشک کر رہی تھیں۔

"سکینہ! کیا ہوا ہے؟" انہوں نے بیڈ کے پاس رکھی کرسی گھسیٹی اور اطمینان سے اس پر بیٹھ گئے۔ سکینہ خاموشی سے اپنے اندر موجود سسکیوں کو باہر نکلنے سے روک رہی تھی۔ اس کے اندر نہ جانے کون سا جوار بھاٹا اٹھ رہا تھا۔ ڈاکٹر خاور کو لگا کہ وہ ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہی ہے۔ لیکن پیمانہ چھلکنے کی اصل وجہ وہ سمجھنے سے قاصر تھے۔

"سکینہ! آپ مجھے نہیں بتائیں گی؟" ڈاکٹر خاور نے لاشعوری طور پر اس کے بھدے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تو سکینہ کو لگا کہ جیسے کائنات کی ساری گردش لمحے بھر کو رک سی گئی ہے۔ اس کا دل ایک عجیب سی ڈھب پر دھڑکا۔ اس کے بہتے ہوئے آنسوؤں کے آگے گویا بند سا لگ گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنے سانولے، موٹے اور بھدے سے ہاتھ پر ڈاکٹر خاور کا سفید رنگت کا حامل خوب صورت ہاتھ دیکھ رہی تھی۔

انہیں شاید اپنی اس لاشعوری حرکت کا ادراک ہو گیا تھا۔ تب ہی انہوں نے غیر محسوس طریقے سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے ہٹایا تو سکینہ کا دل ایک لمحے کو

رک سا گیا۔ اس کی قوت گویائی سلب ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ بالکل گونگے بہرے انداز سے خود سے کچھ فاصلے پر موجود سیاہ پینٹ پر گرے شرٹ میں ملبوس ڈاکٹر خاور کو ٹکٹکی باندھے دیکھے چلی جا رہی تھی۔

"آپ بتائیں کہ کیا ہوا ہے؟" ڈاکٹر خاور اب جمیلہ مائی کی طرف متوجہ ہوئے، جو ان کے بالکل پیچھے خاموش کھڑی تھیں۔ ان کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی اور پریشانی دیکھ کر جمیلہ مائی نے دانستہ اپنے لہجے کو ہلکا پھلکا کیا۔

"بس بیٹا! خوامخواہ یہ نمانی ایک چھوٹی جئی گل نوں دل تے لے گئی اے۔ ورنہ میری دھی رانی تے بڑی ہمت والی اے۔"

"وہ ہی چھوٹی سی بات ہی پوچھ رہا ہوں، جس نے اتنی بہادر اور ہمت والی لڑکی کو رلایا ہے۔ دو دن پہلے تک تو یہ بالکل ٹھیک ٹھاک تھی اور فزیو تھراپسٹ بھی کہہ رہی تھیں کہ سکینہ بہت زیادہ تعاون کر رہی ہے۔" ڈاکٹر خاور نے اپنی آنکھوں پر لگا چشمہ اتار کر سکینہ کے بیڈ پر رکھا۔

"بس ڈاکٹر صاحب! چھڈو اس گل نوں، یہ تو جھلی ہے۔ خوامخواہ دل چھوٹا کر گئی اور مجھے بھی رلا دیا۔" جمیلہ مائی نے زبردستی مسکرانے کی ایک ناکام کوشش کی تھی۔

"سکینہ جیسی لڑکی کسی چھوٹی موٹی بات پر جذباتی نہیں ہو سکتی اور کم از کم میرے بارے میں ایسی سوچ نہیں رکھ سکتی کہ میں اس کے کیس پر کوئی تجربہ کروں گا۔" ڈاکٹر خاور کو مطمئن کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس کا اندازہ آج پہلی دفعہ اماں اور سکینہ کو ہوا۔

"سوری ڈاکٹر صاحب! میرا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا۔ ایسے ہی خوامخواہ میرے منہ سے غلط بات نکل گئی۔ آپ مجھے معاف کر دیں۔" سکینہ نے نظریں چراتے ہوئے اٹک اٹک کر کہا۔

"میں تو اس وقت ہی اس بات کو چھوڑوں گا، جب آپ مجھے اصل بات بتائیں گی۔" وہ اور زیادہ اطمینان سے بیٹھ گئے۔ سکینہ نے گھبرا کر اماں کو دیکھا، جن کے اپنے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ [illegible] آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو [illegible] اشارہ کیا۔ جو ڈاکٹر خاور کی زیرک نگاہوں سے [illegible] نہیں رہ سکا۔

"آپ لوگ کھل کر بات کیوں نہیں کر رہے؟ مجھے بہت عجیب سا لگ رہا ہے۔" ان کے لہجے میں چھپی ہلکی سی ناگواری پر جمیلہ مائی بوکھلا کر بولیں۔

"ایسی کوئی خاص گل نئیں اے ڈاکٹر صیب! رات ڈیوٹی پر موجود دو نرسیں سکینہ پر مخول کر رہی تھیں۔ یہ جھلی ان کی باتوں کو دل پہ لے گئی۔"

"مخول۔۔۔؟" وہ تھوڑا سا الجھے۔

"جی اماں کا مطلب ہے کہ مذاق اور چھیڑ چھاڑ کر رہی تھیں۔" سکینہ کا لہجہ ابھی تک بھیگا ہوا تھا۔

"کیا مذاق کر رہی تھیں؟" ان کے چہرے پر موجود سنجیدگی اب ان دونوں کو ہولائے دے رہی تھی۔ اماں بولتے ہوئے کچھ تذبذب کا شکار ہوئیں تو سکینہ نے جھٹ کہا۔

"کچھ نہیں ڈاکٹر صاحب! وہ کہہ رہی تھیں کہ سکینہ تمہاری کمر کا کوہان دیکھ کر اونٹ کے بچے کا خیال آتا ہے۔"

"واٹ۔۔۔" ان کو سن کر سخت دھچکا لگا اور وہ جھٹکے سے ہی اٹھ کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہرے پر پھیلی سرخی ان کے شدید غصے کی عکاسی کر رہی تھی۔ "یہ تو انتہائی نامناسب اور فضول ترین بات کی ہے انہوں نے۔۔۔" انہیں سخت غصہ آیا تھا۔

"اور کیا یہ بھی انہوں نے ہی کہا تھا کہ ہم لوگ آپ کے کیس پر تجربے کر رہے ہیں؟" ان کے انداز میں اس قدر سختی تھی کہ اماں نے اور اس نے فوراً گھبرا کر نفی میں سر ہلا دیا۔ ان کے نظریں چرانے پر وہ معاملے کی تہہ میں پہنچ گئے تھے۔

"رات کس کی ڈیوٹی تھی؟ کون کال پر تھا؟" انہوں نے زیر لب کہہ کر تھوڑا سا سوچا۔

"دفع کریں ڈاکٹر صیب، بچیاں مخول کر رہی تھیں۔ آپ چھڈیں، مٹی پائیں۔ یہ تو جھلی ہے اویں رات سے رو رو کے ہلکان ہو رہی ہے۔"

جمیلہ مائی کو ڈاکٹر خاور کے چہرے پر پھیلے غصے کو دیکھ کر اپنی حماقت کا احساس ہوا تھا۔ اپنی طرف سے حتی الامکان معاملے کی سنگینی کو کم کرنے کی کوشش کر رہی تھیں اور ان کی بدقسمتی تھی کہ ڈاکٹر خاور کو ان کی یہ بے ضرر سی کوشش صاف سمجھ میں آ رہی تھی۔

"مذاق میں بھی کسی انسان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ ان چیزوں کا مسخر اڑائے جن پہ انسان کا اختیار نہیں۔ جب ہم ایسا کر رہے ہوتے ہیں تو ہم بالواسطہ اس ذات کا مذاق اڑا رہے ہوتے ہیں۔ جس نے ان چیزوں کو تخلیق کیا ہے۔ انسان ناسمجھ ہے اور اس چیز کا شعور نہیں رکھتا۔ اس لیے تو خسارے میں رہتا ہے۔" ڈاکٹر خاور نے تاسف بھرے انداز میں کہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں ان نرسوں کی بھرپور کلاس لینے کا تہیہ کر چکے تھے۔

"رہنے دیں ڈاکٹر صاحب! مجھے ان سے کوئی شکوہ نہیں۔ اللہ خود ہی ان سے پوچھ لے گا۔" سکینہ کی بات پر اماں نے دہل کر اپنی نادان بیٹی کو دیکھا۔

"خبردار سکینہ! کسی نوں اینج نئیں کہندے، اگر تینوں کوئی شکوہ نئیں تے اللہ تے کیوں چھڈ دی اے۔ سوہنے رب دا انصاف بڑا سخت اے پتر! انساناں نوں خود معاف کر دیندے آں، اللہ دی پکڑ بڑی سخت اے۔ سب لئی خیر منگیا کر دھی رانی!"

جمیلہ مائی کے لہجے میں عاجزی ہی عاجزی تھی۔ ڈاکٹر خاور اس ان پڑھ خاتون سے سخت متاثر ہوئے تھے۔ جس کے دل میں اللہ کی محبت اور خوف نے سب کے لیے خیر اور بھلائی بھر دی تھی۔ وہ تیزی سے کمرے سے نکلے اور اپنا چشمہ اٹھانا ہی بھول گئے۔ جبکہ سکینہ نے ان کی نظروں سے بمشکل بچتے ہوئے اس چشمے کو فوراً عقیدت سے اٹھا کر اپنے تکیے کے نیچے چھپا دیا تھا۔ اسے لگا جیسے اسے ہفت اقلیم کی دولت مل گئی ہو۔

☼ ☼ ☼

اس دن ماہم کلینک سے گھر آئی تو پورچ میں ثمن

آپی کی گاڑی دیکھ کر اسے خوش گوار حیرت ہوئی۔ اپنے بھانجے احیان سے ملاقات کا سوچ کر ہی اس کا مزاج بڑا خوش گوار ہو گیا تھا۔ وہ چار سال کا بہت پیارا اور باتونی بچہ تھا۔ جس کے بال سنہری اور آنکھیں کرنجی تھیں۔ اسے ایک نظر دیکھنے پر ہی کسی انگریز۔۔۔ بچے کا گمان ہوتا تھا۔

ٹی وی لاؤنج میں احیان کے پسندیدہ کارٹون ٹام اینڈ جیری کی آواز سن کر ایک بے ساختہ مسکراہٹ نے اس کے چہرے کا احاطہ کر لیا۔

"اوئے ہینڈسم! آپ کب آئے اور آپ کی موٹی ماما کہاں ہیں؟" ماہم نے اس کے پھولے پھولے گالوں پر پیار کرتے ہوئے دائیں بائیں دیکھا۔ وہ اس وقت ٹی وی لاؤنج میں اکیلا تھا۔ سامنے میز پر اس کی پسندیدہ فروٹ جیلی اور اسٹابری شیک رکھا ہوا تھا۔

"موٹی ماما تو اسمارٹ سی نانو کے ساتھ گروسری لینے گئی ہیں۔ پھر وہاں سے کپڑوں کی ایگزیبیشن دیکھنے جائیں گی اور پھر پاپا کے سامنے معصوم سی شکل بنا کر کہیں گی کہ جانو! مہنگائی بہت ہو گئی ہے۔ پیسوں کا کچھ پتا ہی نہیں چلتا۔"

اس نے اس قدر عمدہ طریقے سے ثمن آپی کی نقل اتاری تھی کہ کچھ لمحوں کے لیے ماہم بھی ہکا بکا رہ گئی۔ وہ سخت حیرت اور تعجب سے اپنے چار سالہ ذہین و فطین بھانجے کو دیکھ رہی تھی۔ جس کی آنکھوں میں شوخی جگر جگر کر رہی تھی۔

"اوئے بدتمیز! تمہیں شرم نہیں آتی' ماما کی نقل اتارتے ہوئے۔" ماہم نے کان سے پکڑ کر اسے اپنے پاس بٹھایا۔

وہ چھلانگ لگا کر اپنا کان اس کے ہاتھ سے چھڑا کر دور کھڑے ہو کر ہنسنے لگا۔

"پتا ہے آنی! پاپا' ماما کی اس بات کے جواب میں کیا کہتے ہیں۔" اس نے شرارت سے آنکھیں مٹکائیں اور کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا کہتے ہیں بھئی! ہمیں بھی تو پتا چلے۔" اس نے اپنا بیگ کندھے سے اتار کر سائیڈ میز پر رکھا اور جگ سے پانی گلاس میں انڈیلنے لگی' جو ملازمہ اسے ابھی لے آئی تھی۔

"آپ عائشہ آنی کو تو نہیں بتائیں گی نا' ورنہ وہ ان کو بتا دیں گی۔" اسے پتا تھا کہ ماہم کی دوست عائشہ اس کے پاپا کی کزن بھی ہے۔

"ارے بابا' نہیں بتاتی۔" ماہم نے ٹی وی لاؤنج میں ابھی ابھی داخل ہوتی عائشہ کو دیکھ کر اپنی ہنسی دبائی۔ جس نے احیان کی آخری بات سن لی تھی اور اب خود بھی شرارت اور تجسس کے مارے وہیں کھڑی ہو گئی تھی۔

"جب ماما سارے پیسے خرچ کر لیتی ہیں تو پاپا کہتے ہیں۔ ڈارلنگ! میں تو جو کچھ کماتا ہوں' شریف مردوں کی طرح تمہارے ہاتھ میں دے دیتا ہوں۔ اب تمہاری مرضی جیسے بھی خرچ کرو' بس یہ یاد رکھا کرو کہ مجھے تنخواہ مہینے میں ایک دفعہ ہی ملتی ہے۔" اس کی بالکل درست نقل پر ماہم کے ساتھ عائشہ کے حلق سے بھی ایک بے ساختہ قہقہہ نکلا تھا۔ جبکہ عائشہ کو ایک دم اپنے سامنے دیکھ کر اس کا رنگ فق ہوا تھا۔

"ٹھہر جاؤ' شیطان کے بچے! میں انفر بھائی کو بتاؤں گی کہ یہ کیسے آپ کی نقل اتارتا ہے۔" عائشہ کی دھمکی پر وہ اچھل کر صوفے کے پیچھے کھڑا ہو گیا تھا۔

"آنی! آپ اپنے گھر میں کیوں نہیں ٹک کر بیٹھتیں' جب دیکھو میری نانو کے گھر میں ہوتی ہیں۔" احیان کے منہ بنانے پر ماہم ایک دفعہ پھر کھلکھلا کر ہنسی۔

"مائی گاڈ! یہ کیا چیز پیدا کی ہے ثمن آپی نے۔" عائشہ تعجب کے عالم میں اگلی بات ہی بھول گئی تھی۔

"میں نے ماما سے کہا بھی تھا کہ مجھے گھر چھوڑ دیں' وہاں عائشہ آنی کی وجہ سے ماہم آنی مجھے لفٹ ہی نہیں کرواتیں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"احیان بیٹا! آپ موحد چاچو کے پاس جاؤ اور کیرم بورڈ کھیلو ان کے ساتھ وہ بلا رہے ہیں۔" عائشہ نے اسے وہاں سے بھگانا چاہا۔ ویسے بھی ایک خاص بات کرنے آئی تھی جو احیان کی موجودگی میں ممکن نہیں تھی۔

"نہیں آنی! اب موحد انکل بہت بور ہو گئے ہیں۔ پہلے اچھے تھے۔ جب میرے ساتھ کرکٹ کھیلتے تھے۔ اب ان کے ساتھ مزا نہیں آتا۔" اس کے منہ پھٹ انداز پر عائشہ کے چہرے کی رنگت پھیکی پڑ گئی۔ اپنے بھائی کی معذوری کا احساس اسے خود تو تھا ہی' اب بچے بھی اس کا برملا اظہار کرنے لگے تھے۔

"بہت بری بات ہے احیان!" ماہم نے عائشہ کا پھیکا پڑتا چہرہ دیکھا تو فوراً" احیان کو ڈانٹا۔

"کوئی بات نہیں یار! بچہ ہے۔ آج کل تو اچھے خاصے باشعور انسان اور بہترین دوست کا دعوا کرنے والے لوگ ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔" عائشہ کی بات ماہم کو تیر کی طرح لگی تھی۔ اسے لگا جیسے وہ اسے ہی سنا رہی ہو۔

"زیادہ نخرے مت کیا کرو۔ جاؤ انکل کے پاس۔ انہوں نے تمہارے لیے اسکاٹ لینڈ سے بڑی مزے کی ویڈیو گیم منگوائی ہے۔" ماہم نے عائشہ کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے احیان کو لالچ دیا تو وہ جھٹ سے کھڑا ہو گیا۔

"سچ آنی؟" اس کی آنکھوں میں چمکتی جوت سے عائشہ نے بمشکل آنکھیں چرائی تھیں۔ کسی دور میں ایسی ہی روشنی موحد کی آنکھوں میں بھی دمکتی تھی۔ وہ چھلانگیں مارتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔ اسی لمحے اس کے سیل فون کی مترنم سی بیل بجی۔

"اب کس کا فون آ گیا؟" ماہم کے لہجے میں کوفت اور بے زاری ٹپک رہی تھی۔ وہ اس وقت بس آرام کرنا چاہتی تھی۔

"عائشہ پلیز! ٹی وی کا والیوم ذرا کم کرنا۔" اس کے کہنے پر بالکل خاموش بیٹھی عائشہ نے فوراً" ریموٹ کنٹرول سے ٹی وی کی آواز کم کر دی۔

"جی ہیلو۔" اس نے بے زاری سے اس انجان نمبر کو اٹینڈ کیا۔

"واٹ۔۔۔" وہ باقاعدہ اچھل کر بیٹھی تھی۔ عائشہ نے چونک کر اس کا سخت پریشان۔۔۔ چہرہ دیکھا۔ دوسری جانب سے نہ جانے کیا کہا جا رہا تھا کہ ماہم کے چہرے کی رنگت متغیر ہونے لگی۔ اسے حقیقت میں زوردار جھٹکا لگا تھا۔ اب وہ حواس باختہ انداز سے اپنی گاڑی کی چابی دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔ جو سامنے ہی سائیڈ میز پر پڑی اسے نظر نہیں آ رہی تھی۔ عائشہ نے بہت کم اسے اس طرح پریشان دیکھا تھا۔

"ڈونٹ وری آنٹی' میں پہنچ رہی ہوں۔" اس نے کلائی میں بندھی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے عجلت میں کہا اور فون بند کر دیا۔

"کیا ہوا ماہم؟" عائشہ کو کسی انہونی کا احساس ہوا۔

"یار! بہت برا ہوا ہے۔" عائشہ کو اس کی آواز کسی کنویں سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

"بتاؤ نا' کیا ہوا ہے اور کہاں جا رہی ہو؟" اس نے گاڑی کی چابیاں اسے تھماتے ہوئے فکرمندی سے پوچھا۔

"رامس علی نے خودکشی کر لی۔"

عائشہ کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ جبکہ ماہم جو بہت کم اعصابی دباؤ کا شکار ہوتی تھی' اس لمحے اسے بھی یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے بھاری بلڈوزر اس کے اوپر سے گزار دیا ہو۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اتنا بڑا انتہائی قدم بھی اٹھا لے گا۔

(باقی آئندہ ان شاء اللہ)

نمرہ احمد

جنت کے پتے

اسلام آباد ایئرپورٹ سے لے کر ترکی میں قیام کے دوران تک حیا کے ساتھ جتنے بھی واقعات پیش آتے ہیں اور جتنے بھی لوگ اسے ملتے ہیں، وہ جہان کی منصوبہ بندی کے مطابق ہیں البتہ حیا کو اغوا کرنے میں حبشی کی غداری کا دخل ہے جہان بے خبر ہوتا ہے۔ تاہم وہ اسے چھڑا لیتا ہے۔

عبدالرحمن پاشا اور عبدالرحیم پاشا، حبیب پاشا کی پہلی بیوی کے بیٹے تھے۔ حبیب پاشا نے ترکی میں امت اللہ سے شادی کی۔ ان کا بیٹا طیب حبیب پاشا المعروف پاشا بے ہے۔ طیب بڑا ہو کر مافیا کا حصہ بن جاتا ہے۔ امت اللہ اس بات سے ناحال لاعلم ہیں۔ طیب جہان کو اپنے سوتیلے بھائی عبدالرحمن پاشا کے نام سے متعارف کرواتا ہے۔ ایک ڈیل کے تحت وہ اس کا ہوٹل سنبھالنے لگتا ہے۔ طیب یونان میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ جہان اپنی ایجنسی کے کہنے پر اسے چھڑانے کی کوئی کوشش نہیں کرتا۔ بہارے اور عائشے گل، امت اللہ کی رشتے کی پوتیاں ہیں۔ امت اللہ نے بیوک ادا والا سفید محل عائشے گل کے نام کر دیا ہے۔

جہان اپنے سر درد کے حوالے سے ڈاکٹر سے رجوع کرتا ہے۔ ڈاکٹر کے مطابق جہان کے آنکھ کی پاس ایک اعشاریہ ایک کی کیل (جو اسے ڈی ایم آئی کی قید میں تشدد کے دوران) گھس گئی تھی۔ آپریشن میں جہان کی بینائی جانے کے پچاس فیصد امکان ہیں۔ جہان یہ رسک لینے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔

مکمل ناول

١٣

تیرھویں قسط

ایک زوردار ٹکر نے اسے سڑک کے ایک جانب لڑھکا دیا۔

ولید کی گاڑی زن سے آگے بڑھ گئی۔

وہ اوندھے منہ نیچے گری تھی۔ دایاں گھٹنا، دایاں پاؤں بہت زور سے سیڑھیوں سے ٹکرایا تھا۔ وہ شاید سیڑھیوں پہ گر گئی تھی۔ پورا دماغ جیسے لمحے بھر کو شل سا ہو گیا تھا۔

"امی!" وہ درد سے کراہی۔ ہونٹ اور ٹھوڑی پہ جلن سی ہو رہی تھی۔ بدقت اس نے سیدھے ہونا چاہا۔ ساتھ ہی نقاب کھینچ کر اتارا۔ ہونٹ پھٹ گیا تھا اور اس میں سے خون نکل رہا تھا۔

"حیا باجی...." کوئی دور کہیں اسے پکار رہا تھا۔ اپنا دکھتا سر سہلاتے ہوئے وہ بمشکل اٹھ بیٹھی۔ ولید نے اسے گاڑی تلے دے دیا تھا کیا؟ مگر وہ ٹکر کھا کر سڑک کے ایک طرف گر گئی تھی، سوچ رہی۔ اسے کندھے پہ شدید درد محسوس ہو رہا تھا۔ کسی نے شاید اسے کندھے سے پکڑ کر دائیں جانب دھکا دیا تھا۔

دھیرے دھیرے بیدار ہوتے حواسوں کے ساتھ اس نے گردن موڑی۔ ظفر دور سے بھاگتا آ رہا تھا۔ ولید کی گاڑی کہیں نہیں تھی۔ پارکنگ ایریا میں اندھیرا چھا رہا تھا۔ اور تب اس کی نگاہ روش پہ پڑی جہاں سے ابھی ابھی ولید کی گاڑی گزری تھی۔ صرف ایک لمحہ لگا اس کے دماغ کو سامنے نظر آتے منظر کو سمجھنے میں، اور دوسرے ہی پل اس کی ساری توانائی جیسے واپس آ گئی۔

وہ بدحواس سی ہو کر اٹھی۔

"تایا ابا۔" قدرے لنگڑا کر چلتی وہ ان تک پہنچی۔ وہ زمین پہ گرے ہوئے تھے۔ ان کو چوٹ کس طرح سے لگی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی، مگر ان کا سر پھٹ گیا تھا اور پیشانی سے سرخ خون ابل رہا تھا۔ وہ نیم وا آنکھوں سے کراہ رہے تھے۔

"تایا ابا.... تایا ابا....!" وہ وحشت سے انہیں جھنجھوڑنے لگی۔ ظفر دوڑتے قدموں سے اس تک آیا تھا۔

"بڑے صاحب.... یا اللہ.... وہ آپ کو پکار رہے تھے، آپ سن نہیں رہی تھیں۔" اس نے پریشانی سے حیا کو دیکھا پھر گڑبڑا کر چہرہ نیچے کر لیا۔

"ان کو گاڑی سے ٹکر لگی ہے ظفر؟ اوہ خدایا! مجھے بچاتے بچاتے۔" شدت جذبات سے وہ کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔ اپنے ہاتھ اس نے تایا ابا کے ماتھے سے ابلتے خون پہ دبا کر رکھے تو لمحوں میں ہاتھ گیلے، سرخ ہو گئے۔ تایا بند ہوتی آنکھوں سے نقاہت سے سانس لے رہے تھے۔

"وہ آپ کو آواز دے رہے تھے۔ آپ آگے سے نہیں ہٹیں تو وہ...." ظفر اسے پیش آنے والا واقعہ بتا رہا تھا مگر اس وقت یہ سب غیر ضروری تھا۔ بمشکل اس نے حواس مجتمع کر کے سوچنا چاہا کہ سب سے پہلے اسے کیا کرنا ہے۔

"ان کا.... ان کا خون بہہ رہا ہے۔ فرسٹ ایڈ باکس بھی نہیں ہے۔ کیا کروں۔" اس نے پریشانی سے کہتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ ظفر اس سے بھی زیادہ حواس باختہ لگ رہا تھا۔ آفس بلڈنگ بھی بند ہو گئی تھی۔ نہ ہوتی تب بھی یہ جگہ بلڈنگ کی پشت پہ تھی۔ آس پاس کوئی نہیں تھا جسے مدد کے لیے بلا پاتی۔

"جاؤ دیکھو گاڑی میں کوئی کپڑا ہے تو لے آؤ۔ پہلے ان کا خون روکنا ہے، پھر ہسپتال لے چلتے ہیں۔"

"پتا نہیں جی! آپ کی گاڑی ہے، کدھر رکھا ہو گا آپ نے؟" وہ دیکھ کر واپس آیا اور شدید بدحواسی کے عالم میں بھی اپنے قدموں کو دیکھتے ہوئے بتایا۔

"اوہ خدایا.... میں کیا کروں؟" اس نے گردن ادھر ادھر گھمائی۔ اس کا سیاہ پرس سیڑھیوں کے قریب گرا پڑا تھا۔

"ظفر!" اس نے پکارا، مگر وہ نیچے دیکھتا رہا۔

"ظفر، میری بات سنو!" وہ دبی دبی چلائی۔

"پہلے تسی منہ تے ڈھکو۔" وہ ہکلا گیا تھا۔

"اففو! میری بات سنو۔ جاؤ میرا پرس اٹھا کر لاؤ۔" کہنے کے ساتھ ہی ظفر اٹھا اور بھاگ کر اس کا پرس لے آیا۔ پرس میں کچھ بھی ایسا نہ تھا۔ تایا کے سانس کی ہلکی ہوتی آوازیں ویسی ہی سنائی دے رہی تھیں۔ خدایا! وہ کیا کرے۔ زخم شاید بہت بڑا نہ تھا، مگر بڑھاپے کو پہنچتی عمر میں یوں گرنا بہت تشویش ناک تھا۔

"تایا ابا! پلیز آنکھیں کھولیں۔ ہم آپ کو ہسپتال لے کر جا رہے ہیں۔ مگر پلیز آنکھیں کھولیں۔"

تایا فرقان نے ذرا کی ذرا آنکھیں کھولیں اور سر کے اثبات سے بتانا چاہا کہ وہ ٹھیک ہیں، پھر آنکھیں بند کر دیں۔ وہ ان کا ابلتا خون کیسے روکے۔ عبایا کرنے والی لڑکیوں کی اکثریت کی طرح وہ عبایا کے نیچے دوپٹا نہیں لیتی تھی، سو کچھ بھی نہیں تھا کہ تایا کے زخم پہ رکھتی مگر نہیں۔ اس نے تیزی سے تایا کے ماتھے سے ہاتھ ہٹایا، اپنی اسٹول کی پن کھینچی اور اسے سر سے اتارا۔ کیچر میں جکڑے بالوں کا جوڑا ڈھیلا ہو کر گردن کی پشت پہ آ گرا۔ چہرے کے گرد سے لٹیں نکل کر اطراف میں جھولنے لگیں۔

تایا نے نیم وا آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اس نے سیاہ کپڑے کو جلدی جلدی گول مول لپیٹ کر ان کے ماتھے کے زخم پہ دبا کر رکھا۔ تایا نے کرب سے آنکھیں بند کر لیں۔

"ظفر! گاڑی ادھر لے آؤ۔ ان کو جلدی سے ہسپتال لے چلتے ہیں؟" اس نے ایک ہاتھ سے تایا کے زخم کو کپڑے سے دبائے، سر اٹھا کر ظفر کو دیکھا۔ وہ ہکا بکا سا اسے دیکھ رہا تھا۔

"ظفر! گاڑی ادھر لے کر آؤ۔" وہ غصے سے زور سے چلائی۔ وہ اسپرنگ کی طرح اچھل کر کھڑا ہوا اور گاڑی کی طرف بھاگا۔ چند ہی لمحوں بعد وہ دونوں تایا کو سہارا دے کر کار میں ڈال رہے تھے۔

"فرخ کہاں ہے۔ کیا وہ گھر پہ تھا؟" کار میں بیٹھتے ہوئے اسے تایا کے دوسرے نمبر کے.... بیٹے کا خیال آیا جو ہاؤس جاب کر رہا تھا۔

"نہیں جی، فرخ بھائی کی آج کال تھی۔ وہ ہسپتال میں ہیں۔" ظفر نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے بے چینی سے بیک ویو مرر میں اس کو دیکھا۔

"ٹھیک ہے ہسپتال لے چلو۔ جلدی کرو۔" وہ پچھلی سیٹ پہ تایا کے ساتھ بیٹھی ابھی تک ان کے زخم کو سیاہ کپڑے سے دبائے ہوئے تھی۔

"مگر باجی! آپ ایسے کیسے جائیں گی؟" ظفر کو تایا سے زیادہ اس کی فکر تھی۔

"اففوہ، جو کہا ہے وہ کرو.... تیز چلاؤ گاڑی۔"

ظفر چپ ہو گیا مگر وہ بے حد غیر آرام دہ تھا۔ چند ہی منٹ بعد اس نے کار گھر کے گیٹ کے سامنے روکی۔ حیا نے چونک کر اسے دیکھا۔ گھر ہسپتال کے راستے میں ہی تھا مگر انہیں وہاں رکنا نہیں تھا۔

"ایک منٹ باجی، میں آیا۔"

"ظفر!" وہ اچنبھے سے آوازیں دیتی رہ گئی وہ مگر گیٹ کے اندر جا چکا تھا۔

پورا منٹ بھی نہیں گزرا جب وہ دوڑتا ہوا واپس آیا۔ ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھا، دروازہ بند کیا، ایک دوپٹا اس کی طرف اچھالا اور کار اسٹارٹ کر دی۔

"اوہ ظفر!" اس نے جیسے تھک کر نفی میں سر ہلایا پھر تہہ شدہ سفید دوپٹا کھولا اور لپیٹ کر سر پہ لے لیا۔ وہ صائمہ تائی کا دوپٹا تھا، وہ پہچانتی تھی۔ تایا نیم وا آنکھوں سے اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

"اتنا وقت دوپٹا لانے میں ضائع کر دیا تم نے۔ خیر تھی ظفر! میں ایسے ہی چلی جاتی۔"

جواب میں ظفر نے ہولے سے سر جھٹکا۔

"دو خاندانوں میں وخت ڈال کر اب حیا باجی کہتی ہیں کہ میں ایسے ہی چلی جاتی۔" زیر لب وہ خفگی سے بڑبڑایا تھا۔

اسے ایک دم زور سے ہنسی آئی، مگر بمشکل وہ دبا گئی۔ اس بدتمیز ظفر کو تو وہ بعد میں پوچھے گی۔

فرخ ہسپتال میں ہی تھا۔ تایا کو فوری طور پہ داخل کر لیا گیا۔ انہیں کار سے ٹکر نہیں لگی تھی، بس اسے آگے دھکیلتے وہ خود بھی توازن برقرار نہیں رکھ پائے تھے۔ معمر آدمی کے لیے گرنا ہی بہت تکلیف دہ ہوتا

ہے۔ مگر فرخ کا کہنا تھا کہ اتنی تشویش کی کوئی بات نہیں معمولی چوٹیں ہیں ٹھیک ہو جائیں گی۔
ایک تو پتا نہیں ان ڈاکٹرز کو اتنے بڑے پیمانے پہ چیر پھاڑ کرنے کے بعد بھی اچھے خاصے زخم بھی معمولی کیوں لگتے ہیں۔
"گھر فون مت کرنا ابھی۔ سب خوامخواہ پریشان ہو جائیں گے۔ ویسے بھی ٹانکے لگوا کر ان کو گھر لے جائیں گے اور تمہیں تو چوٹ نہیں آئی؟" فرخ اسے تایا ابا کی حالت کے بارے میں بتانے کے بعد مڑنے لگا تو ایک دم جیسے اسے خیال آیا۔
"نہیں! میں ٹھیک ہوں۔ تھینک یو۔" اس نے نہیں بتایا کہ اس کا دایاں گھٹنا اور پاؤں دکھ رہا ہے۔ وہ جہان سکندر کی بیوی تھی۔ اتنے معمولی زخموں کو لے کر کیوں پریشان ہوتی۔ جہان ..... پتا نہیں وہ کہاں تھا اس نے کب بتایا کہ وہ کدھر جا رہا ہے؟ اس کا ذہن پھر اسی نہج پہ بھٹکنے لگا تب ہی فرخ نے کہا۔
"تم ظفر کے ساتھ گھر چلی جاؤ' ابا خیریت سے ہیں۔" اس نے شائستگی سے پیشکش کی تھی۔ ایک زمانے میں وہ' صائمہ تائی کے بقول اس کو پسند کرتا تھا' مگر جب سے وہ ترک سے آئی تھی اس کے پردے کے باعث یا پھر جہان کی آمد کے باعث وہ محتاط ہو گیا تھا۔
"میں تایا کو یہاں چھوڑ کر کیسے جا سکتی ہوں۔ میں تم لوگوں کے ساتھ ہی جاؤں گی۔
فرخ گہری سانس لے کر آگے بڑھ گیا۔ ابا کو اس نے وہیں سے کال کر کے اطلاع دے دی تھی۔ یہ بھی کہہ دیا کہ ابھی کسی کو مت بتائیں۔ ذیشان انکل ابا کے ساتھ ہی گھر پہ تھے۔ انہوں نے ابا کو بتایا تھا کہ حیا صبح ان کے آفس آئی تھی مگر جلدی واپس چلی گئی۔ اس نے بے اختیار ماتھے کو چھوا۔ کیا وہ آج کا ہی دن تھا؟ یوں لگتا تھا کہ اس بات کو صدیاں بیت گئیں۔
"وہ ابا! ان سے معذرت کریں۔ مجھے کچھ کام یاد آ گیا تھا۔"
پھر اس نے ان دونوں کو ولید کے متعلق بتایا۔ وہ کوئی چھوٹی بات تو نہیں تھی۔ اقدام قتل تھا اور زد میں تایا فرقان اصغر بھی آئے تھے۔ ابا کا غم و غصے سے برا حال تھا۔ اس نے انہیں خود آنے اور گھر میں سے کسی کو بھی بتانے سے منع کر دیا کہ وہ لوگ بس واپس آ ہی رہے تھے۔
رات ابھی زیادہ گہری نہیں ہوئی تھی جب وہ فرخ اور ظفر کے ساتھ تایا ابا کو لے کر گھر پہنچے۔ تایا چل سکتے تھے' مگر سہارا لے کر۔ ایک طرف سے ان کو فرخ نے سہارا دے رکھا تھا۔ دوسری طرف سے حیا نے ان کا بازو تھام رکھا تھا۔ گھر کے داخلی دروازے پہ وہ بے اختیار رکی۔
ایک دم سے بہت کچھ یاد آیا تھا۔ وہ تو اس گھر میں داخل نہیں ہو سکتی تھی۔
"چلو حیا! میں زیادہ کھڑا نہیں رہ سکتا؟" تایا نے نقاہت بھری آواز میں اسے جیسے اکتا کر ڈانٹا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بہت سا پانی جمع ہونے لگا۔ بمشکل جی کہہ کر وہ ان کے ہمراہ چوکھٹ کے اندر آئی۔
لاؤنج میں بیٹھے تمام افراد چونک کر کھڑے ہوئے۔
اس نے سیاہ عبایا پہ سفید ستاروں والے دوپٹے سے ترچھا سا نقاب لے رکھا تھا۔ ایک وہ رات بھی جب اسی جگہ سے تایا نے اسے سب کے سامنے بے عزت کر کے نکالا تھا۔ اور ایک آج کی رات تھی جب وہ اس حالت میں اس گھر میں داخل ہوئی تھی کہ اس کا ہاتھ تایا نے پکڑ رکھا تھا' تایا کا بیٹا ان کے ساتھ تھا اور اس نے جس دوپٹے سے نقاب لے رکھا تھا وہ صائمہ تائی کا تھا۔
"کیا ہوا فرخ ..... حیا!" صائمہ تائی' سونیا بھابھی' ارم سب پریشانی سے دوڑے چلے آئے۔ فرخ سب کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ وہ بس خاموشی سے تایا کو سہارا دے کر ان کے کمرے تک لانے میں مدد دے رہی تھی۔ تایا ابا نے بیڈ پہ لیٹنے تک اس کا ہاتھ تھامے رکھا تھا۔
سارے گھر والے پریشان اور متاسف سے ان کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ تایا لیٹ گئے تو اس نے نرمی سے اپنا ہاتھ علیحدہ کیا اور ان کا تکیہ درست کیا۔ تب انہوں نے پوچھا۔
"کیسے ہوا یہ سب؟" صائمہ تائی پریشانی سے پوچھ رہی تھیں۔
"ولید لغاری نے ہمیں کار سے ٹکر ماری تھی اور وہ بھی جان بوجھ کر۔"
"کون ولید لغاری؟" ارم ذرا حیرت سے چونکی۔
"کمپنی میں ہمارا شیئر ہولڈر ہے' عمیر لغاری کا بیٹا۔" تایا کی گردن تلے تکیے رکھتے وہ سب کے سوالوں کے جواب دے رہی تھی۔ چونکہ وہ اس کمرے میں تھی' اس لیے فرخ خود ہی وہاں سے چلا گیا تھا۔
"حیا..... پانی!" سب کو چھوڑ کر انہوں نے اسے مخاطب کیا۔ وہ تیزی سے باہر نکلی کچن میں آکر پہلے خود پانی پیا پھر ان کے لیے پانی لے آئی۔
"بیٹا..... تمہاری شال!" انہوں نے گلاس لیتے ہوئے نقاہت زدہ لہجے میں یک لفظی استفسار کیا۔ شال سے مراد اس کی اسٹول تھی۔ اس نے سمجھ کر اثبات میں سر ہلا دیا۔
"وہ میں نے رکھ لی تایا ابا! استعمال کے لیے نئی اسٹول لے لوں گی' مگر اسے اپنے پاس رکھوں گی۔" پھر وہ نم آنکھوں سے مسکرائی اور ان کا ہاتھ پکڑ کر وہیں ان کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔ "میں اس اسٹول کو کبھی نہیں دھوؤں گی تایا ابا! اس میں بہت کچھ ہے جو میرے لیے بہت قیمتی ہے۔"
تایا ابا نے ہلکے سے مسکرا کر سر کو اثبات میں ذرا سی جنبش دی اور آنکھیں موند لیں۔
صائمہ تائی حق دق ان کے ہاتھ کو دیکھ رہی تھیں۔ جو حیا نے اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔ ان کی شاید سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہوا کیا ہے اور خود حیا شاید ساری زندگی اس لمحے کی' اس قیمتی لمحے کی وضاحت کسی کو نہیں دے سکتی تھی جو خاموشی سے آیا اور تھوڑے سے خون کا خراج لے کر اسے اس کا بہت کچھ لوٹا گیا۔ خون' جو واقعی پانی سے گاڑھا ہوتا ہے۔
تایا سو گئے تھے۔ پھپھو' سلیمان صاحب اور فاطمہ تائی ابھی وہیں بیٹھی تھیں۔ ان سب کو ظفر فوراً "بلا لایا تھا۔ صائمہ تائی' داور بھائی' سونیا' بلکہ پورا گھر ہی جاگ رہا تھا۔ سب تایا کے لیے پریشان تھے۔ ابا کا غصے سے برا حال تھا۔ وہ اب ہر ممکن طور پہ ولید کو گرفتار کروانا چاہتے تھے اور اس کے لیے کوششیں بھی کر رہے تھے۔ وہ اب تھک گئی تھی' سو وہاں سے اٹھ آئی۔ کچن سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھا' ظفر چائے کے برتن دھو رہا تھا۔ اسے آتے دیکھ کر اس نے سر مزید جھکا لیا۔
"سنو ظفر!" وہ باہر جانے سے قبل ایک لمحے کو رکی۔
ظفر نے سر جھکائے ہوئے ہی "جی" کہا۔ جیسے آج وہ اسے دیکھ لینے پہ ابھی تک شرمندہ تھا۔
"ایک چیز ہوتی ہے جسے ایمرجنسی سچویشن کہتے ہیں اور یقین کرو ہمیں اللہ تعالیٰ کو اپنی کسی بھی سچویشن کی وضاحت دینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ ہمارے حالات ہم سے زیادہ اچھے طریقے سے سمجھتا ہے۔ اس کی شریعت بھلے کتنی بھی سخت ہے۔ مگر اندھی نہیں ہے۔"
ظفر نے سمجھنے اور نہ سمجھنے کے مابین سر اثبات میں ہلا دیا۔
کمرے میں واپس آتے ہی اس نے دروازہ لاک کیا اور پرس سے فلیش نکالی۔ لیپ ٹاپ آن کر کے گھٹنوں پہ رکھا' وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ کمرے میں روشنی مدھم تھی' سو اسکرین اس کے چہرے کو بھی چمکا رہی تھی۔
اس نے ویڈیو وہیں سے شروع کی جہاں سے چھوڑی تھی۔ ایک' دو' تین' پھر کتنی ہی دفعہ اس نے بار بار وہ فلم دیکھی۔
فجر کی اذان ہوئی تو جیسے وہ اس کے حصار سے نکلی۔ اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا۔ بار بار ایک ہی بات کہ وہ اس کا کتنا خیال رکھا کرتا تھا۔ وہ کیوں کبھی یہ نہ جان سکی کہ نرم لہجے والا میجر احمد ہی جہان ہے۔ بس ایک دفعہ ..... جب وہ دونوں چاندی کے مجسموں کی طرح جھیل کے کنارے بیٹھے تھے' تب جس طرح جہان نرمی سے اسے سمجھا رہا تھا' اسے کچھ یاد آیا تھا۔

میجر احمد کا انداز..... آواز بے حد مختلف سہی، مگر اس وقت اسے دونوں کا انداز بالکل ایک سا لگا تھا۔ پھر بھی وہ نہ جان سکی۔ جب وہ اغوا ہوئی تھی، تب ہوش کھونے سے قبل اس نے فون کال کی گھنٹی سنی تھی، وہ جہان تھا جو اسے کال کر رہا تھا تاکہ وہ اندازہ کر سکے کہ وہ کس کمرے میں تھی۔ پھر جب اس نے کسی کو اس روسی کا سر دیوار سے مارتے ہوئے دیکھا تھا، تب وہ غنودگی میں ڈوبتی جا رہی تھی۔ وہ نہیں جان سکی کہ وہ وہیں تھا۔ اس کے پاس، ہمیشہ کی طرح ایک فاصلے سے اس پہ نظر رکھے ہوئے۔

اور ہالے نور اس کے ہوٹل میں کام کر چکی تھی، تب ہی وہ عبدالرحمٰن پاشا کے ذکر پہ اتنی پُچی ہو جاتی تھی۔ ساری کڑیاں ملتی جا رہی تھیں۔

"جب تک آپ یہ باکس کھولیں گی، وہ شاید اس دنیا میں نہ رہے۔"

یہ پنکی نے کہا تھا اور تب اس نے جان بوجھ کر ایسے الفاظ استعمال کیے تھے جن سے وہ سمجھے کہ ڈولی کی زندگی بے یقینی کا شکار ہے۔ وہ اپنے بارے میں ہر وقت ایسی باتیں کیوں کیا کرتا تھا؟ ہر وقت موت کے لیے، دنیا چھوڑنے کے لیے تیار..... جہان سکندر ایسا کیوں تھا؟

"اور اب وہ کہاں تھا؟"

ایک دم وہ چونک کر اٹھی۔ ہاں بھلا اب وہ کہاں تھا۔ یہ ویڈیو ذرا پرانی تھی، اس میں بہت سی چیزوں کی وضاحت نہیں تھی، مگر وہ سب اس وقت بے معنی تھا۔ اہم بات یہ تھی کہ وہ اس وقت کہاں تھا۔ اس نے فون نکالا اور اس کا ہر وہ نمبر ٹرائی کیا جو وہ جانتی تھی مگر سب بند تھے۔

"شاید پھپھو کو کچھ علم ہو۔"

وہ اٹھی، وضو کر کے پہلے نماز پڑھی، پھر باہر چلی آئی۔ بایاں پاؤں ٹخنے اور ایڑی کے قریب سے بہت درد کر رہا تھا۔ شاید موچ آئی تھی، مگر ابھی پٹی باندھنے کا مطلب اماں یا ابا کو اسے ترکی جانے سے روکنے کا بہانہ دینا تھا۔ پھپھو اپنے کمرے میں نماز پڑھ رہی تھیں۔ وہ ان کے قریب کاؤچ پہ بیٹھ کر ان کو دیکھے گئی۔ وہ چہرہ ہاتھ میں چھپائے دعا مانگ رہی تھیں۔ شاید وہ اپنے بیٹے کی سلامتی مانگ رہی تھیں۔ اس کا دل جیسے ڈوب کر ابھرا۔

"ارے! تم کب سے یہاں بیٹھی ہو۔ پتا ہی نہیں چلا۔" چہرے پہ ہاتھ پھیر کر انہوں نے سر اٹھایا تو اسے دیکھ کر جیسے خوش گوار حیرت ہوئی۔

"آپ سے کچھ بات کرنی تھی پھپھو!" وہ بولی تو اس کی آواز مدھم تھی۔ "کیا آپ جانتی ہیں جہان کدھر ہے؟"

"وہ مجھے کبھی نہیں بتایا کرتا مگر....." وہ ذرا رکیں۔ "جانے سے پہلے اس نے کہا تھا کہ اس نے تمہیں بتا دیا ہے کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔"

"اچھا!" اس نے اچنبھے سے انہیں دیکھا۔ "اس نے کسی اور سے بھی یہی بات کہی تھی، مگر مجھے تو ایسا کچھ یاد نہیں کہ....." کہتے کہتے وہ ایک دم رکی۔ ایک جھماکے سے اسے یاد آیا۔ "لندن" وہ کتنی ہی دفعہ لندن جانے کی بات کر چکا تھا۔ وہ لندن میں تھا۔ یقیناً وہ وہیں تھا۔

"اوہ! اس نے واقعی مجھے بتایا تھا۔" اس نے جیسے اپنی کم عقلی پہ افسوس سے سر ہلایا۔ "مگر اس نے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ واپس کب آئے گا۔"

"کہہ رہا تھا ایک آخری کام ہے، پھر وہ ترکی چھوڑ دے گا۔" پھپھو احتیاط سے الفاظ کا چناؤ کر رہی تھیں، جیسے انہیں اندازہ نہ تھا کہ وہ کتنا جانتی ہے۔

"مجھے جانا ہے استنبول کلیرنس کروانے، میں یہ کام کر کے اسے ضرور ڈھونڈوں گی پھپھو! آپ دیکھیے گا۔ میں اسے واپس لے آؤں گی۔"

"حیا! اللہ پہ توکل کرو اور آرام سے بیٹھ کر انتظار کرو، وہ آ ہی جائے گا۔"

"نہیں پھپھو!" اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ "ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا توکل نہیں، سستی ہوتی ہے۔ میں اس کو ڈھونڈنے ضرور جاؤں گی۔" وہ کھڑی ہوئی اور روتے ہوئے چہرے کے ساتھ ذرا سا مسکرائی۔

"ہر دفعہ وہ میرے پیچھے آیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ میں چلی جاؤں گی تو اس میں برا کیا ہے۔"

جاتے جاتے وہ ایک لمحے کو رکی۔ "پھپھو ابا اور تایا لوگوں نے آپ کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔"

پھپھو کے چہرے پہ حیرت ابھری، پھر جیسے انہوں نے سمجھ کر سر جھٹکا۔

"یہ جہان نے کہا ہو گا تم سے۔ پتا نہیں میرا بیٹا اتنی پرانی باتیں یاد کیوں رکھتا ہے؟ تم اس کی مت سنو، وہ ایسے ہی کہتا رہتا ہے۔"

"اگر اسے پتا چلے کہ آپ نے یہ کہا تو وہ کیا کہے گا؟"

"وہ کہے گا، میری ممی کی مت سنا کرو، وہ ایسے ہی بولتی رہتی ہیں۔" وہ ہلکے سے مسکرا دی۔ اسے یقین تھا، جہان پھپھو کے بارے میں کبھی ایسے نہیں کہہ سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

ناشتے کی میز پہ اماں نے سرسری سے انداز میں یہ بات اسے تب بتائی جب پھپھو اور ابا اٹھ چکے تھے۔

"کل دوپہر عابدہ بھابھی آئی تھیں۔"

"پھر؟" وہ جو کانٹے میں آملیٹ کا ٹکڑا پھنسا رہی تھی، سر اٹھا کر انہیں دیکھنے لگی۔

"وہ رضا کے لیے تمہارا رشتہ مانگ رہی تھیں۔"

نوالہ اس کے حلق میں اٹک گیا۔ اسے لگا اس نے غلط سنا ہے۔

"میرا رشتہ۔ آر یو سیریس؟" وہ بے یقینی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔

"جب تم اپنی خوامخواہ کی ضد کے پیچھے جہان کو یوں اپنی زندگی سے نکالو گی تو لوگ یہی کہیں گے نا۔"

وہ چکرا کر رہ گئی۔ جہان اس وجہ سے نہیں گیا تھا۔ وہ جانتی تھی مگر باقی سب تو نہیں جانتے تھے۔ ان کے ذہن ارم کی اس بڑھا چڑھا کر کی بات میں اٹکے تھے۔ دل تو چاہا، اگر رضا سامنے ہوتا تو کچھ اٹھا کر اسے دے مارتی اور.....

"اف....." اس نے سر جھٹکا۔ اسے کبھی محسوس نہیں ہوا تھا کہ وہ چیزیں اٹھا کر دے مارنے کی کتنی شوقین تھی اور وہ کتنی جلدی جان گیا تھا۔

اب مزید اس سے کچھ نہیں کھایا جاتا تھا۔ اس نے پلیٹ پرے کر دی۔

"عابدہ چچی سے کہیے گا، آئندہ ایسی بات سوچیں بھی مت۔ لوگوں کو میرا اور جہان کا رشتہ بھلے کمزور لگتا ہو مگر ہمارا رشتہ بہت مضبوط ہے اماں!"

"شیور!" اماں نے جیسے اکتا کر سر جھٹکا۔ وہ وہاں سے اٹھ آئی۔

ساری رات کی بے خوابی، وہ ویڈیو، تایا کا ایکسیڈنٹ اور پھر عابدہ چچی کا یہ قصہ۔ اس کا سر درد کرنے لگا تھا۔ ارم درست کہہ رہی تھی۔ وہ لوگ جان بوجھ کر اس کے نکاح کو کمزور ثابت کرنے پہ تلے تھے۔

آج اسے آفس نہیں جانا تھا۔ ابا آج خود آفس گئے تھے۔ وہ اب بہت بہتر محسوس کر رہے تھے۔ پتا نہیں ولید کے خلاف ایف آئی آر کا کیا بنا۔ کاش جہان نے اس کے سر پر فرائی پان کی جگہ پورا پریشر ککر دے مارا ہوتا تو کتنا اچھا تھا۔

☼ ☼ ☼

اس نے ابا کے آفس کے دروازے پہ مدھم سی دستک دے کر اسے دھکیلا۔ وہ سامنے اپنی میز کے پیچھے بیٹھے فائلز کی ورق گردانی کر رہے تھے۔ آہٹ پہ سر اٹھا کر اسے دیکھا اور ہلکا سا مسکرائے۔ بیماری نے انہیں کافی کمزور اور زرد کر دیا تھا۔

"آؤ بیٹھو۔" انہوں نے سامنے کرسی کی جانب اشارہ کیا۔ وہ سیدھ میں چلتی ان کے مقابل کرسی تک آئی، پرس میز پہ رکھا اور کرسی پہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر بیٹھ گئی۔

"مارکیٹنگ فنڈ میں سے کٹوتی کس نے کی ہے؟" انہوں نے سامنے کھلی فائل کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ اس کی کارکردگی دیکھ رہے تھے اور یقیناً انہیں اس میں بہت سی غلطیاں دکھائی دے رہی

تھیں۔ "اور کیا ضرورت تھی شیئر ہولڈرز کو سالانہ dividend دینے کی؟"

"فادر ڈیرسٹ! ایک تو میں نے بغیر تنخواہ کے اتنے دن کام کیا اوپر سے ڈانٹ بھی مجھے ہی پڑے گی۔" وہ انگلیوں سے نقاب ناک سے ٹھوڑی تک اتارتے ہوئے وہ خفگی سے بولی۔

"ڈاٹر ڈیرسٹ! احسان جتانے سے ضائع ہو جایا کرتے ہیں۔" وہ مسکرائے تھے۔

"رہنے دیں ابا! اچھا بتائیں' ولید کی ایف آئی آر کا کیا بنا؟"

"وہ پولیس کو نہیں مل رہا۔ اس کا باپ اس کو گرفتار نہیں ہونے دے گا۔ بہر حال! میں اس کو ایسے نہیں جانے دوں گا۔" ایک دم وہ سنجیدہ نظر آنے لگے تھے۔ "لیکن اس وقت میں نے تمہیں کسی اور بات کے لیے بلایا ہے۔"

"جی کہیے۔" اس کا دل زور سے دھڑکا۔ ابا اپنی بیماری کے باعث بہت سے معاملات سے دور رہے تھے' مگر پھر بھی ان کے کانوں تک بہت کچھ پہنچ گیا تھا یقیناً" اور بالآخر انہوں نے حیا سے دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"یہ جہان صاحب واپس کیوں گئے ہیں؟"

"اسے کام تھا کچھ۔ آجائے گا کچھ دن میں واپس۔"

"صائمہ بھابھی کچھ اور کہہ رہی تھیں۔" وہ اسے سوچتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولے تھے۔ حیا نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔

"صائمہ تائی تو ہماری دادی پہ بھی ساری عمر یہی الزام لگاتی رہی تھیں کہ وہ ان پہ جادو کرواتی ہیں۔ اگر صائمہ تائی کا جہان کے بارے میں تجزیہ درست مانا جائے تو دادی والا بھی درست مانا جانا چاہیے؟" وہ بھی حیا تھی۔ اس نے ہار نہ ماننے کا تہیہ کر رکھا تھا۔

"دیکھو! مجھے تمہارے اس برقعے وغیرہ سے کوئی مسئلہ نہیں ہے' مگر اس کی وجہ سے تم نے اپنے تایا اور اماں کو بہت ناراض کیا ہے۔ تمہیں چاہیے تھا کہ تم ان کی بات کا احترام کرتیں۔ بڑوں کا حکم ماننا فرض ہوتا ہے۔" وہ چند لمحے سوچتی نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہی' پھر کہنے لگی۔

"ابا! آپ کو ایک بات بتاؤں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن خطاب نے اپنے بیٹے عبداللہ سے کہا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دیں۔ ابن عمرؓ نے ایسا نہیں کیا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کا علم ہوا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن عمرؓ سے فرمایا کہ بیوی کو طلاق دے دو۔ یوں عبداللہ بن عمرؓ نے اپنے والد کی بات کا احترام کرتے ہوئے بیوی کو طلاق دے دی۔" وہ لحظے بھر کو رکی۔ سلیمان صاحب سیٹ سے ٹیک لگائے' ایک ہاتھ میں پین گھماتے غور سے اسے سن رہے تھے۔

"پھر ہوا یہ کہ عرصے بعد ایک شخص امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ کے پاس آیا اور ان سے کہا کہ میرا باپ چاہتا ہے' میں اپنی بیوی کو طلاق دے دوں۔ امام احمد رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ایسا ہرگز مت کرنا۔ اس شخص نے جواب میں یہ واقعہ بیان کیا کہ عمر رضی اللہ عنہ بن خطاب کے کہنے پر ان کے بیٹے نے تو اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ پھر مجھے کیوں ایسا نہیں کرنا چاہیے؟ ابا۔۔۔! آپ جانتے ہیں اس پہ امام احمد بن حنبل رضی اللہ عنہ نے اس شخص سے کیا کہا؟"

"کیا۔" وہ بے اختیار بولے۔ حیا ہلکے سے مسکرائی۔

"انہوں نے کہا' کیا تمہارا باپ عمر جیسا ہے؟"

آفس میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔ صرف گھڑی کی سوئیوں کی ٹک ٹک سنائی دے رہی تھی۔

"ویل۔۔۔!" ابا نے ہولے سے سر جھٹکا۔ "تم ایل ایل بی اسٹوڈنٹ ہو' میں تم سے بحث میں جیت نہیں سکتا۔ میں صرف اتنا جاننا چاہتا ہوں کہ تم نے خلع کے بارے میں سوچا ہے؟" اس کا جیسے کسی نے سانس بند کر دیا۔ وہ لمحے بھر کو شل سی رہ گئی۔

"تمہیں یاد ہے میں نے ترکی جانے سے قبل بھی تم سے ایسی ہی بات کی تھی؟"

"جی مجھے یاد ہے۔" چند ثانیے بعد وہ بولی تو اس کا لہجہ بے تاثر ہو گیا تھا۔ "اور تب میں نے آپ سے یہی کہا تھا کہ مجھے ترکی جانے دیں' اگر وہاں جا کر مجھے لگا کہ وہ لوگ طلاق چاہتے ہیں تو میں اس رشتے کو وہیں ختم کر دوں گی۔"

"تو پھر؟"

"ابا! ہمارے درمیان یہی ڈیل ہوئی تھی کہ ترکی سے واپسی تک آپ مجھے ٹائم دیں گے۔"

"اور اب عرصہ ہوا۔۔۔ تم واپس آچکی ہو۔"

"میں واپس نہیں آئی۔ آفیشلی مجھے ابھی ترکی سے واپسی کی کلیرنس نہیں ملی۔ پرسوں میں استنبول جا رہی ہوں' واپسی پہ ہم اس بات کو ڈسکس کریں گے۔" وہ بہت اعتماد سے کہہ رہی تھی۔ ابا متفق نہیں تھے' مگر پھر بھی جیسے وقتی طور پہ خاموش ہو گئے۔

"ابا! وہ۔۔۔ ایک اور بات بھی تھی۔" ہمت کر کے اس نے کہنا شروع کیا۔ "میں سوچ رہی تھی کہ اگر کلیرنس کروانے کے بعد میں لندن چلی جاؤں۔ زیادہ نہیں' بس ایک ہفتے کے لیے۔ میں صرف لندن دیکھنا چاہتی ہوں' پھر۔"

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ زیادہ ہی ان ڈیپنڈنٹ ہوتی جا رہی ہیں' مجھے آپ کو ذرا کھینچ کر رکھنا پڑے گا۔" وہ لمحے بھر میں روایتی ابا بن گئے۔

"ابا پلیز!" اس کا لہجہ ملتجی ہو گیا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کلیرنس کروا کر سیدھا آپ واپس آئیں گی۔ جتنا گھومنا ہے استنبول میں گھوم لو۔ ترکی کے کسی اور شہر جانا ہو تو بے شک چلی جاؤ' مگر اکیلے نہیں' فرینڈز کے گروپ کے ساتھ جانا۔ لندن وغیرہ جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔"

"لیکن صرف ایک ہفتے۔۔۔"

"حیا! تم نے سن لیا جو میں نے کہا۔" ان کا لہجہ نرم تھا' مگر ابرو اٹھا کر تنبیہہ کرتا انداز سخت تھا۔ وہ خفگی سے "جی" کہہ کر اٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆

وہ آج پھر یونیورسٹی چلی آئی تھی۔ ڈاکٹر ابراہیم سے اس نے آج وقت نہیں لیا تھا' مگر پھر بھی وہ اسے اپنے آفس میں مل گئے۔

"آپ نے ٹھیک کہا تھا سر! ہمیں لوگوں کو وقت دینا چاہیے۔" ان کے بالمقابل بیٹھی وہ آج بہت سکون سے کہہ رہی تھی اور وہ اسی توجہ سے اسے سن رہے تھے۔ سامنے اس کے لیے منگوا کر رکھی کافی کی سطح سے دھوئیں کے مرغولے اٹھ کر فضا میں گم ہو رہے تھے۔ ان کے آفس کا خاموش' پرسکون ماحول اس کے اعصاب کو ریلیکس کر رہا تھا۔

"یقین کریں سر! لوگ شروع میں آپ کے حجاب کی جتنی مخالفت کر لیں' ایک وقت آتا ہے کہ وہ اسے قبول کر لیتے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ آپ کو اس میں قبول کر لیتے ہیں۔ چاہے انہیں تب بھی حجاب اتنا ہی ناپسند کیوں نہ ہو جتنا پہلے تھا۔ اب مجھے یقین آ گیا ہے کہ آہستہ آہستہ سارے مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔"

"بالکل۔" انہوں نے مسکرا کر دھیرے سے اثبات میں سر ہلا کر تائید کی۔

"مگر سر! میں جب اپنے مسئلوں سے گھبرا گئی تو آپ کے پاس آئی اور تب میں نے آپ سے کہا تھا کہ یہ "تواصوبالصبر" انسانوں کو انسانوں سے ہی چاہیے ہونا ہے۔ آپ نے میری بات کی تائید کی تھی رائٹ؟"

"جی پھر؟" وہ پوری توجہ سے سن رہے تھے۔

"پھر سر! یہ کہ میری پھپھو کہتی ہیں' انسان کو اپنے مسئلے دوسروں کے سامنے نہیں بیان کرنے چاہئیں۔ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ خود کو بے عزت کرتا ہے۔ کیا ایسا ہی ہے سر! کیا ہمیں اپنے مسئلے کسی سے شیئر نہیں کرنے چاہئیں؟"

وہ اپنی کافی کی سطح پہ آئے جھاگ کو دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی' جس میں مختلف اشکال نظر آ رہی تھیں۔

"مگر پھر ہم "تواصوبالصبر" کیسے کریں گے سر؟" جہان کی طرف کی روداد سننے کے بعد یہ سوال اس کے ذہن میں اٹک کر رہ گیا تھا۔

"آپ کی پھپھو ٹھیک کہتی ہیں۔ سوال کرنا یعنی

کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا، بھلے وہ ہمدردی لینے کے لیے ہی ہو، ہر حال میں ناپسندیدہ ہوتا ہے۔ انسان کو واقعی اپنے مسئلے اپنے تک رکھنے چاہئیں۔ دنیا کو اپنی پرابلم سائیڈ دکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اپنے مسئلے کا واقعی اشتہار نہیں لگایا کرتے۔ مگر۔۔۔" وہ لحظہ بھر کو رکے۔

وہ نامحسوس طریقے سے کرسی پہ آگے کو ہوئی۔ اسے اسی "مگر" کا انتظار تھا۔

"مگر انسان پہ ہر وقت ایک سا فیز نہیں رہتا میرے بچے! وقت بدلتا ہے۔ مسئلے بھی بدلتے ہیں۔ بعض دفعہ انسان ایسی سچویشن میں گرفتار ہو جاتا ہے، جس سے وہ پہلے کبھی نہیں گزرا ہوتا۔ تب اسے چاہیے کہ اپنے مسئلے کا حل کسی سے پوچھ لے۔ انسان کو صرف تب اپنے پرابلمز شیئر کرنے چاہئیں جب اس کو واقعی اپنے پاس سے ان کا حل نہ ملے۔ کوئی ایک دوست، ایک ٹیچر یا پھر کوئی اجنبی، کسی ایک بندے کے سامنے اپنے دل کی بھڑاس نکال دینے میں کوئی حرج نہیں ہوتا جو واقعتاً "تواصوبالصبر" کرے۔ ہاں! لیکن ایک بات یاد رکھیں۔ اس شخص کو کبھی اپنی بیساکھی نہ بنائیں۔ آپ کو ہر کچھ دن بعد کسی کے کندھے پہ رونے کی عادت نہیں ڈالنی چاہیے۔ دینے والا ہاتھ لینے والے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے۔ ہر وقت دوسروں سے تسلی لینے کے بجائے بہتر ہے کہ ہم تسلی دینے والے بنیں "تواصوبالصبر" صبر کی تلقین دینے کا نام ہوتا ہے، ہر وقت لیتے رہنے کا نہیں۔"

اس نے سمجھ کر سر ہلا دیا۔ اس کی کافی اب ٹھنڈی پڑتی جا رہی تھی، جھاگ کی اشکال چھٹتی جا رہی تھیں۔ اسے خوشی تھی کہ آج وہ سر کے پاس پھر سے نئے مسئلے لے کر نہیں آئی تھی۔

"میں سمجھ گئی اور مجھے کچھ اور بھی بتانا تھا آپ کو۔" اسے جیسے اسی پل کچھ یاد آیا۔ "آپ نے کہا تھا میں احزاب کی پہیلی میں کچھ مس کر گئی ہوں۔ میں نے اس بارے میں بہت سوچا، پھر مجھے ایک خیال آیا۔"

"اچھا اور وہ کیا۔" وہ دلچسپی سے کہتے ذرا آگے کو ہوئے۔

"سر! جنگ احزاب کے ختم ہونے کے بعد بنو قریظہ اپنے قلعوں میں جا چھپے تھے۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا اور ان کو جا لیا۔ اگر بنو قریظہ کا فیصلہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پہ چھوڑا جاتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ سے زیادہ ان کو وہ جگہ چھوڑ دینے کا حکم دے دیتے، مگر ان کا فیصلہ سعد رضی اللہ عنہ پہ چھوڑا گیا جو قبیلہ اوس سے تھے۔ انہوں نے بنو قریظہ کا فیصلہ یہود کی اپنی سزاؤں کے مطابق کیا یعنی کہ تمام مردوں کو غداری کے جرم میں قتل کیا جائے۔ یہ بنی اسرائیل کے ہاں غداری کی سزا تھی۔ کیا میں نے یہی بات مس کر دی کہ آخر میں بنو قریظہ کو ان کے اپنے ہی سزا دیتے ہیں۔"

ڈاکٹر ابراہیم مسکرا کر سر جھٹکتے ہوئے آگے کو ہوئے۔

"یہ آپ کہاں چلی گئیں۔ غزوہ بنو قریظہ جس کا آپ ذکر کر رہی ہیں، یہ غزوۂ احزاب کے بعد ہوئی تھی، یہ غزوۂ احزاب کا حصہ نہیں تھی۔ آیت حجاب قرآن کی جس سورہ میں ہے اس کا نام احزاب ہے، بنو قریظہ نہیں۔ آپ کو احزاب کے دائرہ کار میں رہ کر اس کا جواب تلاش کرنا تھا۔"

"اچھا پھر! آپ مجھے بتا دیں کہ میں کیا مس کر گئی ہوں۔" اس نے خفگی سے پوچھا۔ پتا نہیں سر اس کو کیا دکھانا چاہتے تھے۔

"حیا! میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ سورۂ احزاب اور حجاب میں مماثلت ہے۔ یہ آپ نے کہا تھا۔ آپ نے اسے پہیلی کہہ کر ایک چیلنج کے طور پہ قبول کیا تھا۔ سو آپ کو یہ پزل خود مکمل کرنا ہے۔"

"سر! تھوڑی بہت چیٹنگ تو جائز ہوتی ہے۔"

"ہرگز نہیں۔ اچھا کچھ کھائیں گی، آج تو میرے پاس ٹرکش کینڈیز بھی نہیں ہیں۔"

"نہیں سر! بس یہ کافی بہت ہے، پھر میں چلوں گی۔ اگلی دفعہ میں آپ کے پاس اس پہیلی کا آخری ٹکڑا لے کر ہی آؤں گی۔" وہ ایک عزم سے کہتی اٹھی۔

ڈاکٹر ابراہیم نے مسکرا کر سر کو جنبش دی۔ انہیں جیسے اپنی اس ذہین اسٹوڈنٹ سے اسی بات کی امید تھی۔

☼ ☼ ☼

یونیورسٹی کے فی میل کیمپس میں ایک دوسری ٹیچر سے مل کر وہ انٹرنس بلاک سے نکلی تو سامنے ایک طویل روش تھی جس کے اختتام پہ مین گیٹ تھا۔ اس نے گردن جھکا کر ایک نظر اپنے پیروں کو دیکھا جو سیاہ ہیل والی سینڈلز میں مقید تھے۔ ہیل کی اتنی عادت تھی کہ دکھتے پیر کے باوجود اس نے ہیل پہن لی تھی، مگر اب چل چل کر دایاں پاؤں ٹخنے اور ایڑی سے درد کر رہا تھا۔ وہ سر جھٹک کر تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔ طویل سڑک عبور کر کے وہ گیٹ سے باہر آئی تو کار سامنے ہی کھڑی تھی۔ ڈرائیور نے اسے آتے دیکھ کر فوراً پچھلی طرف کا دروازہ کھولا۔ وہ اندر بیٹھی اور دروازہ بند کر دیا۔ ڈرائیور الٰہی بخش نے فوراً" کار اسٹارٹ کر دی۔

ایچ ٹین کا وہ خالی خالی سا علاقہ تھا۔ یونیورسٹی کی حدود سے نکل کر کار اب مین روڈ پہ دوڑ رہی تھی۔ اطراف میں دور دور فیکٹریز، عمارتیں یا انسٹی ٹیوٹس تھے۔ ابھی وہ زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ اچانک الٰہی بخش نے بریک لگائے۔ وہ جو ٹیک لگائے بیٹھی تھی جھٹکے سے میکانکی طور پہ ذرا آگے کو ہوئی۔

"کیا ہوا؟"

"یہ گاڑی سامنے آ گئی۔" الفاظ الٰہی بخش کے لبوں پہ ہی تھے کہ حیا نے ونڈ اسکرین کے پار اس منظر کو دیکھا۔ وہ چمکتی ہوئی سیاہ اکارڈ ایک دم سے سامنے آئی تھی۔ یوں کہ ان کا راستہ بلاک ہو گیا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ سے سیاہ سوٹ میں ملبوس شخص نکل کر تیزی سے ان کی جانب آیا تھا۔ حیا یک ٹک اس سیاہ اکارڈ کو دیکھ رہی تھی۔ وہ اس گاڑی کو پہچانتی تھی۔ اس گاڑی نے تایا فرقان کو ٹکر ماری تھی۔

ولید اس کے دروازے سے چند قدم ہی دور تھا۔

غصے کا ایک ابال اس کے اندر اٹھنے لگا۔

"الٰہی بخش! جلدی سے ابا کو فون کرو اور بتاؤ کہ ولید نے ہمارا راستہ روکا ہے۔ میں تب تک اس سے ذرا بات کر لوں۔" وہ دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ ولید اس کے سامنے آ کھڑا ہوا تھا۔ چہرے پہ طیش، آنکھوں میں تنفر۔ اس نے کن اکھیوں سے گاڑی میں بیٹھے الٰہی بخش کو نمبر ملاتے دیکھا۔

"میرا خیال تھا آپ ملک سے فرار ہو چکے ہیں۔ مگر نہیں آپ تو یہیں ہیں۔" بہت اطمینان اور سکون سے کہتی وہ اس کے سامنے کھڑی تھی۔ "خیر چند دن کا عیش ہے مسٹر لغاری! پھر آپ کو اقدام قتل کے کیس کا سامنا کرنا ہی ہو گا۔"

"میری بات سنو!" ایک ہاتھ کار کی چھت پہ رکھے دوسرے ہاتھ کی انگلی سے تنبیہہ کرتا وہ بہت طیش کے عالم میں کہہ رہا تھا۔ "تم اس مقدمے میں میرے خلاف ایک لفظ نہیں کہو گی۔ یہ ایک ایکسیڈنٹ تھا اور تم اپنے بیان میں یہی کہو گی۔"

"میں بیان دے چکی ہوں اور تم نامزد ملزم ٹھہرائے جا چکے ہو۔"

"اپنی بکواس اپنے پاس رکھو۔ جو میں کہہ رہا ہوں، تم وہ ہی کرو گی۔ تم یہ مقدمہ فوراً" واپس لے رہی ہو، سنا تم نے؟" وہ بلند آواز سے بولا تھا۔ الٰہی بخش فون کان سے ہٹا کر دوبارہ نمبر ملا رہا تھا۔ شاید رابطہ نہیں ہو پا رہا تھا۔

"اور اگر میں ایسا نہ کروں تو تم کیا کرو گے؟ مجھے دوبارہ اپنی گاڑی کے نیچے دینے کی کوشش کرو گے؟" اس نے استہزائیہ سر جھٹکا۔

ولید چند لمحے لب بھینچے اسے دیکھتا رہا، پھر ایک طنزیہ مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔

"میرے پاس تمہارے لیے اس سے بھی بہتر حل موجود ہے۔"

"اچھا اور وہ کیا ہے؟" وہ اسی کے انداز میں بولی۔ اطراف سے گاڑیاں زن کی آواز کے ساتھ گزر رہی تھیں۔

ولید نے گاڑی کی چھت سے ہاتھ ہٹایا، جیب سے اپنا موبائل نکالا، چند بٹن پریس کیے اور پھر اس کی اسکرین حیا کے سامنے کی۔

"کیا اس منظر کو دیکھ کر کوئی گھنٹی بجی ہے ذہن میں؟" ایک تپانے والی مسکراہٹ کے ساتھ وہ بولا تو حیا نے ایک نگاہ اس کے موبائل اسکرین پہ ڈالی، مگر پھر ہٹانا بھول گئی۔ ادھر ہی جم گئی۔ منجمد، شل، ساکت۔

"شریفوں کا مجرا" اس ویڈیو کی جھلک۔ کسی نے کھولتا پتیل اس کے اوپر ڈال دیا تھا۔ اندر باہر آگ میں لپٹے گولے برسنے لگے تھے۔ بے یقینی سی بے یقینی۔

"نکل گئی نا اکڑ۔ اب آئی ہو نا اپنی اوقات پہ۔" ولید نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلاتے ہوئے موبائل بند کر کے جیب میں ڈالا۔ نقاب سے جھلکتی اس کی ششدر ساکت آنکھیں ابھی تک وہیں منجمد تھیں۔

"ذرا سوچو میں اس ویڈیو کے ساتھ کیا کیا کر سکتا ہوں۔" وہ اب قدرے مسکرا کر کہہ رہا تھا۔ حیا کا شاک اسے سمجھانے کے لیے کافی تھا کہ تیر عین نشانے پہ لگا ہے۔

"میں اسے اگر تمہارے خاندان کے سارے مردوں تک پہنچا دوں تو کیا ہوگا حیا بی بی! کبھی سوچا تم نے؟ کیا اب بھی تم میرا نام اس کیس میں لے سکو گی؟" پھر اس نے مسکراتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"ایسی غلطی مت کرنا ورنہ میں تمہیں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑوں گا۔"

وہ جو آندھی طوفان کی طرح آیا تھا، کسی پرسکون فاتح کی طرح واپس پلٹ گیا۔ اپنی کار میں بیٹھ کر اس نے دروازہ بند کیا۔ سائیڈ مرر میں دیکھتے ہوئے ہاتھ ہلایا، سن گلاسز آنکھوں پہ لگائے اور گاڑی آگے بڑھا کر لے گیا۔

وہ ابھی تک شل سی کار کے ساتھ کھڑی تھی۔ نقاب کے اندر لب ابھی تک ادھ کھلے اور آنکھوں کی پتلیاں ساکن تھیں۔ دل کی دھڑکن ہلکی ہو گئی تھی، جیسے کوئی لٹی پٹی کشتی، سمندر کی گہرائی میں ڈوبتی چلی جا رہی ہو۔ نیچے... اور نیچے... گہرائی... پاتال۔

"بڑے صاحب فون نہیں اٹھا رہے۔ اب کیا کرنا ہے میم؟"

الٰہی بخش باہر نکل کر پوچھنے لگا۔ اس کا سکتہ جیسے ذرا سا ٹوٹا۔ بے حد خالی خالی نظروں سے الٰہی بخش کو دیکھتے اس نے نفی میں سر ہلایا، پھر بنا کچھ کہے واپس بیٹھ گئی۔ اس کا سارا جسم ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ نیلا اور ٹھنڈا۔ جیسے چاندی کے مجسمے کو کسی نے زہر دے دیا ہو۔

وہ گھر کب پہنچے، کیسے نیچے اتری، اسے ہوش نہ تھا۔ بہت چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے اندرونی دروازہ کھول کر اس نے لاؤنج میں قدم رکھا ہی تھا کہ سامنے کوئی کھڑا نظر آیا۔

بلیو جینز، سیاہ ٹی شرٹ، سنہری سپید رنگت، بڑی بڑی آنکھیں، وہ ہنستے ہوئے کسی سے بات کر رہا تھا، آہٹ پہ پلٹ کر حیا کو دیکھا جو میکانکی انداز میں نقاب ناک سے اتار کر ٹھوڑی تک لا رہی تھی۔

"یہ ہمارے گھر میں جامعہ حفصہ کہاں سے آ گیا؟" وہ خوش گوار حیرت کے زیر اثر بولا تھا۔

حیا نے دھیرے سے پلکیں جھپکائیں۔ اس کی آنکھوں نے اس شخص کا چہرہ اپنے اندر مقید کیا، پھر بصارت نے یہ پیغام دماغ کو پہنچایا، دماغ نے جیسے سست روی سے اس پیغام کو ڈی کوڈ کیا اور پھر اس شخص کا نام اس کے لبوں تک پہنچایا۔

"رو... روحیل۔" چند لمحے لگے تھے اسے اپنے شل ہوتے دماغ کے ساتھ اپنے بڑے بھائی کو پہچاننے میں۔

"اتنے شاکڈ تو ابا بھی نہیں ہوئے تھے جتنی تم ہوئی ہو۔" وہ مسکرا کر کہتا آگے بڑھ کر اسے ملا۔ وہ خوش تھا، ابا اور اس کا معاملہ حل ہو گیا کیا؟ وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ بس خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"حیا! یہ تناشا ہے، ادھر آ کر ملو۔" اماں نے جانے کہاں سے اسے پکارا تھا۔ اس نے دھیرے سے گردن موڑی۔ اماں کے ساتھ لاؤنج کے صوفے پہ ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کا دماغ مزید کام کرنے سے انکاری تھا، اس نے بس سر کے اشارے سے ان انجان لڑکی کو سلام کیا اور پھر روحیل کو دیکھا۔

"میں آتی ہوں۔ سر میں درد ہے۔ سونا ہے مجھے۔" مبہم، ٹوٹے، بے ربط الفاظ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ پیچھے سے اماں نے شاید پکارا تھا، مگر اس نے اندر آ کر دروازہ بند کیا اور کنڈی لگا دی۔ ذہن اس طرح سے ایک نقطے پہ منجمد ہو گیا تھا کہ وہاں سے آگے پیچھے نہیں جا رہا تھا۔

کسی خود کار روبوٹ کی طرح اس نے عبایا کے بٹن کھولے، پھر سر سے سیاہ اسکارف علیحدہ کیا تو بالوں کا جوڑا کھل گیا۔ سارے بال کمر پہ گرتے گئے۔ اس نے سیاہ لمبی قمیص کے ساتھ سفید چوڑی دار پاجاما پہن رکھا تھا۔

ارد گرد ہر شے اجنبی سی لگ رہی تھی۔ وہ خالی الذہنی کے عالم میں چلتی باتھ روم کی طرف آئی، دروازہ کھلا چھوڑ دیا اور باتھ روم کی ساری لائٹیں جلا دیں۔

وہ اسی انداز میں چلتی شاور تک آئی اور اسے پورا کھول دیا۔ پھر باتھ ٹب کی منڈیر کے کنارے پہ بیٹھ گئی۔ اس کی سیاہ لمبی قمیص کا دامن اب پیروں کو چھو رہا تھا۔

شاور سے نکلتی پانی کی تیز دھار بوندیں سیدھی اس کے سر پہ گرنے لگیں۔ وہ جیسے محسوس کیے بنا سامنے سنک کے ساتھ سلیب پہ رکھے باٹ پوری بھرے شیشے کے پیالے کو دیکھ رہی تھی جس کی خوشبو پورے باتھ روم میں پھیلی تھی۔

انسان سمجھتا ہے، گناہ بھلا دینے سے وہ زندگی سے خارج ہو جاتے ہیں، مگر ایسا نہیں ہوتا۔ گناہ پیچھا کرتے ہیں۔ وہ عرصے بعد بھی اپنے مالک سے ملنے آ جایا کرتے ہیں۔ گناہ قبر تک انسان کے پیچھے آتے ہیں۔ اس کے گناہ بھی ایک دفعہ پھر اس کے سامنے آ گئے تھے۔ انہوں نے دنیا کے ہجوم میں بھی اپنے مالک کو تلاش کیا تھا۔

موسلا دھار پانی اس کے سر سے پھسل کر نیچے گر رہا تھا۔ بال بھیگ کر موٹی لٹوں کی صورت بن گئے تھے اس کا پورا لباس گیلا ہو چکا تھا۔ وہ یک ٹک سامنے ٹائلز سے مزین دیوار کو دیکھ رہی تھی۔

ولید کے پاس وہ ویڈیو کہاں سے آئی، وہ نہیں جانتی تھی، مگر ایک بات طے تھی۔ اللہ نے اسے معاف نہیں کیا تھا۔ اس کے گناہ دھلے نہیں تھے۔ وہ آج بھی اس کے سائے کی طرح اس کا پیچھا کر رہے تھے اور اگر وہ سب کچھ اس کے خاندان والوں کے سامنے آ گیا تو؟

پانی کی بوچھاڑ ابھی تک اسے بھگو رہی تھی۔ اس کے چہرے، بالوں اور سارے وجود پہ موٹی موٹی بوندیں گر رہی تھیں۔ ایسے جیسے بارش کے قطرے ہوتے ہیں۔ جیسے سیپ سے نکلے موتی ہوتے ہیں۔ جیسے ٹوٹے ہوئے آنسو ہوتے ہیں۔

وہ پوری طرح بھیگ چکی تھی۔ مگر ابھی تک یوں ہی شل سی بیٹھی تھی۔ یہ کیا ہو گیا تھا؟ وہ کیا کرے گی اب؟ ولید کے ہاتھ اس کی کمزوری لگ گئی تھی۔ وہ اس کے خلاف گواہی نہ دے تو کیا ولید بس کر دے گا؟ نہیں، وہ جان چکا ہے کہ اس کے پاس کیا "چیز" ہے۔ وہ اسے بار بار استعمال کرنا چاہے گا۔ کیا وہ اسی طرح اس کے ہاتھوں بلیک میل ہوتی رہے گی؟ اس نے کیوں ولید کو تھپڑ نہیں دے مارا؟ وہ کیوں ڈر گئی؟ وہ کیوں ظاہر نہیں کر سکی کہ اسے اس بات سے فرق نہیں پڑتا؟ مگر وہ یہ ظاہر نہیں کر سکتی تھی۔ سب کچھ اتنا غیر متوقع ہوا تھا کہ انسان ہونے کے ناتے وہ سنبھل نہیں سکی تھی اور ولید جیت گیا تھا۔

اسے اللہ نے معاف نہیں کیا۔ نیلی مسجد میں بیٹھ کر اس نے کتنی معافی مانگی تھی۔ کتنا نور مانگا تھا اور اب خود کو اس کی پسند کے مطابق ڈھالنے کے بعد جب اسے اپنے گناہ بھولتے جا رہے تھے تو اچانک وہ سب اس کے سامنے لا کر کھڑا کر دیا گیا تھا۔ وہ بری لڑکی نہیں تھی، اس کا کوئی افیئر نہیں رہا تھا۔ دکان دار سے روپے پکڑتے وقت بھی احتیاط کرتی تھی کہ ہاتھ نہ ٹکرائے، مگر خوب صورت دکھنے کی خواہش سے اس سے چند

غلطیاں ہوئی تھیں اور وہ اب تک معاف نہیں ہو سکی تھیں۔

جانے کب وہ اٹھی، شاور بند کیا اور بھیگے بالوں اور کپڑوں سمیت اپنے بیڈ کے ساتھ نیچے کارپٹ پہ آ بیٹھی۔ آنسو تھے کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے اکڑوں بیٹھے، سینے کے گرد بازو لپیٹے سر گھٹنوں میں دیے وہ کب سو گئی اُسے پتا ہی نہیں چلا۔

☼ ☼ ☼

جب وہ اٹھی تو عشاء کی اذان ہو رہی تھی۔ کمرے میں تاریکی پھیلی تھی۔ لباس اور بال ابھی تک نم تھے۔ ذرا حواس بحال ہوئے تو روحیل اور اس کی بیوی کا خیال آیا۔ اس نے تو اسے ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں تھا، پتا نہیں اماں نے کیا نام لیا تھا۔

فریش ہو کر، انگوری لمبی قمیص کے ساتھ میرون چوڑی دار پاجاما اور میرون دوپٹا لے کر وہ گیلے بالوں کو ڈرائیر سے سکھا کر باہر آئی تو گھر میں چہل پہل سی تھی۔ سحرش اور ثنا عابدہ چچی کے ساتھ آئی ہوئی تھیں۔ ارم، سونیا اور صائمہ تائی بھی لاؤنج میں تھیں۔

روحیل کی بیوی فاطمہ کے ساتھ والے صوفے پہ دوپہر کے انداز میں بیٹھی تھی۔ ٹیک لگا کر ٹانگ پہ ٹانگ رکھے۔ گلابی قمیص کے ساتھ سفید کیپری۔ بال سیاہ گھنگھریالے مگر بھوری سنہری اسٹریکنگ میں ڈائی کروا رکھے تھے۔

نقوش سے وہ نیپالی کم اور ذرا صاف رنگت کی افریقن امریکن زیادہ لگتی تھی۔ رنگت گندمی، رخسار کی ہڈیاں اونچی، بھنویں بے حد باریک اور چہرے کی جلد عام امریکی لڑکیوں کی طرح فیس ویکسنگ کروانے کے باعث جیسے چھلی ہوئی سی لگتی تھی۔ لبوں پہ ایک ہلکی سی مسکراہٹ ــــ حیا کی سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے وہ اچھی لگی تھی یا بری۔

"سوری! صبح میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی، صبح سے مل نہیں سکی۔" انگریزی میں اس سے معذرت کرتے ہوئے اس نے ایک نظر اماں پہ ڈالی۔ اماں اتنی نارمل کیوں تھیں؟ کیا ابا اور اماں نے اس لڑکی کو قبول کر لیا تھا؟ اتنی آسانی سے؟

"اٹس او کے!" نہ تو انداز میں رکھائی تھی، نہ ہی والہانہ گرمجوشی۔ بس نارمل، سوبر سا انداز۔ حیا ابھی تک کھڑی تھی۔ اس سے بیٹھا ہی نہیں گیا۔ عجیب سے چبھنی تھی۔ سو معذرت کر کے کچن کی طرف چلی آئی۔ کچن اور لاؤنج کے بیچ کی آدھی دیوار کھلی تھی، سوائے دور سے پھپھو کام کرتی دکھائی دے گئی تھیں۔

"تم ٹھیک ہو؟" وہ ایک ڈش کی ڈریسنگ کرتے ہوئے آہٹ پہ پلٹیں۔ وہی جہان والی آنکھیں، وہی نرم مسکراہٹ۔

"جی، سوری میں دوپہر میں ذرا تھکی ہوئی تھی۔"

"نتاشا سے مل لیں؟" پھپھو نے دور لاؤنج کے صوفوں پہ بیٹھی خواتین کی جانب اشارہ کیا۔ وہ چونکی۔

"اس کا نام نتاشا ہے؟" سرگوشی میں پوچھتے وہ بظاہر چیزیں اٹھا اٹھا کر پھپھو کو دے رہی تھی۔

"ہاں کیوں کیا ہوا؟ اوہ ــــ" پھپھو سمجھ گئیں۔ "اگر روسی اس خوب صورت نام سے کچھ غلط مطلب لیتے ہیں تو اس میں اس نام کا کیا قصور؟ قصور تو روسیوں کا ہے نا۔"

"صحیح مگر روحیل اچانک آ گیا، ابا کا ری ایکشن کیا تھا؟" اب وہ ولید کی باتوں کے اثر سے ذرا نکلی تھی تو ان باتوں کا خیال آیا۔

"وہ اسی لیے بتائے بغیر آیا ہے۔ بس بھائی نے تھوڑا بہت جھڑکا اور پھر روحیل نے معافی مانگ لی اور نتاشا نے بھی اسلام قبول کر لیا ہے سو بھائی مان گئے۔"

وہ بے یقینی سے انہیں دیکھے گئی۔

"اتنی آسانی سے یہ سب کیسے ہوا؟ یاد ہے اسی شادی کی وجہ سے ابا کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔"

اوون میں ڈش رکھ کر ڈھکن بند کرتے پھپھو نے گہری سانس لی۔

"تو پھر اور کیا کرتے بھائی؟ اب وہ شادی کر ہی چکا ہے اور نتاشا کو مسلمان کر ہی چکا ہے تو بس بات ختم۔ روحیل ان کا اکلوتا بیٹا ہے۔ پہلوٹھی کی اولاد۔"

اوون کا ٹائم سیٹ کر کے وہ اس کی طرف پلٹیں تو ان کے چہرے پہ ایک تھکان زدہ مگر بے شکوہ مسکراہٹ تھی۔

"وہ ان کا بیٹا ہے حیا! اور بیٹوں کے قصور جلدی معاف کر دیے جاتے ہیں۔ صلیب پہ لٹکانے کو صرف بیٹیاں ہوتی ہیں۔"

کچھ تھا جو اس کے اندر ٹوٹ سا گیا۔ پھپھو اب کاؤنٹر کی طرف چلی آئی تھیں۔ اس نے بہت سے آنسو اندر اتارے اور پھر چہرے پہ ظاہری بشاشت لا کر ان کی طرف پلٹی۔

"آپ یہ سب کیوں کر رہی ہیں؟ اور نور بانو کدھر ہے؟"

"وہ ڈرائنگ روم میں بھائی وغیرہ کو چائے دینے گئی ہے۔ میں نے سوچا، میں کھانے کو آخری دفعہ دیکھ لوں کھانے کا کام عورت کو خود کرنا چاہیے تاکہ اس میں عورت کے ہاتھ کا ذائقہ بھی آئے۔"

"تو نور بانو ہے نا پھپھو!"

"بیٹا! عورت کے ہاتھ کا ذائقہ صرف اس کی فیملی کے لیے ہوتا ہے۔ نور بانو کے بنائے کھانے میں اس کے اپنے بچوں کو ذائقہ آئے گا، مگر اس کے مالکوں کو نہیں۔"

وہ جہان کی ماں تھیں، ان سے کون بحث کرتا؟ وہ واپس لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئی۔ ذہن میں ولید کی باتیں ابھی تک گردش کر رہی تھیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا ہو گا؟ درمیان میں ایک دفعہ ابا اٹھ کر کسی کام سے آئے تو اسے بلا کر پوچھا۔

"الٰہی بخش کہہ رہا تھا، ولید نے تمہارا راستہ روکا ہے؟" ولید کا نام لیتے ہوئے ان کی آنکھوں میں برہمی در آئی تھی۔ ویسے وہ نارمل لگ رہے تھے، جیسے نتاشا سے کوئی مسئلہ نہ ہو۔

"جی! وہ دھمکی دے رہا تھا کہ اگر ــــ اگر ہم نے اس کے خلاف کوئی قدم اٹھایا تو ہم پر ذاتی حملے بھی کر سکتا ہے۔" اٹک اٹک کر اس نے چند فقرے جوڑے۔

"میں اس کو دیکھ لوں گا۔ اب اکیلے باہر مت جانا۔" ابا کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ اب کیا فائدہ؟ کل تو ویسے ہی اسے استنبول چلے جانا تھا۔

کھانے کے بعد ثنا نے اس سے کہا کہ وہ ترکی کی تصاویر دکھائے سب کو۔ وہ لیپ ٹاپ لینے کمرے کی طرف جانے لگی تو ارم ساتھ ہی آ گئی۔ اس کے سر میں درد تھا اور وہ ذرا لیٹنا چاہتی تھی۔

"تم نے دیکھا، عابدہ چچی اور سحرش کیسے پھپھو کے آگے پیچھے پھر رہی تھیں؟" اس کے بیڈ پہ تکیہ درست کر کے لیٹتی ارم بولی تھی۔ سحرش واقعی سارا وقت صرف پھپھو سے بات چیت کرتی رہی تھی۔

"جیسے مجھے ان کی پروا ہے۔" وہ شانے اچکا کر لیپ ٹاپ اٹھائے باہر آ گئی۔

جب وہ لیپ ٹاپ میز پہ رکھے، اپنے ساتھ بیٹھی ثنا کو تصاویر ایک ایک کر کے دکھا رہی تھی تو نتاشا ثنا کے دوسری جانب سنگل صوفے پہ بیٹھی تھی۔ وہ زیادہ وقت خاموش ہی رہی تھی، بس کبھی کسی بات کا جواب دے دیتی، کبھی مسکرا دیتی، اور کبھی امریکیوں کے مخصوص انداز میں نخرے سے شانے اچکا دیتی۔

"ایک منٹ پیچھے کرنا۔" وہ بیوک ادا کی اپنی اور ڈی جے کی تصاویر آگے کرتی جا رہی تھی جب اس نے نتاشا کو سیدھا ہوتے دیکھا۔ وہ بے اختیار رکی، مڑ کر نتاشا کو دیکھا پھر تصویر پیچھے کی۔

وہ ڈی جے تھی۔ ادا کے بازار کا منظر۔ عقب میں جہان کھڑا بگھی بان سے بات کر رہا تھا۔ وہ بگھی کی سواری سے چند منٹ قبل کا فوٹو تھا وہ تصویریں نہیں بنواتا تھا، مگر اتفاق سے اس تصویر میں وہ نظر آ ہی گیا تھا۔

"یہ جہان ہے نا؟" نتاشا جیسے خوش گوار حیرت سے بولی۔ لاؤنج میں بیٹھی تمام خواتین رک کر اسے دیکھنے لگیں۔ وہ ذرا آگے ہو کر بیٹھی، مسکراتے ہوئے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

"تم کیسے جانتی ہو؟" فاطمہ نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"یہ ہمارے پاس آیا تھا ایک دفعہ' نائٹ اسٹے کیا تھا ہماری طرف۔ بہت سوئٹ ہے۔ ہے نا؟" اس نے تائیدی انداز میں حیا کو دیکھا۔ حیا نے ایک نظر باقی سب پہ ڈالی اور پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ کتنا سوئٹ ہے' مجھ سے بڑھ کر کون جانتا ہے۔

"ہاں' اس نے بتایا تھا۔ مجھے خوشی ہے کہ تمہیں یاد رہا۔" پھپھو مسکرائی تھیں۔ روحیل سے وہ ان ٹچ تھیں مگر نتاشا سے نہیں' سو انہیں اچھا لگا تھا۔

"آف کورس آنٹی! اس نے بالخصوص بتایا تھا کہ وہ روحیل کی بہن کا شوہر ہے تو میں کیسے بھول سکتی تھی؟"

سحرش نے عابدہ چچی کو دیکھا اور عابدہ چچی نے صائمہ تائی کو۔ چند متذبذب نگاہوں کے تبادلے ہوئے اور جیسے لمحے بھر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

پہلی بار اس کو نتاشا بہت اچھی لگی۔ ولید کی باتوں سے چھائی کلفت ذرا کم ہو گئی اور وہ انہیں باقی تصاویر دکھانے لگی۔ پھر جب لیپ ٹاپ رکھنے کمرے میں آئی تو ارم اس کے بیڈ پہ بیٹھی اس کے موبائل کو کان سے لگائے دبی دبی عصیلی آواز میں کسی سے بات کر رہی تھی۔

"یہ لڑکی بھی نا!" حیا نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کیا۔ ارم اسے دیکھ کر تیزی سے الوداعی کلمات کہنے لگی۔

"پلیز کال لاگ کلیئر مت کرنا۔ میرے اہم نمبر ضائع ہو جائیں گے۔" اس نے ابھی کال کاٹی ہی تھی کہ حیا نے فون کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔

ارم نے بغیر کسی شرمندگی کے فون اس کو واپس کر دیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

حیا نے کال لاگ چیک کیا۔ اسی نمبر پہ جو اس نے اپنے موبائل کے اندر ایک میسیج میں محفوظ کر رکھا تھا' ارم نے آدھا گھنٹہ بات کی تھی۔ تیس منٹ اور پچاس سیکنڈ چونکہ نمبر فون بک میں محفوظ نہیں تھا' سو ارم کو نمبر ملاتے معلوم نہ ہو سکا کہ یہ نمبر اس فون میں پہلے سے درج ہے۔ وہ تاسف بھری گہری سانس لے کر رہ گئی۔ یہ لڑکی پتا نہیں کیا کر رہی تھی۔

عائشے گل کہتی تھی۔ "اچھی لڑکیاں چھپے دوست نہیں بناتیں۔"

کاش! وہ یہ بات ارم کو سمجھا سکتی۔

وہ واپس لاؤنج میں آئی تو باتوں کا دور ویسے ہی چل رہا تھا۔ پھر صائمہ تائی نے ایک دم اسے مخاطب کیا۔

"جہان کی واپسی کا کیا پروگرام ہے حیا؟" شاید یہ جتانا مقصود تھا کہ اسے جہان کی خبر تک نہیں۔ اس نے بہت ضبط سے گہری سانس لی۔ سبین پھپھو ابھی اٹھ کر کچن تک گئی تھیں۔

"کل میں استنبول جا رہی ہوں نا' تو پھر دیکھتے ہیں کیا پروگرام ڈیسائڈ ہوتا ہے۔"

"تمہاری کب واپسی ہو گی؟" سحرش نے بہت سادگی سے پوچھا۔ اسے لگا' سب مل کر اس کی تحقیر کر رہے ہیں۔

"کچھ کہہ نہیں سکتی۔ جہان کے پروگرام پہ منحصر ہے۔" اس نے بے پروائی سے شانے اچکائے۔ "شاید ہفتہ لگ جائے' پھر ہم ساتھ ہی واپس آئیں گے۔"

اس کے لہجے کی مضبوطی پہ سب نے' حتیٰ کہ فاطمہ نے بھی اسے بے اختیار دیکھا تھا۔ وہ نظر انداز کر کے ثنا کی طرف متوجہ ہو گئی' جو پیالی میں پانی بھر لائی تھی اور اپنے پرس سے سرخ' گلابی اور کاسنی نیل پالش کی شیشیاں نکال کر میز پہ رکھ رہی تھی۔ اسے ماربل نیل پالش لگانی تھی اور وہ جانتی تھی کہ حیا سے بہتر یہ کام کوئی نہیں کر سکتا۔

"لگا کر دے رہی ہوں' مگر وضو کرنے سے پہلے دھو لینا۔" سب ابھی تک اسے دیکھ رہے تھے وہ جیسے بے نیاز سی ہو کر ہر نیل پالش کا ایک ایک قطرہ پانی میں ٹپکانے لگی۔ تینوں رنگ بلبلوں کی صورت پانی کی سطح پہ تیرنے لگے۔ اس کی امیدوں اور دعوؤں جیسے بلبلے۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بہت بڑی بات کہہ گئی ہے۔ جہان ترکی میں نہیں تھا اور وہ اس کے ساتھ واپس نہیں آئے گا' مگر وہ ان کو مزید خود پہ ہنسنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

"اب انگوٹھا ڈالو۔" اس کے کہنے پہ ثنا نے انگوٹھا پانی میں ڈبو کر نکالا' تو ناخن پہ تینوں رنگوں کا ماربل پرنٹ چھپ گیا تھا۔

"واو!" ثنا ستائش سے انگوٹھے کو ہر زاویے سے دیکھنے لگی۔ وہ قدرتی سا ڈیزائن تھا اور بہت خوب صورت تھا۔ قدرت کے ڈیزائن بھی کتنے خوب صورت ہوتے ہیں نا۔ انسان کی ڈیزائننگ سے بھی زیادہ خوب صورت۔

☼ ☼ ☼

رات دیر سے وہ روحیل کے ساتھ تایا ابا کی طرف گئی تھی تاکہ جانے سے قبل ان سے مل لے اور طبیعت بھی پوچھ لے۔ تایا کی پٹی بندھی تھی اور وہ قدرے بہتر لگ رہے تھے۔

"تم بہن بھائیوں کا بھی آنا جانا لگا رہتا ہے۔" انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں کہا تھا۔ وہ بیڈ پہ تکیوں سے ٹیک لگا کر نیم دراز تھے۔ پرسوں اگر اسے لگا تھا کہ وہ پہلے جیسے تایا فرقان بن گئے ہیں تو وہ غلط تھی گو کہ سرد مہری کی دیوار گر چکی تھی اور وہ نارمل انداز میں اس سے بات چیت کر رہے تھے' پھر بھی پہلے والی بات نہ تھی۔ اس نے اپنے حجاب سے ان کے زخم کو مرہم دیا تھا' یہ بات جیسے پرانی ہو گئی تھی۔ فطرت کبھی نہیں بدلتی۔

"اور جہان کا کیا پروگرام ہے؟"

"جہان میرے ساتھ ہی واپس آئے گا۔" تایا کے جواب میں اس نے ذرا اونچی آواز میں کہتے ہوئے قریب بیٹھی صائمہ تائی کو پھر سے سنایا۔ تائی کو جیسے یہ بات پسند نہیں آئی' انہوں نے رخ پھیر لیا۔

واپسی پہ دونوں گھروں کا درمیانی دروازہ عبور کرتے ہوئے روحیل نے پوچھا۔ "صائمہ تائی صبح بتا رہی تھیں کہ جہان تمہیں تمہارے برقعے کی ضد کی وجہ سے چھوڑ کر گیا ہے؟"

حیا نے گہری سانس لیتے ہوئے درمیانی دروازہ لاک کیا اور پھر روحیل کی طرف مڑی۔

"تمہارے ایف ایس سی پری انجینئرنگ میں کتنے مارکس آئے تھے روحیل؟"

"میرے مارکس؟" وہ ذرا حیران ہوا۔ "نو سو اکانوے۔ کیوں؟"

"اور جب تمہارے نو سو اکانوے نمبر آئے تھے تو صائمہ تائی نے کہا تھا کہ اس فیڈرل بورڈ والوں سے پیپرز گم ہو گئے تھے' سو انہوں نے Randomly مارکنگ کرتے ہوئے شیرنی کی طرح نمبر بانٹے ہیں اور اس بات کو خاندان والوں سے سن کر تم نے کہا تھا کہ ــــ ایک منٹ' مجھے تمہارے الفاظ دہرانے دو۔" وہ اس شام میں پہلی دفعہ مسکرائی۔

"تم نے کہا تھا' صائمہ تائی اس دنیا کی سب سے جھوٹی خاتون ہیں۔"

"اوکے' اوکے' سمجھ گیا۔" روحیل ہنستے ہوئے سر جھٹک کر اس کے ساتھ پورچ کی طرف بڑھ گیا۔

چھ ماہ قبل اس نے ایک بھیانک خواب دیکھا تھا۔ اس واہیات ویڈیو کی سی ڈی اس کے گھر پہنچ گئی تھی۔ ارم لاؤنج میں زمین پہ بیٹھی رو رہی تھی اور تایا' ابا' روحیل سب وہاں موجود تھے۔ تب اس نے سوچا تھا کہ روحیل تو امریکہ میں ہے' پھر ادھر کیسے آیا؟ مگر اب روحیل ادھر آ گیا تھا۔ اس بھیانک منظر کے سارے کردار یہاں موجود تھے۔ جب وہ ترکی سے واپس آئے گی تو کیا اس کا استقبال اس خواب جیسا ہو گا؟ اس سے آگے وہ کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

☼ ☼ ☼

استنبول ویسا ہی تھا جیسے وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ تاقسم کے مجسمۂ آزادی کے پتھروں کا رنگ' ٹوپکپس کی مہک' استقلال جدیسی میں چلتے لوگ' سبانجی کی مصنوعی جھیل' ہر شے پہلے جیسی تھی۔ بس ڈی جے نہیں تھی اور جہان نہیں تھا' مگر ان دونوں کا عکس استنبول کے ہر گلی کوچے اور باسفورس کے نیلے جھاگ کے ہر بلبلے میں جھلملا رہا تھا۔ اس شہر نے اس کی زندگی بدل دی تھی اور اب اس بدلی ہوئی پوری زندگی میں وہ اس شہر کو

بھول نہیں سکتی تھی۔
بیوک ادا کی بندرگاہ سے چند کوس دور وہ پتھروں کے ساحل پہ ایک بڑے پتھر پہ بیٹھی ' ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کی انگلی میں پڑے پلاٹینم بینڈ کو گھماتی سمندر کو دیکھ رہی تھی۔ پرسوں جب وہ استنبول آئی تھی 'تب سے اب تک وہ جہان کا ہر نمبر ملا چکی تھی 'مگر سب بند تھے۔ وائس میسج اس نے پھر بھی نہیں چھوڑا تھا۔ کیا کہے ؟ الفاظ ہی ختم ہو جاتے تھے۔
کلیرنس کے تمام معاملات اس کی توقع سے جلدی حل ہو گئے تھے۔ ورنہ اس نے بڑھوا لیا تھا۔
پہلے اسے لگا کہ وہ دیر سے واپس آئی ہے مگر فلسطینی لڑکے اور اسرائیلی ٹالی بھی ابھی گئے نہیں تھے۔ ان کی آج رات کی فلائٹ تھی اور فریڈم فلوٹیلا نے جو دوستی توڑی تھی 'وہ اب تک جڑ نہ پائی تھی۔ صبح ادالار آنے سے قبل اس نے معتصم کو پھر سے عبایا کے لیے شکریہ کہا تھا۔ وہ جواباً" مسکرا کر رہ گیا تھا۔ بالآخر آج شام ان کا ترکی میں یادگار سمسٹر اختتام پذیر ہو جانا تھا۔ خود اس کا کیا پروگرام تھا 'وہ ابھی کچھ فیصلہ نہیں کر پائی تھی۔ جہان لندن میں ہی تھا اور وہ ادھر جا نہیں سکتی تھی اور اس کو لیے بغیر وہ واپس جانا نہیں چاہتی تھی۔ کیا کرے ؟

ایک لہر تیرتی ہوئی اس کے قریب آئی اور پھر واپس پلٹ گئی۔ وہ اپنے خیالوں سے چونکی۔ لہر اس کے قریب ایک چھوٹا سا سیپ ڈال گئی تھی۔
اس نے سیپ چننے عرصہ ہوا ترک کر دیا تھا۔ خالی سیپ کھولنے سے بڑی مایوسی کیا ہو گی بھلا؟ مگر نہ جانے کیوں وہ اٹھی اور ذرا آگے جا کر جھکتے ہوئے وہ سیپ اٹھا لیا۔ دائیں پیر پہ زور پڑنے سے اب بھی تکلیف ہوئی تھی۔
سیپ لے کر وہ واپس بڑے پتھر پہ آبیٹھی اور دونوں ہاتھوں میں اس کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ سفید سرمئی سیپ 'جس پہ بھوری 'گلابی رگیں سی بنی تھیں۔ سیپ گیلا تھا 'اور ریت کے ذرات بھی اس پہ لگے تھے۔ اس نے پرس سے ٹشو نکالا 'سیپ کو اچھی طرح صاف کیا 'یہاں تک کہ ٹھنڈا سخت خول چمکنے لگا اور پھر وہاں سے اٹھ آئی۔ پکنک کے لیے دور دور تک ٹولیوں میں بیٹھے سیاحوں سے اسے چھری ملنے کی توقع تھی مگر ایک خوانچہ فروش سامنے ہی نظر آ گیا۔ اس کے پاس چاقو تھا۔ حیا نے اس سے چاقو لیا اور وہیں اس کی ریڑھی کے ساتھ کھڑے کھڑے سیپ کو کاٹا۔
اس نے طے کر لیا تھا کہ یہ اس کی زندگی کا آخری سیپ ہو گا۔ اس میں سے یا تو سفید موتی نکلے گا یا پھر نہیں نکلے گا۔ مگر ان دونوں ممکنات میں سے جو بھی ہو 'وہ دوبارہ کبھی سیپ نہیں چنے گی۔
اس نے کٹے ہوئے سیپ کے دونوں باہم ملے ٹکڑوں کو آہستہ سے الگ کرتے ہوئے کھولا۔ دھیرے دھیرے دونوں ٹکڑے جدا ہوتے گئے۔
وہ یک ٹک سی کھلے سیپ کو دیکھ رہی تھی۔
تیسرا امکان بھی ہو سکتا تھا 'یہ اس نے نہیں سوچا تھا۔

☼ ☼ ☼

قریباً" آدھ گھنٹے بعد وہ بہارے گل کے سامنے ' حلیمہ آنٹی کے فرشی نشست والے کمرے میں بیٹھی تھی۔
"تم کہاں چلی گئی تھیں حیا! سب مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔" وہ بہت اداسی سے کہہ رہی تھی۔ وہ دونوں آمنے سامنے زمین پہ بیٹھی تھیں۔ بہارے نے سبز فراک کے اوپر گھنگھریالے بھورے بالوں کو ہمیشہ کی طرح ہم رنگ پونی میں باندھ رکھا تھا 'مگر اس کا چہرہ ہمیشہ جیسا نہ تھا۔
"تو تم نے اپنا پاسپورٹ کیوں جلایا ؟" اس نے جب سے حلیمہ آنٹی سے یہ بات سنی تھی 'وہ الجھنے کا شکار ہو گئی تھی۔
"تاکہ وہ نیا پاسپورٹ دینے کے لیے میرے پاس آجائے۔" بہارے نے کہتے ہوئے سر جھکا لیا۔ حیا نے الجھن سے اسے دیکھا۔ بہارے بہت سمجھ دار بہت ذہین بچی تھی 'مگر اس طرح کی بات کی امید اس

نے بہارے سے نہیں کی تھی۔
"تمہیں کیوں لگا کہ اس طرح وہ واپس آئے گا۔" وہ اس کے جھکے سر کو غور سے دیکھتے ہوئے بولی۔
بہارے خاموش رہی۔
"بہارے گل! تمہیں کس نے کہا کہ ایسا کرنے سے وہ واپس آجائے گا۔" اب کے اس نے سر اٹھایا اس کی بھوری سبز آنکھوں میں بے پناہ اداسی تھی۔
"سفیر نے کہا تھا کہ ایسا کرو گی تو وہ آجائے گا۔"
"اچھا!" وہ اب کچھ کچھ سمجھنے لگی تھی۔ "تو سفیر بے کیوں چاہتے ہیں کہ وہ ادھر آجائے جب کہ ادھر آنا اس کے لیے ٹھیک نہیں ہے ؟" بہارے ٹکر ٹکر اس کا چہرہ دیکھنے لگی۔ حیا نے افسوس سے نفی میں سر ہلایا۔
"یہ سفیر کوئی گڑبڑ کر رہا ہے۔"
"کیا تمہیں پتا ہے عبدالرحمٰن کدھر ہے اور ___" وہ ہچکچائی "کیا تمہیں پتا ہے وہ تمہارا۔"
"ہاں مجھے سب پتا ہے اور اب اس بات کا ذکر مت کرو۔" اس نے جلدی سے بہارے کو خاموش کرایا۔ دروازہ کھلا تھا۔ حلیمہ آنٹی کچن تک ہی گئی تھیں۔
"تم نے کہا تھا ہم مل کر اسے ڈھونڈیں گے۔" بہارے نے بے چینی سے کچھ یاد دلایا۔
"وہ ترکی میں نہیں ہے اور ہم اسے نہیں ڈھونڈ سکتے۔ میرے ابا نے اجازت ___" باہر آہٹ ہوئی تو وہ جلدی سے خاموش ہو گئی۔ حلیمہ آنٹی دوائی کی شیشی پکڑے اندر آ رہی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح دوپٹا اوڑھے ' مسکراتا حلیم چہرہ۔ ان کو یقیناً" خود بھی نہیں پتا تھا کہ ان کا بیٹا کیا کرتا پھر رہا ہے۔ کچھ تو تھا جو غلط تھا۔
"مجھے نہیں کھانی دوائی۔" بہارے نے برا سا منہ بنایا تو وہ گہری سانس بھر کر رہ گئیں۔
"اس کو کل سے بخار ہے ' پلیز اس کو سیرپ پلا دو حیا! میں تب تک کچن دیکھ لوں۔" انہوں نے سیرپ اس کی طرف بڑھایا تو اس نے فوراً" پکڑ لیا۔
"میں پلا دیتی ہوں۔"
"تھینک یو بیٹا۔ میں تب تک کھانا نکالتی ہوں۔ تم کھانا کھائے بغیر نہیں جاؤ گی۔" مسکرا کر کہتی 'وہ باہر نکل گئیں۔ حیا نے گردن ذرا اونچی کر کے دروازے کی طرف دیکھا۔ جب وہ اوجھل ہو گئیں تو وہ بہارے کی طرف مڑی۔
"کیا تم نے انہیں بتایا کہ یہ سب کرنے کو تمہیں سفیر نے کہا تھا ؟" ساتھ ہی اس نے چمچ میں بوتل سے جامنی سیرپ بھرا۔ بہارے نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے منہ کھولا۔ اس نے چمچ اس کے منہ میں رکھا۔
"اللہ اللہ! میرا منہ کڑوا ہو گیا۔" سیرپ پینے کے بعد وہ چہرے کے زاویے بگاڑے شکایت کرنے لگی تھی۔
"اللہ تمہیں سمجھے 'اللہ تمہیں سمجھے!" وہ جلدی جلدی پانی کا گلاس پیتی برا سا منہ بنائے کہہ رہی تھی۔ پانی پی کر بھی اس کی کڑواہٹ ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ جیسے اپنی اصل اداسی کا چڑچڑا پن اس سیرپ پہ نکال رہی تھی۔
"اتنا بھی کڑوا نہیں تھا۔ ٹھہرو میرے پاس کینڈی یا چاکلیٹ ہو گی۔" اس نے قالین پہ رکھا اپنا پرس کھولا اور اندر ہاتھ سے ٹٹولا۔ صبح پرس میں چیزیں ڈالتے ہوئے اس نے دیکھا تھا کہ اندر کینڈی رکھی تھی۔ ایک گلابی ریپر والی کینڈی اور ایک خالی ریپر۔ اس نے دونوں چیزیں باہر نکالیں اور کینڈی بہارے کو دی۔
"شکریہ!" بہارے نے جلدی سے کینڈی کھول کر منہ میں رکھ لی۔ حیا نے خالی ریپر کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اسے اس ریپر کے ساتھ ڈاکٹر ابراہیم کی باتیں بھی یاد آئی تھیں۔ احزاب کی پہیلی ___
"بہارے! تمہیں یاد ہے 'عائشے نے کہا تھا کہ حجاب لینا احزاب کی جنگ جیسا ہوتا ہے۔" ساری کڑواہٹ بھلائے 'کینڈی چوستی بہارے نے سر اثبات میں ہلایا۔
"پتا ہے 'مجھے کسی نے کہا کہ اس میں کچھ مسنگ ہے۔ کیا عائشے کچھ بتانا بھول گئی تھی ؟" بہارے کے ہلتے لب رکے ' آنکھوں میں خوشگوار سی حیرت ابھری۔
"ہاں ' مجھے پتا ہے۔ عائشے نے آخر میں بتایا ہی

نہیں تھا کہ..." وہ کینڈی والے منہ کے ساتھ جوش سے بولتی بولتی ایک دم رکی۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی سی اتر آئی تھی۔ "تمہیں بگلوں نے بتایا کیا؟"

"بگلے!" حیا نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"ہاں' ہاں۔" بہارے جوش سے سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ "جب سمندر کنارے عائشے یہ سب بتا رہی تھی تو میں نے دل ہی دل میں بگلوں کو بتائی تھی یہ بات۔ مرمرا کے بگلے اور سلطان احمت مسجد کے کبوتر دل کی بات سن لیتے ہیں... مگر تم عائشے کو نہ بتانا کہ میں نے یہ کہا ہے' وہ آگے سے کہتی ہے' دل کی بات اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں سُن سکتا۔" حیا بے اختیار ہنس پڑی۔

"وہ ٹھیک کہتی ہے۔ مجھے یہ بات میرے ٹیچر نے کہی تھی۔ بگلے اور کبوتر کیسے کسی کے دل کی بات سُن سکتے ہیں بہارے!"

بہارے کو جیسے اس کا یوں کہنا بہت برا لگا تھا۔

"کیوں' کیوں وہ ماہ سن کے دل کی بات تو سنتے تھے نا' اسی لیے وہ کبوتر بن گئی تھی۔ تو میرے دل کی بات کیوں نہیں سُن سکتے۔"

"ماہ سن کون؟" وہ ذرا سا چونکی۔ اسے لگا اس نے یہ بات پہلے بھی کہیں سنی تھی۔ ماہ سن جو کبوتر بن گئی تھی۔

"کیا تم نے ماہ سن کا واقعہ نہیں سن رکھا؟" بہارے کو اس کی لاعلمی نے حیران کیا۔

"نہیں... تم سناؤ۔"

"اوکے!" بہارے نے کڑچ کڑچ کی آواز کے ساتھ جلدی جلدی کینڈی چبائی اور کسی ماہر داستان گو کی طرح سُنانے لگی۔

"ایک دفعہ کا ذکر ہے کپادوکیہ میں ایک نواب کی بیٹی رہتی تھی' اس کا نام ماہ سن تھا۔ ایک دن ماہ سن نے دیکھا کہ اس کے قلعے کے باہر ایک لڑکا کچھ چیزیں بیچ رہا ہے۔ اس کے پاس کڑھائی کیے ہوئے رومال' قالین اور..."

"ایک منٹ! اتنی لمبی کہانی میں نہیں سُن سکتی۔ صرف ہائی لائٹس بتاؤ!" اس نے دونوں ہاتھ اٹھا کر بہارے کو روکا۔ وہ جو بہت شوق سے سنا رہی تھی' خفا سی ہو گئی۔

"بس اسے وہ لڑکا پسند آگیا مگر نواب نے ان دونوں کو علیحدہ کر دیا۔ اس نے ماہ سن کو قلعے میں بند کر دیا۔ وہاں کھڑکی پہ روز کبوتر آکر بیٹھ جاتے تھے۔ انہوں نے ماہ سن کے دل کی بات سُن لی۔ ایک دن وہ بھی کبوتر بن گئی اور صبح وہ کبوتر بن کر اڑ جاتی اور شام میں واپس آکر پھر سے لڑکی بن جاتی۔ نواب کو پتا چل گیا تو اس نے زہریلے دانے رکھ دیے' ماہ سن نے وہ کھا لیے اور وہ مر گئی اور پھر اس کا باپ بھی پتا نہیں کیسے مر گیا۔"

آخری بات بہارے نے بہت ناراضی کے عالم میں ہاتھ جھلا کر کہی تھی مگر حیا سُن نہیں رہی تھی۔ وہ ہاتھ میں پکڑے ریپر کو دیکھ رہی تھی۔

جس رات جہان گیا تھا اس سے قبل آخری دفعہ وہ اس سے اٹالین ریسٹورنٹ میں ٹھیک سے بات کر پائی تھی اور جب اس نے جہان سے واپسی کا پوچھا تھا تو اس نے کہا تھا۔

"میرا دل چاہتا ہے میں ماہ سن کی طرح کبوتر بن کر کسی غار میں چھپ جاؤں۔"

اس نے شکن زدہ ریپر پہ انگلی پھیری۔ اس پہ بنے غار کو دیکھ کر اسے بہت کچھ یاد آیا تھا۔ اس نے آہستہ سے سر اٹھایا۔

"کپادوکیہ۔" بہارے الجھ کر اسے دیکھ رہی تھی۔

"مجھے کپادوکیہ جانا ہے۔ وہ کپادوکیہ میں ہے۔ مجھے اسے ڈھونڈنا ہے۔" اس نے پرس سے موبائل نکالا اور تیزی سے فلائٹ انکوائری ڈائل کرنے لگی۔

"کیا وہ کپادوکیہ میں ہے؟ کیا تم اب ادھر جاؤ گی؟" بہارے بہت پُرجوش ہو چکی تھی۔ حیا ایک دم ٹھہری گئی۔ اسے اپنی ایکسائٹمنٹ میں بہارے کے سامنے کپادوکیہ کا ذکر نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اگر بہارے نے کسی کو بتا دیا تو... اف' اسے تو راز رکھنا بھی نہیں آیا تھا۔ اس نے خود کو کوسا اور فون بند کر دیا۔

"کیا میں بھی تمہارے ساتھ کپادوکیہ جا سکتی ہوں؟"

بہارے نے اس کے گھٹنے کو ہلا کر پوچھا۔

"شش!" اس نے ہونٹوں پہ انگلی رکھی پھر کھلے دروازے کو دیکھا۔ اب وہ یوٹرن نہیں لے سکتی تھی۔ وہ بہارے کو بتانے کی غلطی کر چکی تھی۔

"پلیز مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ پلیز حیا!" بہارے اب دبی آواز میں منت کرنے لگی تھی۔ ایسا کرتے ہوئے اس نے اپنی آنکھوں میں زمانے بھر کی اداسی و بے بسی سمو لی تھی۔ "پلیز میں وعدہ کرتی ہوں میں اچھی لڑکی بن کر رہوں گی۔ تمہیں تنگ بھی نہیں کروں گی۔"

"میں تمہیں کیسے لے جا سکتی ہوں؟" حیا نے بے چینی و تذبذب سے دوبارہ کھلے دروازے کو دیکھا۔ حلیمہ آنٹی کسی بھی وقت آسکتی تھیں۔

"پلیز حیا... پلیز!" بہارے کی اداس آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

اس کا دل پسیجنے لگا۔ کیا بہارے کو ساتھ لے جانا اتنا مشکل تھا؟ اور اگر وہ اسے یہیں چھوڑ گئی اور اس نے سفیر یا کسی اور کے سامنے کپادوکیہ کا ذکر کر دیا تو...؟ جو بات جہان نے صرف اسے بتائی تھی' اس کی ہر جگہ تشہیر ہو' اس سے بہتر تھا کہ وہ اس لڑکی کو اپنے ساتھ لے جائے۔ کیا وہ درست نہج پہ سوچ رہی تھی؟

"حیا... بہارے! کھانا کھا لو۔"

حلیمہ آنٹی کھانے کے لیے آوازیں دینے لگیں تو بہارے نے جلدی جلدی گیلی آنکھیں رگڑ ڈالیں۔ حیا کچھ کہے بنا اٹھ کھڑی۔

کھانے میں پلاؤ کے ساتھ مچھلی بنی تھی۔ وہ ذرا بے توجہی سے کھاتی بہارے کے بارے میں سوچے جا رہی تھی۔ سفیر اس بچی کو اسی گھر میں روک کے رکھنا چاہتا تھا' ایسا کر کے کہیں وہ جہان کو بلیک میل تو نہیں کر رہا تھا؟ اگر بہارے کسی مصیبت میں ہوئی تو جہان کو واپس آنا پڑے گا۔ وہ بہارے کے لیے ضرور آئے گا۔ اس کو جیسے جھرجھری سی آئی۔

"عثمان انکل اور سفیر کہاں ہیں آنٹی؟" اس نے بظاہر سرسری سے انداز میں پوچھا۔

"ہوٹل پہ ہیں دونوں۔ عثمان شاید آنے والے ہوں' مگر سفیر ذرا لیٹ آتا ہے۔" آنٹی نے مسکرا کر بتایا تو حیا نے سر ہلا دیا۔ سفیر اب گھر پہ نہیں تھا' ایسے میں وہ بہارے کو لے کر وہاں سے جا سکتی تھی۔ یہی ٹھیک تھا۔ بھلے کوئی اسے جلدی میں فیصلے کرنے والی کہے' مگر وہ ایسی ہی تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ بہارے کو ساتھ لے جائے گی۔

"حلیمہ آنٹی! میں چند دن کے لیے ازمیر جا رہی ہوں۔ کیا بہارے میرے ساتھ چل سکتی ہے؟"

بہارے نے تیزی سے گردن اٹھائی۔ اس کے چہرے پہ چمک در آئی تھی۔

"بہارے؟ پتا نہیں' عائشے یا اس کی دادی سے پوچھ لو' اگر ان کو کوئی اعتراض نہ ہو تو۔"

حلیمہ آنٹی نے جیسے راضی برضا انداز میں شانے اچکائے۔ انہیں لگا تھا کہ بہارے اس بات سے خوش ہے' سو انہوں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔

عائشے کا نمبر بہارے سے لے کر اس سے اجازت لینا رسمی کارروائی تھی۔ حلیمہ آنٹی نے بتایا تھا کہ بہارے کا پاسپورٹ عبدالرحمن ایک ہفتے تک بھجوا دے گا۔ وہ کدھر تھا' وہ بھی نہیں جانتی تھیں' سو اس ایک ہفتے تک بہارے اس کے ساتھ اگر رہ لیتی ہے تو کسی کو اس بات سے کوئی مسئلہ نہ تھا۔

بہارے نے جلدی جلدی اپنا چھوٹا سا بیگ تیار کر لیا اور پھر اپنا گلابی پرس کندھے سے لٹکائے' بالکل تیار ہو کر خوشی خوشی اس کے ساتھ آن کھڑی ہوئی۔ چند منٹ پہلے کی لٹکی ہوئی صورت کا اب شائبہ تک نہ تھا۔ چھوٹی سی اداکارہ۔

حلیمہ آنٹی سے رخصت ہو کر وہ پہلی فیری لے کر استنبول واپس آئی تھیں۔ اپنے ڈورم میں آکر اس نے ایک چھوٹے بیگ میں بہارے کا سامان ڈالا اور پھر اپنے چند کپڑے اور ضروری چیزیں رکھیں۔ کم سے کم سامان بہتر تھا۔

بہارے کا نیکلس وہ گزشتہ روز خرید چکی تھی' مگر اس نے ابھی دینا مناسب نہ سمجھا۔ اسے کسی خاص

موقع کے لیے سنبھال کر وہ ابھی صرف اور صرف جہان کے بارے میں سوچنا چاہتی تھی۔

"حیا! ہم اسے وہاں کیسے ڈھونڈیں گے؟" اوپر اس کے بنک پہ بیٹھی اسے پیکنگ کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔

"میں ذرا کچھ فرینڈز سے مل کر آتی ہوں، وہ آج جا رہے ہیں۔" وہ باہر چلی آئی اور کمرا مقفل کر دیا۔

معتصم، حسین اور مومن گورسل اسٹاپ پہ کھڑے تھے۔ ٹالی بھی ان سے ذرا فاصلے پہ کھڑی تھی۔ سب کے بیگز ان کے پاس تھے۔ لطیف، چیری، سارہ، یہ لوگ کب کے جا چکے تھے۔

"کی حال ہے حیا؟" معتصم نے پکارا۔

"حالی بخیر، کیا تم لوگ ابھی نکل رہے ہو؟" فلسطینیوں کے قریب پہنچ کر اس نے ان کو مخاطب کیا تو آواز میں نامعلوم سی اداسی در آئی۔

"ہوں۔" حسین نے ڈھیلے ڈھیلے انداز میں سر ہلا دیا۔ زندگی میں ہر چیز کا ایک اختتام ہوتا ہے اور اب جبکہ اس "سفر" کا اختتام پہنچ رہا تھا۔ ایک عجیب سی کسک دل میں اٹھ رہی تھی۔

"کاش! یہ سفر کبھی ختم نہ ہوتا کاش! ہم سب ہمیشہ ادھر رہتے۔"

"اور ایک ساتھ پڑھتے رہتے۔" وہ بہت سی نمی اندر اتارتے ہوئے بولی۔ مغرب کے وقت کی اداسی ہر سو چھائی تھی۔ بس اسٹاپ اور سبانجی کا سبزہ زار ویران سا لگ رہا تھا۔

"اگر ایسا ہوتا تو اس جگہ کا چارم ہی ختم ہو جاتا۔ اس لیے یہی بہتر ہے کہ زندگی کے اس فیز کا اختتام ہو جائے، تاکہ ہم ساری عمر اسے یاد رکھیں۔" معتصم ٹھیک کہہ رہا تھا۔

"میں تم لوگوں کو یاد رکھوں گی۔ تم سب بہت اچھے ہو۔"

"تھینکس... اور ہاں! کیا تمہیں اپنے پزل باکس سے کوئی کار آمد چیز ملی یا وہ سب مذاق تھا؟" معتصم کو اچانک یاد آیا۔

"ہاں! بہت اچھی چیز ملی مجھے اس سے۔ ایک ایسی چیز جو میں نے پا کر کھو دی، مگر اسے دوبارہ ڈھونڈنے کی کوشش کروں گی۔ خیر! اپنا خیال رکھنا۔"

اللہ حافظ کہہ کر ان کے پاس سے ہٹ کر وہ ٹالی کی طرف آئی۔۔۔ بےچاری ٹالی۔ کتنی بے ضرری سی، ذرا سا چھیڑ ہی دیتی تھی اور وہ خوامخواہ اتنی ٹینشن لے لیتی۔ اہل مکہ تو اہل مکہ ہوتے ہیں۔ ان سے کیا شکوہ، اصل دکھ تو بنو قریظہ دیتے ہیں۔ ہم سارا وقت ترکی، اٹلی اور فرانس کی حکومتوں کو حجاب پہ پابندی لگانے کے باعث برا بھلا کہتے رہتے ہیں۔ اگر اس سے آدھی توجہ اپنے خاندان کے "بروں" کی طرف کر لیں تو کیا ہی اچھا ہو۔

اس کے پکارنے پہ ٹالی، جو رخ پھیرے کھڑی تھی، چونک کر مڑی، پھر اسے دیکھ کر مسکرا دی۔

"او حیا! آج تمہارے بال کس رنگ کے ہیں؟"

"ہمیشہ کی طرح خوب صورت ہیں۔ رنگ جو بھی ہو۔" وہ بہت خوشگوار اور پر اعتماد انداز میں جواب دیتی اس سے گلے ملی۔

"میں تمہیں مس کروں گی۔"

"میں بھی۔" وہ پھر وہاں اس وقت تک کھڑی رہی جب تک کہ وہ لوگ گورسل میں سوار نہ ہو گئے۔

جب بس کیمپس کی حدود سے دور چلی گئی تو وہ واپس ڈورم میں آئی۔ بہارے منہ بسورے بیٹھی تھی۔

"حیا! ہم عبدالرحمٰن کو کپادوکیہ میں کیسے ڈھونڈیں گے؟"

"میں ذرا فلائٹ بک کروا لوں۔" اس نے ان سنی کرتے ہوئے وہیں کمرے میں ٹہلتے ہوئے موبائل پہ نمبر ملایا۔ اتاترک ایئرپورٹ سے ان کو قیصری کے ایئرپورٹ "قیصری ہوالانی" کی صبح کی فلائٹ ملی تھی۔

"ہوالانی۔۔۔ تم لوگ ایئرپورٹ کو ہوالانی کہتے ہو اور ہم "ہوائی اڈہ۔" اردو کے الفاظ ترک سے بھی نکلے ہیں اس لیے۔" فون بند کرتے ہوئے وہ جیسے محظوظ ہو کر بولی۔ بہارے بہت غور سے اس کی بات سن رہی تھی۔

"لیکن اگر ڈی جے ہوتی تو کہتی۔ ترک اردو سے نکلی ہو گی، مگر ہماری اردو اور بیجنل ہے بالکل۔" وہ چہرے سے ہنسی اور سر جھٹکا۔ وہ "میڈ ان پاکستان" پہ کوئی کمپرومائز نہیں کرتی تھی۔" اس کا لہجہ کہیں کھو سا گیا۔

"ڈی جے۔۔۔ وہ ہی جو مر گئی تھی نا؟" بہارے نے بہت سمجھ داری سے پوچھا۔ وہ اپنا سوال بھول چکی تھی۔

"ہوں! اور اب وہ کبھی واپس نہیں آ سکتی۔ بعض لوگ اتنی دور چلے جاتے ہیں کہ ان سے دوبارہ ملنے کے لیے مرنا ضروری ہوتا ہے۔" اس کے چہرے پہ تاریک سائے آن ٹھہرے۔ وہ کھڑکی کے پاس آئی اور سلائیڈ کھولی۔ باہر تاریکی میں ڈوبتے، سبانجی کے وسیع و عریض میدان نظر آ رہے تھے۔

"تمہیں پتا ہے، وہ روز صبح اس جگہ کھڑے ہو کر کیا کہتی تھی؟"

"کیا؟"

"وہ کہتی تھی، گڈ مار۔۔۔" الفاظ لبوں پہ دم توڑ گئے۔ جب پچھلی دفعہ وہ پاکستان سے آئی تھی تب بھی ڈی جے کا مقولہ دہرانے سے قبل الفاظ اسی طرح دم توڑ گئے تھے۔ مگر تب وجہ شدت غم تھی اور آج۔۔۔ آج وجہ سامنے کھڑی تھی۔ بلکہ کھڑا تھا۔

"سفیر! سفیر عثمان!" اس نے جلدی سے سلائیڈ بند کی اور پردہ برابر کیا۔ بہارے اسپرنگ کی طرح اچھل کر بنک سے نیچے اتری۔

"یہ یہاں کیوں آیا ہے؟" حیا بے یقینی سے دہراتی پردے کی درز سے باہر دیکھنے لگی۔ بہارے بھی اس کے ساتھ آ کر ایڑیاں اونچی کر کے کھڑکی سے جھانکنے لگی۔ دور سبزہ زار پہ سفیر کھڑا ایک اسٹوڈنٹ کو روک کر جیسے کچھ پوچھ رہا تھا۔ وہ اسٹوڈنٹ جواباً نفی میں سر ہلا رہا تھا۔

"یہ ہمارے بارے میں پوچھ رہا ہے۔" خطرے کی گھنٹی کہیں بجتی سنائی دے رہی تھی۔ بہارے نے پریشانی سے اسے دیکھا۔

"کیا وہ مجھے لے جائے گا؟"

"نہیں! تم میرے ساتھ رہو گی۔ میں کچھ کرتی ہوں۔" اس نے موبائل اٹھایا اور جلدی سے ہالے کا نمبر ملایا۔ ہر مشکل وقت پہ ہالے ہی کام آتی تھی۔

"سفیر برا نہیں ہے۔ وہ میرا اور عائشے کا بہت خیال رکھا کرتا تھا۔ وہ بالکل ہمارے بھائی جیسا ہے۔"

"بھائی صرف وہی ہوتا ہے، جسے اللہ نے آپ کا بھائی بنایا ہو بہارے اور جسے اللہ آپ کا بھائی نہ بنائے، وہ کبھی بھائی نہیں ہو سکتا۔ بس! تم اور عائشے۔۔۔۔ تم لوگ بہت سادہ ہو۔" نمبر ملا کر اس نے فون کان سے لگایا۔

ہالے لائبریری میں تھی۔ اس کے کہنے کے مطابق وہ فوراً باہر آئی اور سیدھی سفیر کی طرف گئی۔ وہ اسے پہچان گیا تھا۔ ہوٹل گرینڈ پہ وہ اس سے مل چکا تھا۔ سفیر نے اس سے پاکستانی ایکسچینج اسٹوڈنٹ کا پوچھا تو ہالے نے بتایا کہ وہ تو دوپہر کی ٹرین سے ازمیر چلی گئی تھی۔ کس اسٹیشن سے، یہ ہالے نہیں جانتی تھی، مگر سفیر نے اسے اپنا نمبر دے دیا کہ اگر اسے حیا کے بارے میں کچھ معلوم ہو جائے تو اسے ضرور آگاہ کرے۔ ہالے نے اس کی پوری تسلی و تشفی کروا کر فون نمبر رکھ لیا۔

"اور وہ ایک چھوٹی بچی کا بھی پوچھ رہا تھا، جو غالباً یہ ہی ہے۔ ڈونٹ ٹیل می حیا! کہ تم نے اسے اغوا کیا ہے۔" سفیر کے جانے کی تسلی کر لینے کے بعد اب ہالے ان کے ڈورم میں بیٹھی خوش ہوتے ہوئے اپنی کارگزاری بتا رہی تھی۔

"میں اناطولیہ کی بہارے گل ہوں۔ مجھے کوئی اغوا نہیں کر سکتا۔" بہارے باقاعدہ برا مان گئی۔

"پھر ہالے! کل صبح تمہارا خوش قسمت دن ہو گا یا بد قسمت دن؟" اس نے بہارے کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی پیکنگ سمیٹتے ہوئے پوچھا۔ صبح وہ گورسل کی بجائے ہالے کی کار میں ایئرپورٹ جانا چاہتی تھی۔ کوئی خبر نہیں، سفیر صبح پھر واپس آ جائے۔

"خوش قسمت دن۔" ہالے نے ہمیشہ کی طرح

پر خلوص انداز میں بتایا۔ ترک اور ان کی مہمان نوازی۔ وہ واپس جا کر ان سب کو بہت مس کرے گی، وہ جانتی تھی۔

صبح منہ اندھیرے ہالے انہیں لینے آ گئی۔ اس نے احتیاطاً" ہالے کو بتایا تھا کہ وہ انقرہ جا رہے ہیں اور یہ کہ وہ لڑکا بہارے کا ہمسایہ ہے اور اسے اس سے کچھ تحفظات ہیں۔ جب ہالے چلی گئی تو اس نے کپادوکیہ کے لیے دو ٹکٹس خرید لیے۔

"حیا!" بہارے نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے اس کے عبایا کی آستین ذرا کھینچ کر اسے متوجہ کرنا چاہا۔

"ہم اسے کپادوکیہ میں کیسے ڈھونڈیں گے؟" کل سے وہ کوئی تیسری دفعہ یہ سوال دہرا رہی تھی۔

"تیز چلو بہارے! ہمیں جلدی پہنچنا ہے۔"

"حیا! ٹیل می ناؤ۔" بہارے کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔ وہ ایک دم زور سے چیخی۔ حیا نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ بہت غصے اور خفگی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اطراف میں لوگ بھی مڑ مڑ کر دیکھنے لگے۔

"سوری، سوری!" وہ ہاتھ اٹھا کر ان ٹھٹک کر دیکھتے لوگوں سے معذرت کرتی واپس بہارے کے پاس آئی۔ اس کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھی اور گہرا سانس لے کر اس کو دیکھا۔

"تم نے کبھی سمندر سے مچھلیاں پکڑی ہیں؟" بہارے کی آنکھوں میں الجھن در آئی، مگر اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"جب اتنے بڑے سمندر سے مچھلی پکڑنی ہو تو کیا کرتے ہیں بہارے! فش راڈ کی کنڈی پہ چھوٹی مچھلی لگاتے ہیں اور راڈ پانی میں ڈال کر کنارے پر بیٹھ کر انتظار کرتے ہیں۔ بڑی مچھلی خود بخود تیر کر ہمارے پاس آجاتی ہے۔۔۔ ہے نا؟"

"ہم کپادوکیہ مچھلیاں پکڑنے جا رہے ہیں حیا؟" بہارے کو بے پناہ حیرت ہوئی۔

"نہیں، میری بہن!" اس نے گہری سانس لی۔ کیسے سمجھائے؟ وہیں بیٹھے بیٹھے پرس کھول کر اس نے وہ ڈبی نکالی، جسے وہ سباجی کے ڈورم میں رکھ کر بھول گئی تھی۔

"اس ڈبی میں ایک ٹریسر ہے جو عبدالرحمٰن کا ہے۔ اس ٹریسر کا ریسیور اس کے پاس ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ جب میں اس کے قریب ہوتی ہوں چند میل کے فاصلے پہ۔۔۔ تو اس کو اپنے ریسیور پہ پیغام مل جاتا ہے کہ میں اس شہر میں ہوں۔"

"کیا ہمیں بھی پتا چل جائے گا کہ وہ کدھر ہے؟"

"نہیں بہارے! ہمیں اس کو نہیں ڈھونڈنا۔ اسے ہمیں ڈھونڈنا ہے۔ جیسے ہی اسے پتا چلے گا کہ میں اس کے قریب ہوں، وہ فوراً" مجھے کال کرے گا اور میں پہلی دفعہ میجر احمد کی کال کا انتظار کروں گی۔" اس نے آخری فقرہ دل میں کہا تھا اور کھڑی ہو گئی۔

بہارے نے نیم فہمی سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کا ہاتھ پھر سے پکڑ لیا۔ وہ شاید ٹھیک سے سمجھ نہیں پائی تھی۔

☼ ☼ ☼

آج سے لاکھوں برس قبل اناطولیہ کے پہاڑوں بشمول حسن داغ اور ارجیئس داغ (داغ ترک میں پہاڑ کو کہتے ہیں) کا لاوا پھٹا تھا اور یوں سیال مادہ ان پہاڑوں کی چوٹیوں سے بہتا اردگرد کے میدانوں میں دور دور تک پھیلتا گیا۔ کئی صدیاں اس لاوے کو سوکھنے میں لگیں اور قریباً" تیس لاکھ برس قبل یہ لاوا مکمل طور پہ خشک تو ہو گیا، مگر بارش اور کٹاؤ کے بعد یہ اپنے پیچھے زمین کے چہرے پہ ایک عجیب و غریب علاقہ چھوڑ گیا۔ چاند کی سرزمین سے مشابہت رکھنے والے میدان اور وادیاں، جہاں حیرت انگیز نقش و نگار بنے رہ گئے۔ جیسے ہاتھ سے کسی ماہر مصور نے بنائے ہوں۔

کپادوکیہ۔۔۔ خوب صورت گھوڑوں کی سرزمین۔

کپادوکیہ کا پہلا نام کس نے رکھا، اس بارے میں کئی روایات ہیں، البتہ اس کا موجودہ نام "کپادوکیہ" کے بارے میں عام رائے یہ ہی ہے کہ یہ فارسی کے "کت پتوکہ" سے نکلا ہے یعنی .... (خوب صورت گھوڑوں) کی سرزمین۔

خشکی اور سبزے کا امتزاج لیے علاقے کی مٹی اس ... سطح خاصی نرم ہے، جس کے باعث گئے ... کی عیسائی تہذیبوں نے یہاں پہاڑوں کے اندر ... بڑے بڑے گھر اور چرچ بنا لیے تھے۔ ان کی ... یوں ہوتیں کہ دور سے لگتا، جیسے کسی پہاڑی ... بہت سی آنکھیں ہوں۔ زمین کے اندر بنے ... زیر زمین شہر آج بھی یہاں موجود تھے۔

صدیوں پرانا غاروں سے بنا ہوا خوب صورت کپادوکیہ۔

... کے کبوتروں کی سرزمین۔

☼ ☼ ☼

کپادوکیہ، ترکی کے صوبے "نوشہر" میں واقع تھا۔ ... میں چھوٹے چھوٹے شہر تھے۔ جیسے عرگپ، ... وغیرہ۔ جہاں گھر، عبادت گاہیں، ہوٹل، سب ... کی صورت بنے تھے۔ عرگپ سے گھنٹہ بھر کی ... پہ قیصری کا ایرپورٹ "قیصری ہوالانی" تھا جہاں ... کا جہاز اس صبح اترا تھا۔

"ہم کہاں رہیں گے حیا؟" بہارے اس کا ہاتھ ... ایرپورٹ کے لاؤنج میں اس کے ہمراہ چلتی بار ... پوچھ رہی تھی۔

"کسی ہوٹل میں رہیں گے نا، پہلے کچھ کھا لیتے ہیں۔"

"اور اگر عبدالرحمٰن نے فون ہی بند رکھا ہوا ہو؟" اس نقطے پہ پہنچ کر اس کا اپنا دل ڈوب کر ابھرا۔ یہ وہ آخری بات تھی جو وہ سوچنا نہیں چاہتی تھی۔

"اس کے سارے نمبر بند ہیں۔ مگر اس نے کوئی ... نمبر آن کر رکھا ہو گا اور یقیناً" جی پی ایس ریسیور ... آن ہو گا۔ وہ ضرور کال کرے گا۔" اس نے ... سے زیادہ خود کو تسلی دی۔ ابا اور پھپھو کو بھی بتا ... تھا کہ وہ اپنی دوست کے ساتھ کپادوکیہ جا رہی ہے۔ ... اس نے پھپھو سے رابطہ کیا تو جان لے گا ورنہ۔۔۔ ... نہیں۔

وہ دونوں ایرپورٹ کے کیفے ٹیریا میں آئیں اور ایک میز کے قریب اپنا سامان رکھ کر کرسیاں کھینچیں۔ آس پاس کم ہی لوگ تھے۔ کاؤنٹر ساتھ ہی تھا اور ــــ استقبالیہ پر موجود لڑکے کے ساتھ دو، تین نوجوان لڑکے کھڑے ہنستے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ ترکی میں لڑکیوں کا تنہا سفر کرنا بہت عام سی بات تھی مگر لڑکے تو لڑکے ہوتے ہیں۔ چند ہی لمحے گزرے کہ وہ ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔ مسکراتے ہوئے، مڑ مڑ کر دیکھتے ہوئے۔ اگر اسے جہان کو نہ ڈھونڈنا ہوتا تو وہ کبھی ادھر نہ آتی۔ جب بار بار ان کا گردن موڑنا برداشت نہیں ہوا اور بہارے بھی ناگواری سے ناک سکوڑنے لگی تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آپ آرڈر نہیں کریں گی؟" کاؤنٹر والے لڑکے نے پہلے ترک اور پھر بہارے کے "انگلش پلیز" کہنے پہ انگریزی میں یہی بات دہرائی تاکہ حیا سمجھ سکے۔

"نہیں، ہمیں جانا ہے۔" وہ کوفت سے کہتی اپنا سامان اٹھانے لگی۔ پتا نہیں اب آگے کیا کرنا تھا۔ ہالے کو بتایا نہیں تھا۔ سو ہوٹلز کے بارے میں نہیں پوچھ سکی تھی۔

"آپ کو ہوٹل چاہیے تو میں مدد کر سکتا ہوں۔" ایک لڑکے نے دانت نکالتے ہوئے پیش کش کی۔

"شکریہ۔۔۔ میرے پاس ہوٹل ہے۔" وہ رکھائی سے کہہ کر بہارے کا ہاتھ پکڑے پلٹنے ہی لگی تھی کہ وہ پھر بولا۔

"کون سا ہوٹل؟" جتنی تیزی سے اس نے پوچھا تھا، اس سے زیادہ تیزی سے حیا کے لبوں سے نکلا۔ "یہ اوپر والا۔" اس نے بے ساختہ جان چھڑانے کے لیے کاؤنٹر پہ رکھے گائیڈ بک لیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں پہلے صفحے پہ تین ہوٹلز کی تصاویر اور معلومات درج تھیں۔ اتنے فاصلے سے اسے ہوٹل کا نام تو پڑھا ہی نہیں گیا مگر یہ سب غیر ارادی طور پہ ہوا تھا۔

چاروں لڑکوں نے بے اختیار گائیڈ بک کے صفحے کو دیکھا۔ اوپر والے ہوٹل کی تصویر پہ نگاہ ڈالی اور پھر بے ساختہ کاؤنٹر والے کے دانت اندر ہوئے، ٹیک لگا کر کھڑا لڑکا سیدھا ہوا۔ دوسرے نے فوراً" جیسے شانوں

سے قمیص کی نادیدہ سلوٹیں ٹھیک کیں۔
"آپ۔۔۔ آپ مولوت بے کی مہمان ہیں؟ پہلے کیوں نہیں بتایا۔ پلیز بیٹھیں۔" کاؤنٹر والا گڑبڑا کر وضاحت کرتا تیزی سے باہر آیا تھا۔ حیا نے رک کر ان کو دیکھا۔ باقی تینوں لڑکے سلام جھاڑ کر فوراً "ادھر سے رفوچکر ہو گئے تھے۔

"میں نے مولوت بے کو ابھی آدھا گھنٹہ پہلے بازار میں دیکھا تھا۔ وہ ادھر ہی ہیں، میں انہیں فون کرتا ہوں۔" وہ جلدی سے اپنا موبائل نکال کر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ حیا اور بہارے نے ایک دوسرے کو دیکھا، پھر حیا نے کرسی دوبارہ کھینچ لی۔

"مولوت بے آ رہے ہیں آپ کو لینے۔" فون بند کر کے وہ مستعدی سے مینو کارڈ لے آیا۔ "آپ آرڈر کریں، میں لے آتا ہوں۔"

اس کے جانے کے بعد بے چین بیٹھی بہارے گل نے اس کا ہاتھ ہلایا۔

"حیا! یہ مولوت بے کون ہیں اور ہم ان کے ساتھ کیوں جا رہے ہیں؟"

"مجھے نہیں پتا۔ مجھے کچھ سوچنے دو۔"

"ہم ایسے ہی ان کے ساتھ نہیں چلے جائیں گے۔ عائشے گل کہتی ہے اچھی لڑکیاں ہر جگہ۔۔۔"

"ہم دو منٹ کے لیے عائشے گل کے لیکچر بھول نہیں سکتیں؟ اب ہمیں کہیں تو رہنا ہے نا۔ اگر نہیں اچھے لگے یہ مولوت بے تو نہیں جائیں گے ان کے ساتھ۔"

بہارے نے خفگی سے منہ میں کچھ بڑبڑا کر رخ پھیر لیا۔

وہ خود بھی ذرا مضطرب تھی۔ پتا نہیں کون تھے وہ صاحب اور کیوں ان کو لینے آ رہے تھے۔ ایسے تو وہ نہیں جائے گی ان کے ساتھ۔ کوئی مرضی کے بغیر تو نہیں لے کر جا سکتا نا۔

"مولوت بے آ گئے۔" بمشکل پندرہ، بیس منٹ گزرے تھے کہ کاؤنٹر والے لڑکے نے صدا لگائی، تو بے اختیار ان دونوں نے مڑ کر دیکھا۔

سامنے سے ایک ادھیڑ عمر، گورے سے ترک صاحب چلے آ رہے تھے۔ دراز قد، بے حد اسمارٹ، سر کے بال ماتھے سے ذرا کم، چہرے پہ نرم سی مسکراہٹ، نفیس سے پینٹ شرٹ میں ملبوس۔ مگر وہ شاید۔۔۔ ایک قدرے پستہ قد آنٹی ان کے ایک طرف تھیں، دوسری جانب ایک لمبا، پتلا سا لڑکا، انیس بیس برس کا، اور اس کے ساتھ اسی عمر کی لڑکی جس کے بال کندھوں سے کافی نیچے تک آتے، سیاہ اور لہردار تھے۔ اس نے کیپری کے اوپر ڈھیلی شرٹ پہن رکھی تھی اور ایک موٹی، سفید گھنے بالوں والی ایرانی بلی بازوؤں میں اٹھا رکھی ہوئے تھی۔ لڑکی نے دور سے انہیں ہاتھ ہلایا۔

"کیا یہ تمہاری رشتے دار ہے؟" بہارے نے اچنبھے سے اسے مخاطب کیا۔

"نہیں۔۔۔ میں تو اس فیملی کو جانتی بھی نہیں۔" وہ متذبذب سی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"مرحبا۔۔۔ ہمیں دیر تو نہیں ہوئی؟ اگر پہلے پتا ہوتا تو آپ کو اتنا انتظار نہ کرنا پڑتا۔ ریئلی سوری۔" مولوت بے استقبالیہ مسکراہٹ کے ساتھ معذرت کر رہے تھے۔ ان کی مسز خوش دلی سے سلام کرتی، ملنے کے لیے آگے ہوئیں۔ ترکوں کے مخصوص انداز میں باری باری دونوں گال ملا کر چوما اور الگ ہو گئیں۔ وہ قد میں حیا سے کافی چھوٹی تھیں۔

"تم پہلے کال کر دیتیں تو ہم جلدی آ جاتے اور کوئی مسئلہ تو نہیں ہوا؟" اس سے الگ ہو کر وہ بہت افسوس سے کہنے لگیں۔ "میں سونا ہوں، یہ میری بیٹی پنار ہے اور یہ فاتح ہمارے ساتھ کام کرتا ہے۔ میرا بیٹا کو خان آج کل انقرہ گیا ہوا ہے۔ ورنہ اس سے بھی ملاقات ہو جاتی۔"

"میں حیا ہوں۔" اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مزید کیا کہے۔

"میں پنار اور یہ ہماری گارفیلڈ!" پنار نے بلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزے سے بتایا۔ "یہ پورے "آشیانہ" کی لاڈلی ہے۔ آج کل ذرا بیمار ہے۔ اسے علاج کے لیے لائے تھے ادھر اور اس چھوٹی بلی کا نام کیا ہے؟"

بات کے اختتام پہ پنار نے جھک کر بہارے کا گال چوما اور چھوٹی بلی کا پہلے تو تحیر سے منہ کھل گیا، پھر بے اختیار شرمائی، یوں کہ رخسار گلابی پڑ گئے اور پلکیں جھکا کر بہت باریک، نازک سی آواز میں بولی۔

"اناطولیہ کی بہارے گل۔" حیا نے پوری آنکھیں کھول کر اس چھوٹی اداکارہ کو دیکھا۔ جس کی یہ آواز تو اس نے بھی نہیں سن رکھی تھی۔

"آپ استنبول سے آئے ہیں؟" مولوت بے پوچھ رہے تھے۔

"میں پاکستان سے ہوں اور یہ ترکی میں میری رشتے دار ہیں۔" ان سب کے والہانہ اور خوش خلق انداز کے آگے اس کا نو تھینکس کہنے کا ارادہ کمزور پڑنے لگا۔

"باقی باتیں گھر چل کر کر لیں گے۔ فاتح! آپا کا سامان لو۔ دیکھو وہ کتنی تھکی ہوئی لگ رہی ہیں۔ آؤ بیٹا، کار میں چلو۔" مسز سونا اپنے مہمانوں کو مزید تھکانا نہیں چاہتی تھیں۔ فاتح سامان لینے کے لیے آگے بڑھا تو حیا نے بے اختیار بہارے کو دیکھا۔

"چلو جلدی کرو حیا!" تازہ تازہ تعریف سے گلنار ہوئی بہارے نے اٹھ کر اس کی آستین کھینچی۔ حیا نے گہری سانس لے کر بیگ فاتح کو تھما دیا۔ کہیں تو رہنا ہی تھا اور فیملی رن ہوٹلز سے زیادہ اچھا ہوٹل کوئی نہیں ہوا کرتا۔

وہ دونوں ان کے ساتھ چلتی باہر آئیں، جہاں ایک چھوٹی سی وین کھڑی تھی۔ اسے بے اختیار اپنا اور ڈی جے کا ترکی میں پہلا دن یاد آیا۔ جب احمت اور چغتائی ایسی ہی وین میں انہیں لینے آئے تھے۔

مولوت بے کا ہوٹل عرگپ میں تھا۔ قریباً گھنٹے کی ڈرائیو تھی۔ کھڑکی کے اس پار کپادوکیہ کا خشک علاقہ گزر رہا تھا۔ پراسرار خاموش، دنیا سے الگ تھلگ، صدیوں سے بنی خوب صورت گھوڑوں کی سرزمین۔ دور کہیں کوہ حسن کے دونوں پہاڑ دکھائی دیتے تھے۔ جو اپنے اندر کا سارا لاوا صدیوں قبل زمین پہ انڈیل کر اب سکون سے کھڑے تھے۔

"ڈی جے کو بہت حسرت تھی کپادوکیہ دیکھنے کی۔" کھڑکی کے باہر بھاگتے مناظر دیکھ کر بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا۔ پھر فوراً "چپ ہو گئی۔

"ڈی جے کون؟" پنار جو بلی کو تھپک رہی تھی، بے ساختہ پوچھ بیٹھی۔

"میری۔۔۔ ایک دوست تھی۔" اس کے جواب میں بہارے نے آہستہ سے اضافہ کیا۔ "مر گئی ہے۔"

"اوہ!" پنار نے تاسف سے اسے دیکھا۔

"جب تمہاری بلی مر جائے گی تو وہ ڈی جے کے پاس چلی جائے گی۔" چند لمحے بعد بہارے نے بہت سمجھ داری سے پنار کی معلومات میں مزید اضافہ کرنا چاہا۔

"بہارے گل! بہت ہو گیا۔" اس نے ہڑبڑا کر اسے ٹوکا۔ پھر معذرت کرنی چاہی۔ "سوری! یہ بس ایسے ہی بولتی رہتی ہے۔"

مگر پنار اور مسز سونا ہنس پڑی تھیں۔

"یہ چھوٹی بلی کتنی پیاری ہے نا۔" پنار نے جھک کر اس کا گال چوما۔ "آج سے گارفیلڈ بڑی بلی اور تم چھوٹی بلی۔"

بہارے نے شرما کر لب دانت سے دبائے۔ اثبات میں سر ہلایا پھر "دیکھا تم نے" والی فاتحانہ نظروں سے حیا کو دیکھا۔ حیا نے گہری سانس لے کر سر جھٹکا۔ یہ لڑکی بہت پٹے گی اس کے ہاتھوں۔

"آشیانہ کیو ہاؤس" ایک چھوٹا سا دو منزلہ ہوٹل تھا۔ ننھی سی پہاڑی کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ سامنے سے جیسے کوئی بنگلہ سا لگتا تھا۔ ایک طرف باہر سے جاتی سیڑھیاں، اوپر ٹیرس، سامنے صحن تھا۔ ٹیرس اور گراؤنڈ فلور دونوں کے برآمدے محرابی تھے۔ اندر آدھے کمرے پہاڑ کو کاٹ کر بنائے گئے تھے۔ وہ کوئی بہت اونچی پہاڑی نہیں تھی۔ ہوٹل کی چھت سے بھی ذرا کم تھی۔ ہوٹل کی پشت اس پہاڑی میں گویا دھنسی ہوئی تھی۔ چھوٹا سا خوب صورت سا آشیانہ۔

مولوت ہلیگیج کا کپادوکیہ میں ایک خاص مقام تھا۔ وہ اس علاقے کے ڈسٹرکٹ چیف تھے۔ لوگ ان

سے ڈرتے بھی تھے اور ان کی عزت بھی کرتے تھے۔ ان کے مہمانوں کے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں کر سکتا تھا اور آج ہوٹل کے ساتوں کمرے خالی تھے۔ وہ اور بہارے ہی آشیانہ کی مہمان تھیں۔

"یہ ہے تمہارا کمرا' مجھے لگا' تمہیں یہ پسند آئے گا۔ اگر بدلنا ہو تو بتادو۔" متحرک سی مسز سونا ان کو اوپری منزل کے ایک کمرے میں لے آئیں۔ وہ خاکی' سرمئی سنگ مرمر سے بنا کمرا بہت خوب صورت تھا۔ کونوں میں زرد بلب لگے تھے۔ سارے جلادو' تب بھی کمرے میں غار کا نیم مدھم سا اندھیرا برقرار رہتا۔ سرخ سے قالین کا ٹکڑا فرش پہ بچھا تھا۔ اسی سرخ رنگ کا ایک بڑا صوفہ کھڑکی کے آگے رکھا تھا۔ ڈبل بیڈ پہ بھی گہرے سرخ' میرون رنگ کی چادر بچھی تھی۔ بیڈ کی عقبی دیوار پہ ایک جالی دار گلابی پردہ لگا تھا' جو آگے کو ہو کر بیڈ کی پائنتی تک گرتا اور بیڈ پہ سونے والے کو جیسے ڈھک لیتا۔

باہر ٹیرس پہ گول گول میزیں تھیں۔ جن کے گرد کرسیوں کے پھول بنے تھے۔ وہاں بیٹھ کر دیکھو تو کھلا آسمان اور سارا کپادوکیہ دکھائی دیتا تھا۔ اتنی خوب صورت جگہ پہ بھی نامعلوم سی اداسی چھائی تھی۔ جہان کے بغیر اسے سب کچھ اداس لگ رہا تھا۔ اگر اس نے واقعی ریسیور آف کردیا ہو تو...؟

"مجھے یہ کمرا پسند ہے اور میری چھوٹی بلی کو بھی۔" بظاہر بشاشت سے مسکراتے اس نے مسز سونا کو اطمینان دلایا۔

آشیانہ شہر سے ذرا الگ تھلگ تھا۔ سو مولوت بے نے کہہ دیا تھا کہ وہ جہاں جانا چاہیں' وہ انہیں ڈراپ کردیں گے۔ وہ خالصتاً "مہمان نواز ترک خاندان تھا۔ وگرنہ ہوٹل کا مالک جو شہر کا ڈسٹرکٹ چیف بھی ہو' کہاں اپنے مہمانوں کو ڈرائیو کرکے لے جایا کرتا ہے۔ مولوت بے کو پورا کپادوکیہ جانتا تھا۔ ان کے مہمانوں کو کسی بھی قسم کے ٹور پیکج پہ خصوصی ڈسکاؤنٹ مل جاتا تھا۔ ان کا نام "مولوت" اردو لفظ "نومولود" کا "مولود" ہی تھا۔ ہمارے وہ نام جو "د" پہ ختم ہوتے ہیں۔ ترک انہیں "ت" پہ ختم کرتے تھے۔ "احمت" بلند کو بلنت اور مولود کو مولوت پکارتے تھے۔ ایسے ہی ہمارے وہ نام جن کے آخر میں "ب" ہے۔ ترک ان کے آخر میں "پ" لگایا کرتے تھے۔ یوں طیب سے بنا طیپ' ایوب سے ایوپ اور زینب سے زینپ۔

وہ سارا دن کمرے میں ہی رہیں۔ پھر شام کو مسز سونا اور فاتح شہر جا رہے تھے تو ان کے ساتھ چلی گئیں۔ کی ٹریسر والی ڈلی پرس میں ساتھ ہی تھی۔ اگر وہ ادھر ہوا تو جان لے گا کہ وہ اس کے قریب ہے۔ پتا نہیں نظر کے رشتے زیادہ مضبوط تھے یا جی پی ایس کے۔ مگر جب رات اتر آئی اور فون نہیں بجا تو وہ امید کھونے لگی۔

اگلا پورا دن بھی انہوں نے کمرے میں گزارا۔ کھانا بھی وہیں منگوایا۔ مسز سونا کے ہاتھ کے بنے سلاد' جیلی' جام' بالکل گھر جیسا ذائقہ۔ پھر بھی وہ بہت بے زاری محسوس کررہی تھی۔ بہارے باہر جانا چاہتی تھی۔ مگر اس نے منع کردیا۔

"کیا عبدالرحمٰن کال نہیں کرے گا؟" اس نے صبح سے کوئی دسویں دفعہ پوچھا۔

"مجھے نہیں پتا۔ فضول باتیں مت کرو۔" بہارے کی آنکھوں میں ناراضی در آئی۔

"تم نے اگر دوبارہ مجھ سے ایسے بات کی تو میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔"

"میں نے کہا نا فضول باتیں مت کرو!" سختی سے جھڑک کر وہ ڈریسنگ روم کی طرف جانے کے لیے اٹھی۔ بہارے ناک سکوڑ کر منہ میں کچھ بڑبڑائی۔

"کیا کہا تم نے؟" وہ جاتے جاتے جیسے تپ کر پلٹی۔

"نہیں بتاؤں گی۔" بہارے اتنے ہی غصے سے کہتی ٹیرس کی طرف چلی گئی۔

رات میں مسز سونا انہیں بلانے آگئیں۔

"تم لوگ صبح سے کمرے سے نہیں نکلے۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟" حسب توقع وہ فکر مند ہوئی تھیں۔ ٹورسٹ سیر کے لیے نہ جائے' عجیب سی بات تھی۔

"نہیں! اصل میں ایک دوست نے استنبول سے آنا تھا' اس کا انتظار کررہے ہیں۔ وہ آجائے تو مل کر آپ کا کپادوکیہ گھومیں گے۔" اس نے جلدی سے وضاحت دی۔ پھر ان کے اصرار پہ وہ دونوں ڈنر کے لیے نیچے چلی آئیں۔

نچلی منزل کا ڈائننگ ہال پتھر کی دیواروں سے بنا مدھم سا روشن کمرا تھا۔ دو چار میزیں کرسیاں رکھی تھیں۔ دیواروں کے ساتھ فرشی نشست کی طرز کے زمین سے دو بالشت اونچے پتھر کے صوفے بنے تھے۔ جن پہ میرون ترک قالین بچھے تھے۔ اس نے بھی اسی میرون شیڈ کا اجرک کا کرتا اور سیاہ ٹراؤزر پہن رکھا تھا۔ اوپر سیاہ حجاب۔

اسے حجاب سے کھاتا دیکھ کر ٹرے اٹھائے ہال میں داخل ہوئی پنار ٹھٹک کر رکی' پھر سامنے کاؤنٹر پہ کھڑے فاتح کو پکارا۔

"فاتح! تم کچن دیکھ لو۔ وہ کمفرٹیبل نہیں ہیں۔" اس نے انگریزی اور ترک دونوں میں کہا' کیونکہ فاتح کی انگریزی کمزور تھی۔ فاتح "جی آپا" کہہ کر تابعداری سے وہاں سے ہٹ گیا۔

"تھینکس!" حیا ہلکے سے مسکرائی۔ دل پہ اتنی کلفت چھائی تھی کہ مسکرانا بھی دشوار لگتا تھا۔

کھانے کے بعد وہ دونوں آگے پیچھے سیڑھیاں چڑھتی اوپر واپس آگئیں۔ اس کا پاؤں درد کررہا تھا' سو وہ آتے ہی بستر پہ لیٹ گئی اور پیچھے دیوار سے لٹکتا جالی دار گلابی پردہ اپنی پائنتی تک پھیلا دیا۔ اب چت لیٹے اسے چھت گلابی جالی کے پار دکھائی دے رہی تھی۔

"حیا! کیا تم مجھ سے ناراض ہو؟" ساتھ لیٹی بہارے تھوڑی دیر بعد قریب کھسک آئی۔ حیا نے گردن ذرا سی ترچھی کرکے اسے دیکھا۔

"کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"کیونکہ عائشے گل کہتی ہے' کسی کو ناراض کرکے نہیں سوتے۔ کیا پتا صبح ہم جاگ ہی نہ سکیں۔"

"نہیں! میں ناراض نہیں ہوں۔" وہ گردن سیدھی کرکے دوبارہ غار کی چھت کو تکنے لگی۔ "میں بس پریشان ہوں۔"

"تم پریشانی میں یوں ہی غصہ کرتی ہو؟"

"ہاں! اور تم کیا کرتی ہو؟"

"میں؟" بہارے ایک دم جوش سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "میں آسمان میں اڑتی ہوں۔ اوالار کے بگلوں اور سلطان احمت مسجد کے کبوتروں کے ساتھ۔ کیا تمہیں یہ کرنا آتا ہے؟"

حیا نے چند لمحے اس کے معصوم شفاف چہرے کو دیکھنے کے بعد نفی میں سر ہلایا۔ بچپن بھی کتنا پیارا ہوتا ہے۔ کندھے اور دل بہت سارے بوجھ سے خالی ہوتے ہیں۔

"میں تمہیں سکھاتی ہوں۔ آنکھیں بند کرو۔"

حیا نے آنکھیں بند کیں۔ وہی ایک شخص ہر جگہ نظر آنے لگا تھا۔ تکلیف کا احساس جیسے سوا ہو گیا۔

"اب تم آہستہ آہستہ ہوا میں اڑ رہی ہو... اوپر بہت اوپر دیکھو! تم اڑ رہی ہو۔" ساتھ ہی وہ دبے قدموں بستر سے اتری۔ حیا نے پلکوں کی جھری سے دیکھا۔ وہ احتیاط سے بلی کی چال چلتی سوئچ بورڈ تک گئی اور پنکھا فل چلا دیا۔ پھر وہ اسی طرح واپس آگئی۔

"دیکھو! اب تم اوپر ہوا میں اڑ رہی ہو۔ دیکھو! ہوا چل رہی ہے۔ آنکھیں مت کھولنا' ورنہ نیچے گر جاؤ گی۔"

"ہوں!" اس نے بند آنکھوں سے اثبات میں سر ہلایا۔ اگر زندگی کا وہ فیز کوئی خواب تھا تو واقعی وہ نیچے گرنے کے خوف سے آنکھیں کھولنا نہیں چاہتی تھی۔ مگر حقیقت تو ہمیشہ نیچے گرا دیا کرتی ہے۔ اس نے ایک دم سے آنکھیں کھول دیں۔

"ہا! یہ کیا کیا؟ دیکھا! نیچے گر گئیں۔" بہارے نے بوکھلا کر احتجاج کیا' پھر پھرتی سے اٹھ کر پنکھا بند کیا۔ ہوا سے گلابی پردہ پھڑپھڑانے لگا تھا۔

"اللہ تمہیں سمجھے۔" وہ خفگی سے کہتی واپس آکر لیٹ گئی۔

"کیا تم نے نماز پڑھی؟" وہ نماز کے لیے اٹھنے لگی تو بہارے سے پوچھا۔ بہارے نے جھٹ خود پہ بیڈ کور

تان لیا۔

"ہاں! میں ابھی پڑھتی ہوں۔ اوہ! میری آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔ کھل ہی نہیں رہیں۔ اوہ....." اور پھر وہ لمحے بھر میں جیسے ہوش و خرد سے بے گانہ سو چکی تھی۔ حیا سر جھٹک کر رہ گئی۔ پھر وضو کرنے اٹھی تو فون بجنے لگا۔ روحیل کالنگ۔ اس نے کال موصول کی۔

"کب آ رہی ہو تم واپس؟"

"یہ مت کہنا کہ تم مجھے مس کر رہے ہو۔" وہ کھڑکی کے آگے رکھے صوفے پہ بیٹھی مسکرا کر فون کان سے لگائے کہہ رہی تھی۔

"وہ تو خیر نہیں کر رہا۔ مگر ابا چاہتے ہیں کہ میری شادی اناؤنس کریں۔ ایک ولیمہ ریسیپشن دے کر ... لیکن جب تم اور جہان آؤ گے تب ہی فنکشن ہو پائے گا۔"

"ہوں! گڈ فار یو۔ بس کچھ دن تک آجاؤں گی۔" اس نے بہت سے آنسو اندر اتارے۔ کتنے دعوے سے کہہ کر آئی تھی کہ جہان اور وہ ساتھ واپس آئیں گے، مگر وہ تو کہیں بھی نہیں تھا۔

فون بند کر کے اس نے وضو کیا۔ پھر وہیں جائے نماز ڈال کر نماز پڑھی۔ سلام پھیر کر وہ دعا کے لیے اٹھے ہاتھوں کو یوں ہی دیکھنے لگی۔

دعا..... کتنا عرصہ ہوا، جب اس نے دعا مانگنی چھوڑ دی تھی۔ جیسے ڈی جے کے لیے مانگی، ویسے پھر کبھی نہ مانگ سکی۔ کچھ تھا جو ڈی جے کے ساتھ ہی مر گیا تھا۔ پھر معافی مانگی، استقامت مانگی، مگر دنیا مانگنا چھوڑ دی۔ لوگ، رشتے ناتے، یہ سب دنیا ہی تو ہے..... اور یہی سب کو چاہیے ہوتا ہے۔ اسے بھی چاہیے تھا۔ پھر لبوں پہ آ کر ساری دعائیں دم کیوں توڑ جاتی تھیں؟ ایسا کیوں لگتا تھا کہ معافی ابھی تک نہیں ملی؟

وہ گم صم سی اپنے ہاتھوں کی لکیریں دیکھنے لگی۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق بھی کتنا مبہم سا تھا۔ یہ خواہش تھی کہ میں اسے اچھی لگوں، میں اس کی مانوں، مگر مجھے اس پہ کتنا بھروسا ہے۔ کتنا اعتبار ہے، یہاں آ کر زندگی جیسے خالی جگہ کا سوال بن جاتی تھی۔ پورے فقرے کے درمیان ایک خالی جگہ تھی۔ ادھر کون سا لفظ لکھنا تھا۔ اس جگہ پہنچ کر وہ لکھنا بھول جاتی تھی۔

کوئی دعا مانگے بنا وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور میز پہ رکھے موبائل کی اسکرین کو انگلی سے چھوا۔ وال پیپر بھیگ رہا تھا۔ کتنا زہر لگتا ہے یہ وال پیپر بالخصوص تب جب کسی خاص ٹیکسٹ کی توقع ہو۔ پھر جائے نماز رکھی۔ دوپٹا اتار کر بالوں کو انگلیوں سے سنوارا اور ڈریسنگ روم کا پردہ ہٹا کر ادھر آئی۔ ہیر برش ڈریسنگ ٹیبل پہ رکھا تھا۔ وہی رات سونے سے قبل سو دفعہ برش کرنے کی عادت۔ اپنے بالوں، جلد اور خوبصورتی کی حفاظت پہ اسے کوئی سمجھوتا نہ تھا۔

برش کے ساتھ نقلی پھولوں کا گلدان رکھا تھا، جس کے اندر شیشے کی ایک ڈبی تھی جو سنہری افشاں سے بھری تھی۔ اس نے یوں ہی وہ ڈبی نکالی اور کھولی۔ سنہری چم چم چمکتی افشاں۔ اس کی پشت سے آتی بلب کی روشنی میں وہ مزید چمک رہی تھی۔

پھر ایک دم سے دمکتی افشاں پہ چھایا سی بن گئی۔ جیسے اس کے اور بلب کے درمیان کوئی آڑ آ گئی تھی۔ کسی خیال کے تحت اس نے سر اٹھا کر آئینے میں دیکھا۔

اس کے عکس کے پیچھے کوئی کھڑا تھا۔

افشاں کی ڈبی اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ ایک زوردار شاکڈ سی چیخ حلق سے نکلنے ہی لگی تھی کہ پیچھے کھڑے شخص نے سختی سے اپنا ہاتھ اس کے لبوں پہ جما دیا۔

"ششش..... چیخنا نہیں..... آواز باہر جائے گی اور پھر یہ ساری فیملی بھاگتی ہوئی آجائے گی۔" وہ چہرہ اس کے قریب کیے دھیمی سرگوشی میں بولا تھا۔

حیا کی آواز ہی نہیں، سانس بھی جیسے رک گیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی، بے یقین نگاہوں سے دم سادھے آئینے کو دیکھ رہی تھی۔ چند لمحے لگے اس کے اعصاب کو ڈھیلا پڑنے میں اور پھر اس نے ایک نڈھال سے احساس کے تحت آنکھیں بند کر کے کھولیں۔

جہان نے آہستہ سے اپنا ہاتھ ہٹایا۔

سنہری افشاں اس کے ہاتھوں سے ہوتی ہوئی قدموں میں جا گری تھی۔ اس کی انگلیاں، فرش، پیر کا انگوٹھا، ہر جگہ سونے کے ذرات چپکے تھے۔ ایک لمحے کو اس نے دونوں ہاتھ ایک دوسرے سے جھاڑ کر افشاں اتارنی چاہی، مگر وہ پورے ہاتھ پہ پھیلتی گئی تو وہ دھیرے سے اس کی جانب پلٹی۔ وہ ابھی تک شاکڈ اور شل تھی۔

"تم..... تم ادھر کیا کر رہے ہو؟" خالی خالی نگاہوں سے جہان کا چہرہ دیکھتے ہوئے وہ بدقت کہہ پائی۔

"یہی سوال میں تم سے پوچھنے آیا ہوں۔ "تم" ادھر کیا کر رہی ہو؟" وہ جیسے ڈھیروں غصہ ضبط کر کے سختی سے بولا۔

"تم اندر کیسے آئے؟" حیا کا دماغ ابھی تک سن تھا۔

وہ جواب دیے بنا آگے بڑھا اور ڈریسنگ روم کا پردہ برابر کر دیا۔ بیڈ روم کا منظر چھپ گیا۔ پھر وہ حیا کے مقابل دیوار سے ذرا ٹیک لگا کر جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے منتظر سا کھڑا تھا۔ وہ جیسے علیحدہ جگہ تفصیل سے بات کرنا چاہتا تھا۔

اس کے حواس دھیرے دھیرے بحال ہونے لگے۔ وہ اپنے سنہری ذرات والے ہاتھ اضطرابی انداز میں ایک دوسرے سے ملتی ڈریسنگ ٹیبل کے کنارے پہ جا ٹکی، پھر کھلے بال کانوں کے پیچھے اڑسے۔ سنہری ذرات سیاہ بالوں پہ بھی ٹھہر گئے، مگر اسے پتا نہیں چلا۔

"اگر مجھے ذرا سا بھی اندازہ ہوتا کہ تم میرے پیچھے ادھر آجاؤ گی تو میں تمہیں کبھی نہ بتاتا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔"

"تمہارے پیچھے؟" اس نے جیسے تلملا کر سر اٹھایا۔ بس ایک پل لگا تھا۔ اسے اپنے ازلی انداز میں واپس آنے میں۔ "تم نے مجھے کب بتایا کہ تم کہاں جا رہے ہو؟ تم بھول گئے ہو شاید، تم تو بغیر کچھ کہے سنے ہی آ گئے تھے۔"

"اچھا تمہیں نہیں پتا تھا کہ میں کپادوکیہ میں ہوں؟" وہ اسی طرح جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

"مجھے کیسے پتا ہو سکتا ہے؟ تمہیں لگتا ہے، میں تمہارے لیے اناٹرپول کر کے آؤں گی؟" اس نے جیسے افسوس بھری حیرت سے سر جھٹکا۔ "میں تو خود تمہیں ادھر دیکھ کر حیران ہوں..... اور تم نے مجھے کیسے ڈھونڈا؟ بلکہ ایک منٹ۔" وہ جیسے رکی۔ "ڈی جے اور مجھے کپادوکیہ آنا تھا اسپرنگ بریک میں۔ اوہ! تم یہ بات جانتے تھے۔ شاید "تم" میرے پیچھے آئے ہو۔ کیا ایسا ہی ہے؟" اس نے لاء ٹیچرز سے سن رکھا تھا کہ جب اپنا دفاع کمزور ہو تو مخالف پہ چڑھائی کر دینی چاہیے۔ وہ اپنے دفاع کے چکر میں پڑ کر پسپائی اختیار کر لیتے ہیں۔

"نہیں! میں اتنا فارغ نہیں ہوں کہ تمہارے لیے ادھر آؤں گا۔"

"میں بھی اتنی فارغ نہیں ہوں۔ حد ہے۔" جہان نے ایک گہری نظر اس پہ ڈالی۔ اس کے بال ویسے ہی ماتھے پہ ذرا بکھرے سے تھے۔ شیو ہلکی سی بڑھی ہوئی تھی۔ اور سفید رف سی پوری آستین کی ٹی شرٹ کو کہنیوں سے موڑا ہوا تھا۔

"اور اس کو کیوں لائی ہو؟" اس نے ابرو سے پردے کی جانب اشارہ کیا، جس کے پار بیڈ روم تھا۔ حیا نے بظاہر لاپروائی سے شانے اچکائے۔

"اس کے پاسپورٹ کا مسئلہ تھا کوئی۔ وہ بے کار ادھر رہ رہی تھی، پھر ابا نے کہا تھا کہ میں اکیلی نہ جاؤں اور میں نے سوچا کہ....."

"کہ باڈی گارڈ ساتھ لے جاؤں۔ ہے نا؟"

"کیا ہے جہان! میں کپادوکیہ گھوم پھر بھی نہیں سکتی اپنی دوستوں کے ساتھ؟" وہ تنک کر کہتی، اپنی انگلی میں پلاٹینم بینڈ گھمانے لگی۔ سنہری افشاں سے انگوٹھی بھر چکی تھی۔ جہان تھوڑی دیر بغور جانچتی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

"ٹھیک ہے! میں نے مان لیا کہ تم میرے لیے نہیں آئیں اور تمہیں بالکل علم نہیں تھا کہ میں ادھر ہوں۔ بہرحال! کل صبح قیصری سے ایک فلائٹ اتاترک ایئرپورٹ کے لیے نکل رہی ہے..... اور ایک صبیحہ گورچن کے لیے۔ تم کون سی لوگی؟" بہت سنجیدگی

سے اس نے استنبول کے دونوں ایرپورٹس کے نام لیے۔

"کیا مطلب؟ میں واپس نہیں جا رہی۔ میں نے تو ابھی کپادوکیہ دیکھا بھی نہیں۔"

"ہرگز نہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم یہاں رہو۔ تم ادھر یوں اکیلے کیسے رہ سکتی ہو بھلا؟"

"یہ میرا مسئلہ ہے۔۔۔ اور میں اکیلی نہیں ہوں۔ ہم دو ہیں۔ تم میری فکر مت کرو۔ وہ کرو جس کے لیے تم ادھر آئے ہو۔۔۔ اور ویسے مجھے ڈھونڈنے کے علاوہ تم یہاں کس مقصد کے تحت آئے ہو؟"

"مجھے بہت سے کام ہیں زمانے میں۔۔۔" کہتے کہتے وہ ایک دم رکا۔ حیا کا دل زور سے دھڑکا۔ جہان نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی، پھر نفی میں سر ہلایا۔

"میں زیادہ دیر ادھر نہیں رک سکتا۔ تم کل واپس جا رہی ہو حیا!"

"میں نہیں جا رہی۔ تمہیں کیا پرابلم ہے میرے ادھر رہنے سے؟" اسی پل کمرے میں رکھے اس کے موبائل کی میسج ٹون بجی۔ وہ بات روک کر ڈریسنگ ٹیبل کے کنارے سے اٹھی اور پردہ ہٹا کر میز تک گئی۔ جہان نے گردن موڑ کر اس کے قدموں کو دیکھا۔

"پاؤں کو کیا ہوا ہے؟"

میز سے موبائل اٹھاتے ہوئے اس کا دل لمحے بھر کو تھما۔ اللہ اللہ! اس آدمی کی نظریں؟ اس سے کوئی بات مخفی کیوں نہیں رہتی؟ اس نے تو پاؤں پہ پٹی بھی نہیں باندھی تھی۔ چل بھی بالکل ٹھیک رہی تھی، پھر بھی اف!

"میرے پاؤں کو؟" موبائل لے کر واپس مڑتے اس نے حیرت سے گردن جھکا کر اپنے پاؤں کو دیکھا۔

"اوہ! یہ افشاں گر گئی تھی۔ وہ ہی لگ گئی ہے۔" ساتھ ہی اس نے انگوٹھا قالین سے رگڑا۔ سرخ قالین کا وہ حصہ فوراً "چم چم" کرنے لگا، مگر پاؤں سے افشاں نہیں اتری۔

"ٹخنے، ایڑی کو کچھ ہوا ہے۔ موچ آئی ہے یا پاؤں مڑ گیا؟" وہ گردن ترچھی کر کے اس کے پاؤں کو دیکھ کہہ رہا تھا۔

"نہیں! میرا پاؤں تو بالکل ٹھیک ہے۔ مگر وہ اب میں سمجھی۔" موبائل پہ ہالے کا فارورڈ میسج چیک کر کے وہ سر ہلاتی اس کی طرف آئی۔ "تم مجھے واپس بھیجنے کے لیے بہانہ ڈھونڈ رہے ہو۔"

جہان نے نظر اٹھا کر اس کو دیکھا۔ ایک تو جب بھی وہ یوں دیکھتا، لگتا تھا اندر تک دل کا سارا حال جان لے گا۔

"ٹھیک ہے! تم ادھر میری وجہ سے نہیں آئیں اور تمہارے پاؤں کو بھی کچھ نہیں ہوا۔ مجھے ابھی جانا ہے۔ ہم اس بارے میں بعد میں بات کریں گے۔"

"پھر کب ملو گے؟" وہ دروازے کی طرف بڑھا ہی تھا کہ وہ بے اختیار کہہ اٹھی۔ جہان نے رک کر اسے اسی طرح دیکھا۔

"جب تم میرے لیے آئی ہی نہیں ہو تو پھر دوبارہ ملنا؟"

"ابھی خود ہی تو تم نے کہا کہ بعد میں بات کریں گے ورنہ مجھے کیا۔" اس نے خفگی سے شانے اچکائے۔ جہان نے ذرا مسکرا کر سر جھٹکا۔

"کل دوپہر ایک بجے شارپ۔۔۔ مجھے کنویں پہ ملنا۔"

"کون سا کنواں؟"

"مادام! آپ میرے لیے نہیں، کپادوکیہ کی سیاحت کے لیے آئی ہیں تو آپ کو یہاں کی تمام ٹورسٹ اٹریکشن کا علم تو ہوگا۔ کل ہم کنویں پہ ملیں گے۔۔۔ اور دھیان رکھنا، کنواں کافی گہرا ہے۔ تمہیں کلاسٹروفوبیا تو نہیں ہے؟" وہ جیسے یاد آنے پہ جاتے جاتے پلٹا۔ حیا نے نفی میں گردن ہلائی۔

"اوکے۔" اس نے دروازہ کھولا۔ احتیاط سے اطراف میں جھانکا، پھر باہر نکل گیا۔ بہارے اسی طرح سو رہی تھی۔ حیا نے دروازہ بند کیا اور پھر بے اختیار دل پہ ہاتھ رکھ کر، آنکھیں بند کر کے گہرا سانس لیا۔ ایک دبی دبی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ بکھر گئی۔

بہت اسمارٹ بنتا تھا جہان۔ شاید وہ اس سے زیادہ اسمارٹ تھی کہ اس نے اسے ڈھونڈ ہی نکالا تھا۔ ہاں اس کے سامنے یہ نہیں مانے گی کہ وہ اس کے لیے آئی ہے۔ جس بندے نے اسے خوار کیا، اس کو تھوڑا بہت خوار کرنے کا حق تو اسے بھی تھا۔

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے واپس آئی اور ہیر برش اٹھاتے ہوئے آئینے میں دیکھا۔ اجرک کے کرتے پہ سامنے، بالوں پہ، کانوں کے قریب اور دونوں ہاتھوں پہ افشاں لگی تھی۔ ازبلی اسٹون کے فرش پہ ڈبی ابھی تک الٹی پڑی تھی۔ وہ ڈبی اٹھانے کے لیے نہیں جھکی۔ افشاں کی سب سے پیاری بات یہ تھی کہ اسے جتنا خود سے اتارنے کی کوشش کرو، یہ پھیلتی چلی جاتی ہے اور جس کو چھوتی ہے، اس کو چمک عنایت کر دیتی ہے۔

"دوپہر ایک بجے شارپ۔" اس نے زیر لب مسکراتے ہوئے اپنے عکس کو دیکھتے برش بالوں میں اوپر نیچے چلانا شروع کیا۔ ابھی اسے سو دفعہ برش کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

صبح آشیانہ کے اطراف کے پہاڑوں پہ بہت سہانی اتری تھی۔ کپادوکیہ کو جیسے اس کا حسن واپس مل گیا تھا۔

اس نے بہارے کو تیار ہونے کو کہا، پھر مزید کچھ نہیں بتایا۔ بہارے ابھی بال بنا رہی تھی۔ وہ اسے وہاں چھوڑ کر، اپنے عبایا اور اسکارف کو پن لگاتے ہوئے نیچے چلی آئی۔ آج اس کا موڈ بہت خوش گوار تھا۔

فاتح استقبالیہ کاؤنٹر پہ تھا۔ وہ لابی بھی چھوٹے سے پتھریلے کمرے کی مانند بنی تھی۔ غاروں میں غار۔۔۔

"صبح بخیر آپا۔" جلدی سے سب کام چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"شکریہ فاتح!" وہ اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ "ایک بات پوچھنی تھی۔ یہاں آس پاس کوئی کنواں ہے؟"

"کنواں؟" فاتح نے اچنبھے سے دہرایا۔ "پتا نہیں کنویں ہیں بہت سے، مگر آپ کس کی بات کر رہی ہیں؟"

"کوئی ایسا کنواں جو ٹورسٹ اٹریکشن ہو اور جو کافی گہرا ہو۔" فاتح کو بات سمجھانے کے لیے اسے آہستہ آہستہ الفاظ ادا کرنے پڑ رہے تھے۔ فاتح نے تذبذب سے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں! آپا میں ایسے کنویں کو نہیں جانتا۔ ویران کھنڈر کنویں مل جائیں گے، مگر سیاحتی مرکز مشکل ہے۔"

"سوچو فاتح! کوئی بہت گہرا سا کنواں ہوگا ادھر۔ سوچو نا۔" اس کے دل میں بے چینی سی انگڑائی لینے لگی۔ اللہ سمجھے جہان سکندر کو۔ کبھی انسانوں کی زبان میں بات نہیں کرے گا۔ پھر ایک پہیلی؟

"مجھے واقعی کسی گہرے کنویں کے بارے میں نہیں پتا۔۔۔" وہ ذرا دیر کو رکا۔

"آپ گہرے کنویں کا تو نہیں پوچھ رہیں؟"

"اتنی دیر سے میں اور کیا پوچھ رہی ہوں فاتح؟"

"نہیں نہیں! آپ کسی کنویں کا پوچھ رہی ہیں۔ اصلی کنویں کا جو گہرا ہو۔۔۔ یا آپ "گہرے کنویں" کا پوچھ رہی ہیں؟"

"دونوں میں کیا فرق ہوا؟" اس نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔ شاید وہ کسی منزل کے قریب تھی۔

"دیکھیں آپا!" فاتح دونوں ہاتھ ہلاتے ہوئے ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں کہنے لگا۔ "ایک ہوتا ہے کنواں جس سے لوگ پانی نکالتے ہیں۔ ان کے بارے میں میں زیادہ نہیں جانتا۔۔۔ اور ایک ہے "گہرا کنواں" مگر وہ کنواں نہیں ہے۔ وہ۔۔۔ وہ ہلتار شہری ہے۔"

"ہلتار شہری۔۔۔ مطلب؟" اس نے ناسمجھی سے پوچھا۔ فاتح نے بے بسی سے اسے دیکھا، پھر نفی میں سر ہلایا۔ اسی پل مسز سونا لانڈری باسکٹ اٹھائے وہاں داخل ہوئیں۔ فاتح نے فوراً انہیں پکارا۔

"سونا خانم ہلتار شہری کو انگریزی میں کیا کہیں گے؟"

"انڈر گراؤنڈ سٹی۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"ایک منٹ مسز سونا! وہ مجھ سے کمرے میں افشاں گر گئی تھی۔ وہ صاف ہو جائے گی نا؟"

"ہاں! فکر نہ کرو۔ پنار کر لے گی۔" اسے مطمئن کر کے وہ باہر نکل گئیں۔

"انڈر گراؤنڈ سٹی آپا! وہ ایک زیر زمین شہر ہے، جس کا نام "دیرین کیو" یعنی گہرا کنواں ہے۔ آپ اس کا پوچھ رہی تھیں؟"

حیا پر یقین نہیں تھی۔

"شاید! میں نے کپادوکیہ کے زیر زمین شہروں کا سنا تو ہے، مگر وہ تو بہت سے ہوں گے۔ کیا یہ "دیرین کیو" کوئی مشہور اسپاٹ ہے؟"

"یہ کپادوکیہ سب سے بڑا ہلتار شہری ہے آپا! مگر آپ کو کلاسٹروفوبیا تو نہیں ہے؟"

وہ جیسے چونکی... اور پھر ایک دم اس کے دل کی دھڑکن بڑھ گئی۔

"نہیں... اور ہاں! مجھے یہیں جانا ہے۔ بالکل یہی جگہ ہے۔" وہ جیسے بہت پرجوش ہو گئی تھی۔

"پھر آپ پنار کے ساتھ چلی جائیں، وہ آج تو شہر جا رہی ہے۔ گارفیلڈ کی دوا لینی ہے۔"

"ٹھیک ہے!" وہ ایک دم اتنی خوش ہوئی کہ اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ فاتح نے ذرا اچنبھے سے اسے مڑ کر جاتے دیکھا۔ آشیانہ کے کسی مہمان کو اس نے کلاسٹروفوبیا نہ ہونے پہ اتنا پرجوش ہوتے پہلی دفعہ دیکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

ترکی کے صوبہ "نوشہر" کا وہی معنی تھا، جو پاکستان کے شہر "نوشہرہ" کا ہے۔ "دیرین کیو" یہاں کا سب سے بڑا زیر زمین شہر تھا۔ ایسے سینکڑوں شہر کپادوکیہ میں موجود تھے، جو کم سے کم بھی دو منزلہ تھے۔ جیسے تہہ خانے ہی تہہ خانے ہوں۔ گئے زمانوں میں کپادوکیہ کے باسیوں (عیسائی آبادیوں) نے یہ شہر بنائے تھے تاکہ جنگ کے دنوں میں ان میں پناہ لی جا سکے۔ ان کے پاس شہر کے دہانوں کو مکمل طور پہ بند کرنے کا نظام بھی موجود تھا۔ پانی، خوراک، روشن دان، نکاسی اور اخراج کا نظام، غرض یہ تمام انتظامات سے آراستہ مکمل شہر تھے۔ بس ان سے آسمان نظر نہیں آتا تھا۔ بیسویں صدی کے آغاز میں عیسائی یہاں سے چلے گئے تھے۔ اب برسوں سے یہ شہر ویران تھے۔ چند سال پہلے ان کو سیاحوں کے لیے کھول دیا گیا تھا۔

"دیرین کیو" کی آٹھ منزلیں سیاحوں کے لیے کھلی تھیں۔ دیرین کا مطلب گہرا اور کیو یعنی کنواں۔ اردو میں گہری دوستی اور دشمنی کے لیے استعمال ہونے والا لفظ "دیرینہ" کا ماخذ بھی یہی "دیرین" تھا۔

مولوت بے، اسے، بہارے اور پنار کو ایک لمبی ڈرائیو کے بعد دیرین کیو لے آئے تھے۔ وہ گارفیلڈ کو لے کر خود شہر چلے گئے اور وہ تینوں شہر کی داخلی سرنگ کی طرف آ گئیں، جہاں سیاحوں کی لمبی قطار لگی تھی۔

دیرین کیو باہر سے یوں لگتا جیسے ایک چھوٹی پہاڑی ہو جس کی دیواروں میں بہت سے سوراخ تھے۔ یوں جیسے کوئی جادوگرنی خاکی چغہ اوڑھ کر جھکی بیٹھی ہو اور اس کے چغے سے بہت سی آنکھیں جھانک رہی ہوں۔

داخلی سرنگ، غار کے دہانے پہ وہ چھوٹا سا راستہ تھی جس سے اندر جانا تھا۔ باہر دھوپ نکلی تھی، لیکن سرنگ دور سے ہی اندھیری لگ رہی تھی۔

"یہ سوئیٹر رکھ لو۔ شاید ضرورت پڑ جائے۔" پنار نے خود بھی ہلکا سا سوئیٹر پہن لیا تھا اور اب دوسرا اس کی طرف بڑھا رہی تھی۔ حیا نے حیرت سے اسے دیکھا پھر چلچلاتے سورج کو۔

"اتنی گرمی میں؟"

"رکھ لو۔" پنار کے دوبارہ کہنے پہ اس نے سوئیٹر تہہ کر کے بازو پہ ڈال لیا، سیاہ پرس دوسرے کندھے پہ تھا۔ بہارے نے پنار کی انگلی پکڑ رکھی تھی۔ بالوں کو پونی میں باندھے وہ دھوپ کے باعث آنکھیں سکیڑے کھڑی تھی۔

اپنی باری پہ ٹکٹ دکھا کر وہ آگے پیچھے سرنگ میں داخل ہوئیں۔ باہر دھوپ تھی۔ اندر اندھیرا سا پھیلا تھا۔ کپادوکیہ کے غاروں اور خشک پہاڑوں کی مہیب پراسرار خوشبو ہر سو پھیلی تھی۔ گائیڈ ان سب سیاحوں کی رہنمائی کرتا جا رہا تھا۔ رش کافی تھا اور راہداریاں تنگ۔ بعض جگہ تو اتنی تنگ ہوتیں کہ دونوں کندھے اطراف کی دیواروں سے ٹکراتے اور بعض جگہ گردن جھکا کر کمرے میں داخل ہونا پڑتا۔

چند راہداریاں اور سیڑھیوں سے گزر کر وہ سب سیاح ایک بڑے کمرے میں جمع تھے، جہاں شور سا مچا تھا۔ سیاحوں کے سوال اور اونچی آواز میں بولتا گائیڈ، عجیب مچھلی بازار سا بنا تھا۔ وہ بور ہونے لگی۔ جہان کا کوئی اتا پتا نہیں تھا اور فی الوقت اسے یہ جاننے میں دلچسپی نہیں تھی کہ شہر کا روشن دان یا پانی کا نظام کس طرح کام کرتا تھا، سو وہ پنار کی طرف مڑی۔

"تم بہارے کا خیال رکھنا... میں بس آ رہی ہوں۔"

"تم کہاں جا رہی ہو؟" بہارے پریشانی سے کہہ اٹھی۔

"میں اپنے طور پہ اندر سے یہ شہر دیکھنا چاہتی ہوں۔ تم پنار کو تنگ تو نہیں کرو گی؟"

بہارے نے نفی میں سر ہلا دیا، البتہ وہ اس کے جانے پہ خوش نہیں تھی۔

"تم جاؤ! میں چھوٹی بلی کا خیال رکھوں گی۔"

وہ اس کمرے سے آگے کھسک آئی۔ کمرے ہی کمرے، راہداریاں محرابی چوکھٹیں، جیسے دی ممی کا سیٹ ہو۔ دیواروں پہ دور دور مشعلوں کی مانند بلب لگے تھے، جو اندھیر گلیوں کو مدھم، زرد روشنی بخش رہے تھے پراسرار، مگر خوبصورت۔

وہ سیاحوں کے جمگھٹے سے ذرا آگے آئی تو ایک دم ٹھنڈ کا احساس ہوا۔ پنار ٹھیک کہتی تھی۔ اس نے گرے سوئیٹر عبایا کے اوپر پہن لیا اور بٹن سامنے سے کھلے رہنے دیے۔ وہاں آس پاس کوئی نہیں تھا اور ذرا گھٹن والی جگہ تھی تو نقاب ٹھوڑی تک نیچے کر لیا۔

وہ یوں ہی طویل راہداریوں میں آگے چلتی جا رہی تھی کہ دفعتاً...

"حیا!" کسی نے اس کے کندھے کو ہلکا سا چھوا تو وہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے مڑی۔ سانس ایک لمحے کو رکا تھا، مگر پھر بحال ہو گیا۔

"بس! ڈر گئیں؟"

خاکی پینٹ، بھوری آدھے آستین کی ٹی شرٹ، کندھے پہ بھورا دستی بیگ اور سر پہ سیاہ پی کیپ۔ وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے بہت سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ لمحے بھر کو تو کچھ کہہ نہیں پائی۔

"ہائیں! اتنی جلدی ڈر گئیں اور کل مجھے کسی نے کہا تھا کہ وہ اکیلے کپادوکیہ میں رہ سکتی ہے۔"

چونکہ ابھی وہ گزشتہ رات کی طرح نہیں ڈری تھی، سو لمحے بھر میں خود کو سنبھال چکی تھی۔

"کل کسی نے یہ بھی کہا تھا کہ وہ اکیلی نہیں ہے۔"

"اوہ! تمہارا باڈی گارڈ تو بھول گیا تھا۔ ابھی کدھر ہے وہ؟" وہ دونوں نیم روشن راہداری کے وسط میں آمنے سامنے کھڑے تھے۔

"میں مان ہی نہیں سکتی کہ تمہیں معلوم نہیں ہے کہ وہ کہاں ہے۔"

جہان ایک نظر اس پہ ڈال کر دائیں طرف ایک کمرے میں داخل ہو گیا۔ وہ اس کے پیچھے چلی آئی۔ وہ ایک بڑا سا کمرا تھا۔ زیر زمین شہر کا کچن۔ ایک طرف زمین پہ چوکور چولہا بنا تھا (جیسے پاکستان میں گاؤں میں مٹی کے چولہے ہوتے ہیں) اور دوسری طرف دیوار میں کھڑکی کی مانند چوکور بڑا سا خلا تھا۔ اسے اپنا کچن یاد آیا، جہان سے لاؤنج میں جھانکنے کے لیے آدھی دیوار جتنا خلا تھا۔

"کچھ کہا تھا میں نے کل حیا!" وہ اس کھلی بغیر پٹ کی کھڑکی کے ساتھ ٹیک لگائے، جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا ہو گیا۔

"کیا؟" وہ انجان بن گئی۔

"تم واپس جا رہی ہو یا نہیں؟"

دیوار پہ لگے بلب کی روشنی جہان سے ٹکرا کر گزرتی تھی، یوں کہ سامنے والی دیوار پہ اس کا سایہ پڑنے لگا تھا۔ حیا اس کے بالکل مقابل چولہے کی چوکی پہ آ کر بیٹھ گئی۔ اس کا سایہ جہان کے سائے کے مقابل

گرنے لگا۔ وہ اصل میں کافی فاصلے پہ بیٹھے تھے، مگر ایک ہی دیوار پہ گرتے آمنے سامنے بیٹھے سائے کافی بڑے اور قریب لگ رہے تھے۔

"اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ میں واپس نہیں جا رہی۔"

"مگر کیوں؟" وہ جیسے اکتا گیا۔

"کیونکہ میں تمہارے لیے نہیں "کپاڈوکیہ" دیکھنے آئی ہوں اور دیکھ کر ہی جاؤں گی۔"

"مگر میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں سے چلی جاؤ۔ اتنے دن کیسے رہو گی ادھر؟"

"میں نے وہ ویڈیو کھول لی تھی۔" جہان کے چہرے کے بجائے اس کے سائے کو دیکھتے ہوئے وہ ایک دم بہت رسان سے بولی۔

لمحے بھر کو پورے زیر زمین شہر میں سناٹا چھا گیا۔ جہان بالکل چپ ہو گیا۔ اسے لگا، وہ ابھی ہنس دے گا، پھر اسے رکنے کو کہے گا، مگر......

"تو؟ تمہیں ابھی تک اندازہ نہیں ہوا کہ میں کیوں تمہیں یہاں سے بھیجنا چاہتا ہوں؟" وہی سنجیدگی بھرا خشک انداز۔ اسے دھچکا سا لگا۔ کوئی اپنائیت، کوئی راز بانٹ دینے والا احساس نہیں۔ وہ تو ویسا ہی تھا۔

"نہیں! مجھے واپس نہیں جانا..... اور میرے یہاں ہونے سے تمہیں کیا مسئلہ ہے؟" اس کی آواز میں دبا دبا غصہ در آیا۔

"مجھے تمہاری فکر ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم محفوظ رہو اور یہ محفوظ جگہ نہیں ہے۔"

کھڑے سائے نے اتنے ہی غصے سے سر جھٹکا تھا۔ تب ہی زیر زمین شہر کی دیواروں نے بیٹھے سائے کو اٹھتے اور کھڑے سائے کے سامنے آ کر رکتے دیکھا۔

"اور واپس جانے سے میں محفوظ ہو جاؤں گی جہان بے؟"

"ہاں! بالکل۔ مجھے یہاں سے دو چار دنوں میں انقرہ چلے جانا ہے، پھر وہاں سے ایک اور شہر اور ادھر سے شام۔ میں شام سے چند دن میں اسلام آباد واپس آجاؤں گا۔ میں تم سے وہیں ملوں گا۔ ہو سکتا ہے روحیل کے ولیمہ میں ہم دونوں ساتھ ہوں۔ اس لیے ابھی تم چلی جاؤ۔"

"کیا گارنٹی ہے اس بات کی؟ ہو سکتا ہے واپسی پہ میری فلائٹ کریش کر جائے؟"

چند لمحے کے لیے وہ واقعی کچھ کہہ نہیں سکا، مگر مدھم مشعل کی روشنی میں بھی حیا نے اس کی بے تاثر آنکھوں میں کچھ زخمی ہوتے دیکھا تھا۔

"ایسے مت کہو۔" اس کی آواز دھیمی ہو گئی۔

"نہیں جہان بے! مجھے بولنے دو۔ ہاں! پھر کیا گارنٹی ہے کہ میں وہاں محفوظ رہوں گی؟ ہو سکتا ہے کوئی پرانا دشمن مجھے گاڑی تلے کچل دے؟"

"حیا! میں......"

"ہو سکتا ہے یہ ہمارا آخری سفر ہو۔ کیا تب بھی تم اسے میرے ساتھ نہیں کرنا چاہو گے؟" اس کی آواز دیرین کیو کی دیواروں سے ٹکرا کر پلٹ رہی تھی، مگر اب اس میں آنسو بھی شامل تھے۔

"میں صرف تمہیں محفوظ دیکھنا چاہتا ہوں حیا۔" وہ جیسے بے بسی سے بولا تھا۔

"اور تم خود؟"

"میرا کیا ہے۔ میرے لیے رونے والا کوئی نہیں ہو گا۔ مگر مجھے تمہاری فکر ہے۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ......"

"تم یہ چاہتے ہو، تم وہ چاہتے ہو، تم ہر وقت صرف اپنا کیوں سوچتے ہو جہان! تم ہر چیز پلان کر کے کیوں رہنا چاہتے ہو؟ تم ہر وقت دوسروں کو آزماتے کیوں رہتے ہو؟"

"حیا!" اسے جیسے دکھ پہنچا تھا۔ وقت پیچھے چلا گیا تھا وہ اس کا جنجر بریڈ ہاؤس توڑ چکا تھا اور وہ اس پہ چلا رہی تھی۔

"نہیں! مجھے بولنے دو۔ آج مجھے بولنے دو۔ جتنا تم نے مجھے آزمایا۔ اس سے آدھا بھی میں تمہیں آزماتی نا تو تم بہت مشکل میں پڑ جاتے۔" وہ غصے سے بلند آواز میں بول رہی تھی۔ دیوار پہ گرتے سائے اصل سے زیادہ قریب کھڑے تھے۔

"تم یہ سمجھتے ہو کہ ہر دفعہ تم چیزیں پلان کرو گے اور سب تمہاری مرضی کے مطابق ہو جائے گا' پھر بعد میں لوگ تمہاری باتوں کے دوسرے مطلب ڈھونڈتے پھریں اور اس دوران کس کا دل کتنا ٹوٹے' تمہیں کب پروا ہوتی ہے۔ تم دوسروں کا کبھی نہیں سوچتے۔ مگر ہر دفعہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہر دفعہ دوسرے تمہاری طرف کی کہانی نہیں سمجھ لیں گے۔ یہ کرلو تو وہ ہو جائے گا' وہ کرلو تو یہ ہو جائے گا۔ میں مزید تمہارے ان پلانز کے مطابق نہیں چل سکتی۔"

بولتے بولتے اس کا سانس پھولنے لگا۔ جہان نے ہاتھ جیبوں سے نکال کر سینے پہ لپیٹ لیے اور دائیں جو گرے زمین کو کھرچتا وہ سپاٹ چہرے کے ساتھ سن رہا تھا۔

"اور بھی جو کچھ اندر بھرا ہے میرے خلاف' وہ بھی کہہ دو۔"

"میرے اندر جو بھی بھرا ہو' تمہیں پرواہ نہیں ہے تم مجھ سے میرے برقعے پہ بحث کر کے چپ چاپ چلے آئے۔ اگر تمہیں میرے برقعے سے مسئلہ نہیں تھا تو پھر تم نے ایک دفعہ بھی کوئی امید' کوئی وضاحت کیوں نہیں دی؟ کیا یہ مناسب تھا کہ تم مجھے یوں چھوڑ کر آتے اور سارے خاندان میں میرا تماشا بنتا؟ تم ہر دفعہ یہ سمجھتے ہو کہ بعد میں تم دوسرے کو منالو گے۔ کیا منا لینے سے دل پہ لگے زخم مٹ جاتے ہیں؟ سخت لکڑی پہ بھی کلہاڑی کی ایک ضرب لگاؤ تو ساری عمر کے لیے نشان رہ جاتا ہے۔ میں تو پھر انسان ہوں۔ کیا تم ساری زندگی یہ ہی کرتے رہو گے؟"

اس کی آواز درد سے پھٹنے لگی۔ جہان کا بے تاثر' سپاٹ ہوتا چہرہ دیکھ کر اسے اور بھی غصہ چڑھنے لگا۔ جب سے وہ غصے سے بولنے لگی تھی' تب سے اس کا چہرہ بے تاثر پڑ گیا تھا۔

"اور اگر مجھے کوئی گاڑی تلے کچل دے تو پھر کس کو وضاحتیں دینے آؤ گے؟ مگر تم نہیں سمجھو گے۔"

وہ بے بسی بھرے دکھ کے ساتھ کہتی پلٹی اور تیز تیز قدموں سے چلتی باہر نکلی۔ پھولا تنفس اور آنکھوں میں جمع آنسو۔ اذیت ہی اذیت تھی۔ وہ بھی کس کو سمجھا رہی تھی؟ وہ پروا ہی کہاں کرتا تھا؟

راہ داری میں سبک قدموں سے چلتی وہ بے آواز روتی آگے بڑھتی جا رہی تھی' پھر ایک کمرے میں بیٹھنے کو ویسی ہی چوکی نظر آئی تو جا کر ادھر بیٹھ گئی اور چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر بے اختیار رونے لگی۔ چہرہ اس لیے ڈھانپا تھا کہ گہرے کنویں کی قدیم دیواریں اس کے آنسو نہ دیکھ سکیں' سُرنگ اس کی سسکیاں نہ سن سکے اور مصنوعی مشعل کی روشنی میں اس کے ہچکیوں سے لرزتے وجود کا سایہ نہ پڑے' مگر آنسو' سسکیاں اور لرزش ڈھانپ لینے سے بھی نہیں ڈھکتیں۔

وہ بھی کس کو سمجھانا چاہ رہی تھی؟ وہ کہاں اس کی مانتا تھا؟ وہ اس کے ساتھ کپادوکیہ میں رہنا چاہتی تھی' جتنے بھی دن وہ ادھر ہے' مگر وہ اسے اب بھی ہمیشہ کی طرح زبردستی واپس بھیج دے گا۔ بے بسی سی بے بسی تھی۔

اس نے بھیگا چہرہ اٹھایا۔

سُرنگ' محرابی چوکھٹیں' بھول بھلیاں' سب سنسان پڑی تھیں۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ دیوار پہ گرتا سایہ اکیلا تھا۔ جہان اس کے ساتھ نہیں تھا۔ اپنے غصے میں وہ سب بھول جایا کرتی تھی' یہ بھی کہ ایک دفعہ پھر وہ ہمیشہ کی طرح اسے چھوڑ کر آ گئی تھی۔ وہ سب باتیں کہہ کر جو وہ صرف اس کو ہرٹ کرنے کے لیے کہہ رہی تھی۔ اس کا مطلب وہ ہرگز نہیں تھا۔ اس نے دل سے وہ سب نہیں کہا تھا۔

اللہ' اللہ اس نے یہ کیا کر دیا؟ وہ اب کیسے آئے گا اسے منانے؟

"جہان!" وہ بدحواسی کے عالم میں اٹھی اور راہ داری کی طرف آئی۔ وہ دائیں سے آئی تھی یا بائیں سے؟ شاید دائیں سے۔ ہتھیلی کی پشت سے گال رگڑتی وہ اس جانب بھاگی۔

ایک موڑ' دوسرا' دائیں طرف وہ کمرا جہاں ابھی دو سائے ٹکرائے تھے' اب وہ خالی تھا۔ وہ وہاں نہیں تھا۔

"جہان!" آنسو پھر سے اس کی آنکھوں میں جمع ہونے لگے۔ وہ کہیں بھی نہیں تھا۔ اس نے پھر سے اسے کھو دیا تھا۔

مزید اس سے دیرین کیو دیکھا نہیں گیا۔ وہ الٹے قدموں واپس مڑی۔ بمشکل سیڑھیاں ملیں اور باہر جانے کا راستہ سمجھ آیا۔ گائیڈ' سیاح' ابھی تک وہیں تھے۔ بہارے اور پنار بھی ایک طرف کھڑی تھیں۔ اس نے بہارے کا ہاتھ تھاما اور اپنی متورم' سرخ آنکھیں چھپانے کی سعی کیے بغیر بس اتنا بولی۔

"واپس چلتے ہیں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"کیا ہوا؟" پنار حیران اور پھر پریشان ہو گئی' مگر وہ کوئی جواب دیے بنا گہرے کنویں کے داخلی روزن کی طرف بڑھ گئی۔ جہاں سے سورج کی روشنی جھانک رہی تھی۔

وہ تینوں سُرنگ میں آگے پیچھے چلتی گئیں۔ غار کا اندھیرا چھٹتا گیا اور بالآخر غار کے دہانے پہ سورج سے چمکتا' روشن دن سامنے کھڑا تھا۔

وہ کہیں نہیں تھا۔ کہیں بھی نہیں۔

پنار نے پھر کوئی سوال نہیں پوچھا۔ بہارے' جو بے چین ہو رہی تھی' اس کو بھی چپ کروا دیا۔

اس کا دل بار بار بھر رہا تھا۔ وہ کیوں پھر سے اسے چھوڑ گئی۔ آخر کیوں وہ روٹھنے منانے سے آگے نہیں بڑھتے تھے؟

اپنے کمرے میں آ کر وہ سرخ صوفے پہ کھڑکی کے آگے پاؤں اوپر کر کے بیٹھ گئی اور سر گھٹنوں میں دے کر بے آواز روئے جا رہی تھی۔ بہارے پتا نہیں کہاں تھی۔ وہ ہر خیال و فکر سے بے پروا بس آنسو بہا رہی تھی۔ اس کا دل بار بار کسی خوف کے زیر اثر سکڑ جاتا تھا۔

بہارے اسے کھانے کے لیے بلانے آئی' مگر وہ نہیں اٹھی۔ دوپہر کی روشنی آہستہ آہستہ بجھنے لگی اور شام کا اندھیرا کپادوکیہ پہ پھیلنے لگا۔ ہر سو پہاڑوں پہ زرد بتیاں جگمگانے لگیں۔ وہ اسی طرح صوفے پہ سر گھٹنوں میں دیے بیٹھی رہی۔ آنسو بھی پانی سے بنے ہوتے ہیں اور پانی آسمانوں سے اتارا جاتا ہے۔ سو آنسوؤں کے بعد کا مرہم بھی وہیں اوپر سے آتا ہے۔ نیند پر سکون نیند۔ اس پہ کب نیند طاری ہوئی' اسے پتا بھی نہیں چلا۔ ذہن میں' دل میں' آنکھوں کے پیچھے' ہر جگہ زیر زمین شہر کی سُرنگ کا منظر اُمڈ آ رہا تھا۔ وہ غصے میں اس پہ چلّا رہی تھی اور وہ دھیمے لہجے میں اسے پکار رہا تھا۔

"حیا... بات سنو!"

"مگر وہ اسے سننا نہیں چاہ رہی تھی۔ وہ اس سے فاصلے پہ کھڑا تھا' پھر بھی پتا نہیں کیسے' وہ اس کا شانہ ہولے سے ہلا رہا تھا۔

"حیا... اٹھو! میری بات سنو۔" بہت دھیرے سے وہ کہہ رہا تھا۔ چاندی کے مجسمے پھر سے واپس لوٹ آئے تھے۔ گہرے کنویں کا اندھیرا چھٹتا گیا۔ چاندی کی جھیل ہر سو پھیلتی گئی۔ اس نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھولیں۔

کمرے میں مدھم سی روشنی بکھری تھی۔ اس کے صوفے کے سامنے میز کے کنارے پہ بیٹھا جہان بہت تکان سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے آنکھیں کھولتے دیکھ کر وہ تھکے تھکے سے انداز میں مسکرایا۔

"دیکھ لو... تم میرے لیے کپادوکیہ نہیں آئیں' مگر میں ہر دفعہ تمہارے لیے آجاتا ہوں۔ پھر بھی کہتی ہو مجھے پروا نہیں ہے؟"

وہ ایک دم اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بنا پلک جھپکے وہ یک ٹک اسے دیکھنے لگی۔ پھر اچانک ہی بہت سے آنسو اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

(آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

عالیہ بخاری

دلِ وارستہ

خیام کا تعلق اس دنیا سے ہے جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی ہیں۔ ستارہ نانی، نگینہ خالہ اور دل دار نانی نے اس کی پرورش بے حد نازو نعم سے کی ہے۔ پھر بھی وہ اس زندگی سے سخت کبیدہ خاطر ہے۔ حتیٰ کہ ایک دن وہ اس گھر سے کسی کو بتائے بغیر نکل آتا ہے۔ راستے میں اس کا ٹکراؤ سالار سے ہوتا ہے، جس سے اس کی شناسائی ہے، جو ریڈیو پر کام کرتا ہے۔ سالار تمام معاملہ فی الفور سمجھ جاتا ہے۔ گھر سے نکلتے ہوئے خیام رقم کے علاوہ نانی کے زیورات بھی اٹھا لاتا ہے، جس پر اسے کوئی پشیمانی نہیں ہے۔ سالار، لاری اڈے تک خیام کو چھوڑتا ہے۔ خیام کے لیے سالار کا رویہ حیران کن ہے۔ شہر آکر اسے کئی روز تک بے روزگار رہنا پڑتا ہے۔ وہ بابو شوکت کے ہوٹل میں قیام کرتا ہے۔ زیورات کے ساتھ کیتی آرا کی چوڑیاں دیکھ کر خیام کو شدید جھٹکا لگتا ہے اور پہلی مرتبہ اپنے پیچھے رہ جانے والی کا بھروسا ٹوٹ جانے کا دکھ ہوتا ہے۔

ربیعہ کا تعلق سفید پوش خاندان سے ہے۔ اس کے والد سرکاری محکمے کے ایمان دار ہیڈ کلرک ہیں جبکہ بھائی معاذ بالکل ابا کا پر تو رفاحی کاموں میں وہ ہر چیز بھولے رکھتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنی پڑھائی بھی۔ اماں اور دادی ہر دم معاذ اور ربیعہ کے لیے دعا گو ہیں۔

۶۰

ساٹھویں قسط

آج ٹھیک نصف النہار پر ہی سورج غروب ہوا تھا۔

گیتی آرا نے پوری آنکھیں کھول کر سر جھکائے بیٹھے سالار کی طرف دیکھا۔

"یہ پانی!" اس نے پچھلے ایک گھنٹے سے رکھے گئے پانی کے گلاس کی طرف اس کی توجہ دلائی۔ مگر اس نے اب بھی آنکھ اٹھا کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

ذرا فاصلے پر کارپٹ پر بیٹھی ہوئی زری نے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے گیتی کی طرف دیکھا اور پھر سے رونے لگی۔ گیتی تھکے تھکے سے انداز میں وہیں سالار کے قریب بیٹھی۔

وہ کسے تسلی دے اور کس سے تعزیت کرے؟

روزی سے رقابت کا کانٹا لیے رکھنے کے باوجود بھی پورے خلوص کے ساتھ اس کے لیے آنسو بہاتی زری سے باہر کسی کونے پر بیٹھے دل گرفتہ راجو سے اس قریب بیٹھے بے حد پیارے شخص سے... یا پھر خود سے...

گیتی نے اضطراب سے پہلو بدلا...

"سب ختم ہو گیا گیتی... میں ہار گیا۔" سالار کی آواز کسی سرگوشی کی مانند تھی۔ "ہم ہار گئے..."

گیتی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ سالار کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں...

گیتی نے آج سے پہلے اسے کبھی بھی اتنا شکستہ حال نہیں دیکھا تھا۔

"میں روزی کو انصاف نہ دلا سکا... میں نے راجو سے وعدہ کیا تھا۔ پوری پوری کوشش کی گئی... اچھے سے اچھا وکیل..." باوجود کوشش کے وہ اپنی آنکھوں سے گرتے ہوئے آنسوؤں کو نہیں روک پا رہا تھا... نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے سختی سے دبا کر اس نے خود کو سنبھالے رکھنا چاہا...

"یہاں انصاف بھی بکتا ہے... ظالموں کو کھلی چھوٹ... کمینوں کو اشراف کا درجہ ملتا ہے... ہم کس دور جہالت میں واپس آ گئے ہیں گیتی... عدل اٹھ گیا ہے اور زمین پھر بھی اپنے محور پر قائم ہے۔"

اس کی آواز دھیمی اور ہر لفظ درد میں ڈوبا ہوا تھا۔ گیتی کے پاس اس کے شکوہ کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے دھیرے سے سالار کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا... گھٹی گھٹی سسکیاں لیتی ہوئی زری نے سر اٹھایا۔

"راجو کا کیا ہو گا سالار بھائی... وہ تو مر جائے گا۔ نہیں برداشت کر سکے گا وہ یہ سب..." سالار نے ہتھیلی سے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں کو رگڑا۔

"وہ ہے کہاں... اتنی دیر سے وہ مجھے نظر نہیں آیا ہے۔ اسے اکیلا مت چھوڑو... اللہ نہ کرے کہ وہ کہیں خود کو کوئی نقصان نہ پہنچا لے۔" وہ بے چینی سے کہتا ہوا اٹھ کر کھڑا ہوا... اور اس کے ساتھ ہی زری اور گیتی بھی۔

تب ہی ایک ملازم گھبرایا ہوا لاؤنج کے سرے پر آ کر رکا۔

"صاحب! باہر گیٹ پر راجو کا جھگڑا ہو گیا ہے نبیل صاحب سے۔ ان کے لوگ اسے بری طرح مار رہے ہیں۔"

"کیا؟" سالار بنا کوئی تفصیل پوچھے تیزی سے باہر نکلا اور اس کے پیچھے روتی پیٹتی روزی۔

گیتی نے داخلی دروازے کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر گیٹ کی طرف دیکھا۔ جو بھی ہنگامہ تھا وہ گھر کے باہر ہی ہو رہا تھا۔

پھر بھی ادھ کھلے گیٹ سے جمع ہوتے ہوئے لوگ دکھائی دے رہے تھے اور شور یہاں تک آ رہا تھا۔

"خدا کی پناہ!" گیتی نے اپنے ٹھنڈے پڑتے ہاتھوں کو ایک دوسرے میں پھنسایا... اس کے پیر بے دم ہوتے جا رہے تھے۔

کیا ہو چکا تھا... اور کیا ہونے جا رہا تھا؟

خود کو گھسیٹتی ہوئی وہ دوبارہ لاؤنج کے صوفے پر آ کر بیٹھی۔ قیمتی سامان سے سجے اس بڑے سارے لاؤنج میں

سناٹا سا پھیل رہا تھا... سالار کا گھر۔ جسے خود اس کے اپنے دل نے بھی بڑے مان سے اپنا سمجھنے کی خوش فہمی میں مبتلا ہونا چاہا تھا۔ مگر...

ایک افسردہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر ابھری اور معدوم ہوئی... زیادہ سے زیادہ کل تک وہ یہاں سے چلی جائے گی... ایک ایسے وقت میں سالار کو چھوڑ کر، جب اسے سب سے زیادہ اس کی ضرورت ہے... لیکن شاید اس طرح وہ اسے اس ذلت سے بچا سکے گی۔ جس کے چھینٹے اڑانے کے لیے نبیل اب اور بھی بے تاب اور پُراعتماد تھا۔

سو اس کی یہ سادہ سی محبت بھری گھریلو زندگی... مختصر سے سفر کے بعد اب انجام کو پہنچ رہی تھی۔

اس اتنی بڑی دنیا میں اس کی خوشیوں کا بس اتنا سا ہی حصہ تھا۔

اپنے ڈوبتے ہوئے دل کو سنبھالتے ہوئے گیتی آرا کچھ لمحوں کے لیے باہر گیٹ پر مچے ہنگامے کو بھی بھولی۔

اپنے دکھ سے بڑا شاید کوئی اور دکھ نہیں۔ سو وہ بھی اس کرۂ ارض پر اس وقت سب سے زیادہ دکھی تھی۔

اس کے موبائل کی بیل ہو رہی تھی۔

اس وقت کسی سے بھی بات نہیں کی جا سکتی تھی۔ مگر اسکرین پر آیا ہوا نام نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"السلام علیکم امی!"

"وعلیکم السلام بیٹا! خوش رہو، آباد رہو۔" بڑے عرصے بعد نگینہ کی آواز میں ایک بار پھر خوشی کی کھنک تھی۔

"کیسی ہو تم۔ طبیعت تو ٹھیک ہے نا... اماں بتا رہی تھیں کہ لاہور آنے کا پروگرام ہے تمہارا؟" ایک ہی سانس میں وہ کہتی چلی گئی۔ اس خستہ حالی کے عالم میں بھی، گیتی اس کی خوشی کو محسوس کر کے ہلکے سے مسکرا دی۔

"بے چاری امی!" اس نے دل میں کہا...

"خوش خوش آؤ بیٹا... یہاں تو خود تمہیں اتنا یاد کر رہے ہیں سب کہ حد نہیں... اماں، میں صندل۔ شاما۔ استاد جی..." اور گھر سے باہر کے لوگوں کی فہرست سننے میں اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی، سو بات کاٹ گئی۔

"بس، کل یا پرسوں آجاؤں گی امی!"

"کل پرسوں۔" فون کے دوسرے پرے پر کھڑی نگینہ کو تردد سا ہوا... "تم اپنا پروگرام چند دن آگے بڑھا لو تو اچھا ہو گا بیٹا۔ میں منع نہیں کر رہی لیکن..."

"خیریت تو ہے نا امی؟ کوئی بات ہو گئی ہے کیا؟" دل ہمہ وقت ہی کسی بری خبر کے اندیشے سے ڈرتا رہتا تھا۔ مگر نگینہ کے ساتھ فی الحال کوئی مسئلہ نہیں تھا۔

وہ بڑی زور سے کھلکھلا کر ہنسی۔

"خیر ہی خیر ہے... شکر ہے جو پریشانی کے دن تھے، سو ٹل گئے۔" صندل کے گھر بیٹھ رہنے کے بعد، گھر کی کمزور مالی حالت کو گیتی سے چھپائے رکھنے کی اب تک پوری کوشش کی گئی تھی... مگر اب جبکہ اچھے دنوں کی پھر سے نوید سنائی دے رہی تھی تو پھر اس نے ہلکا سا تذکرہ کر ہی دیا۔

"صندل نے پھر سے کام شروع کر دیا ہے بیٹا... راضی ہو گئی ہے وہ پرفارم کرنے پر... شکر ہے جو اس نے عقل کے ناخن لیے۔ پتا ہے لاکھوں روپے کی آفر ہے صرف ایک رقص کے لیے... خیر سے کام کرنے لگے گی تو پھر سے دن پھر جائیں گے..."

گیتی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اس بات پر کس طرح خوشی کا اظہار کرے...

"پچھلے کئی ماہ تو بڑے ہی سخت گزرے... اور تمہیں تو پتا ہے کہ اب میری بھی ہمت اور صحت جواب دے رہی ہے۔ کہاں گھنٹوں ایک شاٹ کے لیے بیٹھ کر انتظار کر سکتی ہوں... یوں بھی ایکسٹراز میں ناچنے کی عمر بھی کہاں

رہی۔" نگینہ کی آواز دھیمی پڑی تھی۔
ایک چھوٹے سے پل میں نگینہ کی مشقت بھری زندگی، گیتی آرا کے دل پر سے ہوتی ہوئی گزری۔
"حالات خراب تھے تو آپ نے مجھے کیوں نہیں بتایا امی۔۔۔ اتنا غیر کیوں سمجھا مجھے۔۔۔ کیا میں اس قابل بھی نہیں تھی۔۔۔" اس کا اپنی لاپروائی پر مرجانے کو دل چاہا تھا۔
"ارے نہیں۔۔۔ ایسا کچھ نہیں بیٹا۔۔۔ غیر کیوں ہونے لگی۔۔۔ تو ہی تو ہم سب کا غرور ہے۔ ماشاء اللہ عزت دار گھر میں شادی ہوئی ہے۔ اللہ سلامت رکھے سالار کو۔۔۔ لیکن اب ایسے گرے ہوئے بھی نہیں کہ تجھ سے پیسے مانگتے بیٹا! صندل نے سختی سے منع کیا تھا۔۔۔ اور خود ہم میں سے کسی کا بھی دل نہ چاہا تجھ سے کہنے کو۔ شکر ہے مجھے ایک بیوٹی پارلر میں کام بھی مل گیا تھا۔۔۔ اپنے محلے سے خاصا دور۔۔۔ صبح سے رات ہو جاتی۔۔۔"
گیتی کی آنکھوں سے چپ چاپ آنسو گرتے رہے۔ لیکن وہ کچھ ایسا ظاہر کر کے اپنی ماں کو نہ دکھی کرنا چاہتی تھی اور نہ شرمندہ۔۔۔
"آپ مجھے بہت یاد آرہی ہیں امی۔۔۔ اس لیے میں آنا چاہ رہی ہوں۔۔۔ کوشش کروں گی کہ کل ہی کی فلائٹ مل جائے۔۔۔"
"وہی تو کہہ رہی ہوں۔۔۔ دو چار دن رک جا۔۔۔ ہم آرہے ہیں کراچی۔۔۔ میں، صندل اور شاما۔۔۔"
گیتی کے لب حیرت سے کچھ کھلے تھے۔
"ان لوگوں نے منع کیا تھا مجھے کہ تجھے ابھی نہ بتاؤں۔۔۔ اچانک پہنچ کر وہی دینا چاہتے تھے تجھے۔۔۔ وہ کیا۔۔۔ سرپرائز۔" اپنی بات کہہ کر وہ پھر سے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
کتنی خواہش تھی اس کی کہ وہ سب یہاں اس کے گھر آئیں۔۔۔ مگر حالات اجازت ہی نہ دے سکے۔ اور اب تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔۔۔
گم صم سی گلاس وال کے دوسری طرف نظر آتے لان کو دیکھتے ہوئے سوچ گئی۔
باہر سے کوئی اندر نہیں آیا تھا۔
"چار دن بعد فنکشن ہے ادھر کراچی میں۔۔۔ پانچ لاکھ کا چیک مل گیا ہے صندل کو۔ گلناز کی معرفت۔ وہی اس کا پرانا ملنے والا کراچی کا سیٹھ۔۔۔"
"نبیل!" گیتی کو خود اپنی آواز اجنبی لگی تھی۔
"ہاں! وہی۔ تو بھی جانتی ہے نا۔۔۔ لگتا ہے مشہور آدمی ہے کراچی کا۔۔۔" نگینہ کے لہجے میں کچھ اور جوش بڑھا۔
"شکر ہے! اماں نے بھی اعتراض نہیں کیا۔ اب زمانہ بدل گیا ہے۔۔۔"
"امی! آپ فوراً" وہ چیک واپس کردیں اور کسی کو بھی ضرورت نہیں یہاں آنے کی۔ سن رہی ہیں نا آپ؟ فوراً" منع کردیں، میں آپ سے کہہ رہی ہوں۔۔۔" وہ مارے گھبراہٹ کے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔
"ایسے کیسے منع کردیں بیٹا۔ اب تو بات طے ہو چکی ہے۔ صندل تیاری میں لگی ہوئی ہے۔ بڑی مشکل سے تو وہ سنبھلی ہے۔ پھر سے مایوسی میں گھر جائے گی۔ اور ہم ان پیسوں میں سے اچھے خاصے تو خرچ بھی کر چکے ہیں۔ تمہیں یہاں کے حالات نہیں پتا ہیں اصل میں۔۔۔" نگینہ کے لہجے میں کوئی لچک نہیں تھی۔ بدترین سے بہترین اور پھر بدترین کا اتار چڑھاؤ، اس جیسی زمانہ شناس عورت کو کسی بے وقوفی کی اجازت نہیں دیتا تھا۔
"کتنے پیسے چاہئیں۔۔۔ میں لے کر آتی ہوں، لیکن آپ واپس۔۔۔"
"میں نے کہا نا، نہیں۔" اس بار نگینہ کی آواز میں سختی اور بھی نمایاں تھی "صندل کبھی بھی نہیں مانے گی۔۔۔ سالار کے سامنے ہمارا تھوڑا سا بھرم رہنے دو تم۔۔۔ ابھی کوئی آیا ہے۔ میں پھر بات کروں گی۔۔۔" وہ دوسری طرف سے فون

بند کر چکی تھی۔ گیتی نے بے بسی سے سر جھکایا۔
"راجو بھائی کو چوٹیں لگی ہیں۔ وہ ایک دم بے ہوش ہو گئے۔ سالار انہیں لے کر اسپتال گئے ہیں، زری بھابھی بھی ساتھ گئی ہیں۔"
باہر سے آئے ایک ملازم نے نئی اطلاع گوش گزار کی اور دبے قدموں واپس لوٹ گیا۔۔۔ وہ یوں ہی بے تاثر سا چہرہ لیے اپنی جگہ پر بیٹھی رہی۔ راجو، زری، ہار گیا مقصد۔۔۔ سب ہی پس پشت۔
اس نے چاروں طرف پھیلے سناٹے پر نگاہ ڈالی۔۔۔ اسے لگا، جیسے وہ اپنی جگہ سے اٹھنے کی بھی ہمت کھو چکی ہے۔

☆ ☆ ☆

خیام ابھی ابھی گھر سے آیا تھا۔
ابا، دادی اور ربیعہ اس کے ساتھ جویا کو دیکھنے آئے تھے۔ اسپتال کے احاطے میں درخت کے نیچے بینچ پر بیٹھے معاذ کی طرف آنے کے بجائے وہ سیدھے اسپتال کی عمارت کے اندر چلے گئے۔ معاذ افسردگی سے انہیں جاتا دیکھے گیا۔
وہ اسے دیکھنے آئے تھے۔ جو خود کسی کی بھی طرف نہ دیکھنے کا شاید تہیہ کر چکی تھی۔
خیام انہیں چھوڑ کر معاذ کے پاس آکر بیٹھ گیا۔
"بری خبر ہے، معاذ بھائی!"
وہ چونک کر اس کو خالی خالی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ خیام کو فوراً" ہی اپنی غلطی کا احساس ہوا۔
"آپ کو شاید یاد نہیں رہا، آج راجو کے کیس کا فیصلہ تھا۔"
"اوہ ہاں! میں واقعی بھول گیا۔" خیام نے افسردگی سے معاذ کو دیکھا۔
"آپ تو شاید خود کو بھی بھول گئے ہیں۔" اس نے دل میں کہا۔
"کیا بنا اس کیس کا؟ نبیل گرفتار ہو گیا؟"
خیام نے دھیرے سے نفی میں سر ہلایا۔ "کیس خارج ہو گیا۔ ثبوت ناکافی تھے۔ عدالت نے نبیل کو شک کا فائدہ دے کر رہا کر دیا ہے۔"
چند لمحوں کے لیے ان دونوں کے بیچ سناٹا سا چھایا۔
"مجھے اسی کا ڈر تھا۔" ایک ٹھنڈی سانس لے کر معاذ نے فقط اتنا ہی کہا۔ خیام کچھ دیر اس کے مزید کچھ کہنے کا منتظر رہا۔ مگر آج کل اس کے یہ خاموشی بھرے وقفے اسی طرح طویل ہو رہے تھے۔
"آپ وہاں جائیں گے کیا؟"
"ہوں۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں کہاں جا سکتا ہوں ابھی۔۔۔ دعا کرو کہ۔۔۔" وہ جملہ بھی پورا نہ کر سکا۔
"ابا سے کہنا! وہ ضرور چلے جائیں۔ ان کی مورل سپورٹ کی سالار کو ضرورت ہو گی۔" چند لمحوں بعد اس نے خیام کی طرف دیکھ کر کہا تو وہ بھی صرف سر ہلا کر رہ گیا۔
ان چند دنوں میں اس نے پہلی بار معاذ کو اس بری طرح ٹوٹ کر بکھرتے ہوئے دیکھا تھا۔
وہ جتنا اس کے لیے افسردہ تھا۔ اتنا ہی حیران بھی۔
یہ کیسی محبت تھی اور کیسا ردعمل۔
ایک طویل عرصے سے وہ دونوں ایک دوسرے سے قطعی لاتعلق ہیں۔ لیکن محض دنیا کی نظر میں۔ ورنہ ہر

گزرتا ہوا پل انہیں ایک دوسرے کے نزدیک تر کرتا گیا ہے۔ مگر افسوس کسی نے بھی اس بات کو سمجھنا ہی نہیں چاہا۔"

گزشتہ رات دیر تک جب وہ ابا کے پاس بیٹھا تھا تو انہوں نے بے حد دردمندی سے کہا تھا۔

ابا، دادی اور ربیعہ جلد ہی واپس آ رہے تھے۔

"اور وہاں کھڑے ہو کر دیکھتے رہنے کے علاوہ ہے بھی کیا؟" معاذ نے انہیں دیکھ کر سوچا تھا۔

ربیعہ کا چہرہ زرد پڑ رہا تھا۔

اور دادی۔

ان کی طرف دوبارہ دیکھنے کا اسے حوصلہ ہی نہیں ہوا۔ اپنی ضعیفی اور بیماری کے باوجود وہ اگر یہاں تک آئی تھیں تو ان کے دل کا حال بخوبی سمجھ میں آتا تھا۔

"معاذ!" ربیعہ بے ساختہ ہی اس کے گلے لگ کر رونا شروع ہو گئی۔ معاذ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیسے چپ کرائے۔

"کیا بچپنا ہے ربیعہ۔۔۔ ایسے ناامید نہیں ہوتے۔ دعا کرو وہ بڑا رحم کرنے والا ہے۔"

بینچ پر بیٹھتے ہوئے دادی کے لہجے میں سختی تھی۔ معاذ نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔ جذباتیت کے کمزور لمحات سے گزر کر وہ خود پر قابو پا چکی تھیں۔

"اللہ نے چاہا تو جویا ضرور ٹھیک ہو جائے گی۔ اللہ پر بھروسا رکھو۔ یہ رونا دھونا بدشگونی کی باتیں ہیں۔ ادھر آؤ میرے پاس دونوں۔"

وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی سب سے بڑی مورل سپورٹ اور سب سے مہربان سایہ تھیں۔

ان کے کمزور بازوؤں میں لپٹتے ہوئے معاذ اور ربیعہ دونوں ہی نے یکساں سکون اور تحفظ محسوس کیا تھا۔

"اب شاید سب کچھ ٹھیک ہونے ہی والا ہے۔"

ایک مدت بعد دل میں اٹھنے والی ہلکی سی خوش گمانی کا سبب دادی کے دو قدم کی برکت تھی۔ حالانکہ چار سو چھائی تیرگی اب بھی ویسی کی ویسی ہی تھی۔ اس کے بس میں ہوتا تو شاید وہ دیر تک ان کے کندھے سے لگ کر آنکھیں بند کیے رکھتا۔ مگر تب ہی ربیعہ نے ہلکے سے اس کے ہاتھ کو چھوا۔

"معاذ! اظہار چچا۔" اس کی سرگوشی پر ہی معاذ نے آنکھیں کھول کر سامنے دیکھا اور پھر "فوراً" ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

اظہار چچا اور شاکرہ چچی بالکل قریب آ چکے تھے۔ ایک مدت بعد وہ انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ اتنا بدل چکے تھے کہ اسے انہیں پہچاننے میں دقت ہوئی تھی۔

بے حد کمزور، جھکے ہوئے کندھوں والے اظہار چچا۔ وہ ایک دم ہی جیسے بہت بوڑھے ہو چکے تھے۔

"السلام علیکم!" وہ اس کے اتنے قریب کھڑے تھے کہ ناممکن تھا کہ انہوں نے اس کا سلام نہ سنا ہو، لیکن وہ جواب دیے بغیر دادی کی طرف مڑ چکے تھے۔ شاکرہ چچی نے ضرور زیر لب کچھ کہا تھا۔ شاید اس کے سلام کا جواب ہی دیا تھا۔

وہ دانستہ وہاں سے ہٹ کر خیام کے ساتھ چلتا ہوا کچھ فاصلے پر چلا گیا۔

اظہار چچا آج بھی اس سے ناراض ہیں۔ حالانکہ کتنی عجیب سی بات ہے کہ وہ ان کے کبھی آڑے نہیں آیا۔ مگر پھر بھی ان کی شدید نفرت کا مستحق ٹھہرا تھا۔ اس وقت بھی وہ پتا نہیں اسے دیکھ کر کس طرح کنٹرول کر رہے ہوں گے۔

"شاید اسے اسپتال سے بے دخل کرنے ہی آئے ہوں۔ مگر دادی کو دیکھ کر فوری ردعمل نہیں کر سکے۔ معاذ کو ایسا ہی لگا تھا۔

مگر اسے اب ان کے غصے اور نفرت سے کیا فرق پڑتا تھا بھلا۔

خیام اسے اسکول کے بارے کچھ اچھی سی رپورٹ دے رہا تھا۔ اسکول کا نظم و ضبط، بچوں اور ٹیچرز کی بہترین کارکردگی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن چند لمحوں میں ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ کچھ بھی نہیں سن پا رہا ہے۔

"سوری خیام۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا۔

"مجھے یقین ہے کہ تم لوگ اسکول کو مجھ سے کہیں زیادہ اچھے طریقے سے سنبھال رہے ہو اور آگے تم ہی لوگوں کو اسے چلانا بھی ہے، میں تو۔۔۔"

آگے وہ جو کچھ کہنا چاہ رہا تھا۔ خیام کے لیے اس کا تصور بھی محال تھا۔

"کچھ مت کہیے۔" اس نے معاذ کی بات کاٹی تھی۔ "اور آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ زندگی کا کوئی فیز کتنا بھی تکلیف دہ کیوں نہ ہو، آخر تو گزر ہی جاتا ہے۔ یہ بھی گزر جائے گا اور وہ ٹھیک ہو جائیں گی بالکل، ان شاء اللہ۔"

جویا کا نام اس نے "احتراماً" نہیں لیا تھا۔

معاذ نے محبت سے اس کی طرف دیکھا۔ کل تک وہ خود خیام کے لیے سپورٹ تھا اور آج وہ اس کے لیے۔۔۔

"میں تمہارا زندگی بھر شکر گزار رہوں گا خیام! اگر تم نہ بتاتے تو یہ وقت بھی میری بے حسی کی نذر ہو جاتا۔ پتا نہیں کیا ہوتا پھر۔۔۔ شاید میں ہی نہ ہوتا۔" آخری بات اس نے بہت دھیمے سے کہی تھی۔ لیکن خیام نے سن لی تھی۔

"آپ نے کیا طے کر لیا ہے معاذ بھائی! کہ مجھے رلا کر ہی چھوڑیں گے۔" اس نے بڑے اضطراب سے معاذ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا تھا۔

"آپ کی ساری خوشیاں آپ کو حاصل ہوں گی ان شاء اللہ۔ آپ جیسے انسان کو اللہ تعالیٰ کبھی اکیلا نہیں چھوڑیں گے۔ وہ کسی کو نہیں چھوڑتے۔ انہیں اپنے ہر بندے کی فکر ہے۔ یہ میں نے جان لیا ہے۔" وہ پر یقین تھا۔

اور اللہ پر بھروسا رکھنا سیکھ چکا تھا۔

اس کا غصہ اس کا احساس کمتری، اس کی گھبراہٹ سب ہی غیر محسوس انداز میں گم ہوئے تھے۔

"اگر زندگی کا کچھ حصہ تلخیوں یا محرومیوں کی نذر ہو رہا ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں کوئی بہت بڑا انعام دینے والے ہیں۔ ایسا انعام جو اس دنیا میں خوشی اور آخرت میں بخشش کا سبب بن جائے گا۔ بس ہمیں معاف کرنے کا ہنر آنا چاہیے اور سب سے پہلے خود اپنے آپ کو معاف کریں۔ ہر غلطی، ہر بدگمانی کے لیے، یہ سب سے ضروری ہے کیونکہ تب ہی ہم دوسروں کو معاف کرنے کے قابل بنتے ہیں۔" وہ کھوئے کھوئے انداز میں کہہ رہا تھا۔

معاذ کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔

ابا نے اپنے حصہ میں آیا ایک اور چراغ روشن کر دیا تھا اور ان بے حد اداسی بھرے دنوں میں ایک بڑی خوش خبری تھی۔

"میں ان لوگوں کے لیے چائے لے آتا ہوں۔"

اسے اچانک ہی میزبانی کا خیال آیا تھا۔ سو وہ بات ختم کر کے اٹھ گیا۔

معاذ نے تھکے تھکے سے انداز میں درخت کے تنے سے ٹیک لگائی۔ پتا نہیں کیا ہونے والا تھا؟

ڈاکٹر، جویا کی حالت کی طرف سے مایوسی کا اظہار تو نہیں کر رہے تھے۔ لیکن کوئی خاص امید افزا پروگریس بھی

اس کی حالت میں نہیں ہو رہی تھی۔ وہی ایک سختی سے بند آنکھیں، جو کھلنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ وہ کتنی ہی دیر آئی سی یو کے باہر شیشے کے اس پار سے اسے دیکھتا رہتا۔ اس امید پر کہ شاید وہ ایک نگاہ اس کی طرف ڈال ہی لے۔ مگر اس کی پلکوں میں جنبش تک نہیں تھی۔ صرف ایک سانس کی روانی تھی جو اس کی زندگی کا پتا دیتی تھی۔ ورنہ... معاذ نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں۔

کسی برے امکان کا شبہ بھی دل کی دھڑکن کو بری طرح تیز کرتا تھا۔

"خود کو سنبھالو معاذ!" ربیعہ کب دادی اس کے پاس سے اٹھ کر یہاں آکر بیٹھ چکی تھی اور بڑی فکرمندی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا شیو بڑھ رہا تھا اور کپڑے میلے ہونے لگے تھے۔

"میں ٹھیک ہوں ربیعہ! فکر مت کرو۔" اس نے نرمی سے ربیعہ کا سر تھپتھپایا۔ "بس جویا کے لیے دعا کرو کہ وہ ٹھیک ہو جائے۔" معاذ کے لہجے میں بڑی درد بھری بے بسی تھی۔

ربیعہ نے حلق میں اٹکتے ہوئے آنسوؤں کو بمشکل پیا۔

"امی اب بھی نہیں آئیں اسے دیکھنے؟"

ربیعہ اسی ایک سوال سے خوف زدہ تھی۔

"حالانکہ اب تو انہیں اسے معاف کر دینا چاہیے۔ اس زندگی کے جھگڑے یہیں نمٹا دینے چاہئیں۔ انہیں تاحشر اٹھائے رکھنا ضروری تو نہیں۔"

"میں نے انہیں بہت کہا معاذ... ہاتھ تک جوڑ لیے۔ لیکن وہ پتا نہیں کیوں اتنی ضدی ہو چکی ہیں کہ کچھ سننے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔ الٹا تم پر ناراض ہو رہی تھیں کہ تم گھر کیوں نہیں آ رہے ہو۔ انہوں نے بہت سختی سے مجھ سے کہا ہے کہ میں تمہیں آنے کو کہوں۔ اصل میں انہیں شاید اندازہ ہی نہیں ہے کہ جویا اتنی زیادہ بیمار ہے۔"

وہ شرمندہ شرمندہ سی صفائی دے رہی تھی۔

معاذ افسردگی سے مسکرا دیا۔

"نہیں کیا... کسی کو بھی اندازہ نہیں تھا کہ وہ کس تکلیف سے گزر رہی ہے۔ سالہا سال سے نہ انہیں، جو اس کے قریب ترین خونی رشتے تھے اور نہ ہی مجھے، جو دنیا میں سب سے زیادہ اس سے..." بات ادھوری چھوڑ کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ "جانے دو۔"

اظہار چچا کتنے عجیب سے ہو گئے ہیں اور کتنے خاموش سلام دعا کے آگے کوئی بات ہی نہیں کی انہوں نے، بس شاکرہ چچی ہی باتیں کرتی رہیں۔ بہت دکھی ہیں بے چاری۔" ربیعہ بتا رہی تھی۔

وہ محض اس کی خوشی کے لیے سنتا رہا۔

خیام ان لوگوں کو چائے دے کر یہاں بھی تین کپ لے آیا تھا۔ معاذ نے شکر گزار نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ آئی سی یو کی طرف جانے والا راستہ اب خالی تھا۔

"میں ابھی آیا!" وہ آدھا کپ پی کر پھر اس طرف چلا گیا۔ چوبیس گھنٹوں میں وقفے وقفے سے ان گنت بار، یہاں یہی ایک مصروفیت تھی۔

ربیعہ اور خیام نے بے ساختہ ہی ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"آپ نے جو کہا اس کی طرف پہلا قدم بھی اتنی جلدی بڑھا دیا۔ مجھے اب تک یقین نہیں آیا۔"

"یہ سب قدرت کی طرف سے ہے۔ اگر میں اس وقت گیٹ پر نہ جاتا تو کبھی بھی نہیں جان سکتا تھا کہ جویا، معاذ بھائی کے لیے کتنی اہم ہیں۔ لیکن دکھ اس بات کا ہے کہ یہ جاننے میں مجھے کتنی دیر ہوئی۔"

"بس جویا ٹھیک ہو جائے' آپ کو اندازہ نہیں ہے کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے کتنی محبت کرتے ہیں۔"
"مجھے اندازہ ہے۔" وہ بے حد سنجیدہ تھا۔
ربیعہ نے ہلکے سے اثبات میں سر ہلایا۔
بستر پر پڑے ایک ایسے وجود کے لیے جس میں خوب صورتی اور کشش کی اب ہلکی سی بھی رمق نہیں تھی۔ معاذ کی دیوانگی کھلی گواہی تھی۔
"میں صرف معاذ بھائی کی خوشی چاہتا ہوں۔ ہر قیمت پر اور اگر خدانہ کرے' خدانہ کرے' وہ خوش نہ رہے تو میں بھی کبھی خوش نہ رہ سکوں گا۔ کچھ نہیں رہے گا میرے لیے بھی۔" خیام کا خلوص دل کو چھوتا تھا۔
"بھائی' بہت خوش قسمت ہیں کہ آپ ان سے اتنی محبت کرتے ہیں۔"
"نہیں' میں بہت زیادہ لکی ہوں کہ مجھ سے معاذ بھائی اور ابا بے انتہا محبت کرتے ہیں۔ میں آپ کے گھر کا حصہ بنا اور آپ۔۔۔"
اس کی نگاہ ربیعہ کے چہرے پہ جمنے لگی تھی۔ تب ہی وہ بروقت سنبھلا۔ لیکن ربیعہ نے اس چھوٹے سے پل میں اس کی آنکھوں میں اترتا رنگ دیکھا تھا۔
چند لمحوں کی معنی خیز سی خاموشی دونوں کے بیچ آکر رکی تھی۔
"خدا کی پناہ! یہ سچ تھا یا گمان۔"
اس نے دوسری بات پر رک کر یقین کرنا چاہا تھا۔ لیکن خیام جس طرح رخ موڑ کر کہیں اور دیکھنے لگا تھا۔ وہ انداز معاملے کو اور بھی مشکوک کر رہا تھا۔
"میں ذرا دادی کو دیکھ لوں۔"
وہ کہتی ہوئی اٹھی اور بنا خیام کی طرف دیکھے تیز قدم اٹھاتی ہوئی ان لوگوں کی طرف چلی آئی۔
ابا اور اظہار چچا دونوں ہی خاموش تھے۔ لیکن پھر بھی آپس کی سرد مہری میں کمی ضرور محسوس ہو رہی تھی۔
"گھر چلیں دادی! پھر آجائیں گے کل۔" اس نے دادی کے قریب بیٹھتے ہوئے سرگوشی کی تو انہوں نے خود ہی سر ہلا دیا۔
"چلو اظہار! ہم تمہیں بھی گھر چھوڑ دیتے ہیں۔" ابا نے نرمی سے گم صم بیٹھے اظہار صاحب کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو وہ کچھ چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔
ابا کو اپنی بات دہرانی پڑی۔
"نہیں اسلام بھائی! ہم ابھی تھوڑی دیر اور بیٹھیں گے۔ زویا آنے والی ہے۔ وہ آجائے تو۔۔۔" وہ ابا کے ساتھ چلتے ہوئے چند قدم فاصلے پر جاکر کھڑے ہوئے۔
"تم فکر مت کرو اظہار! سب ٹھیک ہو جائے گا ان شاء اللہ۔ اپنا خیال رکھا کرو۔ تمہاری صحت بھی بہت خراب ہو رہی ہے۔"
ابا کی فطری نیک دلی انہیں اظہار چچا سے سارے اختلاف بھلا دینے پر مجبور کر رہی تھی۔ مگر ان کے دل میں کیا تھا۔ اس کا اندازہ انہیں اب تک نہیں ہوا تھا۔
"ہم چلتے ہیں۔ میں رات میں پھر آؤں گا۔ اللہ جویا کو صحت یابی کی طرف لوٹا دے۔ بس یہی دعا ہے۔"
وہ بڑے خلوص سے کہتے ہوئے مڑنے لگے تھے کہ اظہار صاحب نے انہیں روکا۔
"اسلام بھائی!" وہ کچھ کہتے کہتے رکے۔ ابا منتظر نگاہوں سے انہیں دیکھنے لگے۔
"اسلام بھائی۔۔۔! جویا کے علاج پر جو پیسہ آپ نے خرچ کیا ہے اور کر رہے ہیں۔ وہ میں سارا آپ کو ادا کر دوں

گا' ذرا میرے حالات سنبھل جائیں بس۔" بے تاثر سے انداز میں وہ ان سے کہہ رہے تھے۔
"تم مجھ سے الگ تو نہیں اظہار! اور جویا میری بھی بیٹی ہے' اپنے بچوں پر خرچ کا بھی کوئی حساب کتاب ہوتا ہے کیا؟" ابا نے بہت نرمی سے ان سے کہا تھا۔ لیکن وہ اور بھی کچھ کہنا چاہ رہے تھے۔
"ہمارا خاندان والوں سے ملنا برائے نام رہ گیا ہے۔ لیکن پھر بھی جویا کی بیماری کی خبر سب کو ہو ہی جائے گی۔ میں نہیں چاہتا کہ لوگوں کو پتا چلے کہ ہم جویا کا علاج نہیں کرا سکے۔"
"اظہار! کیا تم مجھے اتنا گرا ہوا سمجھتے ہو آج بھی۔۔۔ کسی کو کیوں خبر ہو گی؟ اور کون خبر دے گا؟" ابا کو سخت رنج ہوا تھا ان کی بات پر۔
اظہار چچا چند لمحے بالکل خاموش ابا کے چہرے کو تکتے گئے۔
"ہم جویا کا رشتہ طے کر چکے ہیں۔ شادی ہونے والی ہے اس کی۔ معاذ کو کہیں کہ وہ یہاں سے چلا جائے۔ ان لوگوں کو پتا چلا اس کے بارے میں تو جویا کے لیے مشکل ہو جائے گی۔"
بالآخر ان کے لہجے میں وہی پرانی سرد مہری اتری۔
"پہلے وہ زندہ تو بچ جائے۔ پھر شادی بھی کر دینا اس کی۔" ابا بمشکل ہی اپنا غصہ ضبط کر پائے۔
"جویا کے لیے اور کیا مشکل ہونی ہے اظہار؟ بدترین وقت سے گزر رہی ہے وہ۔ رحم کرو اس پر' اولاد ہے تمہاری' اللہ کے سامنے بھی تم اس کے لیے جواب دہ ہو گے۔ اب اور کس چیز کے منتظر ہو تم آخر۔" ان کی آواز دھیمی تھی' لیکن چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔
ربیعہ دادی کو سہارا دے کر گاڑی کی طرف لے جا چکی تھی۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد بھی اظہار چچا کچھ دیر وہیں کھڑے رہے تھے۔ ابا کے الفاظ کی گونج اب بھی باقی تھی۔ تکرار در تکرار۔
"اپنوں سے زیادہ دوسرا محبت دکھائے تو اس میں دکھاوے اور مطلب پرستی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا ابو! اسلام چچا کا گھرانہ ہمیں صرف ذلیل کرنا چاہ رہا ہے۔ احسان تلے دبا رہا ہے۔ آپ جویا کو فوراً" سرکاری اسپتال میں شفٹ کریں' سب سے قابل ڈاکٹر ہوتے ہیں وہاں۔"
انہیں آپا گل کا فرمان بھی یاد تھا۔ تھکے تھکے قدم اٹھاتے ہوئے وہ اسپتال کی عمارت کی طرف چلتے چلے گئے۔
شا کر وہیں اکیلی بینچ پر بیٹھی رہ گئی تھیں۔ ان میں جویا کی خستہ حالی کو بار بار دیکھنے کی ہمت نہیں تھی۔
ٹھنڈے یخ کوریڈور کے آخری سرے پر آئی سی یو کے باہر کھڑا معاذ کسی بت کی طرح ساکت تھا۔
اس کی نگاہ جویا پر جمی تھی اور آنکھ سے گرتا ہر آنسو حرف دعا تھا۔
کوریڈور میں دوسری طرف سے آتے اظہار چچا نے بڑی خاموشی سے یہ منظر دیکھا تھا۔
شاما کی خوشی بے حساب تھی۔
بڑے ہال کی قسمت پتا نہیں کتنے عرصے بعد جاگی تھی۔ آج کل تقریباً" سارا دن ہی وہاں رونق رہتی۔ صندل نے کراچی والے فنکشن کی بھرپور تیاری شروع کی تھی۔
کچھ ہی دنوں کے نوٹس پر ہونے والا یہ پروگرام کھوئی ہوئی خوش حالی کو دوبارہ حاصل کرنے کی طرف پہلا قدم تھا۔ نائی ستارہ کے چوبارے کی ایک پرانی روایت کے خاتمہ کی اطلاع پورے محلے نے بڑی حیرت سے سنی تھی۔ ان کے گھرانے کی لڑکی کا پرائیویٹ فنکشن کے لیے جانا بڑی بات تھی۔ حالانکہ یہی سب برابر میں رہنے والی خالہ زادوں کے ہاں برسوں پہلے سے رواج پا چکا تھا۔
مگر نانی ستارہ۔
"اونہوں۔۔۔" میرا دل نہیں مانتا نگینہ۔۔۔ کوئی جواز' کوئی دلیل مطمئن نہیں کرتی اور ادھر پرائیویٹ پروگراموں

میں تو سنا ہے بڑی ہی عامیانہ قسم کی پرفارمنس کو پسند کیا جاتا ہے اور اسی کا پیسہ مل رہا ہے۔ گھر میں خود الماس کی مثال موجود ہے۔" گو انہوں نے براہ راست اس معاملے میں دخل نہیں دیا تھا، لیکن پھر بھی۔۔۔

نگینہ کاپی پین سنبھالے کوئی حساب کتاب جوڑ رہی تھی۔ عرصے بعد اتنے پیسے آئے تھے جن کا حساب لکھ کر کرنے کی نوبت آئی تھی۔ سو وہ ایک مسکراہٹ کے ساتھ نانی کے اعتراض کو اڑا رہی تھی۔

"الماس، گلناز کا طریقہ اور ہے اماں۔۔۔ ہم کوئی ان جیسے تھوڑی بن جائیں گے ایک پروگرام سے۔"

"لیکن جا تو ان ہی کے ساتھ رہے ہو۔۔۔ جو توقع لوگ ان سے رکھتے ہیں وہی تم سے بھی رکھیں گے۔ یہ یاد رکھنا وہاں کوئی مسئلہ نہ کھڑا ہو تمہارے لیے۔"

"کچھ نہیں ہوتا۔" اس نے لاپروائی سے ہاتھ ہلایا۔ "ہوتا بھی ہے تو دیکھ لوں گی میں۔ ایک عمر کا تجربہ ہے ان سب سے نمٹنے کا۔ آپ فکر مت کریں۔"

مگر وہ کیسے فکر نہ کرتیں۔ نگینہ کو کاپی پینسل ایک طرف رکھنی پڑی۔

"وقت کے ساتھ خود کو نہیں بدلیں گے تو نری خواری کا ہی سامنا ہے اماں اور بہت کچھ زندگی میں پہلی بار ہی ہوتا ہے۔ یہ بھی سہی۔"

وہ کچھ چپ سی ہو گئیں۔

"گیتی بھی تو آنے کو منع کر رہی ہے تمہیں۔"

"آپ سے کس نے کہا؟"

"میں نے خود سنا، جب تھوڑی دیر پہلے تم اس سے بات کر رہی تھیں کیوں منع کیا اس نے۔۔۔ کچھ تو ہے ضرور۔"

نگینہ کو اپنی بے احتیاطی پر خود پر ہی غصہ آیا تھا۔

"تم صبح برآمدے میں کھڑی بات کر رہی تھیں اور یہاں کمرے تک صاف سنائی دے رہا تھا۔ اگر وہ کل آتی ہے تو آنے دو۔ کیوں منع کر رہی تھیں تم۔۔۔ پتا نہیں کیا مسئلہ ہے اس کے ساتھ؟ میرا تو برا حال ہو رہا ہے فکر سے۔"

نگینہ نے بے ساختہ ہی ماتھے کو چھوا۔

"آپ کا بھی جواب نہیں اماں، ماشاء اللہ لاکھوں ہزاروں میں کھیلتی گیتی آرا کی فکر ہے آپ کو۔۔۔ اور یہاں جو حال ہے، اس کی پروا بھی نہیں۔۔۔ میں نے اسے منع نہیں کیا، صرف یہ کہا ہے کہ ہم آ رہے ہیں، چند دن لگ جاتے، پھر سب ساتھ ہی آجائیں گے واپس۔۔۔"

کھلے دروازے میں سے اسے صندل آتی دکھائی دی تھی۔

"اس کے سامنے مت اعتراض کیجیے گا خدا کے واسطے۔۔۔ میں بری طرح تھک رہی ہوں اماں۔ آگے کا بوجھ صندل ہی کو اٹھانا ہے اور کون ہے ہمارا۔ وہ جس پر مان تھا آپ کو، کب کا بھاگ لیا۔"

آخری جملہ، بس یوں ہی چڑچڑاہٹ میں منہ سے نکلا تھا، سوائے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ کیا کمال دکھا گیا ہے۔ نانی ستارہ کے سارے اعتراضات یکسر ختم ہوئے تھے۔

صندل کے کپڑے تیار ہو کر آئے تھے۔ بہت بھاری اور قیمتی لباس تھا۔ مگر وہ پھر بھی تنقیدی نگاہوں سے جائزہ لے رہی تھی۔

اس کے اپنے فلمی ہیروئین کے اسٹیٹس کا بہت دن بعد خیال آیا تھا۔

"اچھے خاصے بریک کے بعد پبلک کے سامنے آ رہی ہوں۔ ایک ایک چیز کا دھیان رکھنا ہے۔" وہ اس طرح شو کر رہی تھی جیسے یہ کوئی بہت بڑا کنسرٹ ہے جس میں اس کی اسپیشل اپیرنس ہے۔

اس کی دلچسپی نگینہ کے جوش کو اور بھی بڑھا رہی تھی۔

کپڑے شکر ہے اسے پسند آ گئے تھے۔ تین پرفارمنس، تینوں کا الگ لباس۔ شاما انہیں سنبھال کر رکھ رہی

"کچھ عرصہ لگ کر پیسہ کما لینا ہے اور اب کے کوئی بے وقوفی نہیں کرنی، بہت سوچ سمجھ کر انویسٹ کروں گی۔ کوئی

سا بزنس۔۔۔"

اس نے بات ادھوری چھوڑی تھی۔

نگینہ اور شاما دونوں نے بے ساختہ ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

"بزنس!"

"پتا نہیں اس نے کہاں پیسے ڈبونے کی ٹھانی تھی!" دونوں ہی نے ایک سا سوچا تھا۔

"ایک بہت اچھا ویل مینٹین بیوٹی سیلون، جس میں بہت ساری سہولتیں ہو، ایک ہیلتھ سینٹر کا Concept ہو سارا اسٹاف باہر سے تربیت یافتہ آئے گا، وہ نہیں جنہیں بس آئی بروز بنائی اور فیشل کے الٹے سیدھے ہاتھ نے سیکھ گئیں اور لگ گئیں پارلر میں۔"

نگینہ کو ایک دم ہی کھانسی اٹھ گئی۔

شاما دوڑتی ہوئی پانی لے آئی۔

"بے کار میں ہی آج کیری ہری مرچ کا اچار کھا لیا، کہا بھی ہے تجھ سے کہ مت رکھا کر میرے سامنے۔۔۔ مگر تجھے بھی ضد ہے لا کر ٹھیک میرے ہی آگے رکھتی ہے للچانے کے لیے۔" پانی پی کر وہ ایک دم ہی شاما پر برس پڑی۔

موضوع خود بخود ہی بدل گیا۔

"میں بھی چائے بنا کر لاتی ہوں باجی۔۔۔ ادرک والی۔ گلا بالکل صاف ہو جائے گا۔" وہ مسکراتی ہوئی باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔

صندل کپڑے لے کر اپنے کمرے میں جا چکی تھی۔

نگینہ نے ذرا مڑ کر نانی ستارہ کی طرف دیکھا۔

سرِ شام لیٹنا کبھی ان کا معمول نہیں رہا تھا، لیکن اس وقت وہ اپنے بستر پر لیٹ چکی تھیں۔

"کیا ہوا اماں!" وہ ان کے پاس فوراً" ہی آ کھڑی ہوئی۔

"کچھ نہیں، بس سر میں درد ہے۔"

"لائیں میں دبا دوں۔" وہ سرہانے بیٹھنے لگی کہ انہوں نے فوراً" ہی منع کر دیا۔

"نہیں!"

"گولی تو کھا لیں۔"

"کھالی ہے۔"

"بی پی نہ بڑھ رہا ہو، ڈاکٹر کو بلوا لوں؟"

"لائٹ بند کر دو بس، اور تھوڑی دیر سونا چاہ رہی ہوں، رات نیند ہی نہیں آئی۔۔۔ شاید اس لیے۔"

"ٹھیک ہے آرام کر لیں۔" وہ بڑی پھرتی سے لائٹ بند کر کے باہر نکل آئی۔ ایک بار بھی شبہ نہیں ہوا کہ وہ اسے ٹال رہی ہیں۔

اندر نیم اندھیرے کمرے میں نانی ستارہ کے دل پر لگے زخموں سے، پھر کھرنڈ اترا تھا۔

"خیام۔۔۔ خیام۔۔۔ خیام!"

ان کی بوڑھی آنکھوں سے گرتے آنسو چہرے کی جھریوں میں جذب ہوتے ہوئے تکیے کو گیلا کر رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

"خیام!" ابا نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے اسے پکارا۔ وہ کچھ فاصلے پر کیاری کے ساتھ پڑی بید کی کرسی پر بیٹھا کہیں اور گم تھا۔ ان کی آواز پر چونک کر اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاسپٹل جاؤ تو مجھے بھی ساتھ لے لینا۔"

اظہار چچا کی باتوں پر وہ شام سے خاصا کڑھ چکے تھے اور انہیں جویا کے ساتھ اب معاذ کی بھی فکر گھیر رہی تھی۔ اس کی وہاں مستقل موجودگی کوئی بڑا مسئلہ ضرور کھڑا کر سکتی تھی۔

خیام ٹھیک کھڑکی کے نیچے آچکا تھا۔

"آپ کیا کریں گے۔ رات ہو رہی ہے آرام کریں۔ وہاں میں رات میں معاذ بھائی کے پاس ہی رکوں گا۔"

ابا بے ساختہ مسکرائے۔ کسی کسی وقت وہ بڑی اپنائیت سے ان سے اپنی منوانے لگتا تھا۔

"معاذ کو سمجھاؤ، ہر وقت ان لوگوں کے سامنے نہ رہے..... انہیں برا لگ رہا ہے اور ایک طرح سے یہ بھی ٹھیک۔ بنا کسی رشتے ناتے کے اس کا وہاں ہونا لوگوں کو اعتراض کا موقع دے رہا ہے۔"

"کسی کو اعتراض کرنے کا حق نہیں ہے ابا اور کم از کم جب تک وہ ٹھیک نہیں ہوتیں، تب تک تو معاذ بھائی آنے والے نہیں ہیں چاہے کوئی کچھ کہے۔"

اسے ان کی بات اچھی نہیں لگی تھی۔

ایک گہری ٹھنڈی سانس انہوں نے لی تھی۔

"وہ ٹھیک ہو جائے گی انشاء اللہ..... لیکن پھر بھی....."

"کیا ہوا ابا!" خیام نے فکر مندی سے ان کی طرف دیکھا۔

"انہیں آج بھی معاذ ناقابل قبول ہے۔ اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی ان لوگوں نے کچھ نہیں سیکھا۔ وہ معاذ کو وہاں دیکھنا نہیں چاہتے۔ جویا ٹھیک ہو جائے تو وہ اس کی شادی وہیں کریں گے، جہاں وہ چاہتے ہیں۔" ابا افسردگی بھری مایوسی میں گھرے تھے۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا..... آپ نے سن کیسے لی یہ بات معاذ بھائی کی خوشی کو کوئی ان سے نہیں چھین سکتا! کبھی بھی نہیں..... میں کسی کو ایسا کرنے نہیں دوں گا، یہ بات طے ہے۔" وہ ایک دم ہی جذباتی ہوا تھا۔

ابا نے ایک خاموش سی نظر خیام کے تپتے ہوئے چہرے پر ڈالی۔ اس کے انداز میں بڑی خود اعتمادی تھی۔

وہ اندر سے شاید فطری طور پر بہت مضبوط تھا۔ چھوٹی سی عمر میں گھر چھوڑنے کا بڑا فیصلہ اور پھر ایک اذیت بھرے تنہا سفر کے بعد یہاں تک پہنچنا.....

"کھانا کھا لیا تم نے؟" انہوں نے جان بوجھ کر بات بدلی۔

"جی نہیں، میں وہیں معاذ بھائی کے ساتھ کھالوں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" ربیعہ سے کہو، وہ تم دونوں کا کھانا نکال دے۔" خیام سر جھکائے مڑنے لگا تھا۔

"اور سنو، مہربانی کر کے وہاں کچھ ایسا نہ کرنا جس سے کوئی تلخی بڑھے..... سوچنے دو مجھے!" وہ کچھ جھنجلائے سے تھے خیام نے بمشکل اپنی مسکراہٹ پر قابو رکھا تھا۔

"فکر مت کریں..... میں کھانا لے لوں جا کر۔"

"ہوں!"

پچھلے احاطے میں چمپا کے پھولوں کی مہک پھیل رہی تھی خیام تیز قدم اٹھاتا ہوا کچن میں داخل ہوا تھا۔

...نے اسے کھڑکی سے آتا ہوا دیکھ لیا تھا۔

...پہر کو جو کنفیوژن ہاسپٹل کے احاطے میں پھیلا تھا۔ اس کا اثر اب تک تھا۔
...نے کے بعد سے اس کی مستقل کوشش تھی کہ خیام سے سامنا نہ ہی تو بہتر ہے۔ مگر اب وہ پھر ٹھیک سر پر آ...ا ہوا تھا۔

"میں کھانا نکال کر لا رہی ہوں۔" تیزی سے لنچ باکسز نکالتے اور کھانا گرم کرتے ہوئے اس نے خود کو لاپروا ظاہر ...نے کی پوری کوشش کی۔

"آپ رہنے دیں..... میں یہیں کھڑا ہوں۔" وہ دروازے سے ہٹ کر کھڑا تھا۔

ربیعہ نے کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ شاید فکر مند تھا۔

"جویا کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا!" پہلا خیال ہی آیا تھا۔

"ہوں!" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"پھر کیا ہوا ہے؟" ایک بار پھر وہ خود کو اس کی طرف دیکھنے سے نہ روک سکی۔

"کچھ بھی نہیں!" اس بار وہ بے ساختہ مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ اس کی دل کشی کو اور بھی بڑھاتی تھی۔

بھلا لڑکوں کے لیے بھی اتنی اچھی شکل کا ہونا کیا ضروری ہے؟ وہ دل ہی دل میں جھنجلائی۔

"یہ لیں۔" شاید آج سے زیادہ پھرتی اس نے کبھی نہیں دکھائی تھی۔

"کیا آپ مجھ سے ناراض ہیں ربیعہ؟" جو کچھ وہ جتانا چاہ رہی تھی۔ اس تک پہنچ گیا تھا۔

"نہیں تو....." وہ مڑ کر کسی اور کام میں مصروف ہونے لگی۔

"اچھا..... مجھے ایسا لگا تھا!"

"غلط لگا!" اس نے بغیر خیام کی طرف دیکھ کر کہا تھا۔

...نہیں کیا تھا کیبنٹ میں، جو ملنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا اس نے چند لمحے ربیعہ کے متوجہ ہونے کا انتظار کیا ...پھر باہر نکل گیا۔

ایک سکون بھری سانس ربیعہ کے لبوں سے آزاد ہوئی۔

کچن کاؤنٹر کے پاس پڑے اسٹول پر بیٹھ کر وہ یوں ہی بلا مقصد کھڑکی سے پچھلے احاطے کی طرف دیکھنے گئی۔ آج ...ن بادلوں سے ڈھکا جا رہا تھا۔ چاند، ستارے سب گم ہوئے اور خیالات میں عجیب سی بے ترتیبی آئی تھی.....

"اور وہ بھی اتنے نامناسب وقت میں....." اس نے خود پر ہنسنا چاہا مگر آنکھ کے کونے پر آکر رکا ایک آنسو.....

"ربیعہ، ربیعہ!" شائستہ امی اسے آواز دیتی ہوئی ادھر ہی آرہی تھیں۔ تیزی سے آنکھوں کو رگڑ کر وہ کچن کے ...وازے میں آکر کھڑی ہوئی۔

"معاذ کا کھانا بھجوا دیا!" اسے دیکھتے ہی انہوں نے پوچھا تھا۔

"شکر ہے، جو خیام اس کے ساتھ ساتھ ہے۔ ورنہ میں تو فکر سے مر ہی جاتی..... کتنی دیر ہو گئی ہے اسے گئے ...ئے۔"

"بس ابھی دس منٹ پہلے!"

"تمہیں کیا ہوا ہے؟" انہیں اس کی اتری ہوئی شکل دیکھ کر تشویش ہوتی۔

"کچھ نہیں امی! بس سر میں درد ہے؟"

"منع بھی کیا تھا۔ دوپہر کو ہاسپٹل جانے کی کیا ضرورت ہے۔ لیکن تم سب نے وہ نہ کرنے کی قسم کھالی ہے۔

جو میں کہوں گی..... اماں کو دیکھ لو' ویسے گھر میں بھی نہیں چلتیں پھرتیں' لیکن وہاں پہنچ گئیں۔"

"جویا کی حالت اچھی نہیں ہے امی!" ربیعہ نے انہیں ایک بار پھر یاد دلانا چاہا تھا۔

"ہاں تو کیا لوگ بیمار نہیں پڑتے..... دنیا سے انوکھی بیمار ہے وہ..... مگر یہاں تو سارا گھر ہی باولا ہوا جا رہا ہے۔ وہ صاحبزادے وہاں جا کر بیٹھ گئے ہیں۔ اپنی ساری ذلت بھلائی سو بھلائی۔ ماں باپ کی عزت کا بھی کوئی خیال نہیں رہا۔ نہیں کون بدبخت تھا' جو تمہارے ابا کو جویا کی بیماری کی اطلاع دے گیا۔ ورنہ میں نے تو....." ادھوری بات چھوڑ کر انہوں نے ربیعہ کو ناراضی سے دیکھا۔

"اب جا کر گولی تو کھالو کوئی سر کے درد کی' زیادہ ہو گیا تو اور تکلیف دے گا۔"

"جی' جا رہی ہوں!" وہ کہتی ہوئی کوریڈور کی طرف جلدی سے مڑ گئی۔

"خیام کو اللہ سلامت رکھے۔ ساری ذمہ داری اٹھا رکھی ہے' معاذ میں تو سدا کی لاپرواہی ہے لیکن اب تو حد ہی کر دی۔ یہ شاکرہ کا خاندان آسیب کی طرح لپٹا ہوا ہے میرے گھر سے اللہ رحم کرے ہم پر۔" وہ بولتی ہوئی اس کے پیچھے آرہی تھیں۔

ابا نے ان سے چھپا لیا تھا کہ جویا کی بیماری کی خبر خیام کے ذریعے پہنچی تھی۔

"شکر ہے یہ بھی۔" ربیعہ نے دادی کے کمرے کی طرف مڑتے ہوئے سوچا۔

☼ ☼ ☼

گھنے گھرے بادل رات کو اور بھی تاریک کر رہے تھے۔ جس وقت وہ گھر پہنچا ہلکی بارش شروع ہو چکی تھی..... اور ہوا اور بھی تیز اور ٹھنڈی۔

فاتحانہ غرور کے ساتھ چلتا ہوا وہ گھر کے داخلی دروازے سے اندر آیا تھا۔

آج اس کا دن تھا! صبح عدالت کے فیصلے کے بعد راجو کو ہاسپٹل پہنچا دینے تک ایک بھرپور جشن منانے کے بعد وہ کچھ دیر کے لیے آرام کرنے آیا تھا۔

گیتی نے اس کے قدموں کی لڑکھڑاہٹ سے ہی اندازہ لگایا تھا کہ وہ نارمل نہیں ہے۔ اتنے ہنگامے کے بعد آج اس کا گھر آنا متوقع نہیں تھا۔

کم از کم اس کے لیے تو ہرگز بھی نہیں۔ سو وہ جلدی سے اوپر جاتی سیڑھیوں کی طرف مڑی تھی کہ وہ اس کے آگے آکھڑا ہوا۔

"اب تو یقین آگیا نا' میں جو کہتا ہوں۔ وہ کر کے بھی دکھا دیتا ہوں۔ کیا بگاڑ سکا سالار میرا اس دو ٹکے کی لڑکی کے لیے مجھے پھانسی پر چڑھوانا چاہتا تھا ....." اس کا لہجہ بے حد سرد تھا۔

گیتی نے اپنا دل بیٹھتا ہوا محسوس کیا۔ سالار اب تک گھر نہیں آیا تھا اور اس اتنے بڑے گھر میں وہ تقریباً" اکیلی تھی۔

"ہاں میں کہتا ہوں کہ روزی نے میری وجہ سے خودکشی کی۔ حالانکہ زندہ رہتی تو نقصان میں نہ رہتی۔ عیش کرا دیتا میں اسے' لیکن اسے ذلت کی موت مرنا تھا سو مر کر بھی اپنا تماشہ بنوا گئی آخ!" انتہا کی ہر حد کو پار کرتی ہوئی حقارت

گیتی کا دل بہت زور سے کانپا تھا۔

وہ بھول چکا تھا کہ اس کا کوئی خدا بھی ہے۔

"میں جو چاہوں' وہی ہوگا' کوئی نہیں روک سکتا مجھے۔ ایک اشارے پر ہے سب کچھ اور اب تمہاری اور راجو کی باری ہے گیتی آرا اس سنڈے کلر میگزین تمہاری بہن کی میرے ساتھ رقص کرتی تصویروں سے بھرا ہوگا۔ سالار بیگ کی سالی معروف رقاصہ صندل....."

وہ بری طرح ہنستا چلا گیا۔

گیتی کا چہرہ زرد پڑ چکا تھا۔

وہ جو کہہ رہا تھا وہی ہونا تھا۔

اب اسے ایک فیصد بھی اس بارے میں شبہ نہیں رہا تھا۔ اپنی پوری ہمت جمع کر کے وہ الٹے پاؤں مڑی اور بھاگتی ہوئی سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔

نبیل اونچی آواز میں ہنستا ہی چلا جا رہا تھا۔

گھر کے سناٹے میں گونجتے ہوئے اس کے قہقہے گیتی کے تعاقب میں تھے اسے لگا جیسے وہ اس کے پیچھے ہی آرہا ہے مگر پیچھے مڑ کر دیکھنے کی اس میں ہمت نہیں تھی۔

کمرے کے کھلے دروازے میں داخل ہو کر اس نے پوری قوت کے ساتھ دروازہ بند کر کے لاک کیا تھا۔

اس کا سانس بری طرح بے ترتیب ہو چکا تھا اور آنکھیں خوف سے پھیل رہی تھیں۔ سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے بڑے سے شیشے میں نظر آتا عکس' خود اسے بھی اجنبی لگا تھا۔

تب ہی اسے احساس ہوا کہ اس کا دوپٹہ کہیں سیڑھیوں پر ہی گر چکا تھا..... اور اس کا موبائل۔

گیتی نے بے تابی سے نگاہ دوڑائی۔

موبائل فون کہیں نہیں تھا۔

اچانک ہی اس کی ہمت بالکل ہی جواب دے گئی۔ دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر روتی ہوئی وہ وہیں زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

باہر بارش تیز ہوتی جا رہی تھی۔

زری' سالار کے ساتھ جس وقت گھر واپس آئی' رات کافی سے زیادہ بیت چکی تھی' بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک طوفانی سا تاثر دے رہی تھی۔

سالار نے گاڑی انیکسی کے دروازے کے بالکل قریب آکر روکی تھی۔

"میں آؤں کیا زری؟" اس نے زری کے اترنے سے پہلے پوچھا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں سالار بھائی' آپ جا کر گیتی بھابھی کو دیکھیں۔ اتنی دیر سے ان کا فون بند جا رہا ہے۔ میں اتنی دیر میں راجو کی پرانی میڈیکل رپورٹس نکالتی ہوں اور جو چیزیں لے کر جانی ہیں اسپتال..... وہ بھی لے لیتی ہوں۔"

"بس ایک رات کی بات ہے' کل دوپہر تک راجو ان شاء اللہ گھر آجائے گا۔"

"جی ان شاء اللہ۔"

"راجو نے بہت گہرا صدمہ لیا ہے سالار بھائی..... اب پتا نہیں دوبارہ سنبھلنے میں کتنا عرصہ لگے گا۔ ادھر اس کے والدین منتظر ہیں ہمارے آنے کے' انہیں آپ جواب دیجئے گا میں نہیں سمجھا سکتی۔"

وہ بہت اداس اور الجھی ہوئی تھی۔ سارا دن روتی رہی تھی۔ سالار کو اس پر بہت رحم آیا تھا۔

اس غریب کی محرومیاں بھی کیا کم تھیں بھلا۔

"میں کرلوں گا بات' سب ٹھیک ہوجائے گا۔"

"ٹھیک ہی تو نہیں ہوتا سالار بھائی' راجو پہلے ہی دکھی تھا' اوپر سے میں آگئی اس کی زندگی میں... بھابھی کہتی تھیں کہ میرے منحوس قدم ہیں۔ جہاں جاؤں گی' خوشی پہلے رخصت ہوجائے گی۔ راجو کو بھی میری نحوست..."

"بکواس کرتی ہے تمہاری بھابھی... خبردار جو یہ الٹی سیدھی باتیں سوچیں۔ بہت خوش رہو گے تم اور راجو ہمیشہ... اللہ پر بھروسا رکھو۔ وہ ہر ایک کے ساتھ انصاف کرنے والا ہے۔ آج جو ہوا' وہ حرف آخر نہیں ہے زری۔ شاباش جاؤ... جلدی کرو... میں آتا ہوں دس' پندرہ منٹ میں۔"

باہر بارش دھواں دھار ہورہی تھی۔

زری بھاگ کر سیڑھیاں چڑھ گئی' تو سالار نے گاڑی کو بیک کرکے گھر کے رہائشی حصے کی طرف موڑ دیا۔ بارش کی وجہ سے لان اور سامنے کا حصہ خالی تھا۔ گیٹ پر بنے گارڈ روم کی لائٹس البتہ جل رہی تھیں۔ بادل بہت زور سے گرجا تھا۔

زری نے داخلی دروازے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ وہ کھلتا چلا گیا۔

اسے بے اختیار راجو یاد آیا۔

کھلے دروازے پر وہ کتنا زیادہ غصے میں آجاتا تھا۔

لیکن وہ آج بھی لاپروا تھی۔

گھر میں گھپ اندھیرا تھا۔ اپنے پیچھے دروازہ بند کرتے ہوئے اس نے سوئچ بورڈ کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اچانک ہی وہ کسی کی مضبوط گرفت میں آئی۔

خوف و دہشت سے اس کی زبان خشک ہوئی تھی۔ وہ جو بھی تھا اس کی گرفت سے نکلنا' ناممکن تھا۔

"خدا... خدا کے لیے۔" التجا ٹوٹ کر اس کے لبوں سے نکلی۔

تب ہی بجلی کی تیز چمک اس اندھیرے برآمدے کی کھڑکیوں پر پڑ کر سارے ماحول کو روشن کرتی چلی گئی۔

نبیل کا وحشت ناک چہرہ زری کے سامنے تھا۔

اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ کسی بڑے دھماکے کی زد میں تھا۔ تار تار ہوتے کپڑوں میں خود کو بچاتی ہوئی یہ لڑکی۔ کوئی اور نہیں' خود اس کی سگی بہن تھی۔

وہ دیوانہ وار دروازے کی طرف بڑھا تھا۔ برآمدے کی کھڑکی سے وہ تیز ہوتی بارش میں دوڑتا ہوا گھر کی طرف جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے پیچھے کوئی آسیب لگا ہو۔

بارش کی پھسلن میں وہ دوبار پھسل کر گرا بھی۔ مگر پھر بھی اس نے اٹھنے میں دیر نہیں کی تھی۔

کیچڑ میں لت پت۔

انیکسی زری کی ہسٹریکل چیخوں سے گونج رہی تھی۔

سالار نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ سیڑھیوں پر پڑا گیتی کا دوپٹہ اور پھر کمرے کے دروازے پر گرا اس کا موبائل اٹھایا۔

"کیا ہوا تھا یہاں؟" کسی بہت بڑے امکان نے سر اٹھایا تھا۔

"اگر گیتی کو ہلکا سا بھی نقصان پہنچا ہے تو وہ ابھی اسی وقت نبیل کو قتل کردے گا۔" پہلی بار اس نے اس حد تک جاکر سوچا تھا۔

"گیتی... گیتی۔"

اندر گیتی نے خوف زدہ نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔

"دروازہ کھولو گیتی!" باہر سے سالار کی آواز مستقل آرہی تھی۔ وہ بہت پریشان تھا۔ بلکہ شاید خوف زدہ۔

گیتی بمشکل دروازہ تک پہنچی تھی۔

تب ہی' بارش کے اس شور میں فائر کی آواز گونجی تھی۔ گیتی نے پلک جھپکتے میں لاک کھولا تھا۔

سامنے سالار کھڑا تھا۔

"یہ فائر!" گیتی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

سالار نے بے ساختہ گیتی کو گلے لگایا۔

نیچے کی منزل میں ایک دم ہی ہنگامہ جاگ اٹھا تھا۔

☼ ☼ ☼

صبح بادلوں سے ڈھکی تھی۔

ایمبولینس ابھی شور مچاتی بڑے سے سیاہ گیٹ سے نکلی تھی اور اس کے ساتھ ہی پولیس کی گاڑی بھی۔ گھر کے سارے ملازمین بہت مستعد نظر آرہے تھے۔ سالار دروازے کے ساتھ سب سے اوپر والی سیڑھی پر کھڑا تھا۔

"اندر چلو بیٹا۔" برابر میں کھڑے یوسف کمال نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ تو وہ بنا کچھ کہے ان کے ساتھ اندر لاؤنج میں چلا آیا۔

"اس نے اپنے سر پر گولی ماری تھی۔ آن اسپاٹ ختم ہوگیا۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے بعد تدفین کی اجازت مل جائے گی۔ میں نے زرتاج کے وکیل کو اطلاع کردی۔ جو ان لوگوں کا پروگرام ہو۔ ہمارا کوئی واسطہ نہیں ہے۔ سمجھے تم۔ میری بات ہوچکی ہے پولیس اتھارٹیز سے۔"

انہوں نے بہت سکون بھرے انداز میں معاملے کو مختصر کیا۔

سالار نے ایک گہری سانس لی۔

اس سارے عرصے میں یوسف کمال ایک بڑی سپورٹ ثابت ہوئے تھے۔ وہی واحد شخص تھے جنہیں اس نے نبیل کے خودکشی کرنے کے بعد سب سے پہلے اطلاع دی تھی۔ اس لیے کہ وہ زرتاج بیگم کے بھائی تھے۔

"میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ نبیل جیسا شخص اس عبرت ناک انجام کو پہنچے گا۔"

وہ اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

سالا کا چہرہ بے تاثر تھا۔

وہ خودکشی کی وجہ کو کسی کے بھی ساتھ شیئر نہیں کرسکتا تھا اور نہ اس نے کی تھی۔

"ابھی چند گھنٹے پہلے تک وہ اپنی کامیابی کے نشے میں بدمست تھا اور اب کچھ بھی نہیں۔ ایک انگلی تک نہیں ہلا سکتا' محض مٹی کا ڈھیر' خدا کی پناہ۔" وہ اندر تک کانپ گئے تھے۔

"یہ سب اس کے بھید ہیں انکل اور اس کے انصاف سے بڑھ کر کون انصاف کرنے والا ہے۔ لوگ ظلم کی ہر حد کو پار کرتے ہیں اور اس کی زمین پر اکڑ کر چلتے ہیں۔ یہ بھول کر کہ غرور کبھی کسی کو راس نہیں آسکتا اور ظالم اس کی گرفت سے دور نہیں ہے۔"

سالار کی آواز دھیمی تھی۔

یہ سب کچھ جو ہوا۔ اسے ہلا کر رکھ چکا تھا۔ کھلے ہوئے گیٹ سے خیام گاڑی اندر لا رہا تھا۔ برابر والی سیٹ پر

بیٹھے ہوئے ابا نے محبت سے خیام کی طرف دیکھا۔

وہ بالکل پرسکون تھا۔ "کیا دیکھ رہے ہیں۔"

"کچھ نہیں بیٹا۔۔۔ فخر ہوتا ہے تم پر، تم میرے، بہت فرماں بردار بچے ہو۔"

"میں نے آپ سے لوگوں کو معاف کرنا سیکھ لیا ہے ابا اور اس سے پہلے خود کو معاف کر چکا ہوں اور یہ بات میں خود کو روزانہ یاد دلاتا ہوں۔ تاکہ بھول نہ جاؤں۔"

گھر کے لمبے ڈرائیووے سے گزر کر اس نے گاڑی روکی اور ان کے ساتھ اُتر آیا۔

سالار کے گھر ہونے والے حادثے کی اطلاع سن کر اس نے خود ابا کے ساتھ چلنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔

سالار نے ان لوگوں کو آتا دیکھ کر بہت خوش گوار حیرت محسوس کی تھی۔

"سمجھ میں نہیں آتا اس حادثے پر کیا کہوں، بس خدا کے حضور بار بار معافی مانگتے رہنے کا مطلب سمجھ میں اور بھی اچھی طرح آتا ہے۔" ابا سالار سے گلے ملتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

خیام ان سے ایک قدم پیچھے، بہت پُرسکون انداز میں کھڑا تھا۔ "کیسے ہیں سالار آپ؟"

ابا مل کر ہٹ چکے تو اس نے نرمی سے کہتے ہوئے سالار کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ دل کی گہرائی سے اٹھتی ہوئی خوشی کی لہر نے سالار کے چہرے کو روشن کیا تھا۔

"خیام!" بہت محبت سے وہ اس کے گلے لگا تھا۔

خیام کو بے ساختہ علی الصبح کا وہ وقت یاد آیا جب لاہور کے بس اسٹاپ پر وہ آخری بار اس کے گلے لگا تھا۔ تب چلتی ہوئی بس کے ساتھ بھاگتے ہوئے اس کے۔۔۔ ہاتھ میں ناشتے کا پیکٹ پکڑانا۔۔۔ فون نمبر کارڈ۔۔۔ فکر مند انداز میں کی جانے والی نصیحتیں۔

اور اس کے بعد بھی جب وہ زندگی کے مایوس ترین دور سے گزر رہا تھا وہ اس تک پہنچا تھا۔

گیتی آرا اور نانی ستارہ کی محبت اور تڑپ کا پیغام لے کر۔ مگر ہر بار وہ اسے مایوس کرتا رہا۔

ابا مسکرا کر کمال صاحب کے پاس جا بیٹھے تھے۔ سالار سے الگ ہوتے ہوئے اس نے اپنی آنکھوں میں آتے آنسوؤں کو ہتھیلی سے خشک کیا تھا۔

"میں بتا نہیں سکتا، تمہیں دیکھ کر میں کتنا خوش ہوں خیام، اللہ کا شکر ہے۔"

خیام کے چہرے پر پرسکون مسکراہٹ تھی۔

"آپ کو اور گیتی کو شادی کی دلی مبارک باد میری طرف سے۔" سالار کی مسکراہٹ اور گہری ہوئی۔

"آؤ میں تمہیں گیتی سے ملواتا ہوں۔ آج کل وہ کچھ بیمار ہے، لیکن دیکھنا تمہیں دیکھ کر کتنی خوش ہوگی۔" سالار نے کہتے ہوئے اجازت طلب نظروں سے ابا کی طرف دیکھا اور خیام کا ہاتھ پکڑ کر اوپر جاتی سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔

کمال صاحب کی نگاہ ایک پل کے لیے بھی خیام کے چہرے سے نہیں ہٹی تھی۔ سیڑھیوں سے اوپر جاتا وہ جب تک انہیں نظر آیا وہ اسے دیکھتے گئے۔

ان کی آنکھوں میں پھیلی محرومی دل دکھاتی تھی۔

"کمال صاحب!" ابا نے نرمی سے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا تو وہ چونک سے گئے۔

"اللہ کا شکر ہے کہ اب وقت آگیا ہے کہ آپ کی امانت آپ کے سپرد کروں۔ میں کل یا پرسوں خیام کو لے کر آپ کے گھر آؤں گا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ اب وہ آپ کو مایوس نہیں کرے گا۔"

کمال صاحب صرف انہیں دیکھے گئے۔

شاید وہ کچھ کہنے کے بھی قابل نہیں تھے۔

لبوں پر آئی مسکراہٹ اور آنکھوں میں آتے آنسوؤں کا عجیب تال میل تھا۔

"اولاد بہت قیمتی اثاثہ ہے کسی بھی انسان کا۔ لیکن اس کے حقوق کی ادائی میں غفلت انسان کو دنیا کا بھی محرم بناتی ہے اور اس سے کہیں زیادہ اللہ کا۔۔۔ یہ معصوم بچے دنیا میں یوں ہی بھٹکنے کے لیے کس دل سے چھوڑ دیے جاتے ہیں۔۔۔ پتا نہیں۔"

جملہ ادھورا چھوڑتے ہوئے انہوں نے افسردگی سے ہاتھ سے لاعلمی کا اشارہ کیا۔

یوسف کمالی کی نگاہ ندامت سے جھکی تھی۔

☼ ☼ ☼

خیام نے پریشان نگاہوں سے سالار کی طرف دیکھا تو اس نے مطمئن سے انداز میں سر ہلا دیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت رو لینا ہی گیتی کے لیے سب سے بہتر علاج ہے۔

"گیتی سنبھالو خود کو۔" خیام نے نرمی سے اسے الگ کیا۔ "تم ماشاء اللہ بہت خوش قسمت ہو، جو تمہیں سالار جیسے اچھے انسان ملے ہیں۔ میں بہت، بہت خوش ہوں تمہارے لیے۔"

گیتی آرا روتے روتے مسکرا دی تھی۔

"بیٹھو! تم سے، بہت ساری باتیں کرنی ہیں۔"

دوپٹے سے چہرے کو صاف کرتے ہوئے گیتی نے خود کو پہلی بار اتنا آزاد محسوس کیا تھا۔ کتنے دباؤ، کتنے خوف، کتنی شرمندگیاں۔۔۔ سب زائل ہوئی تھیں۔ سالار انہیں وہیں چھوڑ کر ملحقہ کمرے میں داخل ہوا تھا۔

زری سامنے ہی بیٹھی تھی۔

اس کا چہرہ اب بھی سفید پڑا ہوا تھا مگر اس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں۔ سالار کو اس نے جس بے بسی کے ساتھ دیکھا تھا۔ وہ اس کی اندرونی کیفیت کو ظاہر کرتا تھا۔

"جو ہوا اسے بھولنا آسان تو نہیں ہے زری۔۔۔ لیکن پھر بھی بھولنے کی کوشش ضرور کرو۔ یہی بہتر ہے۔" اس کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھتے ہوئے سالار نے نرمی سے کہا۔

"خدا کا شکر ہے کہ اس نے تمہاری حفاظت کی اور ایک بات، نبیل کی خودکشی کی وجہ میں نے کسی سے بھی شیئر نہیں کی ہے۔ گیتی سے بھی نہیں۔" وہ کچھ کہتے کہتے رکا۔ "اور میں تم سے بھی یہی درخواست کرتا ہوں کہ تم کسی سے کچھ نہیں کہنا، ایک لفظ بھی نہیں۔ خاص طور پر راجو سے۔۔۔ بہت سی باتوں کو پی لینا بہتر ہوتا ہے۔ اس کی تلخی تکلیف دیتی ہے لیکن آگے آنے والی الجھنوں سے بچا بھی لیتی ہے۔ سمجھ رہی ہو نا میری بات۔۔۔"

زری نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا۔

(آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

کبھی چھپایا نہیں جو گناہ مجھ سے ہوا
بتا دیا جو سفید و سیاہ مجھ سے ہوا

یہ بارِ ہجر بھی تیرے سپرد کر دیتا
بس اک یہی نہ مرے کج کلاہ مجھ سے ہوا

میرے خلاف گئی آخری شہادت بھی
کہ منحرف بھی ہوا تو گواہ مجھ سے ہوا

تُو جانتا ہی نہیں مزاجِ ہم سفری
یہی بہت ہے جو اتنا نباہ مجھ سے ہوا

بس ایک تُو تھا جسے رائیگاں کیا میں نے
اور ایک عشق تھا جو بے پناہ مجھ سے ہوا

سلیم جیت بھی میری تھی، ہار بھی میری
عجب مقابلہ عز و جاہ مجھ سے ہوا

سلیم کوثر

تمہیں بخشی ہے دل پر حکمرانی، اور کیا دیتے
یہی تھی ہماری راجدھانی، اور کیا دیتے

سجا کر سر ہتھیلی پر گئے تھے کوئے جاناں میں
ہم اپنے عشق میں ان کو نشانی اور کیا دیتے

وہ ہم سے مانگتا تھا عمر کا اک دل نشیں حصّہ
نہ دیتے اس کو ہم اپنی جوانی، اور کیا دیتے

ستاروں سے کسی کی مانگ بھرنا اک فسانہ ہے
تمہارے نام لکھ دی زندگانی، اور کیا دیتے

بچھڑتے وقت اس کو اک نہ اک تحفہ تو دینا تھا
ہمارے پاس تھا آنکھوں میں پانی، اور کیا دیتے

لب و گفتار کی شہزاد موجیں مسکراتی رہیں
ہم اس بحرِ محبت کو روانی، اور کیا دیتے

شاہد انور شہزاد

سُنتے آئے ہیں کہ دستار پہ سر جاتے تھے
زندگی کے لیے کیا لوگ تھے کہ مر جاتے تھے

بیٹھ کر چاند کی کشتی میں کہیں جھیل کے پار
ہم سرِ شام کسی خواب نگر جاتے تھے

اگلے وقتوں میں سُنا ہے کہ پرانے کچھ لوگ
آنکھوں آنکھوں میں جہانوں سے گزر جاتے تھے

اپنی آنکھوں میں تپش ایک جہاں کی لے کر
وسعتِ نیل میں کچھ لوگ اُتر جاتے تھے

مدّتوں تک در و دیوار بلائیں لیتے!
جب بھی آوارہ کبھی لوٹ کر گھر جاتے تھے

طاہر شیرازی

محبت کی تلاش میں
بھٹکنے والی لڑکی
بھول گئی تھی کہ
محبت ہر ایک کو نہیں ملتی
کچھ لوگ سدا بھٹکتے ہی رہتے ہیں
کہ جن کی آنکھیں تو
جاگتی رہتی ہیں
پر مقدّر سوئے رہتے ہیں

نوشین اقبال نوشی

صبا سحر

فرق

چاندنی رات کی مسحور کن فضا میں ایک عاشق نے اپنی محبوبہ سے کہا۔
"میں تم سے اتنی محبت کرتا ہوں... اتنی محبت کرتا ہوں۔ جتنی آج تک کسی نے نہ کی ہوگی۔"
محبوبہ نے اکتا کر جواب دیا۔ "مجھے تو کوئی خاص فرق نہیں محسوس ہوتا۔"

(سمیرا بشیر... گلشن اقبال)

جواب

خاتون نے دکان سے سوئیٹر کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد دکان دار سے پوچھا۔ "کیا اسے بارش میں بھی پہن سکتے ہیں؟"
"کیوں نہیں۔ سوئیٹر بھیڑ کی اون سے بنا ہے اور یقیناً" آپ نے کبھی کسی بھیڑ کو بارش میں چھتری لے کر تو جاتے نہیں دیکھا ہوگا؟" سیلز مین نے خوش اخلاقی سے جواب دیا۔

(منال تبسم... سرگودھا)

افسوس

ایک صاحب کو اداس بیٹھے دیکھ کر ایک جاننے والے نے اداسی کا سبب پوچھا۔ صاحب نے آہ بھر کر جواب دیا۔ "میرا ایک پرانا دوست میری بیوی کو لے کر بھاگ گیا ہے۔"
"اوہ! یہ تو بہت برا ہوا۔" جاننے والے نے افسوس سے کہا۔
"مجھے تو کل سے ہی اپنے دوست کی حالت پر رونا آرہا ہے۔" اس نے پھر آہ بھر کر کہا۔

(نرمین لودھی... سرگودھا)

مرمت

ایک صاحب کو ورکشاپ کے مالک نے فون کیا۔
"جناب! میں کار ورکشاپ سے بول رہا ہوں۔ آپ کی بیگم صاحبہ ابھی ابھی اپنی کار مرمت کے لیے لائی ہیں۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ...."
"اچھا بھئی! جتنے پیسے خرچ ہوں گے، میں دے دوں گا۔" ان صاحب نے اکتا کر ورکشاپ والے کی بات کاٹی تو وہ جھنجھلا کر بولا۔
"جناب! میں کار کی مرمت کی بات نہیں کر رہا۔ میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ ورکشاپ کی مرمت کون کرائے گا؟"

(انیلا سرفراز... کراچی)

کارگر

ایک چیف کانسٹیبل ماہر حیوانات بھی تھے۔ ایک دن ان کے گھر فون آیا جوان کی بیگم نے ریسیو کیا۔ آدمی نے پریشان لہجے میں پوچھا۔ "کیا ڈاکٹر صاحب گھر ہی ہے؟"
"جی ہاں! مگر کیا آپ کو جانوروں کے ڈاکٹر کی حیثیت سے ان کی مدد درکار ہے یا بطور پولیس آفیسر...؟" ڈاکٹر صاحب کی بیگم نے پوچھا۔
"دونوں حیثیتوں سے۔ ہمارا کتا منہ نہیں کھول رہا کیونکہ اس کے منہ میں ایک ڈاکو کی ٹانگ ہے۔" اطمینان سے جواب ملا۔

(رخسار ظفر... اقبال ٹاؤن)

سمجھ داری

بیٹے نے باپ سے پوچھا۔ "ابو! لڑائیاں کیسے شروع ہوتی ہیں؟"
"بیٹا! فرض کرو۔ روس اور امریکہ میں ناراضی ہوجاتی ہے۔" باپ نے بیٹے کو سمجھانا شروع کیا۔ پاس ہی بیوی بیٹھی تھی فوراً بولی۔
"یہ ناممکن ہے۔ بھلا روس اور امریکہ میں کیوں ناراضی ہونے لگی۔"
"ارے بیگم! میں تو صرف مثال دے رہا ہوں۔" شوہر نے آرام سے کہا۔
"تم بچے کے ذہن میں فضول باتیں مت بٹھاؤ۔" بیوی نے غصے سے کہا۔
"لیکن فرض کرنے میں تو کوئی حرج نہیں ہے۔" شوہر بے چارگی سے بولا۔
"حرج ہے۔ اس سے بچے کا ذہن خراب ہوگا۔" بیوی کو پھر اعتراض ہوا۔
"تم ہمیشہ میری بات میں ٹانگ اڑاتی ہو۔" شوہر بھی ایک دم غصے میں آگیا۔
"تم بدتمیز آدمی...."
"بس کیجیے ابو، امی! میں سمجھ گیا۔ لڑائی کیسے شروع ہوتی ہے۔" بیٹے نے جواب دیا۔

(ترنم اعجاز... گلستان جوہر)

نسخہ

ایک دولت مند مگر کنجوس خاتون بازار سے گزر رہی تھیں۔ راستے میں ان کی ملاقات اپنے فیملی ڈاکٹر سے ہوگئی۔ موصوفہ کو نزلہ، زکام کی شکایت تھی۔ انہوں نے سوچا کیوں نہ موقع سے فائدہ اٹھایا جائے اور فیس کے بغیر ڈاکٹر سے دوا معلوم کرلی جائے۔ سو انہوں نے ڈاکٹر صاحب سے سلام دعا کے بعد فوراً پوچھا۔
"معاف کیجیے گا ڈاکٹر صاحب! جب آپ کو نزلہ ہوتا ہے تو آپ کیا کرتے ہیں؟"
ڈاکٹر صاحب خاتون کی کنجوسی سے واقف تھے، شائستگی سے بولے۔
"سیدھی سی بات ہے، فوراً" چھینک مار لیتا ہوں۔"

(مسرت جبیں... ڈیفنس)

راز کی بات

باپ نے بیٹے کو پاس بلا کر نصیحت کی۔ "میں تمہیں آج ایک راز کی بات بتا رہا ہوں۔ جب تم بڑے ہوجاؤ تو شراب بالکل نہ پینا۔"
"کیوں ڈیڈی!" بیٹے نے سوال کیا۔
"کیونکہ شراب پینے سے انسان کو چیزیں دوگنا نظر آتی ہیں۔ مثلاً" وہ جو سامنے دو لڑکے کھڑے ہیں۔ وہ تمہیں چار نظر آئیں گے۔"
"لیکن ڈیڈی! وہ تو صرف ایک لڑکا ہے۔" بیٹے نے ادب سے جواب دیا۔

(رشیدہ بتول... اورنگی ٹاؤن)

مطالعہ

ایک مرتبہ ایک سردار جی نے لائبریری سے کتاب لی اور اگلے دن واپس کرنے گئے تو لائبریرین سے کہنے لگے۔
"اف! اتنی بور کتاب۔ اتنے زیادہ کریکٹرز اور اسٹوری بالکل بھی نہیں تھی۔"
لائبریرین نے متانت سے جواب دیا۔ "جناب! آپ پہلے آدمی ہیں جو مطالعے کے لیے ٹیلی فون ڈائریکٹری لے کر گئے تھے۔"

(الماس تنویر... ہزارہ)

شگفتہ جاہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت فاکہ بن مغیرہ کی آزاد کردہ لونڈی سائبہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ وہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس گئیں تو ان کے گھر میں ایک نیزہ پڑا ہوا دیکھا۔ انہوں نے کہا۔

"ام المومنین! آپ اس (نیزے) کا کیا کرتی ہیں؟"

انہوں نے فرمایا۔ "ہم اس کے ساتھ چھپکلیاں مارتے ہیں کیونکہ ہمیں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا تو زمین میں جو بھی جانور تھا، اس نے آگ بجھائی، سوائے چھپکلی کے، وہ تو (آگ تیز کرنے کے لیے) پھونکیں مارتی تھی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قتل کرنے کا حکم دیا ہے۔"

فوائد و مسائل:۔

1۔ چھپکلی کو مار دینا چاہیے۔

2۔ جس چھپکلی نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے جلائی ہوئی آگ میں پھونکیں ماریں وہ تو صدیوں پہلے مر گئی لیکن اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ یہ جانور طبعاً شریر ہے جس طرح گدھا اپنی طبیعت کے لحاظ سے شیطان سے مناسبت رکھتا ہے۔

3۔ چھپکلی نقصان دہ جانور ہے اور ایسے جانور کو قتل کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ اس سے واقعی نقصان پہنچے، جیسے سانپ اور بچھو وغیرہ کو قتل کیا جاتا ہے خواہ انہوں نے کسی کو نہ کاٹا ہو نہ ڈنک مارا ہو۔

قول حضرت علی رضی اللہ عنہ

کوئی گناہ لذت کی وجہ سے مت کرنا کیونکہ لذت ختم ہو جائے گی گناہ باقی رہے گا۔

اور

کوئی نیکی تکلیف کی وجہ سے مت چھوڑنا کیونکہ تکلیف ختم ہو جائے گی نیکی باقی رہے گی۔

سنہری باتیں،

٭ ظالم کے ظلم سے نہیں بلکہ صابر کے صبر سے ڈرو۔

٭ کسی کو حقیر مت سمجھو کیونکہ راستے کا معمولی پتھر بھی منہ کے بل گرا دیتا ہے۔

صباحت گجرات

مسلمانوں کو گالی دینا،

حضرت بہی رحمتہ اللہ علیہ کہتے ہیں حضرت عمر کے بیٹے عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہہ دیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔

"اگر میں عبداللہ کی زبان نہ کاٹوں تو میرے اوپر نذر واجب ہے۔"

لوگوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے اس بارے میں بات کی اور ان سے معافی کی درخواست کی، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔

"مجھے اس کی زبان کاٹنے دو تاکہ آئندہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی صحابی کو گالی نہ دے سکے۔"

کفایت شعاری،

حضرت میمون کہتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے ایک نوجوان بیٹے نے آپ سے لنگی مانگی اور کہا۔ "میری لنگی پھٹ گئی ہے۔"

حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا۔

"لنگی جہاں سے پھٹی ہے وہاں سے کاٹ دو اور باقی کو سی کر پہن لو۔۔۔"

اس نوجوان کو یہ بات اچھی نہ لگی تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا۔

"تیرا بھلا ہو، اللہ سے ڈر، اور ان لوگوں میں سے نہ بن جو اللہ تعالیٰ کے رزق کو اپنے پیٹوں میں اور اپنی پشتوں پر ڈال دیتے ہیں یعنی اپنا مال کھانے اور لباس پر خرچ کر دیتے ہیں۔"

اللہ کی راہ میں،

شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ سے کسی نے پوچھا۔

"باباجی ہم اللہ کی راہ میں کس کو دیں کیونکہ ہمیں نہیں پتا چلتا کہ کون مستحق ہے اور کون غیر مستحق؟"

انہوں نے فرمایا۔ "اے نادان! تو اللہ کی راہ میں مستحق کو بھی دے اور غیر مستحق کو بھی۔ تجھے اللہ تعالیٰ وہ بھی دے گا جس کا تو مستحق ہے اور جس کا مستحق نہیں بھی۔" سبحان اللہ۔

نبیلہ خان مون۔ عبدالحکیم

بڑے لوگوں کی بڑی باتیں،

، اچھا دوست جتنا بھی برا بن جائے اس سے دوستی کبھی مت توڑنا کیونکہ پانی چاہے جتنا بھی گندا ہو جائے، آگ بجھانے کے کام آتا ہے۔

، جب تک تمہیں یقین ہے کہ اللہ کے خزانے ختم نہیں ہو سکتے تب تک اپنی روزی کے بارے میں پریشان نہ ہونا۔

، حسد کرنے والا موت سے پہلے مر جاتا ہے۔

، کسی پر اعتماد نہ کرو جب تک اسے غصے میں نہ دیکھ لو۔

، موت کو یاد رکھنا تمام برائیوں کی شفا ہے۔

، خوشی انسان کو اتنا نہیں سکھاتی جتنا کہ غم۔

، سچائی ایسی دوا ہے جس کی لذت کڑوی مگر تاثیر میٹھی ہے۔

ام ایمان۔ کوٹ چھٹہ

کچھ موتی چنتے ہیں،

٭ لوگوں کے لیے تم تب تک اچھے ہو، جب تک ان کی امیدوں پر پورا اترو۔ اور سبھی لوگ اچھے ہیں جب تک تم ان سے کوئی امید نہ رکھو۔

٭ جہاں روٹی مزدور کی تنخواہ سے مہنگی ہو جائے وہاں دو چیزیں سستی ہو جاتی ہیں۔ عورت کی عزت اور مرد کی غیرت۔

٭ کوئی جنت کا طالب ہے کوئی غم سے پریشان ہے۔ غرض سجدہ کرواتی ہے، عبادت کون کرتا ہے۔

٭ محبوب گلیوں میں نظر نہیں آتے، ان کو دل کے خلوت کدوں میں تلاش کرو۔

٭ جذباتی لوگ دوسروں کے لیے کم اپنے لیے زیادہ نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔

٭ جسے رشتے کا پاس نہیں، وہ کسی اور سے محبت نہیں کر سکتا۔

رضوانہ شکیل راؤ۔ لودھراں

آٹھ قیمتی خزانے،

ایک روز شیخ شفیق رحمتہ اللہ علیہ نے اپنے شاگرد حاتم سے پوچھا۔

"حاتم! تم کتنے دنوں سے میرے ساتھ ہو؟"

انہوں نے کہا۔ "بتیس برس سے۔"

شفیق بلخی رحمتہ اللہ علیہ نے پوچھا۔ "بتاؤ اتنے طویل عرصے میں تم نے مجھ سے کیا سیکھا؟"

حاتم نے کہا۔ "صرف آٹھ مسئلے۔"

شیخ نے کہا۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون۔ میرے اوقات تیرے اوپر ضائع چلے گئے۔ تو نے صرف آٹھ مسئلے سیکھے۔"

حاتم نے کہا۔ "استاد محترم! زیادہ نہیں سیکھ سکا اور جھوٹ بھی نہیں بول سکتا۔"

شیخ نے کہا۔ "اچھا بتاؤ کیا کچھ سیکھا ہے؟"

حاتم نے کہا۔ "میں نے مخلوق کو دیکھا تو معلوم ہوا ہر ایک کا محبوب ہوتا ہے قبر میں جانے تک۔ جب بندہ قبر میں پہنچ جاتا ہے تو اپنے محبوب سے جدا ہو جاتا ہے اس لیے میں نے اپنا محبوب "نیکیوں" کو بنا لیا ہے کہ جب میں قبر میں جاؤں گا تو یہ میرا محبوب میرے ساتھ قبر میں رہے گا۔

2۔ لوگوں کو دیکھا کہ کسی کے پاس قیمتی چیز ہے تو

اسے سنبھال کر رکھتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا ہے۔ پھر فرمانِ الٰہی (سورہ نحل آیت 96) "جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ خرچ ہو جانے والا ہے۔ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی باقی رہنے والا ہے۔" تو جو چیز مجھے قیمتی ہاتھ آئی اسے خدا کی طرف پھیر دیا تاکہ اس کے پاس محفوظ ہو جائے۔ جو کبھی ضائع نہ ہو۔

3:۔ میں نے خدا کے فرمان پر غور کیا (سورۃ النازعات آیت 40) "اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا اور نفس کو بری خواہشات سے باز رکھا، جنت اسی کا ٹھکانہ ہوگا" تو اپنے نفس کو برائیوں سے لگام دی، خواہشات نفسانی سے بچنے کی محنت کی۔ یہاں تک کہ میرا نفس اطاعت الٰہی پر جم گیا۔

4:۔ لوگوں کو دیکھا ہر ایک کا رجحان دنیاوی مال، حسب نسب، دنیوی جاہ و منصب میں پایا۔ ان امور میں غور کرنے سے یہ چیزیں ہیچ دکھائی دیں۔ ادھر فرمانِ الٰہی الحجرات، آیت 13 پڑھی۔ "درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو (تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیز گار ہے" تو میں نے تقویٰ اختیار کیا تاکہ اللہ کے ہاں عزت پاؤں۔

5:۔ لوگوں میں یہ بھی دیکھا کہ آپس میں گمان بد رکھتے ہیں۔ ایک دوسرے کو برا کہتے ہیں۔ دوسری طرف اللہ کا فرمان (زخرف آیت 32) دیکھا "دنیا کی زندگی میں ان کی بسر اوقات کے ذرائع تو ہم نے ان کے درمیان تقسیم کیے ہیں۔" اس لیے میں نے حسد کو چھوڑ کر خلق سے کنارہ کر لیا اور یقین ہوا کہ قسمت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے، خلق کی عداوت سے باز آ گیا۔

6:۔ لوگوں کو دیکھا ایک دوسرے سے سرکشی اور کشت و خون کرتے ہیں۔ اللہ کی طرف رجوع کیا تو فرمایا کہ (فاطر آیت 6) "درحقیقت شیطان تمہارا دشمن ہے اس لیے تم بھی اسے اپنا دشمن سمجھو۔" اس بنا پر میں نے صرف اس اکیلے شیطان کو اپنا دشمن ٹھہرا لیا۔ اور اس بات کی کوشش کی کہ اس سے ہوشیار رہوں۔

7:۔ لوگوں کو دیکھا کہ پارہ نان (روٹی کے ٹکڑے) پر اپنے نفس کو ذلیل کر رہے ہیں۔ ناجائز امور میں قدم رکھتے ہیں۔ میں نے ارشاد باری تعالیٰ دیکھا (ہود آیت 6) "زمین پر چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں ہے جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو۔" پھر میں ان باتوں میں مشغول ہوا جو اللہ کے حقوق میرے ذمہ ہیں۔ اس رزق کی طلب ترک کی جو اللہ کے ذمے ہے۔

8:۔ میں نے خلق کو دیکھا کہ ہر ایک کسی عارضی چیز پر بھروسا کرتا ہے۔ کوئی زمین پر بھروسا کرتا ہے کوئی اپنی تجارت پر۔ کوئی اپنے پیشے پر، کوئی بدن پر، کوئی ذہنی و علمی صلاحیتوں پر بھروسا کیے ہوئے ہے۔ اور ہر کوئی اپنی طرح کی مخلوق پر تکیہ کرتا ہے۔ میں نے خدا کی طرف رجوع کیا۔ یہ ارشاد دیکھا۔ (طلاق آیت 3) "جو اللہ پر بھروسا کرے اس کے لیے وہ کافی ہے" تو میں نے اپنے خدا پر توکل کیا وہی مجھے کافی ہے۔"

شیخ بلخیؒ نے فرمایا۔ "اے میرے پیارے شاگرد حاتم! خدا تمہیں ان کی توفیق نصیب کرے۔ میں نے جب قرآن کے علوم پر مطالعہ کیا تو ان سب کی اصل جڑ انہیں آٹھ مسائل کو پایا۔ ان پر عمل کرنے والا گویا چاروں آسمانی کتابوں کا عامل ہوا۔

(بحوالہ احیاء العلوم غزالیؒ)

ثمرہ، اقرا۔ کراچی

خلیل جبران نے کہا

٭ عورت درخت کے اس پتے کی مانند ہے جو ہوا کے لطیف جھونکے سے ہی ہل جاتا ہے مگر اس کے ساتھ ساتھ ایسی چٹان ہے جو بڑے بڑے طوفانوں کے سامنے سینہ سپر ہو جاتا ہے۔

٭ تو شبنم کے قطرے پر غور کر، تجھے سمندر کا راز معلوم ہو جائے گا۔

٭ کانٹوں سے ڈرنے والی انگلیاں، پھولوں کی نرمی محسوس نہیں کر سکتیں۔

٭ جو مرد عورت کی ادنیٰ کمزوریوں کو معاف نہیں کرتا وہ اس کی اعلیٰ خوبیوں سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا۔

٭ جب دو عورتیں باتیں کرتی ہیں تو ان کی باتوں کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔

٭ بارش کا ایک چھوٹا سا قطرہ یوں تو کچھ بھی نہیں لیکن اس کی قدر و قیمت صرف صحرا ہی جان سکتا ہے۔

علمہ شمشاد حسین۔ کراچی

خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

عالیہ خضر ______ ہارون آباد
جانے کس راہ سے آجائے وہ جانے والا
ہم نے ہر سمت سے دیوار گرا رکھی ہے

عاصمہ رمضان ______ گجرات
زندگی تیرے تعاقب میں یہ لوگ
اتنا چلتے ہیں، کہ مر جاتے ہیں

بشریٰ گوندل ______ کوٹ مومن
میں لوگوں سے ملاقاتوں کے لمحے یاد رکھتا ہوں
میں باتیں بھول جاتا ہوں، لہجے یاد رکھتا ہوں
میں یوں تو بھول جاتا ہوں خراشیں تلخ باتوں کی
مگر جو زخم گہرے دیں، رویے یاد رکھتا ہوں

کوثر پروین ______ میاں چنوں
کیا کہا؛ بلاوجہ بدنام ہو گئے
نہیں نہیں صاحب ضرور محبت کی ہوگی

امبر گل ______ جھڈو (سندھ)
ہجر کی شب کا کسی اسم سے کٹنا مشکل
چاند پورا ہو تو پھر درد کا گھٹنا مشکل
قوتِ غم ہے جو اس طرح سنبھالے ہے مجھے
ورنہ بکھروں کسی لمحے تو سنبھلنا مشکل

ملائکہ کوثر ______ بسم اللہ پور
مانا وہ ایک خواب تھا، دھوکا نظر کا تھا
اس بے وفا سے ربط مگر عمر بھر کا تھا
ہم آج بھی خود اپنے ہی سائے میں گھر گئے
سر میں ہمارے آج بھی سودا سفر کا تھا

سائرہ مجید ______ فیصل آباد
خود کو بکھرتے دیکھتے ہیں، کچھ کر نہیں پاتے ہیں
پھر بھی لوگ خداؤں جیسی باتیں کرتے ہیں
ایک ذرا سی جوت کے بل پر اندھیاروں سے بیر
پاگل دیے ہواؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

فوزیہ ثمر بٹ ______ گجرات
یوں بھی نہیں کہ میرے بلانے سے آگیا
جب وہ نہیں سکا تو بہانے سے آگیا
ہم کرکے بات پھنس گئے اپنے ہی جال میں
کیسا پلٹ کے تیر نشانے سے آگیا

سورٹھ ساند ______ روجل والی گاؤں
مرتا ہوں کہ مر مٹوں گا آخر
جینے کو تو عمر بھر جیا ہوں
دھل جاؤں گا اگلی بارشوں میں
دیوار پہ چاک سے لکھا ہوں

سونیا ربانی ______ قاضیاں محلہ بالا
غروب ہوتے ہوئے آفتاب کی مانند
بچھڑ کے اس نے طبیعت اداس کردی ہے
وہ عمر جس میں ہمیں خود سے ملنا تھا
وہ عمر صرف تری جستجو میں کردی ہے

سمیرا لورین ______ لاہور
کوئی ہنس کے ملے، غنچۂ دل کھلے، چاک دل کا سلے
ہر قدم پر نگاہیں بچھاتا رہا شوقِ آوارگی!

فارحہ اقبال ______ کراچی
ایک ہمیں آوارہ کہنا کوئی بڑا الزام نہیں
دنیا والے دل والوں کو اور بہت کچھ کہتے ہیں

سونیا ربانی ______ قاضیاں محلہ بالا
دسمبر کی شبِ آخر نہ پوچھو کس طرح گزری
یہی لگتا تھا ہر دم وہ ہمیں کچھ پھول بھیجے گا

نوشابہ منظور ______ پھریا روڈ
یہ دسمبر کہ جس میں کڑی دھوپ بھی میٹھی لگنے لگے
تم نہیں تو دسمبر سلگتا رہا، چاند جلتا رہا

☆

تبصیر نشاط

مرڈر

ہمارے فنکاروں سے بات کی جائے تو وہ اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ اپنے فن کی معراج حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن جناب! اس کا کیا جائے کہ اکثر فنکار پڑوسی ملک میں کام کرنے کو ہی فن کی معراج سمجھتے ہیں۔ (خواہ فن کے نام پر کچھ بھی کرایا جائے۔) خاص طور پر ہماری اداکارائیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بالی ووڈ میں کام کرنے کے لیے سرحدی حدود بندیوں کے ساتھ ساتھ اخلاقیات کی حدیں بھی پار کر جاتی ہیں۔ اس وقت وہاں کئی پاکستانی فنکارائیں کام کر رہی ہیں۔ حال ہی میں ایک پاکستانی فنکارہ مونالیزا کی فلم "مرڈر 3" ریلیز ہوئی ہے۔ جس میں انہوں نے تمام اخلاقی حدود اور ملکی عزت و وقار کا "مرڈر" کر دیا ہے۔ مونالیزا نے اس فلم میں اپنا نام تبدیل کرکے کام کیا ہے۔ کیونکہ انہیں وہم تھا کہ ان کا نام ان کے لیے خوش بختی کا باعث نہیں ہے۔ (ایں.... ؟ تو لباس بھی نام ہی کا حصہ ہوتا ہے کیا؟) چنانچہ انہوں نے معروف اداکارہ صوفیہ لورین کے نام پر اپنا نام "سارہ لورین" رکھ لیا ہے۔

(سارہ لورین جی! اپنے اصلی نام کو ترک کرتے ہی آپ اپنا اصل بھی بھول بیٹھیں کہ آپ کی شناخت ایک مسلمان ملک ہے۔ وہاں آپ اس ملک کے ایک نمائندہ کی حیثیت سے گئی تھیں.... اور جو کام آپ نے کیا ہے، اسے حاصل کرنا خوش بختی نہیں۔ بلکہ یہ تو سیاہ بختی کی علامت ہے۔)

روٹی

شاہد آفریدی کا شمار پاکستان ہی نہیں، بلکہ دنیا کے

مقبول ترین کرکٹرز میں ہوتا ہے۔ ان کی بے پناہ مقبولیت کی وجہ ان کا شان دار جارحانہ کھیل تو ہے ہی۔ تاہم اس میں ان کی پرکشش شخصیت کا بھی خاصا عمل دخل ہے۔ خاص طور پر نوجوان لڑکیوں میں ان کی مقبولیت کی وجہ ان کی سحر انگیز شخصیت ہی ہے۔(کیونکہ وہ کھیل کی باریکیوں سے واقف نہیں ہوتیں ناں!) شاہد آفریدی باصلاحیت کرکٹر ہونے کے ساتھ ایک ذہین انسان بھی ہیں۔

وہ جانتے ہیں کہ روٹی کپڑا اور مکان ہر انسان کی بنیادی ضروریات ہیں۔ لہٰذا ڈھلتی عمر اور ماند پڑتے کھیل کا احساس ہوتے ہی انہوں نے جھٹ پٹ ایک بوتیک کھول ڈالا۔ کرکٹ چونکہ مردانہ کھیل ہے اور شاہد آفریدی مقبول زیادہ صنف نازک میں ہیں۔ سو اس بوتیک میں انہوں نے مردانہ وزنانہ ہردو قسم کے ملبوسات کا خیال رکھا۔ کچھ عرصے بعد انہیں خیال آیا کہ معاشی مسائل سے نبرد آزما اکثر لوگ تن ڈھانپنے کو دو جوڑے ہی کافی سمجھتے ہیں۔ چنانچہ شاہد آفریدی نے انسان کی سب سے بڑی کمزوری بھوک کی طرف توجہ دی کہ پاپی پیٹ تو ہر روز اپنا خراج چاہتا ہے۔ ویسے بھی سارے دنیاوی گورکھ دھندے پیٹ کی خاطر ہی تو ہیں ناں۔ گزشتہ دنوں شاہد آفریدی نے لاہور میں ایک ریسٹورنٹ قائم کیا ہے۔ اس کی افتتاحی تقریب میں عمران خان مہمان خصوصی تھے۔ جبکہ عاطف اسلم، ہمایوں سعید، معمر رانا، جان ریمبو اور صاحبہ سمیت کئی نامور ستاروں نے شرکت کی۔ شاہد آفریدی مستقبل میں اس ریسٹورنٹ کی دیگر شاخیں ملک کے دیگر شہروں میں بھی قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

مرا ہوا ہاتھی

معروف اداکارہ انجمن سے کون واقف نہیں۔ انہیں شوبز سے کنارہ کشی اختیار کیے ایک مدت گزر گئی۔ لیکن وہ ابھی تک شائقین فلم کے ذہنوں سے محو نہیں ہو سکی ہیں۔ اسی بات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک معروف پاکستانی فلم ساز نے انہیں شوبز میں دوبارہ لانے کا سوچا۔ اس کے لیے انہوں نے انجمن سے رابطہ قائم کیا۔ انجمن گو شوبز سے دور ہیں، مگر وہ رہتی تو اسی دنیا میں ہی ہیں ناں..... سو وہ موجودہ دور کی ہیروئنوں کے بڑھتے ہوئے معاوضوں سے خوب اچھی طرح واقف ہیں۔ لہٰذا! انجمن نے کام کرنے کے لیے پندرہ لاکھ روپے کے معاوضے کا مطالبہ کر دیا۔ (غالباً" انجمن نے سوچا ہوگا کہ جب آج کل کی ہیروئنیں فن سے ناواقف ہونے کے باوجود بھی ایک خطیر معاوضہ لیتی ہیں تو ایک بے مثال فنکارہ ہونے کے باعث وہ کیوں نہیں لے سکتیں۔) لیکن جناب! وہ فلم ساز انجمن کو اتنی بڑی رقم دینے کے موڈ میں نہیں تھے۔ لہٰذا بات بن نہ سکی اور یوں انجمن کی شوبز میں واپسی نہ ہو سکی۔

(انجمن نے سن رکھا ہوگا ناں کہ ہاتھی تو مر کے بھی سوا لاکھ کا ہوتا ہے..... اور جب یہ مثال بنی تھی تو اس وقت کے سوا لاکھ آج کے سوا ارب کے برابر تو ہوں گے ہی۔ اس لحاظ سے تو انہوں نے کم ہی رقم کا مطالبہ کیا ہے۔ مگر یہ نادان فلم ساز اتنی گہری بات کیا جانیں۔)

کچھ اِدھر سے کچھ اُدھر سے

وینا ملک کو صرف پبلسٹی چاہیے۔ اس کے لیے وہ کچھ بھی کر سکتی ہے۔ اشمیت میرا بھائی ہے۔ میں جانتی ہوں، وہ وینا ملک کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتا تھا۔

(ایشیا پاٹیل)

جنرل شاہد عزیز کی کتاب اور ایک ٹی وی انٹرویو پر رد عمل میں جنرل مشرف نے انتہائی پست انداز اختیار کیا۔ مشرف کو سن کر لگا جیسے ہم اپنی سپاہ کے سابق چیف اور ملک کے صدر نہیں، نجی ٹی وی پر چلنے والے بھانڈوں کے کسی پروگرام کو دیکھ رہے ہیں۔

(شکیل ترابی۔ لوح ایام)

کراچی میں طالبان دہشت گردی نہیں کر رہے۔ سرحد پار کے دشمن کراچی میں بڑے پیمانے پر قتل عام کا منصوبہ بنا کر کراچی کو علیحدہ کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں اندرونی دشمنوں سے زیادہ خطرہ ہے۔

(وزیر داخلہ رحمن ملک کا بیان)

منگل کو عدالت عظمیٰ میں طاہر القادری نے اپنی آئینی درخواست کی سماعت کے دوران قرآنی آیات کے حوالے دیے۔ ایک موقع پر انہوں نے اپنے ساتھ موجود بیگ، جو کہ زمین پر ان کے پاؤں کے پاس پڑا ہوا تھا، اس میں سے قرآن پاک کا نسخہ نکالا اور اس میں سے قرآنی آیات کا حوالہ دیا۔ کورٹ میں موجود وکلاء اور صحافیوں کو یہ دیکھ کر سخت حیرت اور افسوس ہوا کہ شیخ الاسلام قرآن پاک کی توہین کے مرتکب ہو رہے ہیں۔

(آئی این پی)

جی ایم سید کے استاد قاضی محمد ہاشم میمن کے پوتے قاضی پرویز نے یہ انکشاف کیا ہے کہ جی ایم سید کے گھرانے کی عورتیں ناک نہیں چھدواتی ہیں۔ وہ صرف کان چھدوا کر اس میں زیور پہنتی ہیں اور حد تو یہ ہے کہ ان کے گھر میں پلیجو برادری کی جو خواتین گھریلو کام کاج کرتی ہیں۔ وہ بھی ان کی تقلید میں ناک نہیں چھدواتی ہیں۔ مطلب یہ ہے ان کی خواتین نتھ نہیں پہنتی ہیں۔ بھلا جس گھرانے کی عورتیں نتھ سے ماورا ہوں، اس گھر کے مرد حضرات کو کسی بھی میدان میں کون نتھ دے سکتا ہے واقعی ایسا ہی تاریخ سے بھی ثابت ہے۔

(عبدالتواب شیخ)

قیامت تک لڑنے کا افغان جذبہ کبھی سرد نہیں پڑے گا۔ ایک طالبان مجاہد جس کے تین بچے اور ایک بیوی تھی، جن سے وہ شاذ ہی کبھی ملنے جاتا تھا۔ اس کا سب سے بڑا بیٹا صرف چھ برس کا تھا، جب نیوز ویک کے نمائندے نے اس سے افغان یا امریکا حکومت سے صلح کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا۔ "کیسی صلح؟ جب میں مر جاؤں گا تو یہ جنگ میرا بیٹا لڑے گا اور اس کے بعد اس کا بیٹا۔" سوال یہ ہے کہ امریکا کا کون سا فوجی اپنے بیٹے کو اس جنگ پر بھیجنے کے لیے تیار ہے؟

(نیوز ویک اکتوبر 2011)

کراچی کے شہریوں کو جس چوک پر حکم ملتا ہے "سب کچھ ہمارے حوالے کر دو" کا حکم ملتے ہی، یہ چپ چاپ اپنی گھڑی، اپنا پرس، اور اپنا موبائل حکم دینے والے کے حوالے کر دیتے ہیں، لیکن اس کے باوجود مارے جاتے ہیں، کیونکہ لٹیرے صرف مال نہیں چھینتے، بلکہ انہیں جان لینے کا مینڈیٹ بھی ہوتا ہے۔

(جاوید چودھری..... زیرو پوائنٹ)

شاعری سچ بولتی ہے

سجل باجوہ

شاعری عطیۂ قدرت ہے اور اللہ کی گراں بہا نعمت۔ شعر کی تاثیر سے کوئی شخص انکار کر ہی نہیں سکتا۔ اچھی شاعری جذبات و احساسات کو تسکین پہنچاتی ہے۔

احمد ندیم قاسمی کا تخلیق شعر کے حوالے سے ایک خوبصورت شعر۔

؎ شاعری روزِ اوّل سے ہوئی تخلیق ندیم
شعر سے کم نہیں، انسان کا پیدا ہونا

•

حیدر علی آتش اردو ادب کا سرمایہ ہیں۔ ان کے ہاں عشق و محبت کا تصوّر، دردمندی، خلش و آرزو اور درد و کسک دبستان دہلی کے رنگ میں ہے۔ ان کی یہ غزل۔

؎ یہ آرزو تھی تجھے گُل کے روبرو کرتے
ہم اور بلبلِ بے تاب گفتگو کرتے

پیام بر نہ میسّر ہوا تو خوب ہوا
زبانِ غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

میری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

ہمیشہ میں نے گریبان کو چاک چاک کیا
تمام عمر رفو گر رہے رفو کرتے

نہ پوچھ عالمِ برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

اردو شاعری میں پیام بر اور قاصد کا مضمون بہت پرانا ہے۔ ہر شاعر نے اپنے انداز سے اسے بیان کیا ہے۔

؎ قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

داغ دہلوی نے کہا ہے۔

؎ چاہیے پیام بر دونوں طرف
لطف کیا ہے جب دو بدو ہونے لگی

کسی اور شاعر نے کیا خوب لکھا ہے۔

؎ قاصد نہیں یہ کام تیرا تو اپنی راہ لے
اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

علامہ اقبال کا انداز بھی ملاحظہ ہو۔

؎ تامّل تو تھا ان کو آنے میں قاصد!
مگر یہ بتا طرزِ انکار کیا تھی

میرے پسندیدہ شعرائے کرام میں غالب، حیدر علی آتش، مومن، محسن نقوی، منیر نیازی اور مولانا الطاف حسین حالی شامل ہیں۔

مولانا الطاف حسین حالی کی "مسدس حالی"، جو کہ انہوں نے ——— ہندوستان کے عوام کو خوابِ غفلت سے بیدار کرنے کے لیے لکھی۔ اس میں چند اشعار۔

؎ وہ غفلت کی راتیں گزرنے کو ہیں اب
نشے جو چڑھے تھے اترنے کو ہیں اب

؎ کہ بعد اپنے کھائیں گے فرزند و زن کیا
لباس ان کا اور اپنا ہو گا کفن کیا

کلاسیکی شاعری کے حوالے سے شعراء کی یوں تو ایک طویل فہرست ہے لیکن مجھے ادا جعفری کی یہ غزل بہت زیادہ پسند ہے۔

؎ ہونٹوں پہ کبھی ان کے میرا نام ہی آئے
آئے تو سہی برسرِ الزام ہی آئے

حیراں ہیں، لب بستہ ہیں، دل گیر ہیں غنچے
خوشبو کی زبانی تیرا پیغام ہی آئے

تاروں سے سجالیں گے رہ شہرِ تمنّا
مقدور نہیں صبح، چلو شام ہی آئے

کیا راہ بدلنے کا گلہ ہم سفروں سے
جس راہ سے چلے تیرے در و بام ہی آئے

باقی نہ رہے ساکھ ادا دشتِ جنوں کی
دل میں اگر اندیشۂ انجام ہی آئے

اب کچھ اپنے پسندیدہ متفرق اشعار۔

؎ ہوتی نہیں قبولِ دُعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

میدانِ وفا دربار نہیں، یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں، کچھ عشق کسی کی ذات نہیں

؎ بازیچۂ اطفال ہے دُنیا میرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا میرے آگے

؎ مٹی کی محبت میں ہم آشفتہ سروں نے
وہ قرض اتارے ہیں جو واجب بھی نہیں تھے

؎ تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

؎ احباب کو رہی میرے عیبوں کی جستجو
میں پُر خلوص ان کے ہُنر تولتا رہا

؎ باز آجاؤ ظلم سے ہمدم
ورنہ اک روزِ حشر کا بھی ہے

یہ شعر میری سب سے اچھی، کیوٹ سی فرینڈ لائبہ سعید کے لیے۔

؎ میں اس کی محبّت میں مہکتا ہی رہوں گا
وہ شخص گلابوں کے جزیرے کی طرح ہے

اور آخر میں رسمِ تعارف ہی نبھاتے جائیں۔ میں سرگودھا کے گاؤں 106 شمالی کی رہنے والی ہوں۔ میں فرسٹ ایر کی اسٹوڈنٹ ہوں اور قریبی گاؤں 107 کے کالج میں پڑھتی ہوں۔ شاعری پڑھنے کا شعف رکھتی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ میرے محترم قارئین کو میرا انتخاب ضرور پسند آئے گا۔ اپنی رائے سے ضرور آگاہ کریں۔

آخر میں قارئین کی نذر ایک شعر۔

؎ میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا ✻

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات کے لیے حاضر ہیں

آپ کی سلامتی، عافیت اور خوشیوں کے لیے دعائیں۔ اب آتے ہیں آپ کے خطوں کی طرف۔

پہلا خط کراچی سے زینب منظور کا ہے، لکھتی ہیں

نمرہ آپی آپ کے ناول نے تو کمال کر دیا۔ میری بہت سی الجھنوں کو سلجھانے کے لیے ایک راستہ مل گیا۔ اور میری مما نے صرف آپ کے ناول کی وجہ سے مجھے پردہ کرنے کی اجازت بھی دے دی۔ اس کے لیے بھی بہت شکریہ کیونکہ میرے پردہ کرنے کا کریڈٹ بھی آپ کو جاتا ہے۔ پچھلے ماہ انعم اعجاز نے اپنے خط میں گاؤں میں لڑکیوں کی تعلیم پہ پابندی کی بات کی تھی، میں کہوں گی گاؤں تو گاؤں یہاں تو شہروں میں بھی ایسا ہوتا ہے۔ ہمارے ددھیال میں بھی لوگ لڑکیوں کی زیادہ تعلیم کے خلاف ہیں۔ مجھے ڈاکٹر بننے کا بہت شوق ہے۔ اس لیے تمام قارئین و مصنفین سے درخواست ہے کہ دعا کریں۔ میں ڈاکٹر بن جاؤں۔ ہمارے یہاں لڑکیوں کو گھر تو بٹھایا جا سکتا ہے۔ مگر زیادہ تعلیم تو کیا کوئی کتاب پڑھنے پر بھی اعتراض ہوتا ہے کہ لڑکیاں کہیں تیز، چالاک یا خراب نہ ہو جائیں۔ مگر مجھے لگتا ہے کتابیں پڑھنے سے انسان کو شعور آتا ہے۔ اختتام میں نمرہ آپی سے درخواست ہے پلیز حیا اور جہان کو الگ مت کیجیے گا۔

ج۔ پیاری زینب آپ نے صحیح لکھا ہے۔ آج بھی اس ترقی یافتہ دور میں بھی بہت سارے لوگوں کی سوچ نہیں بدلی ہے۔ آپ جدوجہد اور کوشش جاری رکھیں۔ آپ نہیں تو آپ کی اولاد ان شاء اللہ ایک دن تبدیلی ضرور آئے گی۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ

سیدہ صائمہ سرفراز نے نارتھ کراچی سے لکھا ہے

اس ماہ کا ٹائٹل اچھا لگا۔ حسب معمول "پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں" سے مستفید ہو کر سبک خرامی سے آگے بڑھے۔ نمرہ جی ہر موضوع پر اس طرح لکھتی ہیں کہ گرفت کہیں بھی کمزور نہیں ہو پاتی اور سچی بات ہے، زندگی میں بہت سی کٹھن دشوار راہوں پر ہم نے ان ڈائجسٹوں سے رہنمائی حاصل کی۔

ج۔ صائمہ! اللہ تعالیٰ آپ کو صبر اور آپ کے والد کو جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے۔ (آمین۔) شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

شزا لاریب سرگودھا سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

نمرہ احمد ہر کہانی میں ہی سرپرائز دیتی ہیں۔ اسی لیے میری پسندیدہ مصنفہ ہیں۔ "ستارۂ شام" کا اختتام بھی خوب ہوا۔ فہرست میں رخسانہ نگار کا نام پڑھ کر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ نایاب جیلانی اتنے عرصے سے کہاں گم ہیں؟ بشریٰ سعید اور آمنہ مفتی سے بھی کوئی ناول لکھوائیں۔ "پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں" پسندیدہ سلسلہ ہے۔

ج۔ پیاری شزا شعاع کی بزم میں خوش آمدید اور دعائیں۔ نایاب جیلانی کی تحریر آپ جلد ہی پڑھ سکیں گی۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

رابعہ بصری فاطمہ لکھتی ہیں

شعاع پہلی بار کب پڑھا، کچھ ٹھیک سے یاد نہیں، مگر اسے پڑھنے کے بعد پھر کوئی ڈائجسٹ متاثر کن نہ لگا۔ ماہ و سال گزرتے رہے ہمارا اور شعاع کا تعلق مضبوط اور گہرا ہوتا گیا۔ خط لکھنے کی وجہ صرف "جنت کے پتے" ہے۔ حیا اور جہان ناقابل فراموش کردار ہیں۔ جنہیں ہم اپنی زندگی کے آخری سانس تک یاد رکھیں گے۔ آخری قسط پڑھ کر بہت دیر تک دل اداس رہا کہ ہمارا اتنا پیارا ناول ختم ہو جائے گا۔ ہمیشہ کی طرح اس ماہ بھی شعاع زبردست تھا۔ ناول بس ٹھیک تھے۔ ناولٹ "ہرجائی قصائی" نے ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کر دیا اور عالیہ جی۔ پلیز جویا اور معاذ پر رحم کریں۔ "ایک تھی مثال" نے پہلی قسط میں ہی توجہ حاصل کر لی۔

ج۔ پیاری رابعہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ اداس نہ ہوں۔ ناول اس ماہ نہیں آئندہ ماہ ختم ہو گا۔ آپ نے خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

ماریہ شفیق نے لاہور سے لکھا ہے

ٹائٹل بہت اچھا لگا دونوں ناول تو بہت ہی اچھے ہیں۔ خاص طور پر نمرہ احمد کا ناولٹ "جنت کے پتے" مجھے اس میں حیا کا کریکٹر اور نام بہت ہی پسند ہے۔ پلیز نمرہ جی حیا اور جہاں کے ساتھ کچھ برا مت کیجیے گا۔ مکمل ناول میں ام مریم کا "واپسی" بھی بہت اچھا تھا۔ اور عائشہ نصیر احمد کا ناول "اس راہ طلب میں" بھی زبردست تھا۔

ج۔ ماریہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ آپ کی تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جا رہی ہے۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

فوزیہ زبیر چشتیاں سے تشریف لائی ہیں، لکھا ہے

حسب معمول "دیوار شب" پڑھا۔ اس قسط کے اختتام نے تو عجیب سی الجھن میں ڈال دیا ہے۔ نمرہ احمد تو شروع سے ہی ہماری پسندیدہ ترین رہی ہیں۔ "جنت کے پتے" اپنے نام کی طرح چونکا دینے والا اور سوچ کے نئے در کھولتا ہوا ناول ہے۔ رخسانہ نگار کے نئے ناول کا پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ تاہم اس قسط سے تو یوں لگا جیسے یہ ایک ایسے خاندان کی کہانی ہے، جس کے تمام افراد کے دل ایک دوسرے کے لیے کدورت سے بھرے ہوئے ہیں۔ بہرحال رخسانہ جی کے قلم کا جادو تو سر چڑھ کے بولتا ہے سو سراپا انتظار ہیں۔ مکمل ناولز میں سے ام مریم کا "واپسی" تو حقیقت سے قدرے دور ہی لگا۔ عائشہ نصیر احمد کا "اس راہ طلب میں" ہماری روایتی معاشرتی کہانی تھی۔ ام طیفور جی کے ناولٹ کے تو کیا ہی کہنے۔ لطف و تفریح سے بھرپور اس ہلکی پھلکی تحریر نے اعصاب کو ایک دم ہلکا پھلکا کر دیا۔ ہر ماہ ہی اگر ایسی کوئی کاوش ہو تو کیا ہی کہنے۔ افسانے سب ہی اچھے تھے۔ مگر مصباح خادم اور ایلیا یقین کی تحریروں نے زیادہ متاثر کیا۔

ج۔ پیاری فوزیہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

نوشین امین ٹنڈو میر علی سے اپنے گاؤں کے تعارف کے ساتھ آئی ہیں لکھتی ہیں

میرا گاؤں ٹنڈو میر علی، محراب پور جیسے شہر سے سات کلو میٹر، خیرپور سے تقریباً" 50 کلو میٹر اور سکھر سے اندازاً" 70 کلو میٹر دور ہے۔ یہاں ہر سہولت میسر ہے۔ لیکن تعلیم کی سہولت صرف میٹرک تک تھی جواب انٹر تک ہو گئی ہے۔ میں بھی انٹر کی طالبہ ہوں۔ ویسے میری ایسی بہت سی سہیلیاں اور کلاس فیلوز ہیں جو مزید تعلیم حاصل کر کے کچھ کر دکھانا چاہتی تھیں، لیکن ماں، باپ کی حوصلہ افزائی اور اجازت نہ ہونے کی وجہ سے مزید تعلیم حاصل نہ کر سکیں اور میٹرک کے بعد ہی انہیں اپنی تعلیم کو خیرباد کہنا پڑا۔ آج جبکہ انٹرنیٹ اور میڈیا کا دور ہے اور دنیا بہت آگے نکل چکی ہے تو بعض لوگ آج بھی یہ سوچتے ہیں کہ بیٹیوں نے کون سا پڑھ لکھ کر، تعلیم حاصل کر کے ملازمت کرنی ہے۔

یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ آپ، آپ کی پوری ٹیم اور تمام مصنفین، گلاب کے وہ پھول ہیں جو نہ صرف اپنے اردگرد بلکہ دور دور تک بھی نہایت مسحور کن اور پرکیف سی خوشبو مہکا رہے ہیں۔

ج - پیاری نوشین! بہت خوشی کی بات ہے کہ آپ تعلیم حاصل کررہی ہیں۔ تعلیم حاصل کرنا تو ہر دور میں ضروری رہا ہے اور خواتین کی تعلیم تو اور بھی زیادہ ضروری ہے۔ آپ نے وہ قول نہیں سنا' ایک مرد کی تعلیم ایک فرد کی تعلیم ہے' جبکہ ایک عورت کی تعلیم ایک پورے کنبہ کی تعلیم ہے۔
اللہ تعالیٰ آپ کو کامیابی دے۔ فی الحال آپ افسانے لکھنے کے بجائے تعلیم پر توجہ دیں۔

مدیحہ حرا کراچی سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

ہر بار کی طرح شعاع اس بار بھی بہت اچھا لگا۔ "جنت کے پتے" رسالے کی جان ہے اور بہت زبردست چل رہی ہے۔ لیکن اینڈ میں حیا کا ایکسیڈنٹ دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ دیکھتے ہیں کہ اب آگے کیا ہوتا ہے۔ پلیز مائرہ خان کا انٹرویو شائع کردیں۔
ج - پیاری مدیحہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی فرمائش ضرور پوری کریں گے۔ تھوڑا انتظار کریں۔

خوشبو احمد نے بدین سے لکھا ہے

ثوبیہ جبیں' واہ کیا لکھا ہے۔ ان کی کہانی پڑھنے سے یقین کرلینا بہت سی لڑکیاں شفق بننے سے بچ گئی ہوں گی۔ نمرہ احمد بہت ہی اچھا لکھ رہی ہیں۔ آپی یہ ہماری کنیز نبوی کہاں غائب ہیں اور ان کے گاؤں کا نام کیا ہے اور ام ثمامہ میرپور خاص میں کس جگہ رہتی ہیں۔
ج - پیاری خوشبو! آپ کا پہلا خط شائع نہ ہوسکا۔ اس کے لیے معذرت۔ کنیز نبوی کو اللہ تعالیٰ نے دوسری بار اپنی رحمت سے نوازا ہے۔ وہ ایک اور پیاری سی بیٹی مصفا کی ماں بن گئی ہیں۔ اسی لیے پچھلے ایک سال کے دوران وہ لکھ بھی نہیں پائیں۔ اب جلد ہی لکھیں گی۔
ام ثمامہ میرپور خاص میں جھڈو میں رہتی ہیں۔

امبر گل نے جھڈو سندھ سے لکھا ہے

جب کافی عرصے تک شعاع والوں نے ہمیں یاد کرنا یا ہمارا حال پوچھنا گوارا نہ کیا تو ہم نے بھی یہ سوچ لیا تھا کہ بقول شاعر۔
وہ تجھ کو بھولے ہیں تو تجھ پر بھی یہ لازم ہے میر
خاک ڈال' آگ لگا' نام نہ لے' یاد نہ کر
پھر سوچا کہ آخر تو شعاع اپنا ہے۔ فروری کا شعاع 3 تاریخ کو ہی مل گیا۔ سب سے پہلے ٹائٹل جو کہ میرے خیال سے اس دفعہ کے شعاع کی واحد بری چیز لگ رہا تھا۔ ورنہ پورے کا پورا شعاع اس بار زبردست رہا۔ اس بار سب سے پہلے "ہرجائی قصائی" پڑھا اس ناول نے بڑا ہی مزہ دیا۔ مجھے اپنے جھڈو کے نائیوں اور قصائیوں کی وہ یادگار شادیاں یاد آگئیں۔ ام طیفور کا انداز تحریر آہستہ آہستہ نکھر رہا ہے۔
عالیہ جی کو لکھتے ہوئے پورے پانچ سال ہونے والے ہیں۔ مگر کبھی طوالت محسوس نہ ہوئی۔ ہمیشہ ایک الگ ہی نیاپن' اک عجیب سا سرور و سحر طاری ہوتا ہے اس کو پڑھتے وقت۔ مکمل ناول میں سب سے پہلے "واپسی" کو پڑھا۔ کچھ خاص مزہ نہیں آیا ناول کو پڑھ کے اور کچھ ایسا ہی حال "اس راہ طلب" کو پڑھ کے ہوا۔ کہیں تو بہت اچھا لگا اور کہیں پر بس سو سو سا لگا۔ بازی تو اس بار افسانوں نے مار لی ہے۔ سب سے پہلے نمبر پر مصباح کا "گھات" پھر صباحت کا "ویسی ہی" سعدیہ کا "ساعت سکون" ایلیا کا "فیصلہ" چاروں افسانے زبردست لگے۔ اب کچھ بات ہوجائے اس ناول کی کہ جس کی پہلی قسط نے ہی مجھے خط لکھنے پر مجبور کرڈالا ہے۔ جی ہاں میں "ایک تھی مثال" کی بات کررہی ہوں۔ پہلی قسط سے ہی یہ ناول اپنے جان دار' شان دار' مزے دار ہونے کی آگاہی دے رہا ہے ہمیں۔
پہلی بار ہم نے شعاع میں سے ترکیب پڑھ کر منٹ پلاؤ بنایا جو سب کو بہت پسند آیا۔ ہمارے گھر چکن زیادہ کھائی جاتی ہے تو آپ چکن کی زیادہ سے زیادہ اور آسان اور پوری ترکیبیں بتائیں۔ انٹرویو سے یاد آیا کہ شاہین آپی! شاہد آفریدی' سعید اجمل' جنید خان' عمر گل کے ساتھ ندا یاسر' اقرا الحسن' وسیم بادامی' فہد مصطفیٰ اور آفتاب اقبال صاحب کے انٹرویوز بھی کرنے کی کوشش کریں۔
ج - پیاری امبر! آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ ہم نے آپ کی کمی محسوس نہیں کی۔ تشویش اس لیے نہیں ہوئی کہ خواتین اور کرن میں آپ کے خط اور انتخاب شائع ہورہے تھے۔ سوچا کہ شاید مصروفیت کی وجہ سے شعاع کے لیے خط نہ لکھ سکیں۔ شعاع آپ کا اپنا پرچا ہے اور اپنوں سے بدگمان نہیں ہوتے۔
ٹائٹل آپ کو پسند نہیں آیا۔ اس کے لیے معذرت'

اس کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ آپ کی تعریف و تنقید متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔

راجن پور سے شیریں ظفر نے' لکھا ہے

سب سے پہلے "پہلی شعاع" پڑھا۔ "ستارہ شام" کی آخری قسط ہے۔ شکر ہے ختم ہوگیا۔ اس کے کرداروں اور کہانی کے بارے میں کیا سوالات کیے جائیں۔ الجھے اور پریشان سے کردار' عجیب و غریب پیش آنے والے واقعات۔ حقیقت سے کافی دور' ایک بھی کردار مضبوط نہیں تھا۔ ثروت' دانیال' جلال' جنت بی بی' جنت عرف تنوی' شہروز' مستقیم بھٹی' ثمینہ' بہت ٹوٹے پھوٹے ادھورے کردار تھے۔ شکست ہی شکست کی کہانی۔ "ایک تھی مثال" اسٹارٹ تو بہت زبردست ہے اور ناول مختصر ہے یعنی بہت مزہ آنے والا ہے۔ "دیوار شب" کی قسط ہمیشہ کی طرح آپا گل کی خودغرضی سے بھری اور واقعات کی تیز رفتاری کا شکار تھی۔ اینڈ میں بھی کہانی کی بنت کو مار جن دیا کریں کہ اینڈ بھی اتنا ہی خوب صورت ہو جیسے کہانی' ایک دم سے تمام کرداروں کو رول کردیتی ہیں آپ لوگ۔ ان تمام لوگوں کا انجام دیکھنا ہے۔ وہ دکھائے بغیر آخری قسط مت کریجیے گا۔
سب سے زبردست ناولٹ تھا "ہرجائی قصائی" پڑھتے ہوئے ایک مزہ آگیا۔ "اس راہ طلب میں" عائشہ نصیر اور واپسی ام مریم دونوں ٹاپک کئی بار لکھے جاچکے ہیں۔ آپی پلیز! آپ کو نئے لگ رہے تھے جو آپ نے چھاپ دیے۔ ہیروئن کے اغوا والی تو کتنی ہی کہانیاں پہلے چھپ چکی ہیں۔ ہیرو کی نشیلی آنکھیں اور بازوؤں کے مسلز بھی متاثر نہیں کرتے۔ "بس ایک ساعت سکون" سعدیہ جی ویل ڈن۔ بہت مختصر الفاظ میں زندگی کا کچا چٹھا کھولا' مزہ آیا اور "ویسی ہی" میں صباحت یاسمین نے بھی۔ دونوں ہی افسانے انعام یافتہ ہیں۔ مرد و زن کے تعلق کے نازک دور اور موڑ ان کی فطرت کی نقاب کشائی۔ آپ کے ہاتھ چومنے کو دل چاہتا ہے۔
ج - پیاری شیریں! تفصیلی تبصرے کے لیے بہت شکریہ۔ تعریف اور تنقید مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔

ایمن تحریم نے سرگودھا سے لکھا ہے

مجھے ٹائٹل گرل کا ہیئر اسٹائل اور جیولری بہت پسند آئی۔ آخر کار "ستارہ شام" بھی اپنے اختتام کو پہنچی۔ 30 ماہ ہم نے آمنہ جی کے ساتھ شان دار سفر طے کیا۔ آمنہ جی! آپ کو بہت بہت مبارک ہو' اتنی خوب صورت تحریر لکھنے پر۔ افسانوں میں سب سے پہلے گھات پڑھا۔ مصباح جی بہت مزے دار تحریر تھی آپ کی۔
ج پیاری ایمن! اللہ تعالیٰ آپ کو امتحان میں شان دار نمبروں سے کامیابی عطا فرمائے۔ (آمین) شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

مشی بچہ نے ملتان سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

مجھے کبھی کسی کا فین بننا اچھا نہیں لگتا تھا۔ مگر جب سے شاید 2007ء یا 2008ء سے خواتین اور شعاع پڑھنا شروع کیا' پھر تو بس میں فین بن گئی ہوں تمام رائٹرز اور تمام لوگوں کی جو خواتین یا شعاع کے لیے کام کرتے ہیں۔ مجھے نمرہ احمد سے ملنا اپنی زندگی کی ایک بہت بڑی خواہش لگتا ہے۔ مجھے رمشا خالد بہت متاثر کرتی ہیں۔ اب بات کرتی ہوں اس شمارے کی تو آئی کانٹ بلیو اٹ کہ سالار کیس ہار گیا۔ یہ پڑھ کر میں کتنی دیر بے یقین رہی "ستارہ شام" میں اگر شبیہ اور تنوی کو مزید دکھایا جاتا تو آئس گریٹ۔ اب بات ہوجائے "جنت کے پتے" کی تو اس کے لیے میں اپنے تاثرات بیان نہیں کرسکتی۔
ج - پیاری مشی! آپ خواتین اور شعاع کی پرستار بن گئی ہیں۔ یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ سالار کیس ہار گیا' لیکن ناول ابھی ختم نہیں ہوا۔ آگے دیکھیے کون ہارتا ہے' کون جیتتا ہے۔

صائمہ جاوید علوی نے سیالکوٹ سے لکھا ہے

شعاع کے اس ماہ کے شمارے کی بات کروں تو قلم اٹھانے کی اصل وجہ اس میں دی جانے والی ایک تحریر ہے جسے پڑھ کر کچھ اچنبھے کا شکار ہوئی کہ یہ تو شعاع کا وتیرہ نہیں۔ کیونکہ میں نے آپ کی مصنفات کو حقیقت کے قریب ترین موضوعات پر لکھتے دیکھا ہے۔ جبکہ یہ ایک ایسے موضوع پر لکھی گئی جس کا حقیقت سے دور دور تک واسطہ نہیں تھا۔ اس کا نام "واپسی" ہے۔ جس میں ہیروئن اغوا کے بعد اپنے ماں' باپ کو بھلا ہی دیتی ہے اور نہ ہی اس

کے ماں' باپ کی حالت کا کوئی حوالہ دیا گیا ہے۔ پلیز اس طرح کی تحریریں معصوم قارئین کو افسانوی دنیا کا باسی بنا دیتی ہیں۔ جہاں ہر شے صرف مثبت ہی لگتی ہے اور دوسری تحریر آمنہ ریاض کا سلسلے وار ناول "ستارہ شام" معاف کیجئے گا' آخری قسط ان جیسی منجھی ہوئی لکھاری کی نہیں لگ رہی۔ جس میں کچھ انتہائی اہم کرداروں کو لپیٹ کر سائیڈ پر رکھ دیا گیا۔ امید ہے اس تنقید کو آپ برے معنوں میں نہیں لیں گی۔

ج ۔ پیاری صائمہ! ہم کبھی بھی کسی کی بھی تنقید کو برے معنوں میں نہیں لیتے۔ تنقید سے تو ہمیں پرچے کو بہتر بنانے میں مدد ملتی ہے اور ویسے بھی یہ محفل قارئین کی رائے جاننے کے لیے ہی سجائی گئی ہے۔ خواہ تعریف ہو یا تنقید آپ کو اپنی رائے کے اظہار کا پورا حق حاصل ہے۔

سمیرا انور نے جھنگ سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

"ام مریم" کے مکمل ناول "واپسی" نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کردیا۔ ام کریم کا یہ ناول تمام والدین کے لیے خصوصی تلقین ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تربیت کرتے وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ ان کی ذرا سی کوتاہی ان کے بچے کی شخصیت کو مسخ کرسکتی ہے۔ عائشہ نصیر احمد کا مکمل ناول بھی بہت زبردست تھا۔ لیکن اینڈ بہت جلدی کردیا۔ رخسانہ نگار کا "ایک تھی مثال" دیکھ کر دل بہت خوش ہوا۔ آپ سے پوچھنا ہے کہ "شاعری سچ بولتی ہے" کے سوالات کہاں سے ملیں گے۔ آپ فرحت اشتیاق کا کوئی مکمل ناول بھی شائع کریں۔

ج ۔ سمیرا! "شاعری سچ بولتی ہے" کے سلسلے میں سوالات نہیں ہیں۔ اس سلسلے میں آپ اپنی پسند کی شاعری کا انتخاب کریں اور یہ بھی بتائیں کہ جو شعر یا غزل آپ نے لکھی ہے وہ آپ کو کیوں پسند ہے۔ آپ نے پہلی بار اسے خود پڑھا یا سنا یا کسی نے آپ کو بھجوایا۔ کس غزل سے آپ کی کون سی یاد وابستہ ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

نازیہ اسلم بھاول نگر سے لکھتی ہیں

اس ماہ کا ٹائٹل نہ جانے کیوں اچھا نہیں لگا مجھے۔ ہاں شمارہ بہت کیوٹ تھا۔ "جنت کے پتے" نمرہ جی نے بہت خوب لکھا اور جہان جیسے لوگ واقعی قابل فخر قابل ستائش ہوا کرتے ہیں ملکی سرمایہ۔ "واپسی" اس ماہ کی نمبرون کی اسٹوری رہی۔ بہت زبردست۔ جویا اور معاذ کے ساتھ برا مت کرنا۔ باقی صرف ایک دعا۔ قائداعظم کا پاکستان قائد کی سوچوں اور اقبال کے خواب جیسا ہو۔

ج ۔ پیاری نازیہ! آپ کی دعا پر آمین کہتے ہیں۔ آپ کا خط شامل ہے۔ امید ہے آپ کی شکایت دور ہوگئی ہوگی۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ لیکن صرف دو کہانیوں پر تبصرہ؟ آئندہ تفصیلی خط لکھیے گا۔

اقرا مظفر' عفیرہ مظفر نے چھوکر خورد ضلع گجرات سے لکھا ہے

"ستارہ شام" اپنے اختتام کو پہنچی۔ جنت بیگم نے اپنے ظلم اور سفاکی کے ساتھ نہ جانے کتنی زندگیاں برباد کیں۔ ظالم کو اس دنیا میں تو سزا ملتی ہے لیکن آخرت کا دردناک عذاب تو پھر باقی ہے۔ بہرحال اختتام اچھا تھا۔ ہر کردار کے ساتھ بھرپور انصاف کیا گیا۔ بہت بہت مبارک باد آمنہ ریاض صاحبہ۔ "دیوار شب" پڑھ کے اس بات پہ تو یقین ہوگیا ہے کہ واقعی اپنے بھی بعض اوقات خودغرضی اور بے شرمی کی انتہا کردیتے ہیں۔ آپا گل جیسی بہن کو اپنی بہن کے ساتھ یہ سب کرتے ہوئے اپنی جوان بیٹیاں نظر کیوں نہیں آئیں؟ کہانی بڑے خوش گوار موڈ میں پڑھی۔ مگر اختتام نے تو شاکڈ کردیا۔ کیا نبیل جیسے بھیڑیے کو اس کے کیے کی سزا اب بھی نہیں ملے گی؟ بات کروں مکمل ناول کی' تو پہلے "اس راہ طلب میں" پڑھا۔ احسان صاحب جیسے سخت والد اکثریت میں پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ اپنی طرف سے اولاد کی خوشی کے لیے ہی فیصلے کرتے ہیں۔ مگر یہ نہیں دیکھتے کہ اولاد کیا چاہتی ہے؟ اگر وہ بچوں کے ساتھ فرینڈلی رویہ روا رکھتے تو پھر علی کبھی بھی انہیں رسوا نہ کرتا۔ بہرحال علی کی حرکت ہمیں بھی ناگوار لگی اور جو ہی صاحبہ کی مغروریت اور ہٹ دھری نے تو میٹر گھما دیا' کیسے دھڑلے سے واثق کے کندھے پہ رکھ کے بندوق چلادی۔ لیکن اینڈ تو چلیں ہیپی ہوگیا۔ "جنت کے پتے" کے اختتام پہ جامع تبصرہ کروں گی۔ افسانے سب ہی اچھے تھے۔ صباحت یاسمین کو پھر سے کیل کانٹوں سے لیس میدان میں اترتے دیکھا دل باغ باغ ہوگیا۔ "ہرجائی قصائی" نام ہی کافی منفرد تھا اور کہانی تو تھی ہی شان دار۔ دادی اور اماں کی نوک جھونک۔ اماجی کی چرب زبانی' عمر کا اپنی خوب صورتی کی وجہ سے بٹ کہلانا' علینہ کا اس سے دھوکا کھا جانا' سب ہی زبردست تھا اور اماں کی نون غنہ والی بولی سے تو بڑی ہی امپریس ہوگئی ہوں۔ (ہاہاہا) "خط آپ کے" بھی تبصرے اچھے تھے۔ فوزیہ ثمریٹ کی انٹری بھی اچھی لگی اور اب آخر میں اس ناول پہ تبصرہ کرتی چلوں جس نے چھ ماہ بعد قلم اٹھانے پر مجبور کیا۔ "واپسی" "ام مریم" کی تحاریر مجھے کافی اچھی لگتی ہیں۔ لیکن انتہائی افسوس اور معذرت کے ساتھ ام مریم میں یہ کہوں گی کہ اس دفعہ آپ کا قلم کچھ زیادہ بے باک ہوگیا تھا۔ ہوسکتا ہے باقی قارئین مجھ سے متفق نہ ہوں۔ ٹھیک ہے اس ناول میں ایک معاشرتی پہلو بھی تھا کہ کس طرح حالات سے مجبور ہوکر مستقیم ڈاکو بنا اور کس طرح دیا کی آزمائش کی گئی' لیکن مجموعی طور پر کہانی زیادہ اچھی نہیں رہی۔

ج ۔ اقرا اور عفیرہ! ام مریم کی کہانی میں آپ کو کچھ فقرے بے باک لگے۔ آئندہ احتیاط رکھیں گے۔ ہماری کوشش تو یہی ہوتی ہے کہ کہانیوں میں کوئی ایسی بات نہ جائے جس سے کچے ذہنوں پر ناخوش گوار اثرات ہوں۔ کبھی کبھی سہواً کچھ فقرے حذف ہونے سے رہ جاتے ہیں۔ اس کے لیے ہم اپنی قارئین سے معذرت خواہ ہیں۔

رابعہ تبسم اینڈ سائرہ رمضان E.B 367 ککو منڈی سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

السلام علیکم! اس دفعہ خط لکھنے کی بڑی وجہ میری چھوٹی بہن سائرہ ہے۔ ٹائٹل سائرہ کو بہت پسند آیا۔ اسپیشلی ماڈل کے لمبے بال۔ سب سے پہلے پہنچے حسب معمول اپنے موسٹ فیورٹ ناول "جنت کے پتے" کی طرف۔ اف جہان اور جہان کی کور اسٹوریز جہان میرا پسندیدہ کردار ہے۔ "ستارہ شام" کا اینڈ کچھ جلدی نہیں ہوگیا۔ بہرحال مجموعی طور پر اچھا لگا۔ جنت بی بی اپنے انجام کو پہنچی۔ رخسانہ نگار عدنان کی آمد پر دل خوش ہوگیا۔ پورا رسالہ دو دن میں ختم کرکے اب پھر پورا مہینہ انتظار۔

ج ۔ سائرہ! آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے اصرار کرکے خط لکھوایا اور رابعہ آپ کا بھی کہ آپ نے ہمیں خط لکھا۔ پورا مہینہ انتظار تو واقعی بہت مشکل ہے۔ آپ ایسا کریں خواتین اور کرن بھی خرید لیا کریں۔ اس طرح آپ کو مہینہ گزرنے کا پتا بھی نہیں چلے گا۔

خدیجہ آرزو نے کوٹلہ ارب خان ضلع گجرات سے لکھا ہے

چھٹی کلاس سے لے کر اب میں بی اے کررہی ہوں اور نوے کی دہائی کے بھی تمام رسالے پڑھ چکی ہوں۔ میری پسندیدہ ترین رائٹرز عمیرہ احمد' نمرہ احمد' فرحت اشتیاق اور نایاب جیلانی ہیں اور بھی ساری ہی رائٹرز اچھا لکھتی ہیں۔ اس ماہ کے شمارے کا ٹائٹل بہت خوب صورت ہے اور جس تحریر نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا اور میری خاموشی کو توڑا وہ ہے "جنت کے پتے" جہان کا کردار میرے دل کے بہت قریب ہے۔ باقی تحاریر بھی خوب صورت تھیں اور تمام سلسلے بھی۔ "ستارہ شام" کا اختتام بھی اچھا لگا۔

ج ۔ پیاری خدیجہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ اتنی طویل مدت سے ہمارے پرچے پڑھ رہی ہیں اور ایک بار بھی خط نہیں لکھا۔ اب باقاعدگی سے خط لکھتی رہیے گا۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

آصفہ صداقت چشتیاں سے لکھتی ہیں

فروری کا شمارہ دیدہ زیب سرورق کے ساتھ نگاہوں کے سامنے آیا۔ شمارہ اپنے سب ہی سلسلوں کے ساتھ اے ون تھا۔ ام طیفور نے کافی سے زیادہ ہنسایا۔ سادہ' دلچسپ مگر بے مثال کرداروں سے سجا چھوٹا سا ناولٹ بہت ہی مزے کا لگا۔ کچھ فقروں پہ تو بے اختیار ہنسی آئی اور ہنستے ہی چلے گئے۔ شکریہ ام طیفور صاحب۔ آپی یہ طیفور نام کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ ضرور بتائیے گا۔ عالیہ آپی ادھر ناول شروع کیا اور ادھر باقی آئندہ سامنے آگیا۔ بھئی کچھ تو اس کے صفحے بڑھا دیں۔ آمنہ ریاض کا "ستارہ شام" انسانی رویوں کی نفسیات کو بیان کرتا۔ اختتام پذیر ہوا اور سوچ کے کئی در وا کرگیا۔ ام مریم کا ناول "واپسی" مجھے کچھ فلمی سا لگا۔ لیکن تھیم بہت اچھی تھی ۔ رخسانہ جی کا انتظار آخرکار ختم ہوا۔ شروعات تو بہت اچھی ہیں ۔ دیکھیے آگے آگے ہوتا ہے کیا۔ نمرہ جی کے بارے میں کیا کہیں۔ شروع دن سے ہی اس ناول نے اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ نمرہ جی اتنی انفارمیشن کہاں سے لے لیتی ہیں۔

ایک اہم وجہ جس کی بنا پہ میں یہ خط لکھ رہی ہوں، وہ ہے "بیٹھ کر سیرِ دو جہاں کرنا" آمنہ زریں نے ہمارے فیورٹ رائٹر کرنل اشفاق حسین صاحب کی کتاب پر جو تبصرہ پیش کیا ہے۔ اس نے چودہ طبق روشن کردیے اور لمحہ فکریہ بڑھا دیا۔ اللہ ہمارے عوام کس قدر اندھیرے میں ہیں۔ کارگل کے بارے میں جو حقائق ہم جیسے لوگوں کو معلوم تھے، وہ ان حقائق کے الٹ تھے۔ سچ کیا ہوتا ہے۔ یہ ہم جیسے لوگوں کو شاید کبھی پتا نہیں چلتا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میڈیا اتنا آزاد ہے، مگر حقائق عوام سے پھر بھی دور۔ شاید میڈیا آزاد تو ہے مگر فیئر نہیں۔

ج - پیاری آصفہ! آپ نے خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کیا، بہت شکریہ۔ میڈیا ہمارے ہاں آزاد تو ہے لیکن اسے بھی بہرحال بہت سے خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کی بھی کچھ مجبوریاں ہیں اس لیے بعض اوقات پورے حقائق سامنے نہیں آتے۔ بابر ولی کا انجام ہم سب کے سامنے ہے۔ کیسا خوب صورت اور ذہین نوجوان 'ٹارگٹ کلنگ' کا نشانہ بن گیا اور اب تو انصاف کی بھی امید نہیں کہ اس کے قتل کے چھ چشم دید گواہ بھی اندھی گولیوں کا نشانہ بن چکے ہیں۔ ان حالات میں مصلحت سے کام لینا مجبوری بن جاتی ہے۔

طیفور کا مطلب تو ہمیں بھی نہیں معلوم۔ ام طیفور ہی بتا سکتی ہیں۔

نجمہ انور چونڈہ ضلع سیالکوٹ سے شریک محفل ہیں،

لکھا ہے

میں تقریباً 99ء سے شعاع اور خواتین پڑھ رہی ہوں۔ اس طرح بارہ یا تیرہ سال سے شعاع اور خواتین سے رشتہ ہے۔ ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ کہانیوں میں نمبرون نمرہ احمد کا "جنت کے پتے" ہے۔ اس کی جتنی تعریف کروں کم ہے۔ باقی دونوں مکمل ناول بھی اچھے تھے۔ ناولٹ بالکل بور تھا۔ افسانے بھی بس ٹھیک ہی تھے۔ بندھن میں فاطمہ آفندی اور کنور ارسلان کا انٹرویو اچھا لگا۔ پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں پڑھ کر ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ باقی سب سلسلے بہت اچھے تھے۔ میری موسٹ فیورٹ رائٹرز کو عمیرہ احمد۔ ماہا ملک، فائزہ افتخار، راحت جبیں ہیں، پلیز عمیرہ جی سے مکمل ناول لکھوائیں۔ بس اک داغ ندامت ناول دوبارہ شائع کرسکتی ہیں۔

ج - پیاری نجمہ! بس اک داغ ندامت عمیرہ احمد کا ناول تھا۔ ہم اسے دوبارہ شائع کردیں گے۔ تھوڑا انتظار کریں۔ آپ نے جن رائٹرز کے نام لکھے ہیں۔ ہم بھی ان کی تحریریں پڑھنا چاہتے ہیں۔ آپ کا پیغام ان تک پہنچا رہے ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ماریہ الماس ہارون آباد سے تشریف لائی ہیں، لکھا ہے

ٹائٹل گرل کا لباس پسند نہیں آیا۔ سب سے پہلے "جنت کے پتے" سمجھ میں نہیں آتا کہ اس ناول کو کیسے سراہوں۔ آخری قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ "ایک تھی مثال" کی پہلی قسط پسند آئی اور یہ جان کر بھی خوشی ہوئی کہ یہ زیادہ طویل نہیں ہے۔ کیونکہ مجھ سے اتنا لمبا انتظار نہیں ہوتا۔ ام طیفور کا ناولٹ "ہرجائی قصائی" اور ام مریم کا مکمل ناول "واپسی" بہت پسند آیا۔ افسانوں میں "ڈیسی ہی" اچھا تھا۔ باقی مستقل سلسلے بھی خوب تھے۔ خطوط میں حوریہ کبیر کا خط، مسکراہٹوں میں فرح بابر اور "کھلتا کسی پہ کیوں" میں شفق راجپوت بازی لے گئیں۔ آخر میں شاہین رشید سے گزارش ہے کہ پلیز رائٹرز کے انٹرویوز زیادہ سے زیادہ لیا کریں، ہمیں اداکاروں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

ج - پیاری ماریہ! شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔ امید ہے آئندہ بھی خط لکھ کر اپنی رائے کا اظہار کرتی رہیں گی۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

امت الصبور

حلال اور حرام کے درمیان مفاہمت

جائز اور ناجائز کا معاملہ بنی نوع انسان کی پوری تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل رہا ہے۔ ہمارے دین میں جائز اور ناجائز کے لیے دو بڑی واضح اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں۔ حلال اور حرام۔

اس معاملے میں قرآن حکیم مکمل طور پر غیر مبہم ہے اور آنحضرت ﷺ کی تعلیمات بھی سو فیصد واضح ہیں۔ ایک سچے مسلمان کی پہچان ہی یہ ہے کہ وہ اپنی ساری زندگی حلال کے دائرے میں رہ کر گزارنے کی شعوری کوشش کرتا ہے۔ اگر اس کوشش کے باوجود حرام کبھی اس کی زندگی میں داخل ہو جائے تو توبہ کا دروازہ اس پر کھلا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ چونکہ اس کی نیت کو جانتا ہے اس لیے اس کی توبہ قبول ہو سکتی ہے۔ مگر جو بات قادر مطلق کو قبول نہیں، وہ حلال اور حرام کا فرق مٹانے کی کوشش ہے۔ خواہ وہ کسی ہی نیت سے کیوں نہ کی جائے۔

برصغیر کے "عہد اکبری" کو ہم قومی مفاہمت کا دور کہہ سکتے ہیں۔ مغلیہ سلطنت کے بانی ظہیر الدین بابر کے پوتے جلال الدین اکبر، جسے تاریخ میں اکبر اعظم کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اگر برصغیر میں مسلمانوں کا روشن ترین عہد شیر شاہ سوری کا تھا تو تاریک ترین دور اکبری کو کہا جا سکتا ہے۔ یہ وہ دور تھا جب سیاسی مصلحتوں اور رموز مملکت کے نام پر حلال اور حرام کا فرق مٹا ڈالنے کی ایک شعوری کوشش کی گئی۔ یہ شعوری کوشش پورے دور اکبری میں نظر آتی ہے۔ شہنشاہ اکبر نے "مفاہمت کی سیاست" کے نام پر "دین الٰہی" رائج کرنے کی جو افسوس ناک (بلکہ ناپاک) کوشش کی، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔

اس ناپاک کوشش کا اظہار اس کا "حرم" کرتا ہے۔ اگر شہزادہ سلیم کی ماں نے کبھی ہندومت نہیں چھوڑا تھا یا اللہ کا دین قبول نہیں کیا تھا تو پھر کون سا قانون یا جواز ایسا ہے جو شہنشاہ اکبر اور مہارانی جودھابائی کے ازدواجی رشتے کو "حلال" قرار دلا سکتا ہے؟ اور اگر شہنشاہ ہند اور ملکہ ہند کے درمیان قائم ہونے والا رشتہ حلال نہیں تھا تو پھر شہزادہ سلیم (جو بعد میں شہنشاہ جہانگیر بنا) کو کس خانے میں رکھا جائے؟

حلال اور حرام کے درمیان قائم لکیر کو مٹا ڈالنے کی ناپاک جسارت کے خلاف ہی حضرت مجدد الف ثانی کا ظہور ہوا تھا۔ یہ لکیر جہانگیری عہد میں تو "مدھم" رہی ہی شاہجہانی عہد میں بھی واضح طور پر سامنے نہ آسکی۔ اس لکیر کو دوبارہ کھینچنے اور قائم کرنے کا کام جس شخص نے انجام دیا، وہ اورنگ زیب عالمگیر ہے۔ اورنگ زیب ہمیشہ بیشتر مورخین کے معتوب رہے ہیں۔ ان کی کردار کشی کے لیے سہارا ہمیشہ اس دلیل کا لیا گیا ہے کہ انہوں نے اپنے والد کو قید خانے میں ڈالا اور اپنے بھائیوں کو یکے بعد دیگرے مروا ڈالا۔

بادی النظر میں یہ الزامات محض الزامات نہیں حقیقت کا درجہ رکھتے ہیں، مگر یہ مورخین اس بات کو ہمیشہ نظر انداز کرتے رہے ہیں، اورنگ زیب اپنے مذہبی رجحان اور عقائد کے پیش نظر دربار شاہجہانی میں پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھے جاتے تھے۔ جب وہ بیس برس کے تھے تو انہیں کابل کی فتح کے لیے بھیجا گیا۔ اس زمانے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ جس سپہ سالار کے سپرد کابل کی مہم کی جاتی ہے اسے ایک طرح سے موت کا پروانہ دے دیا جاتا ہے۔

اورنگ زیب نے تمام اندازے غلط ثابت کر دیے اور وہ کابل فتح کر کے واپس لوٹے۔ یہ صورت حال شاہجہاں اور ان کے لاڈلے بیٹے دارا کے لیے خوش آئند نہیں تھی۔ چنانچہ دہلی میں اورنگ زیب کے لیے جو جشن فتح منایا گیا اس میں انہیں ایک مست ہاتھی کے ذریعے ہلاک کرنے کی کوشش کی گئی۔

اس کوشش میں ناکامی کے بعد اورنگ زیب کے سپرد حیدر آباد دکن کی شورشوں کی سرکوبی کا مشن کیا گیا یہ بھی مشہور تھا کہ حیدر آباد دکن ہمیشہ ایسے سالاروں کو بھیجا جاتا تھا جن کو "زندہ نہ دیکھنا" مقصود ہو۔ اورنگ زیب نے سترہ اٹھارہ برس دکن کی صوبیداری میں گزارے۔ تمام شورشوں پر قابو پایا اور پورے ہند میں ان کا طوطی بولنے لگا۔

یہ صورت حال شہنشاہ شاہجہان کے لیے پریشان کن تھی۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے بڑے بیٹے دارا کے لیے اورنگ زیب کا وجود بہت بڑا خطرہ ہے۔ چنانچہ اورنگ زیب کو انعام و اکرام کے لیے دکن سے دہلی طلب کیا گیا۔ مقصد انہیں ایک نادیدہ تلوار کی زد میں لانا تھا اورنگ زیب کی چھوٹی بہن روشن آرا نے انہیں اس سازش سے آگاہ کر دیا۔ وہ پھر بھی دہلی آئے۔ جس محل میں ضیافت کا اہتمام تھا اس کے مرکزی دروازے کے اوپر سے ایک تلوار عین اس وقت گرنی تھی، جب اورنگ زیب اندر داخل ہوتے۔

جب وہ لمحہ آیا تو اورنگ زیب نے رک کر اپنے باپ کی طرف دیکھا اور کہا۔

"ابا حضور! پہلے آپ۔"

کہا جاتا ہے کہ شاہجہان کا رنگ فق ہو گیا۔ یہ دیکھ کر اورنگ زیب نے کلمہ پڑھا اور دروازے میں داخل ہو گئے۔ تلوار گری ضرور، لیکن اللہ نے اورنگ زیب کو بچا لیا۔

یہ واقعہ اورنگ زیب کی زندگی کا اہم ترین موڑ تھا۔ انہوں نے اپنے باپ سے کہا۔

"ابا حضور! مجھے یقین نہیں تھا کہ ایک باپ ایسا کر سکتا ہے، لیکن میں آپ کو معاف کرتا ہوں، مگر اب ہندوستان کو ان عناصر کے قبضے میں نہیں جانے دوں گا، جن کے ہاتھوں میں آپ کھیل رہے ہیں اور جو اسے اللہ کے دین سے دور رکھنا چاہتے ہیں۔"

پھر جو کچھ ہوا تاریخ کا حصہ ہے۔

اورنگ زیب نے تقریباً" نصف صدی تک حکومت کی۔ لیکن جو فتنے "دین اکبری" نے پیدا کیے تھے اور "حلال و حرام" میں امتیاز ختم کرنے کا جو کلچر دربار اکبری سے فروغ پا کر دربار جہانگیری اور دربار شاہجہانی تک پہنچا تھا اسے وہ پوری طرح نہ مٹا سکے۔

جب ایک مرتبہ حلال میں حرام کی آمیزش ہو جاتی ہے اور اس آمیزش کو معاشرے میں قبولیت ملنا شروع ہو جاتی ہے تو اصلاح احوال کے لیے ایک اورنگ زیب کافی نہیں ہوتا۔ بد قسمتی سے اورنگ زیب کے بعد کوئی دوسرا اورنگ زیب پیدا نہ ہو سکا۔

(غلام اکبر کے کالم سے اقتباس)

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

نرگسی کوفتے

اجزا :

قیمہ	ایک کلو
انڈے	آٹھ عدد
پیاز	آدھا پاؤ
دہی	ایک پاؤ
ادرک	ایک بڑا ٹکڑا
لہسن	ایک پوتھی
ہری مرچ	چار عدد
سرخ مرچ	دو چائے کے چمچے
پسا دھنیا	آدھا چائے کا چمچہ
گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
بیسن	چار کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

چھ انڈوں کو سخت ابال لیں۔ قیمے کو لہسن ادرک اور ہری مرچ کے ساتھ باریک پیس لیں۔ پھر نمک، مرچ، دھنیا، گرم مسالا، بیسن، ایک کچا انڈا اور دو پیاز باریک پیس کر قیمے میں ملا کر انڈوں پر چڑھائیں۔ دو چمچے دہی بھی ملا لیں۔ اس سے قیمہ انڈوں پر باآسانی چپک سکے گا۔ ایک انڈا پھینٹ لیں۔ قیمہ چڑھے تمام انڈے اس پھینٹے ہوئے انڈے میں ڈبو کر ہلکے تیل میں ہلکی آنچ پر سنہری سے تل لیں۔ الگ پتیلی میں باقی پیاز براؤن کر کے چورا کریں اور دہی میں اچھی طرح پھینٹ کر گرم تیل میں ڈالیں اور خوب بھونیں۔ جب مسالا روغن چھوڑ دے تو حسب مرضی شوربہ کے لیے پانی ڈال کر پکائیں۔ پھر چھری کی مدد سے قیمہ چڑھے انڈوں کو درمیان سے کاٹ کر آہستگی سے شوربے میں رکھیں اور پانچ منٹ کے لیے ہلکی آنچ پر پکنے دیں۔

بیف نگٹس

اجزا :

گوشت	آدھا کلو
چنے کی دال	آدھا کپ
لہسن ادرک پیسٹ	ایک کھانے کا چمچہ
انڈے	تین عدد
لیموں کا رس	ایک کھانے کا چمچہ
ہری مرچ	چار عدد
سرخ کٹی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
پسا گرم مسالا	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	تلنے کے لیے

ترکیب :

گوشت کی چھوٹی بوٹیاں کر کے نمک، لہسن ادرک پیسٹ، دال اور کٹی مرچ کے ساتھ گلا لیں۔ دو ابلے ہوئے انڈے چھیل کر شامل کر دیں۔ گرم مسالا، لیموں کا رس اور ایک کچا انڈا پھینٹ کر مکس کریں اور کوئی شیپ دے لیں۔ فریج میں آدھا گھنٹہ رکھ کر درمیانی آنچ پر تلیں اور کیچپ کے ساتھ پیش کریں۔

چکن تھائی رائس

اجزا :

چکن بغیر ہڈی	ایک کپ
ابلے چاول	دو کپ
ہری پیاز	ایک عدد
شملہ مرچ	ایک عدد
گاجر	ایک عدد
پسی سیاہ مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
سویا ساس	ایک کھانے کا چمچہ
چلی ساس	ایک کھانے کا چمچہ
لہسن پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

ہری پیاز، شملہ مرچ اور گاجر چوکور کاٹ لیں۔ پتیلی میں تیل گرم کر کے لہسن پیسٹ ڈالیں۔ سنہری ہو جائے تو چکن ڈال کر فرائی کریں۔ چوپ کی ہوئی سبزیوں کے ساتھ تمام اجزا ڈال کر ہلکے ہاتھ سے مکس کریں، پھر چاول ڈال کر ایک بار پھر سب کو اچھی طرح مکس کریں اور پانچ منٹ کے لیے ہلکی آنچ پر دم پر رکھ دیں۔ جلد تیار ہو جانے والی تھائی ڈش حاضر ہے۔

وائٹ کڑاہی

اجزا :

چکن	ایک کلو
کالی مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
گرم مسالا	ایک کھانے کا چمچہ
دہی	ایک کپ
ہری پیاز	تین عدد
سفید مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
لہسن، ادرک پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
ادرک	ایک ٹکڑا
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

تیل گرم کر کے لہسن ادرک ڈال کر بھونیں پھر چکن ڈال کر فرائی کریں۔ اب اس میں ہری مرچ، دہی، نمک، مرچ اور گرم مسالا ڈال کر بھونیں۔ دہی کا پانی خشک ہو جائے تو اتار لیں پھر ادرک لمبائی میں کتر کر چھڑکیں اور نان کے ساتھ پیش کریں۔ ✡

ادارہ

ناخن بھی توجہ چاہتے ہیں

چہرے کے بعد آپ کے ہاتھ پاؤں آپ کی شخصیت کی جاذبیت اور خوبصورتی کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ خواتین عام طور سے ہاتھوں پر زیادہ توجہ نہیں دیتیں، حالانکہ لوگ شخصیت کی خوبصورتی کا اندازہ ہاتھ اور پاؤں سے لگاتے ہیں۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ اپنے سراپے کے ساتھ ساتھ آپ اپنے ہاتھوں پر بھی پوری توجہ دیں۔ ان کو خوبصورت اور خوش نما بنائیں۔ آپ بغیر کسی بیوٹی پارلر کے بھی ہاتھوں کو "مینی کیور" کے ذریعے خوبصورت بنا سکتی ہیں۔

سب سے پہلے آپ اپنے ہاتھوں کے ناخن کو ترتیبی شکل میں فائل کریں، یعنی کناروں سے درمیان کی طرف اس طرح فائل کریں کہ درمیانی حصہ چوڑائی میں ابھرا ہوا لگے، اور کنارے گھسے ہوئے نظر آئیں۔ آج کل ناخن کی گولائی کی بہ نسبت چوکور شکل زیادہ پسند کی جارہی ہے۔ اب آپ اپنے ہاتھوں کو صفائی کے لیے تیار کریں۔

ہینڈ باتھ لینے کے لیے آپ لیکوئیڈ سوپ کو نیم گرم پانی میں ڈال کر ملالیں، اور اپنے ہاتھوں کو پانی میں پانچ منٹ تک بھگوئیں یہ ہینڈ باتھ آپ کے ناخنوں اور جلد کو گہرائی تک صاف کردے گا اور آپ کے کیوٹیکل کو بھی نرم کردے گا۔

اب اورنج اسٹک (جو عام طور پر دستیاب ہیں) لے کر ناخنوں کے نیچے جمی ہوئی میل صاف کریں اور انگلیوں کے پوروں اور ہاتھوں کو اعلا درجے کی چمک دینے کے لیے آپ روغن بادام بھی استعمال کرسکتی ہیں۔ طریقہ یہ ہے کہ آپ پانچ سے دس منٹ تک اپنی انگلیوں کو گرم روغن بادام میں ڈبوئے رکھیں اس عمل سے انگلیاں خوشنما ہوجائیں گی۔

ناخن کے کناروں کی صفائی کے لیے کیوٹیکل بلشر استعمال ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے آپ گلاب کے پھول کی ڈنڈی بھی استعمال کرسکتی ہیں۔ ناخن کے کناروں کی جلد انگلیوں کی بہ نسبت زیادہ گندی ہوتی ہے۔ چونکہ ناخن کی جڑ بھی یہی جلد ہے۔ اس لیے آہستگی سے جڑ میں سے گندگی نکالیں، اس کے ساتھ ساتھ کناروں سے جلد کی فاضل کھال کے خلیات بھی نکال لیں۔ لیکن اس طرح کہ ناخن کی جڑ کے مضبوط خلیوں کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔

اب نیل کریم یا نیل آئل سے ناخن اور انگلیوں کی پوروں کا مساج کریں۔ یہ ناخن کی نشوونما اور چمک میں اضافے کے لیے صحیح ثابت ہوگی۔ اب ہینڈ لوشن سے پورے ہاتھوں کا مساج کریں۔ مساج کرنے سے ہاتھوں اور انگلیوں کی پوروں میں خون کا دوران تیز ہوگا، جو ہاتھوں کی خوبصورتی کا باعث بنتا ہے۔

اب آپ یہ فیصلہ کریں کہ آپ کے ناخنوں کا اسٹائل کیا ہونا چاہیے۔ ناخنوں کا جدید فیشن تو یہ ہے کہ ناخن چھوٹے اور چوکور ہوں، لانبے ناخنوں کا فیشن ختم ہوچکا ہے۔ ناخنوں کو مطلوبہ سائز تک کاٹنے اور تراشنے کے لیے عمدہ قینچی یا کٹر استعمال کریں۔ کاٹ لینے کے بعد انہیں فائل کے ذریعے، بڑی نرمی اور توجہ سے گھس گھس کر اپنے مطلوبہ اسٹائل پر لے آئیں۔ فائل یا چھوٹی ریتی کو ایک ہی ڈائریکشن میں استعمال کیا کریں۔